پیغمبرِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ پاکستان

پیغمبرِ انسانیت ﷺ

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ۔ لاہور

طبع ـــــــ اوّل

تعداد ـــــــ ۱۰۰۰

مطبع:- دین محمدی پریس مُل روڈ لاہور -
ناشر:- محمد اشرف ڈار سیکرٹری ادارہ ثقافتِ اسلامیہ
کلب روڈ-لاہور

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پاکستان و ہندوستان کے خادمانِ سیرت

از مولانا حسن مثنیٰ ندوی

اردو زبان میں سیرتِ نبوی کی اشاعت و تبلیغ کا کام بڑی محنت، بڑی توجہ اور بڑے شدومد سے ہوا ہے۔ اس کی ایک باقاعدہ تحریک چلی ہے اور اس عنوان پر مسلسل تصنیفات و تالیفات وجود میں آئی ہیں اور آتی چلی جاتی ہیں۔ جس طرح ہر تحریک کے پیچھے کوئی اہم تاریخ اور کوئی بڑا پس منظر ہوتا ہے اسی طرح اس تحریکِ سیرت کے پیچھے بھی ایک اہم تاریخ اور ایک بڑا پس منظر ہے جس کا جاننا بہت ضروری ہے۔

مسلمانوں کا عروج

یہ برعظیم جو ۱۹۴۷ء سے پاکستان اور ہندوستان(۱) کی دو آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو گیا ہے

---

(۱) اس برعظیم کے بارے میں قدیم عربی تاریخوں میں الھند والسند کی اصطلاح رائج تھی۔ اب پھر یہ برعظیم ان ہی دونوں علاقوں میں تقسیم ہے۔ علاقۂ سندھ پاکستان میں ہے اور علاقۂ ہند، ہندوستان میں۔ سندھ اور ملتان کا پہلا مسلم فاتح محمد بن قاسم تھا۔ اس علاقے پر عرصۂ دراز تک عربوں کی حکومت رہی ہے۔ سلطان محمود غزنوی سے تقریباً ساٹھ سال پہلے بغداد کا سیاح اصطخری ۳۴۰ھ (سنہ ۹۵۱ء) میں سندھ اور ملتان آیا تھا۔ لکھتا ہے "لسان اہل المنصورۃ و ملتان (باقی اگلے صفحہ پر)

اسلام کے ساتھ پہلی صدی ہجری ہی سے خصوصی ربط رکھتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اختتام تک ایک طرف بحر ہند کے سواحل ملیبار و مدراس سے لیکر گجرات و کاٹھیاواڑ تک مسلمانوں کی نو آبادیاں قائم ہو چکی تھیں، دوسری طرف سندھ کی وادی اسلام کی فوج ظفر موج سے معمور ہو گئی تھی۔ تیسری صدی کے اختتام پر غزنی میں جب ترکوں کی نوجوان تازہ دم قوم نے الپ تگین کی رہنمائی میں سلطنت قائم کی تو اس سلطنت کے مشہور بادشاہ سلطان محمود غزنوی کے اقتدار و حکومت کی سرحدیں غزنی سے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھیں۔ چھٹی صدی میں غوریوں[1] کا دور آیا، پھر خلجیوں کا، پھر تغلقوں کا، پھر سادات کا اور لودھیوں کا۔ اور تقریباً سارا برِ عظیم مسلم حکومت کے زیرِ نگیں رہا۔

بخارا، بلخ، سمرقند، خوارزم، عراق اور ایران کے شہروں سے اربابِ علم و ہنر سمٹ سمٹ کر قطار اندر قطار اس برعظیم میں پہنچے جن کا پہلا مرکز ملتان[2] اور بھکر بنا، پھر

(سابقہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) ونواجیھا العربیۃ والسندیۃ (سفرنامہ المسالک والممالک) منصورہ موجودہ بھکر واقع سندھ کا نام تھا ـــ خاندان تو بدلتے رہے مگر سنہ ۹۳ھ سے سنہ ۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء تک مسلمان ہی اس علاقے پر حکمرانی کرتے رہے۔ سنہ ۴۱۲ھ (سنہ ۱۰۲۱ء) سے پنجاب غزنوی سلطنت کا جزء ہوا اور سنہ ۱۲۱۶ھ (سنہ ۱۸۰۱ء) تک مسلمانوں کے ماتحت رہا۔ (۱) سنہ ۵۸۷ھ (سنہ ۱۱۹۱ء) میں غوریوں کا دور شروع ہوا اور دہلی کی سلطنت قائم ہوئی۔ سنہ ۵۸۹ھ (سنہ ۱۱۹۳ء) سے سنہ ۱۲۷۴ھ (سنہ ۱۸۵۷ء) تک ترک، افغان، عرب اور پھر مغل حکمرانوں کی صورت میں مسلمانوں کا اقتدار برابر قائم رہا۔

(۲) ملتان پنجاب کا علاقہ ہے اور بھکر سندھ کا۔ یہ دونوں تاریخی علاقے پاکستان میں ہیں۔ اسی طرح لاہور اور سیالکوٹ بھی۔

لاہور اور سیالکوٹ۔ بعد میں شمس الدین التمش نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تو ارباب علم و ہنر دہلی میں سمٹ آئے اور دہلی بغداد و قرطبہ کی ہمسر بن گئی۔ ۷۹۶ھ/۱۳۹۴ء میں خواجہ جہاں نے سلطان الشرق کے لقب سے جونپور کو اپنا مستقر بنایا تو علم و فضل کا مرکز "پورب" ہو گیا فیض آباد (اودھ)، الہ آباد اور عظیم آباد (پٹنہ)[1] اس پورب کا "خطۂ علم و فضل" تھے۔ پھر مغلوں کا دور آیا۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر بہت بڑے بادشاہ ہوئے۔ اور سارے برعظیم پر ایک وسیع و ہمہ گیر مسلم حکومت اورنگ زیب عالمگیر کے عہد تک قائم رہی۔ ملک سرسبز و شاداب رہا اور علوم و فنون بھی پھلتے پھولتے رہے۔

سلطنت مغلیہ کا خاتمہ

اورنگ زیب نے ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء میں وفات پائی تو مملکت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی جو نصب العین اور مقصد حیات سے کورے ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضیوں اور گروہ بندیوں نے قومی تنظیم اور استحکام ملی کو گھن لگا دیا اور سب آپس ہی میں لڑبھڑ کر تباہ ہو گئے۔[2] ۱۱۱۹ھ/۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء یعنی آخری بادشاہ مغلیہ بہادر شاہ ظفر تک، اگرچہ مرکزی مسلم حکومت اور تخت و تاج دہلی کا نام باقی تھا مگر صرف نام ہی تھا ورنہ ملک و ملت، رہنماؤں کی نااہلی یا نااہلوں کی رہنمائی کی بدولت جنگ و جدل کی آماجگاہ اور انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی[3] کی سازشوں، ریشہ دوانیوں، ملک گیری کی چالبازیوں اور

---

(۱) پورب کے یہ علاقے اودھ، الہ آباد، اور عظیم آباد (پٹنہ) تقسیم کے بعد ہندوستان کے حصے میں ہیں

(۲) یہ برائیاں جس ملک اور جس خطے میں اور جس قوم کے درمیان پھیلتی ہیں اور جڑ پکڑتی ہیں اس کا حشر یہی ہوتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔ عواقب و علل کی اس دنیا میں جَو بو کر گیہوں کوئی نہیں کاٹ سکتا۔

(۳) یہ انگریزوں کی ایک تجارتی کمپنی تھی جس نے تجارت کے بھیس میں ملک (باقی اگلے صفحہ پر)

دسیسہ کاریوں کی جولانگاہ تھے۔ اور ان ہی کے نتائج تھے جو آخر کار ۱۸۵۷ء / ۱۲۷۵ھ کی ہولناک خونریزی و تباہی کی صورت میں رونما ہوئے۔ مسلم اقتدار کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا اور سارا برعظیم برطانوی شہنشاہی کا حصہ بن گیا۔ [1]

خونیں انقلاب کے بعد

اس پورے طویل زمانے میں دوسری صدی ہجری سے لیکر عہدِ مغلیہ کے اختتام تک اس برعظیم نے بے شمار علماء و مصنفین پیدا کیے جنہوں نے معقولات و منقولات، تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، نحو و صرف، لغت و لغت، معانی و بیان، منطق و کلام، تاریخ و سیر، فلسفہ و ریاضی وغیرہ تمام علوم و فنون میں ایک سے ایک بیش بہا تصنیفیں چھوڑی ہیں۔ بیشتر عربی میں اور کمتر فارسی میں۔ عہدِ مغلیہ کے اختتام تک فارسی سرکاری زبان تھی۔

۱۸۵۷ء کے خونیں انقلاب میں صرف یہی نہ ہوا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کی

(سابقہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) رشوتوں، سازشوں اور فتنوں کے جال بچھائے اور مختلف علاقوں اور ریاستوں کو باہم لڑوایا۔ بالآخر ایک بڑے علاقے پر قابض ہوگئی۔ اولاً اس کا طریقہ یہ تھا کہ علاقے کے مسلم حکام اور صوبہ داروں کو اپنی مٹھی میں لیتی۔ خود سامنے نہ آتی۔ لیکن علاقے بھر میں اپنی تجارت کے پردے میں ایک طرف دولت سمیٹ سمیٹ کر انگلستان بھیجتی، دوسری طرف ملک میں سیاسی، معاشی اور تجارتی بحران اور پریشان حالی پیدا کرتی رہتی تاکہ علاقے کے حکمران مطمئن نہ رہ سکیں (دیکھیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت از باری یا تقاریر ایڈمنڈ برک وغیرہ) اور یہ عالم تو آج تک ان کمپنیوں کا جاری ہے۔ (۱) تفصیلی پس منظر اور مسلمانوں کی داستانِ تباہی اور انگریزوں کے متعصبانہ مظالم کی فہرست سے واقف ہونے کے لیے ملاحظہ کیجیے "انڈین مسلمانس" از ڈاکٹر ولیم ہنٹر۔ "ان ہیپی انڈیا" از لالہ لاجپت رائے "تقاریر ایڈمنڈ برک"، "وارن ہیسٹنگز کی سوانح" از میکالے۔ "ایمپائر آف ایشیا" (لے بک آف کنفیشنز) از ڈبلیو ایم ٹارنس۔ ممبر برطانوی پارلیمنٹ

سلطنت کا نام ونشان مٹا دیا۔ یہیں تک ہوتا تو کوئی بات نہ تھی حکومتیں آتی ہیں، حکومتیں جاتی ہیں۔ دنیا میں ایسے نشیب وفراز ہوتے ہی رہتے ہیں مگر یہاں یہ ہوا کہ انگریزوں نے ساری مسلمان قوم کو نشانۂ عتاب وانتقام بنایا۔ ان کی جمعیت وتنظیم اور معاشرے کو پراگندہ کیا۔ ان کے نظامِ تعلیم(۱) اور نظامِ معیشت کو توڑا، نظامِ صنعت وحرفت کو بکھیرا۔ ان کی صلاحیتوں(۲) کو کچلا۔ چُن چُن کے ان کے علماء(۳) وزعماء کو تہ تیغ کیا۔ جو بچ رہے ان پر مقدمات چلائے پھر ان کو گولی ماردی یا عبورِ(۴)

---

(۱) مسلمانوں کا نظامِ تعلیم سارے ملک میں جال کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ تنہا بنگال میں اسّی ہزار مدارس تھے۔ یہی حال نظامِ معیشت وصنعت وحرفت کا تھا۔ (انڈین مسلمانس) (۲) ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے "جب ملک ہمارے قبضے میں آیا تو مسلمان سب سے اعلیٰ قوم تھی۔ وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ہی میں برتر نہیں تھے بلکہ سیاسیات اور حکمتِ عملی میں بھی سب سے افضل تھے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بند ہے۔ غیر سرکاری زندگی میں انہیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔" (انڈین مسلمانس)۔ (۳) دیکھیے تفصیلات مقدمات بغاوت ۱۸۶۴ء و ۱۸۶۵ء وتفصیلات خانوادۂ علمائے صادقپور پٹنہ جن کے محلّے کی جڑ تک کھود دی گئی۔ نیز دیکھیے "شاندار ماضی" از مولانا محمد میاں ——— اسپنسر وال پول لکھتا ہے کہ دلی میں فتح کے بعد جو لوٹ اور قتل کا بازار گرم ہوا وہ نادر نے بھی روا نہ رکھا تھا۔ مؤلف تبصرۃ التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کیے گئے اور سات دن تک برابر قتلِ عام جاری رہا" ——— یہ تو صرف دلی کا حال تھا۔ یہی عالم سارے ملک میں ہوا۔ (۴) مفتی عنایت احمد، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا عبدالرحیم و مولانا احمد اللہ صادقپوری وغیرہ انڈمان بھیج دیے گئے۔ مولانا نذیر حسین محدث، مفتی صدرالدین، نواب شیفتہ، مولوی عبدالقادر وغیرہ جیل میں ڈال دیے گئے۔ کچھ لوگ ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے جیسے حضرت حاجی امداد اللہ شاہ عبدالغنی، شاہ احمد سعید اور ڈاکٹر وزیر وغیرہ۔ یہ چند مثالیں ہیں اکابر کی۔

دریائے شور کی سزا دی۔ غرض خواص کو اور عوام کو طرح طرح سے تباہ و برباد کیا۔ اور یہ سب کچھ باقاعدہ "اسکیم"[1] اور پلان کے ساتھ ہوا۔ ہندوؤں کو ان کے خلاف ابھارا گیا۔ اکسایا گیا۔ زندگی[2] کے ہر شعبے میں ہندوؤں کو آگے بڑھایا گیا۔ مسلمانوں کو گرایا گیا۔ یہ انگریزوں کی مستقل "پالیسی"[3] رہی۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ خود اسلام پر بھی ہر طرف

---

(۱) ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے کہ "مسلمان شہنشاہی کی ظاہری برتری کو مٹانے سے بہت پہلے ہم نے مسلمان حکام کو برطرف کرنا شروع کیا تھا۔" (انڈین مسلمانس ص ۱۹۵) (۲) میلکم لوئین جج عدالت العالیہ مدراس و ممبر امپیریل کونسل کا یہ بیان پڑھیے — "ہم نے ہندوستانیوں کی ذاتوں کو ذلیل کیا۔ ان کے قانونِ وراثت کو منسوخ کیا۔ بیاہ شادی کے قاعدوں کو بدل دیا، مذہبی رسم و رواج کی توہین کی، عبادت خانوں کی جاگیریں ضبط کیں۔ سرکاری کاغذات میں ان کو کافر لکھا۔ امراء کی ریاستیں ضبط کیں، لوٹ کھسوٹ سے ملک کو تباہ کیا۔ انہیں تکلیف دے دے کر مالگذاری وصول کی۔ سب سے اونچے خاندانوں کو برباد کر کے انہیں آوارہ گرد بنا دینے والے بندوبست قائم کیے۔" — دیکھیے مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد علیگ — (حتیٰ کہ جون ۱۸۳۱ء میں کشن رائے زمیندار کے مظالم مسلمانانِ بنگال پر اس قدر بڑھے اور انگریزوں کے اشارے پر اس نے مذہبی مداخلت اور توہین یہاں تک کی کہ ہر مسلمان پر "داڑھی ٹیکس" لگاتا تھا — دیکھیے کلکتہ ریویو ۱۸۵۱ء جلد ۱۵ ص ۱۷۹ جولائی ۱۸۷۰ء)۔ (۳) برعظیم میں انگریزی تعلیم کے اجرا کی اسکیم لارڈ میکالے نے تیار کی تھی۔ اس اسکیم کا مقصد جو رپورٹ میں درج ہے یہ تھا کہ: "ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہم میں اور کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو۔ اور یہ جماعت ایسی ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر و نظر اور مذاق کے اعتبار سے انگریز ہو (دیکھیے تاریخ التعلیم از میجر باسو ص ۱۰۵، نیز دیکھیے تقاریر ایڈمنڈ برک انگریزی جلد اول ص ۱۰۴، ۱۰۵) میکالے کا خیال یہاں تک تھا کہ "ممکن ہو تو حکمران تو اس ملک میں ان کے اپنے ہوں مگر طریقہ اور راستہ سارا ہمارا ہو، حتیٰ کہ کٹوری (کھانے پینے کے برتن اور ساز و سامان)

(باقی اگلے صفحہ پر)

سے حملے شروع ہو گئے۔ ایک طرف عیسائی مشنریاں تھیں، دوسری طرف ان کی شہ پر ہندوؤں کی آریہ تحریک اٹھی، ادھر یورپ کے مستشرقین نکلے سب کا نشانہ اسلام تھا۔

مخالفِ اسلام سرگرمیاں

مستشرقین یورپ کی جماعت آگے بڑھی اور اس نے علوم و فنونِ اسلامیہ کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ان میں سے کوئی نہ کوئی بات نکال کر اس پر اعتراضات شروع کیے اور تیور محققانہ و عالمانہ رکھا۔ اس کا اثر نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر ہونے لگا۔ یورپ کے نئے دور میں علم کلام کا مرکز فلسفہ سے کچھ ہٹ کر تاریخ کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ لہٰذا تاریخی ریشہ دوانیاں اسلام کے خلاف زور و شور سے ہوئیں اور آج تک جاری ہیں۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے اور اپنے مقاصد[1]

(سابقہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) تک انگریزی ہو" دیکھیے رائٹنگ اینڈ اسپیچز آف میکالے، ——— اور اہل ہند کو عیسائی بنانا بھی مقصود تھا۔" دیکھیے تاریخ التعلیم میجر باسو ص ۱۰۵، و تاریخ تعلیم از سید محمود ص ۶۶ ——— لارڈ میکالے کہتا ہے کہ "زمانہ سابق میں جس طرح زوردار اور بااثر لوگوں کو افیون کے پوست پلا کر کاہل اور پست ہمت اور بدعقل بنا دیا جاتا تھا ہمارا انتظام سلطنت اسی طرح اہلِ ہند کو بیکار کر دے گا۔" ——— دیکھیے حکومت خود اختیاری: ان ہیپی انڈیا۔

(۱) لارڈ میکالے مسلمانوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ "کلایو کسی مسلمان کو بنگال کے محکمۂ انتظامی کا افسر بنانے کے بہت خلاف تھا۔ اس وقت تک انگریزوں کا اقتدار بنگال ہی تک محدود تھا۔ نیز کلکتہ گزٹ میں مشتہر کیا گیا کہ مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت ہی ذلیل ہو گئی ہے ہندوؤں سے ہم کو کچھ خوف نہیں ہے۔ اگرچہ بہت آدمیوں نے صلاح دی ہے کہ مسلمانوں کو تقویت پہنچا کر ہندوؤں کی قوت کو مغلوب کرنا چاہیے مگر یہ تدبیر اور انتظام اچھا نہیں ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے حصول کے لیے اسکولوں میں جہاں خود برِعظیم کے مسلمان بادشاہوں کی تاریخ توڑ مروڑ کے پڑھانی شروع کی (جن کی اصلیت ملک کے علماء و مصنفین اس عہد سے آج تک برابر واضح کرتے رہے ہیں) وہاں آں حضرت ؐ کی سیرت طیبہ کو بھی طرح طرح

(سابقہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) کچھ ضروری نہیں کہ ہم ایسے کام کریں جو ہندوستانیوں (ہندوؤں) کو ناگوار ہوں اور سلطنت جو بر سرِ زوال ہے وہ حقیقت میں ہماری قلبی دشمن اور رقیب ہے، اس کے حامی و مددگار ہوں۔" (تاریخ ہندوستان از ذکاء اللہ جلد پنجم ص ۴۳۳) — سندربن (بنگال) کے کمشنر نے اعلان کیا کہ جو ملازمتیں خالی ہوں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے (انڈین مسلمانس از ہنٹر) ۔ (۱) نہ جانے کتنی تاریخیں تباہ کر دیں ۔ یورپ اور انگلستان کی سیاست میں اس طرز عمل کو بڑی اہمیت اور خصوصیت حاصل ہے ۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ غلط کو صحیح اور صحیح کو غلط بنا کر پیش کرنے کا فن ایک خاص فن ہے جس کو اہل غرب نے سارے عالم اسلام بلکہ ساری دنیا میں طرح طرح سے استعمال کیا ہے اور اب تک کر رہے ہیں ۔ اسی کی ایک، ترقی یافتہ صورت وہ ہے جو جرمنی کے مشہور نازی لیڈر ڈاکٹر گوبلز کی طرف منسوب ہے کہ جھوٹ کو اتنی مرتبہ اور اس طرح اتنی شدت سے دہراؤ کہ بالآخر دنیا اس کو سچ سمجھ لے ۔ بڑے سائنس دان اور محققین تک اس سے مستثنٰی نہیں رہے PILL-DOWN MAN کا واقعہ ابھی لوگ بھولے نہ ہوں گے ۔ آج سے چالیس سال قبل برٹش میوزیم کے دو اعلیٰ درجے کے ماہرین محققین نے بڑی دھوم سے اعلان کیا تھا کہ بندر اور انسان کے درمیان کی مشترک مخلوق مل گئی اور ایک تسلیم شدہ حقیقت کے طور پر اسے برٹش میوزیم میں نصب بھی کر دیا گیا ۔ لیکن اب چالیس سال بعد ۱۹۵۳ء میں یہ ثابت ہوا کہ یہ اعلان سراسر فریب تھا جعل تھا ۔ ان دونوں جعل سازوں نے مختلف ہڈیوں کو جوڑ کر ایک ڈھانچہ کھڑا کر دیا تھا جس میں دانت اور جبڑے عہد حاضر کے بندر کے لگا دیے گئے تھے ۔ اس فریب نے کتنے اذہان و افکار پر کہاں کہاں اثر ڈالا ہوگا (دیکھیے انکشاف برٹش میوزیم کے ہسٹری سیکشن کا، مورخہ ۲۱ نومبر ۵۳ء) ۔

سے توڑا مروڑا گیا۔ اس کا مقصد صرف اسلام کی طرف سے شبہات وشکوک پیدا کرنا نہ تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ اسلامیانِ برعظیم کی قلبی و روحانی وابستگی پیغمبر آخرالزماں ؐ کے ساتھ اور عالم اسلام کے ساتھ کم سے کم تر ہو جائے"۔[1] اُس دور کو اور مسلمانوں کے تصورِ وحدتِ اسلامی کو ذہن میں رکھیے۔

ہندوستان میں ڈاکٹر اسپرنگر اس طرزِ عمل کے پہلے علمبردار تھے جو اس زمانے میں دلی کالج اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے سربراہ تھے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی ان کا حملہ شروع ہوا تھا، پھر صوبۂ یوپی کے گورنر سر ولیم میور اور ان کے معاصرین ڈاکٹر جے۔ اے مولر، ڈاکٹر ڈیل، وان کریمر، بر تھالی سینٹ ہیلر، نولڈیکی، ولہاززن، گولڈزیہر، رینان وغیرہ فضلائے یورپ نے اور پھر اخیر میں پروفیسر مارگولیوتھ وغیرہ نے یکے بعد دیگرے بڑی محنت سے اپنا کام انجام دیا۔ اور اب تو پوچھنا ہی نہیں، بے شمار حضرات نکل پڑے ہیں حتیٰ کہ خود اسلام کے گھر میں بھی لوگ ان سے متاثر

---

(۱) دیکھیے حیاتِ شبلی از سید سلیمان ندوی و دیگر کتب متعلقہ — (یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھیے کہ دیانت داری و ایمانداری (HONESTY) کم از کم انگریزوں کے یہاں کوئی قدر عالیہ نہیں بلکہ ایک حکمت عملی (پالیسی) ہے جو اغراض و مقاصد کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ ان کے اقوالِ زریں میں ایک قول ہے" ایمانداری ایک بہترین پالیسی ہے" (HONESTY IS A BEST POLICY) — جی ہاں دوسرا نکتہ یہ بھی ذہن میں رہے کہ عالم اسلام کی وحدت ان کے نزدیک سب سے زیادہ مہلک چیز ہے۔ اسی لیے ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم جب ختم ہوئی اور لارڈ ایلنبی فلسطین میں داخل ہوا تو ونسٹن چرچل جیسے شخص نے بھی مبارکباد کا تار دیا تو لکھا کہ صلیبی جنگ آج ختم ہوئی" حالانکہ یہ کوئی موقع بظاہر اس کا نہ تھا، مسلمان ادھر بھی تھے مسلمان ادھر بھی تھے، مگر سیاست کے تو ہاتھی کی طرح کچھ دانت دکھانے کے ہوتے ہیں اور کچھ چبانے کے۔ پھر تو مسلسل ہی عالم اسلام کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ تمام راہیں بند کی گئیں جو عالم اسلام کو اتحاد کی طرف لے جانے والی ہوں۔

ہوئے بغیر نہ رہے۔

مسلمانوں کی جوابی تحریکیں

اسلام کی طرف سے مخالفین کے ان حملوں کا جواب دینے کے لیے ملک میں متعدد اہل علم اٹھے اور جس سے جو بن آئی اس نے کیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رحم علی، مولانا عنایت رسول، مولانا سید احمد خاں، مولانا چراغ علی، مولانا سید محمد علی مونگیری وغیرہ سامنے آتے رہے (اور پھر بعد میں جسٹس امیر علی کلکتہ، مسٹر صلاح الدین خدابخش پٹنہ وغیرہ نے قلم اٹھایا) ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے ان عیسائیوں اور آریوں کا جواب دیا۔ مولانا سید محمد علی مونگیری نے تحفۂ محمدیہ کے نام سے اور مولانا سید احمد خاں نے تہذیب الاخلاق کے نام سے رسالہ بھی نکال لیا تھا۔ سر ولیم میور کی مشہور زہریلی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں سرسید نے ۱۸۶۹ء میں اپنی کتاب "خطبات احمدیہ" خاص طور پر لندن جا کر مرتب کی تھی۔ پھر مشہور شیعی عالم چراغ علی نے انگریزی زبان میں "محمد دی پرافٹ" جوابی طور پر لکھی۔(۱) ان کا سلسلۂ تصانیف ۱۸۸۲ء سے شروع ہوتا ہے۔

لیکن یہ ساری خدمات و مساعی انفرادی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی ہولناک دارو گیر کے بعد اُس عہد وحشت و بربریت میں مسلمان بحیثیت قوم کسی قسم کی کوئی سیاسی جنبش(۲) تک نہ

---

(۱) "مناظرہ" کا مزاج ہی یہ ہے کہ آدمی اعتدال پر باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے ان بزرگوں میں سے بعض سے چوکیں بھی ہوئیں۔ کیونکہ ان کی جوابی کوششیں قلمی مناظرے ہی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ (۲) ساری مسلم قوم باغی قرار دے دی گئی تھی۔ سید احمد خاں نے اس مہلک ضرب سے قوم کو بچانے کے لیے ۱۸۶۳ء میں بڑی جرأت سے کام لیا۔ "اسباب بغاوتِ ہند" کے نام سے ایک کتاب لکھی (باقی اگلے صفحہ پر)

کر سکتے تھے حالانکہ یہ سارے حملے جو اسلام پر ہو رہے تھے اصلاً سیاسی ہی تھے۔ تاہم کچھ عرصہ بعد چار تحریکیں یکے بعد دیگرے وجود میں آئیں۔ تحریک دیوبند[1]۔ تحریک علیگڈھ[2]، تحریک ندوہ[3] اور تحریک سیرت[4]۔

(سابقہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) اور ثابت کیا کہ بغاوت کا الزام مسلمانوں پر نہیں خود انگریز حکام کے سر عائد ہونا چاہیے جن کی پالیسی اور طرز عمل نے اضطراب پیدا کیا۔ یہ کتاب انھوں نے تمام ممبران پارلیمنٹ کو بھیجی۔

(۱) اس کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ یہ شاگرد تھے مولانا مملوک علی کے اور مسترشد تھے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے (حاجی صاحب نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے جنگ کی تھی) انہوں نے تحفظ علوم اسلامیہ قدیمہ کے لیے مدرسہ دیوبند ۱۸۶۶ء میں قائم کیا۔ ان کی وفات ۱۸۷۹ء میں ہوئی (تاریخ دیوبند)۔

(۲) اس کے بانی مولانا سید احمد خاں تھے۔ یہ بھی شاگرد مولانا مملوک علی کے تھے۔ انہوں نے اور ان کے رفقا نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علیگڈھ قائم کیا۔ زبان انگریزی اور علوم جدید (بشمول دینیات) رائج کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ انگریزی سرکاری زبان ہوگئی تھی اور مسلمانوں کے مستقل طور پر محروم و پس ماندہ اور نظام ملکی سے دور ہو جانے کا خطرہ تھا۔ انگریز پہلے ہی دشمن تھے۔ سرسید نے خود انگریزی نہیں پڑھی تھی۔ انہوں نے ۱۸۸۶ء میں تعلیمی تحریک کو عام کرنے کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی (حیات جاوید از حالی)۔ (۳) اس کے بانی مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور مولانا سید محمد علی مونگیری تھے۔ دونوں صوفی اور ہم مشرب اور ہم مرشد تھے۔ (دیکھیے خطبہ قاضی سلیمان مصنف رحمۃ للعالمین، اجلاس ہشتم ندوۃ العلماء ص ۱۱۲)۔ عیسائیوں کے حملوں کا جواب دیتے دیتے بعض آیات قرآنی اور مسائل دینی کی ایسی تاویلیں مولانا سید احمد خاں نے کی تھیں کہ اکثر علمائے قدیم ناراض ہو گئے اور سرسید پر اعتزال، نیچریت اور عقل پرستی کے الزامات عائد ہوئے۔ مسلمانوں کے دو گروہ ہو گئے۔ اور تحریک تعلیم و تنظیم متاثر ہوئی تو ان دونوں بزرگوں نے ۱۸۹۳ء میں مجلس ندوۃ العلماء، اصلاح علماء، و رفع نزاع باہمی اور قدیم و جدید سب کو ایک مرکز پر لانے کے لیے قائم کی اور سارے برعظیم کے علماء کو سمیٹا۔ پھر اس مجلس کے ماتحت ایک دار العلوم بھی لکھنؤ میں قائم کیا جو دیوبند اور علیگڈھ کے درمیان نقطۂ وصل ہے۔ (۴) اس کے بانی مولانا شاہ سلیمان پھلواروی تھے۔ اس کی (باقی اگلے صفحہ پر)

تحریکِ سیرت

اسلام کی طرف سے عیسائیوں اور آریوں کے حملوں کا جواب بھی انفرادی طور پر دیا گیا۔ وقت کے وقت ان کا پورا توڑ بھی کیا گیا۔ اعتراضات وشبہات کی صحت وعدمِ صحت کی حقیقت بھی واضح کی گئی اور ملی تنظیم کا آغاز بھی کیا گیا مگر ملتِ اسلامیہ ہندیہ کا اپنا حال کیا تھا؟ وہ اپنے ملی نظامِ تعلیم اور نظامِ معاشرہ سے محروم ہو کر منتشر ہو چکی تھی۔ اس کا تسلسلِ حیاتِ اجتماعی منقطع ہو گیا تھا۔ اس کی ایک پوری نسل، انقلاب وانتقام کے ہاتھوں بیچ سے ختم ہو چکی تھی۔ انگریزی نظامِ سیاست کی بدولت غربت وافلاس اور ذہنی وفکری انتشار اس کے اندر عام تھا۔ جسے از سرِ نو سمیٹا اور سنبھالا جا رہا تھا۔ وہ خود ہی محتاج تھی کہ اسلام اور اسلام کی تاریخ سے پوری صحت وسند کے ساتھ اسے باخبر کیا جائے۔ اس کی پراگندہ حالی وپراگندہ خیالی کو دور کیا جائے۔ تعلیمی اصلاح وتنظیم کے ساتھ ساتھ روحانی تزکیے اور اخلاقی تربیت اور کردار وعمل کے اسباق پڑھائے جائیں۔ خود آگاہی وخود شناسی کی تلقین کی جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے بجز سیرتِ طیبہ کی اشاعتِ عام کے اور کوئی دوسرا ذریعہ اور وسیلہ نہ تھا کہ وہی ملتِ اسلامیہ کے لیے داروئے حیات تھا۔ لہٰذا تحریکِ سیرت کی بنیاد پڑی۔ ملتِ اسلامیہ کی زندگی میں سیرتِ طیبہ کا درجہ وہی ہے جو

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) بنیاد انھوں نے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں رکھی۔ گویا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تحریکِ سیرت دونوں ساتھ ساتھ چلے ۔۔۔ قدیم علماء وصوفیاء کے ممتاز خانوادوں میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کی حمایت کی تھی اور تقویت پہنچائی تھی (دیکھیے روزنامہ البشیر اٹاوہ جون ۳۵ء وروزنامہ انقلاب لاہور جون ۳۵ء وخاتمِ سلیمانی از مولانا شاہ غلام حسنین ندوی) مگر وہ تعلیمی اصلاح وترقی کے ساتھ روحانی تزکیے اور اخلاقی تربیت کو بھی ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کے لیے لازمی قرار دیتے تھے (دیکھیے رودادِ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)۔

آدمی کی زندگی میں اس کی شہ رگ کا ہے۔ اور اس شہ رگ کو بچانے کی، اور صرف بچانے ہی کی نہیں بلکہ صحیح طور پر اس کو جسدِ ملّی میں کارفرما باقی رکھنے کی شدید جدوجہد مسلمانوں نے کی، اور وہ از سرِ نو تازہ دم ہو گئے، سنبھل گئے، ہندوستان کے ماضی قریب کی تاریخ ملّی تو یہی بتاتی ہے۔

سید احمد خاں

اس دور کے خادمانِ سیرت میں سب سے پہلا نام تحریک علی گڈھ کے بانی سید احمد خاں کا ہے۔ جنھوں نے یورپی مستشرقین کی گمراہ کن سرگرمیوں کا بہت مدلل اور مؤثر جواب دیا۔ سر سید نے سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں اپنی مشہور کتاب "خطباتِ احمدیہ" لکھی جس کو اردو زبان میں سیرت کی پہلی تصنیف کہنا چاہیے۔ سر سید نے یہ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی تھی۔ حتیٰ کہ عبرانی بائبل کے حوالے بھی اسی زبان کے حروف میں پیش کیے ہیں اور پھر رومن تلفظ کے ساتھ ان حوالوں کے ترجمے بھی درج کر دیے ہیں۔ یہ کتاب نہایت سنجیدہ اور مدلل ہے اور اس میں ولیم میور کے اعتراضات کا جواب بھی بڑے اچھے انداز میں دیا گیا ہے۔

شاہ سلیمان پھلواروی

تحریکِ سیرت کی بنیاد مولانا شاہ سلیمان پھلواروی[1] نے ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء میں رکھی تھی۔ ان

---

(۱) "وسیع النظر عالم، بذلہ سنج ادیب، خوش بیان خطیب، پُر اثر واعظ، موقع شناس مقرر اور بڑے بڑے بزرگوں کے حلقے سے فیض یاب صوفی تھے۔ ان کو تاریخ کا شوق اور عربی نظم و نثر کا اچھا ذوق تھا۔ اچھے کتب خانوں اور کتابوں کی تلاش رہتی تھی اور اس حیثیت سے وہ اپنے ہمعصروں (باقی اگلے صفحہ پر)

کا وطن پھلواری (پٹنہ عظیم آباد) تھا۔ یہ بستی زمانہ قدیم سے شریعت و طریقت کا گہوارہ چلی آتی ہے۔ اس کی حیثیت ایک بڑی درگاہ کی تھی جہاں ماہ مبارک ربیع الاول میں عرس کے موقع پر ہزارہا کی تعداد میں لوگ دور دراز گوشوں سے بھی کھنچ کھنچ کر پہنچتے تھے۔ اور چاند رات سے بارہ بلکہ پندرہ تاریخ تک زبردست اجتماع رہا کرتا تھا اور اس اجتماع نے دوسری تمام بڑی درگاہوں کے اعراس کی طرح ایک بڑے میلے کی صورت اختیار کر رکھی تھی۔ مولانا نے اپنی اسی بستی، اسی موقع اور اسی مہینے کو آغازِ تحریک کے لیے منتخب کیا۔ اور اس میلے کو بیانِ سیرت و تذکرۂ تاریخِ اسلام کے اجتماع و اجلاس میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے چاند رات سے روزانہ شب دوازدہم تک ایک نئے انداز سے سیرت کا بیان شروع کیا۔ اور اس انداز بیان کو سارے ملک میں رواج دیا۔ یہ بیان وہ اپنے گھر پر کرتے تھے جواب "آستانۂ سلیمانیہ" ہے۔

برعظیم میں ذوقِ سیرت پیدا کرنے کی یہ پہلی بنیاد تھی۔ اس سے زیادہ قدیم کوئی محفل سیرت اور نہیں ہے۔ پھلواری سے یہ تحریک ملک کے طول و عرض میں

گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) میں پورا امتیاز رکھتے تھے ... شاہ صاحب کی ذات ایک عجیب جامع ہستی تھی ایسے لوگ اب پیدا نہ ہوں گے۔ زمانہ بدل رہا ہے، ہوا کا رخ اور طرف ہے۔ وہ قدیم و جدید کے درمیان حلقۂ اتصال تھے۔" (یادِ رفتگان از علامہ سید سلیمان ندوی ص ۱۸۱-۱۸۷) "وہ بہت بڑے عالم اور سجادہ نشین صوفیاء کرام پھلواری تھے۔" دیکھیے تحریر سر سید احمد خاں، رسالہ تہذیب الاخلاق مجریہ یکم محرم الحرام ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۵ء (ج ۱)۔ ان کی شخصیت کو مسلمانوں کے تمام فرقوں میں، صوفیوں کے تمام خانوادوں میں، علماء کے تمام مراکز میں اور جدید تعلیم یافتوں کے تمام حلقوں میں غیر معمولی طور پر یکساں مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی۔ (دیکھیے معارف اعظم گڈھ جولائی ۳۵ء از سید سلیمان ندوی، منادی دہلی ۲۸ جون ۳۵ء از خواجہ حسن نظامی) "احد مشائخ الصوفیۃ الکبار فی ھذہ البلاد کان من انصار الدین و حماۃ الاسلام و محبی السلم والوئام بین المسلمین۔ (الرضوان لکھنؤ شیعی ترجمان) ماہ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ)

خوشبو کی طرح پھیلی۔ اور سیرت کی محفلوں، کمیٹیوں اور باقاعدہ تصانیف سیرت کی محرک ہوئی۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس اس زمانے میں بڑے اہتمام اور تزک و احتشام کے ساتھ ہونے لگے تھے۔ یہی اس عہد کے بڑے تنظیمی ادارے تھے۔ ان تمام اداروں کو بھی انہوں نے اپنی ذات سے اور اپنے پُر اثر وعظوں[۲] سے بیانِ سیرت کا اجلاس بنا دیا تھا۔ بلکہ پشاور سے رنگون تک کوئی چھوٹا بڑا اجتماع یا اجلاس ایسا نہ ہوتا تھا جس میں ان کی شرکت ضروری نہ سمجھی جاتی ہو۔ وہ اس زمانے کے نہایت ہی محبوب و مقبول رہنما تھے۔ اسی طرح سارے ملک میں انہوں نے ایک خاص لگن پیدا کر دی۔

۱۸۸۵ء سے لے کر اب تک یوں تو اس تحریک کی روح برابر اپنا کام کر رہی ہے اور ارباب علم و نظر اس کی طرف متوجہ ہیں۔ اور خدمت چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، پہلے ہو یا بعد میں، مسلک و مقصود میں منسلک ہے تو اپنی اپنی جگہ ہر ایک اہم ہوتی

---

(۱) دیکھیے رودادیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی، ندوۃ العلماء کی اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی، اور ان میں مولانائے پھلواروی کی تقریریں۔ (۲) "پچیس برس تک ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کے پُر کیف و پُر اثر خطبوں سے متمہور رہا ہے۔ وہ جس جلسے میں ہوتے تھے ان کے سوا ہر آواز ماند پڑ جاتی تھی۔ جلسے کے اہم موقعوں پر ان کی طوطی گفتاری بڑی بڑی پیچیدگیوں کو حل کر دیتی تھی۔" (یادِ رفتگاں از علامہ سید سلیمان ندوی ص ۱۸۵)۔ (۳) یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء سے پھلواری میں بیانِ سیرت کا جو سلسلہ شروع ہوا تو آج ۱۹۶۲ء تک برابر جاری ہے اور کسی سال ناغہ نہیں ہوا۔ نہ تو مولانائے پھلواروی کی زندگی میں نہ ان کے بعد۔ ان کی اولاد نے بھی بدستور اسے جاری رکھا ہے۔ آج اسے شمسی حساب سے ستتّر اور قمری حساب سے اناسی برس ہو چکے ہیں۔

ہے۔ مگر تین ہم ناموں (سلاسنہ ثلاثہ) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ دیکھیے کہ سیرت نبوی کو انھوں نے کس کس انداز سے پیش کیا اور تربیت فکری و نظری کے اعتبار سے اس کا درجہ کیا ہے۔

بانی تحریک سلیمان اول کے بیان سیرت کی خصوصیات حسب ذیل تھیں:

(۱) رسول اللہؐ کی زندگی، نبوت، نزول وحی، تبلیغ، غزوات، اور دوسرے تمام اہم واقعات کا بیان زمانی تسلسل کے ساتھ تفصیل سے ہوتا تھا۔

(۲) تمام اسمار، انساب، مقامات، جغرافیہ اور سنین کی پوری پوری تعیین ہوتی تھی۔

(۳) تاریخی روایات کے محض حوالے پر اکتفا نہ ہوتی بلکہ جابجا ان پر قرآن سے عقل و درایت سے، رجال سے، اصول جرح و تعدیل سے اور معیارِ سیرت کے نقطۂ نگاہ سے تبصرہ اور تنقید بھی کرتے جاتے تھے۔

(۴) جہاں سیرت کی تفصیل پیش کی جاتی وہیں قدم قدم پر اپنی سیرتوں کو سیرتِ طیبہ کے آئینے میں دیکھ کر سنبھالنے اور سنوارنے کی تلقین بھی ہوتی جاتی۔

(۵) یہ بیان محض علمی تحقیق اور خشک لکچر نہ ہوتا تھا بلکہ محققانہ اور حکیمانہ انداز کے ساتھ ساتھ عارفانہ شیفتگی و سوز و گداز اور برمحل اشعارِ مثنوی وغیرہ کی آمیزش سے پورا بیان روحانی تاثیر کا عجیب مرقع بن جاتا تھا۔ گویا بیک وقت وہ دماغ اور دل دونوں سے اپیل کرتے تھے۔ ان کا علم و فضل، ان کی سحر بیانی اور روحانی سوز و گداز آج تک ضرب المثل ہے۔[۱]

---

(۱) دیکھیے رسالہ الضیار لکھنؤ ربیع الآخر ۱۳۵۲ھ۔ یہ رسالہ ندوۃ العلماء کا عربی ترجمان تھا۔ ادیب شہیر مولانا مسعود عالم ندوی اس کے مدیر تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی سرپرست (باقی اگلے صفحہ پر)

حسن میاں

اس میں شک نہیں کہ سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب "خطباتِ احمدیہ" سیرت ہی پر لکھی تھی اور اردو زبان میں اس کو سیرت کی پہلی تصنیف کہنا چاہیے لیکن یہ کتاب دراصل ان اعتراضات و شبہات کا جواب ہے جو سر ولیم میور نے اپنی کتاب "لائف آف محمد" لکھ کر پیدا کیے تھے۔ سرسید نے یہ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی تھی، حتیٰ کہ عبرانی بائبل کے حوالے اسی زبان کے حروف میں پیش کیے ہیں۔ پھر رومن تلفظ کے ساتھ ان کے ترجمے درج کیے ہیں۔ یہ کتاب بے حد سنجیدہ اور مدلل ہے مگر رخ جوابی ہے اس لیے مناظرانہ رنگ سے پاک نہیں ہے۔ مولانائے پھلواروی کی تحریک یہ تھی کہ اردو زبان میں کوئی ایسی جامع

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) نگران لکھتا ہے:

نعت الصحف فی الشہر السالف احد اعلام النهضة الاسلامية الحاضرة فی الهند الا وهو الشيخ الجليل المغفور له الشاه محمد سليمان الفلواروی، كان الفقيد من العلماء الاجلة المتنورين الذين شدوا عضد السيد احمد خان فی نشر التعليم الجديد وبث معارفه فی المسلمين ولذلك انتخب رئيسًا للمجالس التعليمی الاسلامی العام غير مرة ..... ومن اكبر ميزات الفقيد انه كان خطيبًا مصقعًا ينطوهم تجلا فيلعب لقلوب الناس ويتصرف بعقولهم تصرف انامل الموسيقی باوتار العود وبلغ من البراعة فی هذا الشان ان اصبح مضرب المثل وحديث الناس فی اندية الخطابة ومجالس الوعظ والارشاد، وللمرحوم حسنات وفضائل لا يمكن استيفاءها فی هذه النبذة وبالجملة ان حياة المغفور له كانت كلها جليلة حافلة بالاعمال الخالدة [۵]"

دماغ اور مستند کتاب مرتب کی جائے جو بحیثیت سیرت طیبہ و تاریخ دین متین مکمل ہو اور مناظرہ و جواب سے قطع نظر خود ملتِ اسلامیہ کے سامنے اور اس کے توسط سے دنیا کے سامنے اسلام کی اور رسولِ اکرمؐ کی جامع تصویر پیش کرے۔

اولاً اس مقصد کی تکمیل کے لیے مولانا شاہ حسن میاں پھلواروی[۱] نے قلم اٹھایا اور مولانائے پھلواروی کی تحقیق و جستجو اور بیانات کو سمیٹ کر ایک جامع سیرت نبوی لکھنا شروع کی۔ حسن میاں کی سیرۃ النبی کے کچھ اجزاء میلاد الرسول، حُبِّ رسول اور خلقِ حسن کے نام سے چھوٹی چھوٹی کتابوں کی صورت میں تو سامنے آئے مگر جامع سیرتِ نبوی[۲] کی تکمیل وہ نہ کر سکے۔

قاضی سلیمان منصور پوری

خدمتِ سیرت کے سلسلے میں دوسرا اہم نام مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری کا ہے۔ قاضی صاحب ریاست پٹیالہ پنجاب کے جج تھے اور وسیع النظر عالم و محقق تھے۔ ان کی مشہور کتاب رحمۃ للعالمین کی پہلی جلد ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب

---

(۱) حسن میاں بڑے بیٹے تھے مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے اور انہوں نے اپنے والد ماجد کے حکم سے سیرت نبوی کی تالیف شروع کی تھی۔ اس وقت تک کوئی مستند اور جامع کتاب سیرت پر اردو زبان میں موجود نہیں تھی۔ (۲) یہ تینوں کتابیں مختصر مگر بڑی جامع اور محققانہ و مورخانہ ہیں اور ساتھ ہی والہانہ شیفتگی کی بھی حامل، تمام مذاہب کی کتابوں سے اور تاریخ و سیر سے اور قرآن مجید سے حوالے اور استدلال و استناد درج ہیں۔ یہ کتابیں علمی حلقے میں بے حد مقبول ہوئیں اور بالعموم مجالس سیرت میں وہی رائج ہوئیں (۳) مکتوب مولانائے پھلواروی بنام نواب وقار الملک سیکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بہ سلسلۂ وفاتِ حسن میاں (دیکھیے شمس المعارف مجموعۂ مکاتیب) اس میں لکھا ہے کہ "حسن میاں نے سیرۃ النبی لکھنے کے لیے بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا"۔

سیرت رسول پر بحیثیت سیرت پہلی تفصیلی جامعیت کی کتاب تھی جو اردو زبان میں منظر عام پر آئی۔ یہ تحریک سیرت کے مقصود کے مطابق تھی اور قاضی صاحب نے سب سے پہلے یہ کتاب مرکز تحریک سیرت (پھلواری) کو بھیجی۔ قاضی صاحب کو اس مرکز سے خصوصی ربط تھا۔ حسن میاں نے تبصرہ و تنقید کے ساتھ قاضی صاحب کو لکھا کہ[1] "اس کتاب کے بعد مجھے یہ کام کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔" قاضی صاحب نے جب دوسری جلد شائع کی تو اس خط کا خاص طور پر تذکرہ دیباچے میں یوں کیا:[2]

"پہلی جلد شائع ہونے کے بعد حسن میاں ولد شاہ سلیمان صاحب پھلواروی مدظلہ العالی کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ غزوۂ خیبر کا پورا واقعہ اس کتاب سے غائب ہے مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ میں نے اپنا مسودہ دیکھا تو اس میں غزوۂ خیبر پورا موجود تھا لیکن مطبوعہ کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ جو کچھ انہوں نے لکھا تھا صحیح تھا، کاتب کی غلطی سے یہ پورا واقعہ درج ہونے سے رہ گیا اس لیے اب میں دوسری جلد میں اس فتح، سراپا ظفر کو بالتفصیل لکھتا ہوں۔"

قاضی صاحب کی اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد صرف اشاعتِ سیرت ہی نہ تھا بلکہ ایسے ڈھنگ اور اسلوب کے ساتھ سیرتِ طیبہ کو پیش کرنا تھا کہ اس کا تسلسلِ تاریخی تک نظر انداز نہ ہو۔ اور مرکز سیرت کی اس پر نگاہ

---

(۱) حسن میاں اس وقت (۱۹۲۰ء میں) تپ محرقہ میں مبتلا تھے اور بستر مرگ پر تھے۔

(۲) رحمۃ للعالمین جلد دوم، دیباچۂ مصنف (قاضی سلیمان صاحب منصورپوری) پہلا ایڈیشن۔ تسلسل کے اعتبار سے غزوۂ خیبر جلد اول کی بجائے جلد ثانی میں اسی وجہ سے شامل تھا۔ مگر اب جدید ایڈیشن میں اسے جلد اول ہی میں اس کے صحیح مقام پر درج کر دیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

رہتی تھی۔"[1]

رحمۃ للعالمین تین جلدوں پر مشتمل ہے اور ملک کے ہر گوشے میں اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مختصراً اس کی خصوصیات یہ ہیں :

(۱) پوری عالمانہ تحقیق سے لکھی گئی ہے۔ جو روایت جہاں سے لی ہے وہاں حاشیے پر اس کا پورا حوالہ بھی درج ہے۔

(۲) تمام واقعات جو سیرت سے متعلق ہیں سنہ وار ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔

(۳) جہاں کوئی عمدہ نتیجہ مستنبط ہو سکتا ہے اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق ہے، وہ بھی لکھ دیا گیا ہے۔

(۴) بائبل سے ہر جگہ استناد کر کے اہل کتاب پر حجت قائم کی گئی ہے۔[2]

(۵) زبان اردو ہر جگہ معیاری تو نہیں لیکن، لب و لہجہ اتنا متین، سنجیدہ اور پر اثر ہے کہ مخالف سے مخالف پڑھنے والا بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مناظرانہ اور متشددانہ انداز سے پرہیز کیا گیا ہے۔

(۶) مصنف نے اس کے صفحات پر دماغ کے ساتھ دل کے ٹکڑے بھی رکھ دیے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے عشق نبوی اور حب انسانیت نمایاں ہے۔

(۷) مصنف اپنے دور کی تمام جدید تحریکات اور عملی و تحقیقی اقدار سے بھی واقف ہے اور جا بجا اسلامی اقدار و احکام سے ان کا مقابلہ کرتا جاتا ہے۔ نبوی غزوات، نظام زکوٰۃ، قانون طلاق وغیرہ کا ذکر آتا ہے تو وہ صرف ان کا ذکر کر کے آگے

---

(۱) مذکورۂ بالا لاحظ اور جس اہمیت کے ساتھ قاضی صاحب نے اس کو اپنے دیباچے میں درج کیا ہے وہ اس کی دلیل ہے (۲) اس بارے میں سر سید احمد خاں کے بعد حسن میاں (اپنی کتاب میلاد الرسول میں ایجاز اً) اور قاضی صاحب (اپنی کتاب رحمۃ للعالمین میں اطناباً) منفرد ہیں۔

نہیں بڑھ جاتا بلکہ وہیں متن میں یا حاشیے پر ایسے اسلوب سے بحث کرتا ہے کہ پڑھنے والے کے تمام شکوک خود بخود رفع ہوتے چلے جائیں، خواہ وہ کسی قوم اور کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔

(۸) تفحص و جستجو کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ احد میں جس انصاری خاتون کے چار اعزا (شوہر، فرزند، باپ اور بھائی) شہید ہوئے اور اس نے کوئی پروانہ کی اس کا نام تلاش کرنے کے لیے انصار کے تمام انساب کو چھان ڈالا اور بالآخر اس خاتون کا نام "ھند" تلاش کر ہی لیا۔ ارباب تاریخ و سیر نے قاضی صاحب سے پہلے اس خاتون کا نام کہیں درج نہیں کیا تھا۔

(۹) دوسری جلد میں حضور اکرمؐ، اصحاب، ازواج، اولاد وغیرہ کے انساب کا جس طرح تفحص کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو فنِ انساب پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ سنن کی تحقیقات جو آخر کتاب میں درج ہے اس سے ریاضی کے اس فن میں بھی مصنف کے دخل اور وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔

(۱۰) تیسری جلد میں حضور اکرمؐ کے شمائل اور اسلام کی خصوصیات بڑی خوش اسلوبی سے پیش کی ہیں۔

شبلی نعمانی

زبان و قلم کی ان دو گراں قدر خدماتِ سیرت کے بعد تو بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں کسی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جگہ کبھی کسی کے واسطے کہیں ختم نہیں ہوتی۔ اسی زمانے میں دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی[۱] بھی

---

(۱) مولانا شبلی نعمانی پچھلے عہد کے مشہور و معروف اکابر علماء میں ہیں۔ متعدد قیمتی کتابوں کے (باقی اگلے صفحہ پر)

سیرت النبی مرتب کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے بلکہ کام کچھ شروع بھی کر دیا تھا۔[1] لیکن ان کا پیمانۂ عمر جلد ہی لبریز ہو گیا۔ شبلی نے ابتداء کی مگر وہ ان کا آخری دور تھا اور کچھ ہی عرصہ بعد بستر مرگ پر پہنچ کے انھوں نے یہ "امانت" سید سلیمان ندوی[2] کے سپرد کی اور آنکھیں موند لیں۔[3]

(گزشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) مصنف الندوہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے بانی۔ علی گڑھ کالج اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے خدمت گذار۔ پہلے علیگڑھ کالج میں پروفیسر تھے جب مجلس ندوۃ العلماء مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور مولانا شاہ محمد علی مونگیری نے قائم کی تو اس کے پہلے اجلاس عام ۱۸۹۴ء میں سر سید نے ان کو اور مولانا عبد اللہ ناظم دینیات کو علیگڑھ کالج کی طرف سے شرکت کے لیے بھیجا (دیکھیے شبلی از امین زبیری) پھر جب وہ کالج سے الگ ہوئے تو ۱۹۰۵ء میں دار العلوم ندوہ کے معتمد مالیات مقرر ہوئے اور اس طرح علیگڑھ اور ندوہ دونوں کی بے انتہا خدمت کی (دیکھیے خطبۂ سر عبد القادر اجلاس بستم انبالہ ص ۸۳)

(۱) مکتوب شبلی بنام حبیب الرحمن خاں شروانی (۲) علامہ سید سلیمان ندوی کا وطن دیسنہ (پٹنہ) تھا۔ ان کے والد حکیم شاہ ابو الحسن صاحب بڑے صوفی اور مولانا شاہ سلیمان پھلواری کے خسر مولانا شاہ علی حبیب نصر پھلواری کے مسترشد تھے۔ اسی نسبت سے سید صاحب نے پہلی تعلیم و تربیت آغاز عہد جوانی میں پھلواری میں پائی تھی۔ اس کے بعد دار العلوم ندوہ میں تکمیل کی۔ سید صاحب کے والد اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی طرح (یاد رفتگاں) حسن میاں اور سید سلیمان ندوی دونوں ہم عمر و ہم درس و ہم بزم تھے (سید سلیمان نمبر ریاض کراچی و سلیمان نمبر معارف اعظم گڈھ) (۳) مولانا شبلی نے وفات ۱۹۱۴ء میں پائی۔ سیرت النبی کی ترتیب و تالیف میں سید سلیمان ندوی ابتداء سے شریک رہے تھے۔ مشورے میں بھی، عنوانات متعین کرنے میں بھی، اور ان عنوانات کے تحت مواد مہیا کرنے میں بھی، اور پھر ان کو لکھنے میں بھی اور مبیضے پر نظر ثانی کرنے میں بھی۔ (دیکھیے مکاتیب شبلی بنام سید سلیمان)۔ قدرت نے ان کو آغاز ہی سے اس خدمت کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ شبلی بیماریوں کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے اور چوبیس گھنٹوں میں بمشکل ایک ڈیڑھ گھنٹہ کام کرتے تھے۔ انگریزی معلومات میں پروفیسر عباس، مولانا محمد علی جوہر، شیخ عبد القادر کی مدد شامل تھی (باقی اگلے صفحہ پر)

جب پہلی مرتبہ لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ مولانا شبلی نعمانی بھی سیرت النبی لکھ رہے ہیں تو ایک اخبار[1] نے لکھا تھا کہ "جناب قاضی سلیمان صاحب منصور پوری تو سیرت لکھ ہی چکے اب اس کی کیا ضرورت ہے اور اس سے زیادہ کیا کچھ لکھا جا سکتا ہے۔"

لیکن اخبار مذکور نے یہ محسوس نہ کیا کہ رسول اللہ صلعم کی شخصیت اتنی جامع ہے اور سیرت پاک ایک ایسا نگینہ ہے جس کے ہزاروں پہلو ہیں اور لکھتے وقت انسان کی محدود نگاہ ایک یا چند پہلو سے آگے نہیں بڑھتی۔ خود یورپ میں حضورؐ کی سیرت پر بے شمار چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں بعضوں کا تو خیال ہے کہ ڈھائی ہزار سے کم نہیں لکھی گئیں۔ اس بیان کو انتہائی مبالغہ بھی قرار دیا جائے جب بھی ان کی تعداد کچھ معمولی نہیں رہتی۔ مشہور سیرت نگاروں میں ایڈورڈ گبن، جان ڈیون پورٹ، لینیارڈ، کارلائل وغیرہ کو کون نہیں جانتا؟ انہوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ ایک مؤرخ پہلے سیرت لکھ چکا ہے تو اب ہمارے لیے کوئی گنجائش کہاں باقی رہی؟

سید سلیمان ندوی

بہرحال مولانا شبلی نے سیرت النبی کا آغاز کیا لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے قرعۂ فال پھر ایک سلیمان ہی کے نام پڑا اور فضلائے علم و تحقیق علامہ سید سلیمان ندوی کے نام سے گونج اٹھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے اندر سیرت طیبہ کا ذوق، روحانیت اور شوقِ

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالسلام ندوی، پروفیسر نواب علی، مولانا حمید الدین بی۔ اے وغیرہ بھی مددگاروں میں تھے۔ لیکن شبلی کی عمر نے وفا نہ کی۔ بالآخر حق بحقدار رسید (۱) لاہور کے مشہور اخبار وطن نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی انشاء اللہ خاں تھے اخبار مذکور کی یہ عبارت ہم نے علامہ سید سلیمان ندوی کے اس مقدمے سے لیکر درج کی ہے جو انہوں نے قاضی صاحب کی کتاب رحمۃ للعالمین کی تیسری جلد پر لکھا ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ مدیر وطن نے سیرۃ الرسول کے نام سے خود بھی ایک کتاب سیرت پر لکھی۔

علم و جستجو اولاً مولانائے پھلواروی سے پہنچا تھا جو ان کے بزرگ مُربی اور رہنما تھے، اور پھر مذاقِ تصنیف و تدوین و قوتِ تحریر و طرزِ ادا مولانا شبلی نعمانی سے ملا تھا جو بڑے مؤرخ اور صاحبِ اسلوب ادیب و محقق و مصنف اور ان کے استاد تھے۔ سید صاحب اپنے عہد میں اپنی جامعیت و کمال کے لحاظ سے "استاذ الکل"(۱) تسلیم کیے گئے۔ سید صاحب(۲) نے سیرت النبی کی تکمیل(۳) کی اور اس کی جلدوں پر جلدیں منظرِ عام(۴) پر آنی شروع ہو گئیں،

---

(۱) یہ لقب علامہ اقبال کا عطا کردہ ہے جو سید صاحب کے علم و فضل کے بے حد گرویدہ تھے (دیکھیے مکاتیبِ اقبال)، (۲) "وہ تحقیق اور تنقید میں جتنی احتیاط برتتے تھے اور محنت کرتے تھے اتنا ہی مطالعہ کرنے والے کے جذبات یا تخئیل کو بے ضرورت مہمیز کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ تصانیف میں شبلی کا انداز مشرقی ہے، سید صاحب کا مغربی۔" (گنج گرانمایہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی علیگڈھ، سلیمان نمبر معارف اعظم گڑھ ص ۱۱۶)، (۳) اس کتاب سیرت النبی کی اشاعت و طبع کا آغاز ۱۹۱۸ء سے ہوا۔ سیرت کی پہلی اور دوسری جلد میں ایک بڑا حصہ سید صاحب کا ہے اور نئے سرے سے اس کو مرتب و مدون بھی انہیں نے کیا ہے لیکن بحیثیت تصنیف وہ مولانا شبلی کی ہے کیونکہ اتنا کام مولانا شبلی کی زندگی میں ہو چکا تھا (سید صاحب کی دوسری تصنیفات بھی مشہور زمانہ ہیں، سیرت کے علاوہ عمر خیام، ارض القرآن، سیرت عائشہؓ، عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ ان کی انمول اور بڑی اہم تصانیف ہیں۔ ارض القرآن تو اپنے مندرجہ عنوان و بحث کے لحاظ سے بالکل ہی جدید داور بجلی) چیز ہے جس کی طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہیں کی تھی نہ مشرق میں نہ مغرب میں۔ (۴) سیرت النبی کی پہلی اور دوسری جلدیں جب شائع ہوئیں تو مولانا شاہ سلیمان پھلواروی زندہ تھے اور مرکز سیرت کی تنقیدی نگاہ سیرت کی تصانیف پر رہا کرتی تھی چنانچہ سیرت النبی کی دوسری جلد کے دو واقعات پر خصوصیت سے تنقید کی ایک یہ کہ حضرت علیؓ نے شراب پی کر نماز پڑھائی تو یہ آیت اتری کہ لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکارٰی اور حضرت علیؓ نے جب بنت ابی جہل سے نکاح کرنا چاہا تو حضورؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ اور عدو اللہ کی بیٹیاں (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب نے اس خدمت کو ایک زندۂ جاوید کارنامہ، لازوال یادگار اور غیر فانی توشۂ آخرت بنا دیا۔ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیرت کی کونسی کمی باقی رہ گئی ہے جسے یہ تیسرا سلیمان پورا کرے گا مگر سیرت کی ساری جلدیں آپ کے سامنے ہیں۔ اس کی عالمگیر مقبولیت و اہمیت کا اندازہ لگانا بھی کچھ دشوار نہیں۔ ایک سرسری نظر اس کی خصوصیات پر ڈالیے:

(۱) اس کی زبان ایسی معیاری اور اتنی بلند پایہ ہے کہ اردو ادب بہت کچھ ترقیاں کرنے کے باوجود ابھی تک اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

(۲) سیرت نگاری میں جذبات کا عنصر اتنا ہی رکھا گیا ہے جتنی اس کی ضرورت ہے، دل سے زیادہ دماغ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس دور عقلیت کے عقلیت پسندوں، جدید تعلیم یافتوں، روشن خیالوں، مسلمانوں اور نامسلمانوں سب کے لیے یکساں مؤثر، اپیلنگ اور تسکین بخش ہے۔

(۳) روایات پر محققانہ، مورخانہ اور ناقدانہ بحثیں ہر جگہ نمایاں ہیں۔ جس روایت کو رد کرنا مقصود ہوا اس کے لیے عمدہ عقلی توجیہہ پیش کی گئی ہے اور ایسے

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے خطبۂ بنتِ ابی جہل پر مولانائے پھلواروی نے ایک ضخیم رسالہ لکھا جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ یہ روایت مسور بن مخرمہ سے مروی ہے۔ اور ارادۂ نکاح کا قصہ ہجرت کے بعد کا ہے۔ مسور بن مخرمہ ہجرت کے دو سال بعد پیدا ہوئے تھے اور وفات نبوی ۱۱ھ کے وقت ان کی عمر آٹھ سال سے زیادہ کی نہ تھی لہذا اس واقعے کے وقت ان کی عمر چھ سات سال کے قریب ہو سکتی ہے۔ اور روایت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ (انا محتلم) (میں اس وقت بالغ تھا)۔ علاوہ ازیں یہ روایت (اسناد میں "مضطرب" بھی ہے۔ نیز مسور مدینے میں آئے ہی ہیں ۸ھ کے بعد۔

نازک موقعے پر بھی علمی سنجیدگی میں ذرا فرق نہیں آتا۔ غیر ضروری اور مبالغہ آمیز روایات سے احتراز کیا گیا ہے، وہ بھی دلیل کے ساتھ۔

(۴) مغربی مفکرین کی تمام قدیم و جدید متعصبانہ نکتہ چینیاں[1] پیش نظر رہی ہیں بلکہ ان مباحث میں عموماً ہتھیار تک ان ہی کے استعمال کیے گئے ہیں مگر بحث کے انداز میں کہیں جوابی رخ نہیں ہے اور بحثیں اس حسن کے ساتھ کی ہیں کہ مسائل زیر بحث کے تمام پہلو ابھرتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

(۵) ملت کو عقلی ارتقا کی طرف لے جانے کی غرض سے قدیم انداز کو جدید اقدار کے قالب میں ڈھالنے کا ایک عمدہ نمونہ پیش کیا گیا۔ اور جدید علم کلام کی شاندار رہنمائی کی گئی ہے۔

---

(۱) سیرت طیبہ کی اس طرح ترتیب و تالیف کا رخ جب متعین ہوگیا تو متعصب حملہ آوروں اور مستشرقین کے جواب براہِ راست مقالات و مضامین اور چھوٹی بڑی مستقل کتابوں کی صورت میں الگ دیے جانے لگے۔ اردو میں بھی، انگریزی میں بھی اور ان جوابات کا بجائے خود ایک بڑا ذخیرہ مہیا ہوگیا ہے۔ رسالہ الندوہ لکھنؤ، معارف اعظم گڑھ، اسلامک کلچر حیدرآباد دکن، اور ملک کے دوسرے رسائل میں اس قسم کی بحثیں برابر آتی رہیں۔

(۶) رسول کی سیرت پر ہر جگہ انسانی نگاہ ڈالی گئی ہے اور پڑھنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسانیت کا ہمدرد، بلند اقدار کا محافظ، اعلیٰ کردار کا حامل، سعی پیہم کا پیکر، افکار عالیہ کا مخزن بن کر اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے اگر کوئی واحد نمونہ ہے تو وہ صرف محمد رسول اللہؐ کی پاک سیرت ہے ولقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اسوۃ حسنۃ مسلمانوں ہی کے لیے نہیں ساری دنیا کے لیے کافۃً للناس بشیراً ونذیراً۔

(۷) معجزات نبوی کے لیے ایک پوری جلد وقف کی ہے اور اس میں معجزے کی حقیقت اور مقام پر عقلی حیثیت سے ایسی پُرمغز بحث کی ہے کہ اردو میں تو کیا دوسری زبانوں میں بھی ایک جگہ اتنا بڑا اور ایسا ذخیرہ نہیں ملے گا۔ پھر تمام صحیح معجزات کو ایک ایک کر کے اس طرح سمیٹا ہے کہ دوسری تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔ پھر ان سب پر مدلل عقلی اور سائنٹفک بحثیں کی ہیں۔

(۸) ایک جلد صرف اخلاق کے لیے مخصوص کی ہے۔ یہ مجموعہ بجائے خود بے حد اہم ہے۔ اس سے زیادہ جامع کتاب اس فن پر اور کہیں نہیں ملے گی۔ اخلاقیات کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات اور بڑے سے بڑے اصول کو اس طرح مرتب کر دیا ہے کہ اب اس سے باہر کسی چیز کو تلاش کرنا اور پانا مشکل ہے۔ اخلاقیات ایک ایسی ہمہ گیر حقیقت ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے باہر نہیں۔ سید صاحب کی تلاش و جستجو، دقتِ نظر اور ہمہ گیری نے پوری زندگی کو مجسم کر دیا ہے جس کی اہمیت کا اندازہ لگانا اہلِ نظر ہی کا کام ہے۔

(۹) ایک جلد اسلامی عبادات پر مشتمل ہے۔ بہ بظاہر یہ سمجھ میں آنا دشوار ہے کہ

عبادات کے احکام اتنی ضخیم جلد میں کس طرح پھیل سکتے ہیں لیکن پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ کس کس انداز سے ایک ایک چیز کا احاطہ کیا ہے پھر ہر جگہ عبادت کا فلسفہ اور اس پر عقلی و علمی بحثیں ـــــ ایسی جامعیت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی ہے۔

(۱۰) سیرت النبی کی یہ تمام جلدیں اپنی وسعت مضامین و معلومات اور جامعیت مسائل حیات کے لحاظ سے اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہیں''۔

نیا تصوّر

سید صاحب کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ اس دور میں یہ ہے کہ انھوں نے "سیرت" کا ایک نیا تصور بخشا اور ایک جامع قدر عطا کی۔ عام طور پر یہی خیال

---

(۱) مولانا شبلی کا خیال یہی تھا کہ "ہر قسم کے مباحث، سیرت میں آجائیں یعنی تمام مہات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو۔ اور نام بھی " دائرۃ المعارف النبویہ " موزوں ہوگا" (مکتوب شبلی بنام مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) شبلی کو اولاً مولانا محمد علی جوہر نے مارگولیوتھ کا جواب لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ پھر یہ خیال سیرۃ النبی کی تالیف کی طرف منتقل ہوا۔ اور جب سیرت کا آغاز ہوا اور سید سلیمان ندوی نے بے شمار متنوع مباحث اور ان کا مواد مہیا کرنا شروع کیا (دیکھیے مکاتیب شبلی بنام سید سلیمان)، تو شبلی کا خیال سیرت سے ہٹ کر انسائیکلوپیڈیا کی طرف منتقل ہونے لگا۔ کیونکہ ان کا تصور سیرت اہل غرب کے تصور سے کچھ متاثر تھا اسی لیے وہ نام تک بدلنے کی سوچ رہے تھے مگر سید سلیمان ندوی نے بظاہر انسائیکلوپیڈیا بنا دینے کے باوجود اس کا نام دائرۃ المعارف النبویہ نہیں رکھا جو شبلی کی نظر میں موزوں تھا بلکہ سیرت النبی ہی رکھا کیونکہ سید صاحب کا تصور سیرت کچھ اور تھا (بہت سی تحقیقات میں شبلی کا اور سید صاحب کا اختلاف رہا ہے اور اس میں بھی تھا)۔

کیا جاتا تھا کہ سیرت کا تعلق صرف ان " واقعات " سے ہے جو ولادت سے وفات تک کے عرصے میں پیش آئے ہوں، انگریزی زبان میں اسی کو لائف کہتے ہیں۔ اس لیے حضور اکرمؐ کی سیرت یہی ہے کہ ولادت سے وفات تک کے تمام واقعات مرتب کر دیے جائیں، لیکن سید صاحب نے سیرت[1] اور حیات (لائف) میں فرق کیا اور محدود تصور میں وسعت پیدا کی۔ اسے ہمہ گیر بنایا۔ سیرت النبی کی مسلسل جلدیں پیش کر کے انہوں نے دراصل یہ حقیقت واضح کی کہ رسولؐ کی زندگی کے چند واقعات ہی کا نام سیرت نہیں ہے، بلکہ " رسالت " اس پوری انسانی زندگی اور اس کے ایک ایک گوشے سے تعلق رکھتی ہے، رسول کی زندگی کو رسالت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی شخص کو اس کے اخلاق و کردار سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ رسولؐ اکرم کے اخلاق و کردار اور طرز حیات پر مختصر مگر جامع ترین تبصرہ یہی ہے وکان خلقه القرآن اور اسی کو قرآن نے یوں کہا کہ اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ لہٰذا سیرت نبوی کے دائرے میں چند تاریخی واقعات و سوانح ہی نہیں آتے بلکہ سارا قرآن آتا ہے، ساری تعلیمات، آتی ہیں۔ فرامین، عقائد، معاملات، عبادات، انداز زیست حتیٰ کہ حضورؐ سے کچھ تعلق رکھنے والے ان رفقاء کے سوانح حیات بھی آجاتے ہیں جو حضورؐ کے زیر تربیت رہے۔ غرض وہ ساری اسلامی زندگی اور فکر زندگی، اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر ہر بات جو حضورؐ سے کچھ بھی واسطہ رکھتی ہو —— چاہے انفرادی چاہے اجتماعی —— سیرت رسول کے احاطے کے اندر ہے۔ سیرت کے

---

(۱) سیرت اور لائف کا فرق اسی قسم کا ہے جیسا دین اور ریلیجن کا کہ بظاہر دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں لیکن اہل غرب جب اس پر لکھیں گے تو کچھ اور ہو گا۔ اور اہل اسلام جب اس پر لکھیں گے تو وہ ہمہ گیر ہو گا۔ کیونکہ دونوں کے تصور میں آسمان زمین کا فرق ہے۔

اسی نئے تصور، حقیقی تصور اور جامع قدر نے "سیرت النبی" کی جلدوں میں اتنا اضافہ کیا ہے۔ اگر زندگی رہتی تو خدا جانے وہ اسے اور کہاں تک پہنچاتے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ ساتویں جلد زیر ترتیب تھی۔ یہ ساتواں سمند ر یقیناً عصر حاضر کے مسائل و امور اور انسان کی جدید تر فکری و عملی زندگی پر محیط ہوتا۔ اور یہ مسائل و افکار حاضرہ عالمگیر پیغام محمدی کی میزان پر ایک مرتبہ اچھی طرح تلنے، پرکھے جاتے اور اس حقیقت کی روشنی میں منظر عام پر آتے کہ اس دنیا میں سب سے بلند وجہ وحدت انسانی کا ہے جس کا رشتہ توحید سے بندھا ہوا ہے اور اسی کے صحیح عرفان پر اہل دنیا کی سلامتی کا انحصار ہے مگر وہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے۔

سیرت کمیٹی پٹی

اس سلسلے میں سیرت کمیٹی پٹی کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اس نے متحدہ ہندوستان میں جابجا بڑی تعداد میں سیرت کمیٹیاں قائم کیں۔ چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کر کے ہر جگہ پھیلا دیے۔ ان رسالوں میں حضورؐ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی ایک رسالے غیر مسلموں کے لیے بھی شائع کیے اور ان اعتراضات کو دور کیا جو عموماً غیر مسلموں کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ اس کمیٹی نے بڑی عالمگیر شہرت حاصل کی لیکن ایک ذات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ اس کے بانی عبدالمجید قرشی تھے جو پاکستان میں آنے کے کچھ عرصہ بعد انتقال کر گئے۔ یہ کام ان کے ساتھ ہی گویا ختم ہو گیا۔

ارتقائی کڑیاں

قانونِ ارتقاء کے مطابق شاہ سلیمان پھلواروی، قاضی سلیمان منصور پوری،

اور سید سلیمان ندوی، سلسلۂ ارتقاء کی ترقی پذیر کڑیاں ہیں۔ ان علمبرداران سیرت و پیغام محمدی کی کیفیت کچھ ایسی نظر آتی ہے جیسے ایک دور مکی زندگی کا ہو جب کہ دعوت عام دی جا رہی تھی اور قبول دعوت کے لیے دلوں کو گداز کیا جا رہا تھا، دوسرا دور مدنی زندگی (قبل فتح مکہ) کا ہو جب کہ اہل کتاب کو آمادہ کیا جا رہی تھی۔ اور انہیں کے مسلمات سے ان کو قائل کیا جا رہا تھا۔ اور تیسرا دور فتح مکہ کے بعد کا ہو جب کہ "اکمال دین اور اتمام نعمت" ہوا۔ تجلیاں تو کچھ اسی انداز کی ہیں۔ یہاں قدرت کی اس لطیفہ پسندی کا ہم تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ سیرت رسول کی خدمت تبلیغ و اشاعت کے لیے کچھ عجیب انداز سے سلسلہ وار اس نے سلاسلہ ثلاثہ کا انتخاب کیا۔ اور یہ بھی ایک وحدت کا ظہور ہے۔ "فالکل واحد یتجلی بکل شان"

دوسری چند اہم کتابیں

یوں تو اور بھی بہتیری کتابیں چھوٹی بھی اور بڑی بھی، سیرت پر اردو زبان میں لکھی گئی ہیں لیکن بیشتر نقل و اختصار یا اقتباس و تلخیص کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کو چھوڑ کر، اور پھر ان کو بھی چھوڑ کر جو انگریزی میں کچھ لکھی گئی ہیں، یہاں بے موقع نہ ہوگا اگر چند کا تذکرہ کر دیا جائے جو کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہیں، اور خاص طور سے سیرت پر لکھی گئی ہیں۔ یہاں ان کتابوں کو بھی ہم نظر انداز کریں گے جن میں سیرت، پوری کتاب یعنی تاریخ اسلام کے ایک حصے کی صورت میں آئی ہے۔ ان کے تذکرے میں زمانی تسلسل کا لحاظ بھی پیش نظر نہیں ہے۔

(۱) تذکرۂ جمیل۔ یہ کتاب مولانا شاہ محمد جعفر ندوی[۱] کی مرتب کردہ ہے۔ اس کے تین

---

(۱) یہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے چھوٹے بیٹے ہیں، اور حسن میاں کے چھوٹے بھائی (باقی اگلے صفحہ پر)

حصے ہیں۔ پہلے حصے کے تین ابواب ہیں۔ مسلسل بیان سیرت، انتیس[۲۹] وفود کا ذکر جو بارگاہِ رسالت میں آئے، اور چودہ خطباتِ نبوی، دوسرے حصے میں، قرآن مجید، جنگ وجہاد، تعدد ازواج النبی، قانونِ طلاق اور غلامی وغیرہ پر بحیثیت مسئلہ بحثیں ہیں۔ تیسرے حصے میں اسلام کا نظام الاخلاق ہے۔

ان تینوں جلدوں کی خصوصیت یہ ہے کہ:

الف۔ بیانِ سیرت کو بارہ مجالس میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

ب۔ اس میں جابجا وہ عارفانہ نکات اور سوز ودرد کی کیفیات بھی ہیں جو مولانا شاہ سلیمان پھلواری کا خاص حصہ تھیں۔

ج۔ وہ عقلی مباحث اور نفسیاتی نکتے بھی درج ہیں جن کی طرف عموماً سیرت نگاروں کی نظر نہیں جاتی یا چھوڑ جاتے ہیں۔

د۔ اس میں کہیں کہیں سیرت نگاروں کے تسامحات کی طرف بھی اشارات ہیں۔ اور اندازِ بیان بہت سادہ اور رواں ہے۔ زمانی اعتبار سے یہ کتاب اگرچہ متاخر ہے لیکن اس لحاظ سے اولیت اس کو حاصل ہے کہ باغِ سیرت کا پودا لگانے والے سلیمان اول کے بیانِ سیرت اور نکات ومعارف کو قلمبند کیا گیا ہے۔

(گذشتہ صفحے کا بقیہ حاشیہ) حسن میاں کی میلاد الرسول، حب رسول اور خلق حَسَن اور جعفر میاں کی یہ تذکرۂ جمیل اگرچہ آج متفرق اجزاء کی صورت میں ہیں لیکن اصلاً یہ پورا مجموعہ "سلیمان اول" کی تحقیق وجستجو اور ترتیب بیان سیرت کا مجموعہ ہے۔ جعفر میاں کے مرتب کردہ مجموعے کے اجزاء رسالہ پیشوا دہلی نے رسول نمبر کی صورت میں شائع کیے تھے (۱)

(۲) سیرۃ الرسول۔ یہ کتاب مولانا اسلم جیراجپوری کی تالیف ہے۔مولانا سنجیدہ اہل قلم اور مورخ و محقق ہیں لیکن ان روایات کو قبول نہیں کرتے جو ان کی نظر میں قرآن سے متعارض ہوتی ہوں۔ وہ روایات پر ایک خاص انداز سے کڑی تنقید کرتے ہیں۔

(۳) اصح السیر۔ یہ کتاب مولانا عبدالرؤف قادری دانا پوری کی تالیف ہے مولانا بڑے حنفی عالم اور مؤرخ ہیں۔ جا بجا معتدل انداز کی تحقیق و تشریح سے کام لیتے ہیں اور اپنے استدلال کو روایات سے تقویت پہنچاتے ہیں۔ دوسری جلد مکمل نہ ہو سکی۔

(۴) النبی الخاتم۔ یہ مولانا مناظر احسن گیلانی پروفیسر دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کی ایک غیر ضخیم تصنیف ہے۔مولانا بڑے فاضل محقق ہیں اور وسیع النظر عالم۔ ان کی تحریر میں سوز و گداز بھی ہے والہانہ کیفیت بھی اور محققانہ اشارات بھی۔

(۵) معراج انسانیت۔ اس کے مرتب مشہور اہل قلم غلام احمد صاحب پرویز (مدیر طلوع اسلام) ہیں۔ ان کی تصنیف معارف القرآن کی یہ چوتھی جلد ہے۔لیکن یہ جلد سیرت طیبہ پر ہے اور اپنی جگہ مکمل ہے۔ اس میں التزام اس بات کا ہے کہ سیرت طیبہ صرف قرآن کی روشنی میں پیش کی جائے اس لیے مصنف نے بعض واقعات کے اندراج سے گریز کیا ہے جو اور کتابوں میں موجود ہیں۔

(۶) اسوۃ الرسول۔ یہ مولانا سید اولاد حیدر بلگرامی کی تصنیف ہے۔ مولانا مشہور شیعی عالم، مؤرخ اور اہل قلم ہیں۔ ان کی یہ کتاب شبلی اور شبلی کے مقدمۂ سیرت پر کڑی تنقید سے شروع ہوتی ہے۔ نقد و جرح کو پیش نظر رکھا

گیا ہے۔ مگر شاید تکمیل کو نہ پہنچی۔ صرف پہلی جلد شائع ہوئی۔

(۷) سرورِ عالم۔ ریاست کپور تھلہ کے جج سید عبدالمجید نے لکھی ہے اور سیرت کی ایک مختصر کتاب ہے۔ اندازِ بیان بہت مؤثر ہے۔

(۸) رحمت عالم۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی لکھی ہوئی ایک مختصر کتاب سیرت ہے۔ اگرچہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اور سادہ انداز کی کتاب ہے مگر بڑوں کے لیے بھی اتنی ہی مفید ہے۔

(۹) سوانح عمری محمدؐ۔ محمد شاہ خاں صاحب حنفی آفریدی کی لکھی ہوئی ہے اور سوانح عمری ہے۔

(۱۰) مہرِ نبوّت۔ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری نے اپنی ضخیم کتاب رحمۃ للعالمین لکھنے سے پہلے لکھی تھی۔ یہ سیرت کی ایک مختصر سی کتاب ہے۔

(۱۱) خاتم النبیینؐ۔ اس کے مؤلف مولوی محمد علی صاحب لاہوری ہیں۔ اپنا خاص محققانہ انداز ہے۔

(۱۲) حضرت محمدؐ۔ یہ ایک برہمو سماجی پنڈت نے اردو زبان میں لکھی ہے اور ایک مختصر کتاب سیرت ہے۔ برہمو سماج ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے جو تمام انبیاء و رسل کو مانتا ہے مگر ختم نبوّت کا قائل نہیں۔

(۱۳) خطبات مدراس۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے آٹھ لکچروں کا مجموعہ ہے۔ یہ لکچر انھوں نے ۱۹۲۵ء میں جنوبی ہند کی اسلامی تعلیمی انجمن کی فرمائش پر مدراس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے مشترک اجتماع کے سامنے دیے تھے۔ ہر خطبہ سیرت کے الگ الگ پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ (۱) انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء کی سیرتوں سے ہو سکتی ہے (۲) عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف محمد رسول اللہؐ کی سیرت ہے (۳) سیرت محمدی کا

تاریخی پہلو (۴) تکمیلی پہلو (۵) جامعیت (۶) عملی پہلو (۷) پیغمبر اسلام کا پیغام (۸) پیغامِ محمدی ——— ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے سابق سفیر مصر برائے پاکستان کے ایما پر کوئی دو سال قبل مولانا محمد ناظم ندوی نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا اور یہ کتاب مصر میں شائع ہو کر مقبول ہوئی۔

(۱۴) ختم المرسلینؐ ۔ مولانا عبدالحلیم شررؔ مشہور مؤرخ اور ناول نگار دعالم و ادیب تھے ۔ انہوں نے "ختم المرسلینؐ" کے نام سے سیرت لکھی تھی۔

اس موقع پر ہم مولانا شررؔ کی ضخیم کتاب "جویائے حق" کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو اپنے طرز کی نرالی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت سلمان فارسی کی زندگی اس انداز سے پیش کی ہے کہ ان کی زبان سے سیرت نبوی نہایت ہی مؤثر انداز میں (بطرز ناول) بیان ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا اسے ختم کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔

(۱۵) نشر الطیب فی ذکر النبی الحبیب ۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تالیف ہے۔ مولانا قدیم انداز کے بزرگ، بڑے عالم، اور مفسر تھے اور ان کی تحریر میں سادگی ہوتی تھی۔

(۱۶) تذکرۃ المصطفےٰ ۔ مشہور مورخ و محقق پروفیسر نواب علی کی تالیف ہے۔

(۱۷) تاریخ احمدی ۔ یہ کتاب نواب پریاوان کی لکھی ہوئی ہے۔ انہوں نے ذخیرۂ کتب و روایات کو سامنے رکھ کر یہ سیرت مرتب کی ہے۔

(۱۸) پیغمبر صحرا ۔ مشہور نومسلم خالد لطیف گابا کی انگریزی تصنیف "دی پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" کا ترجمہ ہے۔

(۱۹) حدیثِ دفاع ۔ اردو زبان میں ایک تازہ ترین اور غالباً اپنے انداز اور زاویۂ نظر سے انوکھی کتاب وہ ہے جو حال ہی میں "حدیثِ دفاع" کے نام سے پاکستان

کے ایک مشہور فوجی افسر میجر جنرل اکبر خاں نے لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے غزوات نبوی پر جدید فنی و فوجی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ اور فوجی حکمت عملی STRATEGY یعنی مقاماتِ جنگ، اندازِ جنگ، اور اوقاتِ جنگ کے انتخاب پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز میدانِ جنگ، صف بندی کے رخ، اور فوجوں کی آمد کے راستے وغیرہ کے نقشے بھی دیے ہیں ـــــ مصنف نے اپنی کتاب کا نام رکھنے میں بھی بڑی حسین ادبیت کا ثبوت دیا ہے۔

(۲۰) انگریزی زبان سے جو تراجم ہوئے ہیں ان میں "سیرت اور مستشرقین" کے نام سے مولوی عبدالعلیم بی۔ اے جامعی کی کتاب بھی سیرت ہی پر ہے اور بہت مفید ہے۔ یہ ولہازن کا ترجمہ ہے اور مترجم نے یہ التزام کیا ہے کہ ولہازن کی بحثوں اور رایوں پر محققانہ نقد و جرح ساتھ ہی ساتھ کی ہے اور تفصیلی مدلل حاشیے لگا کہ ان کی وہیں تصحیح کی ہے۔

یہ چند اہم کتابیں ہیں، ان کے نام اور ان کے مصنفوں کے نام بھی ہم نے لکھ دیے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہی ساری تصنیفیں نہیں اور بھی کتابیں ہیں جن میں کچھ ایسی ہوں گی جو ہماری نظر سے نہ گذری ہوں گی۔ پھر یہاں مقصود ان سب کا احصا بھی نہیں ہے۔ ہر مصنف کا کوئی نہ کوئی خاص زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اور اپنی تصنیف میں وہ اسی زاویے کو سب سے زیادہ نمایاں رکھتا ہے۔ ان خصوصی زاویوں سے نہ جانے کتنی کتابیں ابھی اور بھی لکھی جائیں گی۔ پھر تحقیق و جستجو کا دروازہ تو ہمیشہ ہی کھلا ہوا ہے۔ اگلوں نے جتنی کتابیں بھی لکھی ہیں ان کو ہمارے لیے چھوڑتے وقت ہم سے اسی کی توقع رکھی ہے کہ ان کی محنت و جستجو کو ہم مزید تحقیق و تلاش کی روشنی میں آگے بڑھائیں گے۔ سیرت ایک حیات انگیز زندگی کا مرقع ہے اُس شخصیت کا جس نے انسانیت کو پیغامِ حیات دیا ہے اور زندگی ہر لمحے آگے بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا عنوانِ سیرت

اور انداز جستجو بھی نئے سے نئے سامنے آتے جاتے ہیں۔

المختصر یہ ہے پس منظر اور پھر ماحصل اس تحریک سیرت کا جو اس برعظیم میں ۱۸۵۷ء کی ہولناک تباہی کے بعد شروع ہوئی اور برابر ترقی کرتی جا رہی ہے۔

یہ کتاب سیرت ـــــ پیغمبر انسانیت ـــــ جو آپ کے پیش نظر ہے اپنی نوعیت کی ایک الگ کتاب ہے۔ اسے جو باتیں ممتاز کرتی ہیں ان میں سب سے پہلی بات اس کا مخصوص نقطۂ نظر ہے اور وہ یہ ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر مرحلۂ زندگی پر انسانی اقدار کی کتنی محافظت فرمائی ہے۔ آں حضورؐ کو زندگی کے نازک ترین مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ لیکن ہر موقعے پر اس نصب العین کو پیش نظر رکھا ہے کہ انسانیت کا سر بلند رہے۔ حضورؐ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ **بعثت لاتمم مکارم اخلاق** میں انسانی اقدار کی تکمیل کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔ لہٰذا جہاں مختلف قدریں یکجا ہوئیں وہاں اعلیٰ اقدار کو اختیار فرمایا اور کسی موقعے پر بھی انسانی قدروں کو مجروح نہ ہونے دیا۔ فلسفی بھی بڑی اعلیٰ اقدار کا ذکر کرتے ہیں لیکن عموماً یہ صرف افکار تک محدود رہتے ہیں۔ عملی زندگی میں یا تو انہیں اقدار کو بلند کرنے کا موقع ہی نہ ملا یا اگر ملا تو وہاں وہ پھسپھسے ثابت ہوئے۔ آں حضرتؐ نے افکار عالیہ محض پیش ہی نہیں فرمائے بلکہ ہر قدم پر عملی زندگی میں اسے جزو حیات بھی بنایا۔ اس کتاب میں اسی حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ بعض روایات پر کھل کر تنقید کی ہے اور اسے محض اس لیے تسلیم نہیں کیا ہے کہ ہر سیرت نگار لکھتا چلا آیا ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ بعض استنباطی نکات ایسے درج کیے ہیں جن کی طرف ذہن نہیں گئے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ زبان رواں اور

عاشقانہ ہے۔ اندازِ نگارش اچھوتا ہے اور جذبۂ عقیدت و محبت ہر جگہ نمایاں ہے اور یہی سیرتِ مصطفیٰؐ کی جان ہے۔ ہم نے انتہائی اختصار کے ساتھ چند خصوصیات لکھی ہیں۔ اگر اختصار پیشِ نظر نہ ہوتا تو تفصیل سے ہر ایک پر مثالیں دے دے کر گفتگو کرتے۔ ان تمام باتوں کا صحیح اندازہ کتاب پڑھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

نعتِ مصطفیٰؐ

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است — آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است
ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست — بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
طُور موجے از غبارِ خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش
در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش — تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز — چشمِ او شد اشکبار اندر نماز
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد — ہمچو او بطنِ اُمِّ گیتی نہ زاد
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد — مکہ را پیغامِ لاتثریب داد
مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
معنیِ حرفم کنی تصدیق اگر — بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر
قوتِ قلب و جگر گردد نبیؐ — ق — از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

(اقبالؒ)

بعثتِ نبوی سے پہلے دنیا کی حالت

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مصنفین نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

"جس وقت آں حضرتؐ نے اعلانِ نبوّت فرمایا اس وقت دنیا میں تین طرح کے لوگ موجود تھے۔ عیسائی، یہودی، اور مشرکین۔ اپنے آپ کو عیسائی کہنے والوں میں بھی مذہبِ عیسوی کا اقرار بہت ناقص تھا۔ جزیرہ نمائے عرب میں ہر قسم کا کفر و الحاد جو انسان کے خیال میں آسکتا ہے رائج تھا۔ مشرکین کے عقائد مذہبی ایک دوسرے سے قطعی مختلف تھے۔ اس لیے ایک ایسی چیز کی ضرورت تھی جو زیادہ سادہ، متعین اور با اصول ہو۔"

سر ولیم میور نے زیادہ صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے کہ:

"آں حضرتؐ کی تشریف آوری کے وقت دنیا میں جو گمراہی تھی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اور حضورؐ کے رخصت ہوتے وقت جیسی مکمل ہدایت تھی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔"

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ:

۱- ایسی گمراہ قوم کسی کو اس سے پہلے نہ ملی

۲- اتنی مختصر مدت بھی ـــــ صرف تیئس سال ـــــ کسی کو نہ ملی

۳- اس کے باوجود اتنی شاندار قوم کبھی پہلے نہ ہوئی

اس امت نے جو اقدار قائم کی ہیں ان کے لیے ایک الگ دفتر چاہیے۔ یہاں ان کا ذکر مقصود نہیں لیکن اتنی بات تو تسلیم کرنی ہی پڑے گی کہ ان سب کا کریڈٹ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو ملتا ہے۔

ولادتِ باسعادت

حضورؐ ۹ ربیع الاول سلہ عام الفیل (واقعۂ فیل کے ۵۲ دن بعد) مکہ مکرمہ میں بروز دوشنبہ بوقتِ صبح صادق پیدا ہوئے۔ انگریزی تاریخ ۲۲ اپریل ۵۷۱ء تھی اور بکرمی ۲۵ بیساکھ سمت ۶۲۸۔

یتیمی

ولادت سے کئی دن پیشتر حضورؐ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب وفات پا چکے تھے۔ بے سہاروں کا سہارا بن بھی وہی سکتا ہے جس کی زندگی خود بھی بے سہارا رہ چکی ہو۔ یتیموں کا صحیح دستگیر وہی ہو سکتا ہے جس نے خود بھی یتیمی کے دن دیکھے ہوں۔ حضورؐ کی زندگی کا مشن "دستگیر بندۂ بے ساز و برگ" ہونا تھا اس لیے قدرت نے ولادت کے ساتھ ہی یتیمی کو وابستہ کر دیا۔ دنیا کے ان گنت یتیموں کے لیے یہی ذات سہارا

بننے والی تھی اور ہر یتیم کو اسی کی ذات سے ایک ابدی شرفِ انتساب حاصل کرنا تھا۔

عبدالمطلب اور آمنہ رضؓ

اس یتیم کا نام دادا (عبدالمطلب) نے محمدؐ رکھا اور باپ کی طرح پرورش میں ہاتھ بٹایا۔ والدہ (آمنہ رضؓ) نے کچھ دنوں دودھ پلایا اور کچھ دنوں ابولہب کی لونڈی ثویبہ نے رضاعت کا فرض انجام دیا۔ اس کے بعد کم و بیش چار سال حلیمہ سعدیہ رضؓ نے اپنے پاس رکھا۔ رضاعت کے دن ختم ہونے کے بعد حلیمہ رضؓ آپؐ کو واپس لائیں۔ مگر آمنہ رضؓ نے پھر لوٹا دیا۔ بنی ہوازن کے گاؤں کی آب و ہوا نے حضورؐ کی صحت پر اچھا اثر کیا۔ چار سال پورے ہونے کے بعد حلیمہ رضؓ پھر آپؐ کو لائیں۔ اس کے بعد حضورؐ کبھی آمنہ رضؓ کے پاس رہے اور کبھی حلیمہ رضؓ کے پاس۔ چھٹے برس سے حضورؐ مستقل اپنی والدہ آمنہ رضؓ کے پاس رہنے لگے۔ آمنہ رضؓ نے ان ہی دنوں میں مدینے کا سفر کیا۔ واپسی میں بمقام ابواء انتقال کیا اور آپؐ کی دایہ ام ایمن رضؓ آپؐ کو اپنے ساتھ مکے واپس لائیں۔ باپ کے بعد یہ دوسرا سہارا ماں تھی۔ قدرت نے اسے بھی اٹھالیا۔ اب دادا (عبدالمطلب) نے پرورش کی طرف پوری توجہ دی۔ مگر دو سال کے بعد ۸۲ سال کا یہ بوڑھا بھی چل بسا اور یہ تیسرا سہارا بھی ختم ہوگیا۔ قدرت نے یہ پسند نہ کیا کہ جسے خود بے سہاروں کا سہارا بننا ہے وہ کسی کا سہارا لے۔ لہٰذا رفتہ رفتہ سارے بڑے چھوٹے سہارے ہٹا لیے۔

شغلِ تجارت اور نکاح خدیجہ

آمنہؓ اور عبدالمطلب کے بعد چچا زبیر پھر ابو طالب نے بڑی عمدگی سے پرورش کا حق ادا کیا۔ ابو طالب ہر وقت حضورؐ کو حضر و سفر میں ساتھ رکھتے۔ اس رفاقت کی وجہ سے حضورؐ کو تجارتی نشیب و فراز کا خاصہ علم ہو گیا۔ آپؐ کی امانت داری، دیانت داری، ہوشیاری اور پختہ کاری مشہور ہونے لگی۔ ان خوبیوں کا علم جب خدیجہؓ بنت خویلد کو ہوا تو انہوں نے حضورؐ سے تجارتی شرکت و معاونت کی درخواست کی جو حضورؐ نے منظور فرمالی۔ خدیجہؓ عرب کی ایک مالدار تاجرہ تھیں۔ ان کے دو نکاح پہلے ہو چکے تھے۔ ایک عتیق بن عائذ مخزومی سے اور دوسرا ابو ہالہ بن نباش تمیمی سے۔ ان دونوں کی وفات ہو چکی تھی اور اب خدیجہؓ بیوہ تھیں۔ تجارتی کاروبار میں مدد دینے والے ان کے چند غلام تھے اور میسرہؓ ان میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اب خدیجہؓ نے اپنی تجارت یوں شروع کی کہ مال ان کا تھا اور محنت حضورؐ کی۔

اس پہلے تجارتی تجربے کے بعد ہی خدیجہؓ کو کافی منافعہ ہوا۔ اس کے علاوہ میسرہ کی زبانی خدیجہؓ کو حضورؐ کی بلند کرداری، صداقت، امانت دیانت، معاملہ فہمی کے ایسے غیر معمولی اوصاف کا علم ہوا کہ خدیجہؓ نے خود حضورؐ سے مناکحت کی درخواست کی جو حضورؐ نے قبول فرمالی۔ اس وقت حضورؐ کی عمر پچیس ۲۵ سال کی تھی اور خدیجہؓ کی چالیس سال۔

لمحہ فکریہ

آگے چلنے سے پہلے ذرا یہاں ان اقدار پر غور کرتے چلیے جو اس بظاہر

غیر اہم واقعے سے قائم ہوتی ہیں۔ یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ پیغمبر کی زندگی میں تضاد نہیں ہوتا۔ یعنی اس کی زندگی قبل از پیغمبری بھی قدرۃً ان ہی خطوط پر قائم رہتی ہے جن پر بعد از پیغمبری بہت بڑے اور وسیع پیمانے پر چلنا پڑتا ہے۔ ان دونوں زندگیوں میں تضاد نہیں ہوتا۔ قبل از بعثت زندگی گلستان ہوتی ہے جس سے بعد از بعثت کی زندگی کی بہار کا قیاس و اندازہ کیا جاتا ہے۔ اولیاء اور انبیاء میں یہی بڑا فرق ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص ابتدا میں پکا شیطان ہو۔ مشرک ہو۔ رہزن ہو۔ شرابی ہو۔ بدکار ہو۔ سب کچھ ہو اور پھر دفعتاً اس کی زندگی میں ایسا انقلاب آجائے کہ نہ صرف یہ کہ اس کی ساری بدکرداریوں کی تلافی ہی ہو جائے بلکہ مقربین میں اس کا نام سرِ فہرست لکھ دیا جائے۔ لیکن اس قسم کا تضاد نبی کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ نبی کا رخ ابتداء میں بھی لاشعوری طور پر ادھر ہی ہوتا ہے جدھر آخر کار اسے جانا ہے۔

اب ذرا غور کیجیے۔ انسانی زندگی میں دو چیزوں کو بڑی اساسی اہمیت حاصل ہے اور انسان کتنا ہی مقدس بن جائے مگر ان دو چیزوں کی غیر معمولی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایک تو ہے تسکینِ شکم اور دوسری تسکینِ جنسیت۔ ان دونوں چیزوں کے متعلق آگے چل کر قرآنِ کریم جو واضح ہدایات، محکم اصول اور اساسی قوانین دینے والا تھا ان کا ایک سمٹا ہوا نقشہ ابتدا ہی سے حضورؐ کی قبل از بعثت زندگی میں بنیادی طور پر موجود تھا۔ یعنی اپنی معاشی زندگی کو سنبھالنے کے لیے حضورؐ نے تجارت کو پسند فرمایا۔

تجارت کا مقصد اگر محض حصولِ دولت ہو تو تجارت ہی کے نام

سے سو طرح کی بے عنوانیاں ہو سکتی ہیں لیکن حضورؐ نے کسبِ معاش کے لیے جو تجارت اختیار فرمائی وہ محض تجارت نہ تھی بلکہ ہر قدم پر اخلاقی اقدار کو برقرار رکھا۔ سب سے پہلی "قدر" دیانت و امانت ہے اور تاریخ کی ہر سطر اس پر گواہ ہے کہ سارے جاننے والے آمنہؓ کے اس لال کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے[1]۔ شدید اعتقادی اختلاف کے باوجود اہل کفر بھی آخر وقت تک اپنی امانتیں حضورؐ کے پاس رکھتے رہے۔ پھر تجارتی کامیابی کے دوسرے عوامل و عناصر محنت اور حکمت ہیں جس کی شاہد حضورؐ کی پوری زندگی ہے۔ جناب خدیجہؓ پر محض اس بات کا اثر نہ تھا کہ حضورؐ نے بہت سا منافعہ لاکر دیا۔ یہ منافعے تو اس سے پہلے بھی بارہا ہوئے ہوں گے۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ محض حضورؐ کے جمال . . . . نے خدیجہؓ کو متاثر کیا تھا۔ اگر اس کو بھی دخل ہو تو یہ تقاضائے بشریت کے خلاف تو نہیں لیکن خدیجہؓ جیسی مالدار کے لیے ایسے حسین نوجوانوں کی کمی نہ تھی۔ ان کو متاثر کرنے والی شے نہ تجارتی منافعہ تھا نہ جمال و شباب۔ انہیں متاثر کرنے والی چیز صرف وہ کردار تھا جو انہوں نے خود دیکھا اور موثق ذرائع سے معلوم کیا۔ خدیجہؓ کے اصلی تاثرات ان جملوں سے واضح ہوتے ہیں جو انہوں نے حضورؐ کے متعلق پہلی وحی نازل ہونے اور حضورؐ کے خوف زدہ ہونے کے وقت فرمائے ہیں (دیکھیے صفحہ ۶۹ سطر ۱۰)

دوسری اعلیٰ قدر جو اس ازدواج میں ہے وہ حضورؐ کی عفت و

---

(۱) دیکھیے صفحہ ۴۵ سطر ۴

پاکبازی ہے جو ولادت سے وفات تک اسی طرح قائم رہی۔ منکرین رسالت نے حضورؐ پر ہر طرح کے الزام لگائے۔ کاہن و ساحر کہا۔ مسحور کہا، مجنون بتایا۔ پرستارِ اقتدار ہونے کا الزام لگایا۔ کاذب کہنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ آبائی دین کے لیے فتنہ قرار دیا۔ سب کچھ ہوا لیکن صداقت و امانت کی طرح عفاف و پاکیزگی کو بھی ایک مسلّم حقیقت سمجھتے رہے۔ تقوے پر کبھی حرف گیری نہ کی۔ اگر حضورؐ کی پاکبازی میں دشمنوں کو ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی ہوتا تو وہ اسے اچھالنے، پھیلانے اور بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ عفت و پاکدامنی کی یہ اعلیٰ قدر کس جگہ حضورؐ نے قائم فرمائی ہے؟ اس جگہ جہاں سارا ماحول جنسی بے راہ روی کی سڑاند سے بسا ہوا ہے۔ جہاں شعراء اپنی فحش کاریوں کو عریاں کرنا ادب کا کمال سمجھتے ہیں۔ اور جہاں بے حیائی و بے حجابی سے بھرے ہوئے قصیدے کو اتنا بلند مقام حاصل ہوتا ہے کہ دیوارِ کعبہ پر اسے آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ اور جہاں رسمِ مناکحت سے پہلے اور نکاح کے بغیر بھی کوئی جنسی اختلاط معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ اس پلید اور مسموم فضا میں پرورش پانے کے باوجود ایک انسان کا عفاف و پاکدامنی کے اعلیٰ ترین مقام پر جمے رہنا قدرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جو ہونے والے پیغمبر ہی کے حصے میں سب سے پہلے آسکتا تھا۔ حضورؐ نے عمر کے پچیس سال اس طرح گزارے ہیں کہ عفت و پاکبازی قدموں پر لوٹتی رہی۔

پھر نکاح کیا تو کس سے؟ اس عورت سے جو حضورؐ سے پندرہ سال بڑی یعنی چالیس سال کی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ دو شوہروں کو دیکھ

چکی ہے۔ کیا حضورؐ پر نفسانی مغلوبیت کا ادنیٰ سے ادنیٰ گمان بھی کیا جا سکتا ہے؟

ایک اور بڑی حقیقت پر بھی غور کیجیے۔ عرب کا کون سا فرد تھا جو حضورؐ کی صورت و سیرت کا شیدا نہ ہو؟ نبوت سے پہلے حضورؐ کس کی نگاہوں میں محبوب نہ تھے؟ کون شخص تھا جسے حضورؐ سے کوئی معمولی سی بھی شکایت ہو؟ کیا ایسے حسنِ صورت و سیرت رکھنے والے باوقار و معزز انسان کے پاس دوسرے پیغامِ نکاح نہ آئے ہوں گے؟ پھر حضورؐ نے اسے منظور کیوں نہ فرمایا؟ یا خود کسی جگہ پیغام کیوں نہ دیا؟ ابوطالب سے ایک رفیقۂ حیات تلاش کرنے کا تقاضا کیوں نہ فرمایا؟ عرب میں ایک رفیقۂ زندگی تلاش کرنے میں کون سی دشواری تھی؟ نبی کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے اس منزل کی طرف ہوتا ہے جدھر اسے نبوت کے بعد جانا ہوتا ہے۔ ازدواجی زندگی کے لیے آگے چل کر جو ہدایات ملنی تھیں ان میں ایک بڑی اہم چیز کفالت ہے۔ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ (۲:) بیوی اور بچوں کی معاشی کفالت شوہر ہی کے ذمے ہے۔ حضورؐ نے یہ محسوس فرمالیا تھا کہ کفالت کے بوجھ کو اٹھانے کی سردست استطاعت نہیں ہے اس لیے ازدواج کی طرف پچیس سال کی عمر تک کوئی توجہ نہ فرمائی حالانکہ یہی عمر ولولۂ شباب سے بھرپور ہوتی ہے۔ جب ایک ایسی عورت نے خود پیام دیا جو اپنا معاشی بوجھ خود اٹھا سکتی تھی اور جس کے تجارتی منافعے میں خود حضورؐ بھی حصے دار تھے تو حضورؐ نے اس پیغام کو قبول فرمالیا۔ کتاب اللہ اور سنتِ نبوی میں یہ تصریحات ملتی ہیں کہ اگر معاشی کفالت کی استطاعت نہ ہو تو ایک شادی سے بھی احتراز کرنا چاہیے چہ جائیکہ

تعددِ ازدواج ۔ایسی ہی معاشی تنگیوں کے لیے صبر کرنے اور روزہ رکھنے کی ہدایات ہیں۔حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک صبر وعفاف کی جو قدر دنیا کو دی ہے وہی نبوت کے بعد بھی قائم رکھی ہے۔

یہاں ایک حقیقت اور بھی غور طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی اصل ازدواجی زندگی حضرت خدیجہؓ ہی سے وابستہ رہی ہے۔باقی جتنی ازواج مطہرات آئی ہیں وہ دوسرے مصالح کے تحت آئی ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ بجز خدیجہؓ (اور ماریہ قبطیہ) کے کسی کے بطن سے حضورؐ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی حالانکہ حضورؐ صحتِ جسمانی میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ اور ازواج بانجھ نہ تھیں۔ہم ان شاء اللہ اس کا مفصل ذکر آگے کریں گے (دیکھیے ص ـــــ)۔

اس ازدواجِ خدیجہؓ میں ایسی اعلیٰ ازدواجی قدریں ہیں جو ہر متاہل کے لیے اسوۂ حسنہ ہیں۔حضورؐ نے کتنی اعلیٰ درجے کی وفا کا ثبوت دیا ہے کہ ان کی موجودگی میں کسی دوسری رفیقۂ حیات کو لانے کا تصور تک نہ آنے دیا حالانکہ عرب کے کلچر (ثقافت و تمدن) میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا نہ فقط یہ کہ معیوب نہ تھا بلکہ ہنر تھا۔دس دس بیویاں تک رکھنے کا ثبوت ملتا ہے۔تحدید تو نبوت کے بعد ہوئی ہے۔اس سے پہلے کوئی حد بندی نہ تھی۔اس کے باوجود حضورؐ نے وفا کا جو ثبوت دیا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی پچاس سال کی عمر تک اسی ایک رفیقۂ حیات کے ساتھ جو پینسٹھ سال کی بڑھیا ہو کر دنیا سے رخصت ہوئی نباہ کرتے رہے اور کسی دوسرے ازدواج کی طرف رخ بھی نہ کیا۔وفا کی انتہا یہ ہے کہ خدیجہؓ کی رحلت کے بعد بھی ہمیشہ ان کی فراست و ایثار و ایمان

کو یاد فرماتے رہے۔ حضورؐ کے اسی کیرکٹر کا اثر تھا کہ اس فلکِ نیلگوں کے نیچے سب سے پہلے حضورؐ کی نبوّت پر ایمان لانے والی ہستی یہی رفیقۂ زندگی خدیجہؓ ہوئی۔ اور یہ صرف ایمان ہی نہیں لائی بلکہ اپنا سب کچھ حضورؐ پر قربان کر دیا اور شعب ابی طالب میں تین سال تک محصوریت اور فقر و فاقہ کی انتہائی مصیبتوں میں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ازدواجی زندگی میں حسنِ وفا کی ایسی اعلیٰ قدریں کہیں اور بھی مل سکتی ہیں؟

غور و فکر

اس ازدواجی زندگی کے بعد ہی سے حضورؐ کے خیالات میں ایک تموّج سا پیدا ہونے لگا۔ اپنی عرب قوم کی حالت کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے قوم کی بد اخلاقیاں، مسافروں کا لٹنا، غریبوں کمزوروں کا ستایا جانا اور سب سے بڑھ کر قبیلے قبیلے کی باہمی خونریزیاں۔ یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے سامنے آتیں۔ پھر اور پیچھے جاتے اور یہ پوری کائنات، اس کی آفرینش اور اس کا نظام زیرِ غور آ جاتا۔ کوئی حل سمجھ میں نہ آتا تو عبادت میں مشغول ہو جاتے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا طریقِ عبادت تھا جو حضورؐ اختیار فرماتے تھے؟ اس سوال کا قطعی جواب دینا تو مشکل ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ عبادات و مناسک کا کوئی نہ کوئی طریقہ ہر قوم میں رہا کیا ہے۔ عرب قوم میں بھی یہ مناسک موجود تھے۔ مسیحی بھی اپنے طرز پر مناسک بجا لاتے تھے اور صابئی بھی نماز ادا کرتے تھے۔ قرینہ یہ ہے کہ ان ہی طریقوں میں سے کوئی طریقہ حضورؐ نے اختیار فرمایا ہو گا۔ حضورؐ کو اور ایمان لانے والوں کو اہلِ مکہ عموماً صابئی کہتے تھے اس لیے ممکن

ہے کہ حضورؐ کا طریقہ عبادت ان سے ملتا جلتا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ساری قومیں اللہ کو ماننے کے باوجود کواکب، جنوں، فرشتوں، پیغمبروں اور بتوں کی پرستش کیا کرتی تھیں اور ان سب معبودانِ باطل کو خدا تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ، وسیلہ اور مقرّب تصور کرتی تھیں۔ لیکن جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں پیغمبر کی زندگی کا رخ شروع سے صحیح سمت میں ہوتا ہے اس لئے یہ یقینی بات ہے کہ حضورؐ نے جو بھی طریقہ عبادت اختیار فرمایا ہوگا اس کا رخ خالقِ کائنات ہی کی طرف تھا۔

کائنات پر ایک فلسفی کی نگاہ سے اور معاشرے پر ایک مصلح کے انداز سے غور و فکر اسی مقامِ نبوت کی تمہید تھی جس کے بعد ایک پیغمبر معاشرے کو خالقِ کائنات کے دئے ہوئے نظام کے سانچے میں ڈھالنے کا پیغام دیتا ہے۔ نبی کا پیغام یہی تو ہوتا ہے کہ جس طرح یہ کائناتی نظام بڑی حسن و خوبی سے اس لیے چل رہا ہے کہ یہ بے اختیارانہ قانونِ الٰہی کے تابع ہے اسی طرح انسانی معاشرے کی سلامتی و امن بھی اسی پر موقوف ہے کہ وہ اپنے اختیار سے خدا کے دیے ہوئے نظام پر چلے۔

معاشرے کی خرابیوں پر غور کرنے کے بعد حضورؐ نے بہت سے لوگوں سے گفتگو فرمائی اور ان خرابیوں کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ آخر "حلف الفضول" کے نام سے ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ "حلف الفضول" اس کا نام اس لیے پڑا کہ اس کے کئی ارکان کے نام لفظ "فضل" سے مشتق تھے۔ اس انجمن میں بنی ہاشم مع ابنائے عبد المطلب

بنی اسد، بنی زہرہ اور بنی تمیم شامل تھے۔ ان سب نے مل کر اس بات کا حلف لیا کہ ملک سے بدامنی دور کریں گے۔ غریبوں کی دستگیری کریں گے۔ مظلوموں کی حمایت کریں گے۔ اور مسافروں کی حفاظت کریں گے۔

لمحۂ فکریہ

ذرا یہاں غور کیجیے۔ کیا پیغمبر کا رخ پیغمبری سے پہلے ہی انہی اخلاقی اقدار کی طرف نہیں جو پیغمبری کے بعد آنے والی ہیں؟ کیا پیغامِ الٰہی کا بہت بڑا حصہ ان ہی مقاصد میں سمٹا ہوا نہیں؟ کیا یہی وہ مقاصد نہیں جو عالمگیر ہونے کے بعد انسانی معاشرے کو امن و عافیت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ یہی تو وہ اقدارِ عالیہ ہیں جن کی دنیا ہمیشہ سے پیاسی رہی ہے۔ بلاشبہ یہ مقاصد ابھی چھوٹے پیمانے پر اور محدود دائرے کے اندر ہیں لیکن آگے چل کر آفاقی رنگ اور بین الاقوامی مقام حاصل کرنے والے ہیں۔

نصبِ حجرِ اسود کا حکیمانہ فیصلہ

"حلف الفضول" کو ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ اسی سال سیلاب نے کعبۃ اللہ کی دیواریں شق کر دیں۔ اس کی تعمیر میں تمام ابنائے قریش نے حصہ لیا کیونکہ کعبے کی مرکزیت اور احترام سب میں مسلّم تھا اور قریش کی آبرو کعبے ہی کی وجہ سے قائم تھی۔ تعمیر کے سلسلے میں یہ سوال اٹھا کہ حجرِ اسود کو کون اٹھا کر نصب کرے۔ ہر قبیلہ کیا ہر شخص ہی یہ چاہتا تھا کہ حجرِ اسود

کو نصب کرنے کا شرف ہمیں حاصل ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تلواریں نیام سے نکلنے لگیں۔ یہ وقت تھا حلف الفضول کے امتحان کا۔ اس انجمن کا پہلا مقصد ملک سے بدامنی و فساد کو دور کرنا تھا۔ مگر یہاں قبیلوی جہالت ابھر رہی تھی۔ قریب تھا کہ تلواریں حرکت میں آجائیں۔ یکایک ایک طویل العمر شخص ابوامیہ بن مغیرہ آگے بڑھا اور یہ تجویز پیش کی کہ ہم سب مل کر ایک حَکَم بنالیں اور فیصلہ اسی کے سپرد کر دیں۔ اس تجویز کو مان لینے کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوا کہ حَکَم کون ہو؟ آخر بحث و مباحثہ یہاں آکر ختم ہوا کہ کل صبح جو شخص کعبے کے اندر سب سے پہلے آئے اسی کو حَکَم تسلیم کر لیا جائے۔

یہ رات سب نے کس بے چینی اور ادھیڑ بن میں کاٹی ہوگی اور کس انداز سے ہر قبیلے کے افراد میں اس مسئلے پر گفتگوئیں ہوئی ہوں گی؟ اس کا صحیح اندازہ تو وہی کر سکتا ہے جو عرب کی قبیلوی ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ بھی ظاہر ہے ہر ایک نے سویرے سب سے پہلے پہنچنے کی اسکیم بنائی ہوگی اور کوشش بھی کی ہوگی۔ لیکن ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ ہر آنے والے نے اپنے سے پہلے محمدؐ بن عبداللہ کو کعبے میں موجود پایا۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام لوگوں نے رات کا بڑا حصہ گفتگوئیں کرنے اور اسکیمیں بنانے میں صرف کر دیا اور جب نیند نے غلبہ کیا تو سب کے سب غافل ہو گئے۔ لیکن کیا خود حضورؐ کو کوئی فکر نہ ہوگی؟ کیا حضورؐ کی وہ ساری رات چین آرام سے گزری ہوگی؟ قیاس کہتا ہے نہیں بلکہ حضورؐ سب سے زیادہ مضطرب ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا شرف حاصل کریں یا حَکَم بنیں بلکہ اس لیے کہ قوم کو باہمی

خونریزی سے بچاکر حلف الفضول کا ایک بڑا مقصد پورا فرمائیں۔ اور کیا عجب کہ یہی بے چینی حضورؐ کو سب سے پہلے کعبے میں لے گئی ہو۔

بہرحال جب آنے والوں نے سب سے پہلے حضورؐ کو دیکھا تو سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے هٰذا الامین رضینا کہ یہ "امین" جو فیصلہ کر دے ہمیں منظور ہے۔ یوں تو جو بھی پہلے پہنچ جاتا اس کو طے شدہ فیصلے کے مطابق حکم ماننا پڑتا لیکن یہ کوئی ضرور نہیں کہ حکم ماننے والوں کے دل بھی اسے گوارا کر لیتے۔ مگر یہاں ہر آنے والا اس طرح بے ساختہ اپنی رضامندی و شگفتگی کا اظہار کرتا ہے جیسے حضورؐ اس کے دل کی آواز ہیں۔ یہ جملہ اس محبوبیت کا پتا دے رہا ہے جو حضورؐ کو اپنی ساری قوم میں حاصل تھی۔

حضورؐ خود بخود حکم تسلیم ہو گئے۔ ہر شخص متوجہ ہے کہ دیکھیں حضورؐ کیا فیصلہ فرماتے ہیں؟ لوگ یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ یا تو خود ہی حجرِ اسود کو نصب کریں گے یا کسی اور کو اس کام کے لیے نامزد فرمادیں گے۔ مگر حضورؐ کا فیصلہ یہ تھا کہ ایک چادر بچھائی۔ حجرِ اسود کو اس کے بیچ میں رکھا۔ اور ہر قبیلے کے سردار سے کہا کہ اس چادر کا ایک ایک گوشہ پکڑ کر اٹھاؤ۔ سب نے مل کر اسے اٹھایا اور اس جگہ لے آئے جہاں اسے نصب ہونا تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اسے اس کے مقام پر نصب فرمادیا۔

لمحۂ فکریہ

بات دیکھنے میں معمولی سی نظر آتی ہے لیکن یہ حقیقت پھر سامنے

لا یئے کہ نبی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے۔ حضورؐ کا یہ فیصلہ کتنی بڑی قدریں اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس موقعے پر تلواریں تو حرکت میں آنے لگی تھیں۔ اگر خدانخواستہ کسی ایک کی گردن پر بھی لگتی تو جنگ کا سلسلہ نسلوں تک چلتا رہتا اور جنگ بعاث⁽¹⁾ پیچھے رہ جاتی۔ جنگ کے معاملے میں عربوں کی ذہنیت کسی مؤرخ سے پوشیدہ نہیں۔ یہ حلف الفضول ہی کا صدقہ ہے جو ابو امیہ بن مغیرہ نے تحکیم کی رائے دی۔ پھر حضورؐ نے اس موقعے پر حجر اسود کے نصب کرنے میں جس دانائی و حکمت سے فیصلہ دیا ہے وہ بڑی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے۔ اس سے جنگ ہی نہ رکی بلکہ ایک بڑا درس اس سے یہ حاصل ہوا کہ انسانی خون کو محفوظ رکھنے اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کے لیے مختلف اور متضاد عناصر کو ایک مرکز پر کس حکیمانہ طریقے سے لایا جا سکتا ہے کہ وہ مرکزی نقطہ سب کے لیے قدر مشترک کا کام دے کعبہ ہو یا حجر اسود یہ سارے افراد کی مشترک ملکیت ہے۔ اس کی غرض سارے بنی آدم کو "قیام امن" کی دولت سے نوازنا ہے۔ قیٰماً للناس وامناً

حضورؐ کی ہستی اتنی محبوب تھی کہ اگر حضورؐ حکم ہو چکنے کے بعد خود ہی حجر اسود کو نصب کر دیتے تو کوئی اختلاف نہ کرتا۔ لیکن اس میں کسی قدر خود غرضی کا شائبہ پیدا ہوتا۔ اس لیے حضورؐ نے سب ہی کو اس میں شریک کر لیا۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ جھگڑنے والے قبائل کے تمام افراد کا ایک ایک

---

(۱) اوس و خزرج کے درمیان ایک معمولی بات پر جنگ شروع ہو گئی تھی جو ایک سو بیس سال تک جاری رہی تھی۔

کر کے چادر میں شریک ہونا ممکن نہ تھا اس لیے حضورؐ نے نمائندگی کا اصول برتا۔ اور یہ ایک ایسا زریں اصول ہے جسے کاروبارِ زندگی کے ہر مرحلے پر برتنا پڑتا ہے۔ یہ چادر محض ایک چادر نہ تھی بلکہ آئندہ آنے والا ایک ایسا مثالی پیغام تھا جس میں ہر رنگ و نسل، ہر وطن و زبان اور ہر پیشہ و مذہب کا آدمی شریک ہو سکے۔

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

عرب کی گمراہیاں

آگے چلنے سے پہلے ذرا عرب اور خصوصاً مکے کی حالت پر ایک سرسری نظر ڈالتے جایئے۔ قبلِ بعثت دنیا کی عام حالت کا مختصر نقشہ تو آپ آغاز ہی میں دیکھ چکے ہیں۔ اب عرب کی عمومی حالت کا اندازہ بھی کیجیے۔ عربوں میں صرف عیوب ہی نہ تھے۔ بہت سے ہنر بھی تھے۔ لیکن محلِ استعمال کی غلطی نے ان کے ہنر کو بھی عیب بنا دیا تھا۔ عرب بے غیرت بھی تھے اور غیرت مند بھی۔ زن و مرد طوافِ کعبہ کے وقت عریاں ہو جانے کو عبادت سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اسے بے غیرتی ہی میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی غیرت مندی کا انداز یہ تھا کہ اپنی نومولود دختر کو زندہ درگور کر دینا تقاضائے غیرت تصور کرتے تھے۔ وہ بزدل بھی تھے اور بہادر بھی۔ جہاں شرفِ انسانیت کے اظہار کا موقع ہوتا وہاں وہ بزدل ثابت ہوتے تھے۔ وہ جن، فرشتے، ارواح کے علاوہ ستاروں اور پتھر کی مورتیوں تک سے ڈر کر ان کے آگے گردنِ عبادت خم کر دیتے تھے۔ یہ تو تھی ان کی بزدلی۔ ساتھ ہی وہ بڑے جری اور بہادر

بھی تھے مگر اس وقت جب کسی قافلے کو لوٹنا ہو یا معمولی سی بات پر آپس میں خونریزی کرنی ہو۔ وہ مہمان نواز بھی تھے اور مہمان کُش بھی۔ جب کسی کو اپنی زبان سے پناہ دے دیتے تو ان کے لیے مہمان نواز تھے لیکن جب زائرین حرم کو لوٹنا ہو تو انہیں مہمان نہیں سمجھتے تھے۔ وہ بڑے فصیح و بلیغ تھے۔ لیکن اس وقت جب اپنی خودستائی یا دوسروں کی ہجو کرنی ہو یا اپنے معاشقے کی عریاں داستانیں بیان کرنی ہوں۔ لیکن جب قبیلوی عصبیت مسلط ہو تو اظہارِ حق میں وہ گونگے بن جاتے تھے۔ سوتیلی ماؤں بہنوں کو وراثت میں لے کر اپنی بیوی بنا لینا ان کے نزدیک کوئی عیب نہ تھا۔ تعددِ ازدواج کی کوئی حد بندی نہ تھی۔ انسان بعض اوقات بتوں پر بھینٹ چڑھا دیے جاتے تھے۔ غرض عقائد اوہام کا مجموعہ اور اخلاق ناگفتہ بہ تھے۔ امن و امان مفقود، راستے پُرخطر، عصمتیں غیر محفوظ۔ جہالت، تاریکی، بے رحمی، ظلم ہر عیب کی فراوانی تھی۔ جو ہنر تھے وہ بھی محلِ استعمال غلط ہونے کی وجہ سے سراپا عیب بن گئے تھے۔ اصنام پرستی اس طرح دلوں میں رچی ہوئی تھی کہ کعبے کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے تھے۔ یہ وہ خانۂ خدا تھا جسے سیدنا خلیل اللہؑ نے خالص خدائے واحد کی عبادت کے لیے تعمیر کیا تھا۔ لیکن نیرنگیٔ زمانہ کی ستم ظریفی دیکھیے کہ اسی کعبے کے اندر خود سیدنا ابراہیمؑ کا مجسمہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔

عزلت گزینی

قوم کے یہ رجحانات اور معاشرے کے یہ حالات حضورؐ کے سامنے تھے۔ مگر اصلاحِ حال کی کوئی سبیل نظر نہ آتی تھی۔ ان تمام قسم کی

برائیوں سے حضورؐ کو طبعاً نفرت تھی۔ اس لیے ان چیزوں میں حضورؐ نے کبھی قوم کا ساتھ نہ دیا۔ حضورؐ کبھی نظامِ کائنات پر غور فرماتے اور کبھی انسانوں کی ان بربادیوں کو دیکھتے۔ نظامِ کائنات میں حسن، نظم، باقاعدگی اور امن نظر آتا اور زمین پر قبح، بدنظمی، بے قاعدگی، اور فساد دکھائی دیتا۔ طبیعت میں کڑھن سی پیدا ہوتی مگر کوئی بس نہ چلتا۔ کوئی اصلاح کی سبیل نظر نہ آتی۔ ہرچند کہ حلف الفضول نے اپنا کچھ اثر دکھایا مگر وہ جزئی اصلاح تھی اور یہاں زندگی کے بے شمار گوشوں میں خلا نظر آرہا تھا۔

قاعدہ ہے کہ جب انسان برائی کو دور کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کم از کم اپنے آپ کو برے اثرات سے الگ رکھے۔ بظاہر یہی محرک دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ سے حضورؐ کے دل میں کنارہ کشی کا جذبہ پیدا ہوا تاکہ تنہائی میں غور و فکر کر کے اس پیچیدگی کا حل تلاش کیا جائے۔ لیکن درحقیقت یہ قدرت کی طرف سے ایک غیر محسوس پکار تھی ایک خاص اسکیم کے تحت۔ یہ ایک نامعلوم کشش تھی ایک بارِ گراں سپرد ہونے کے لیے:

من نہ باختیارِ خود می روم از قفائے او
آں دو کمندِ عنبریں می برد م کشاں کشاں

حضورؐ نے اپنے لیے ایک پُرسکون گوشۂ تنہائی تلاش فرمایا۔ یہ کوہِ حرا پر ایک غار تھا جسے غارِ حرا کہتے ہیں۔ مکے سے کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ غار چار گز لمبا اور پونے دو گز چوڑا ہے۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس خشک و تنگ غار کی قدر و قیمت کا

جس سے تمام اقدارِ حیات کے چشمے ابل کر سارے عالم کو سیراب کرتے رہے اور ابد تک کرتے رہیں گے؟

رویائے صادقہ

حضورؐ یہاں تنہا جا بیٹھتے اور سارا وقت یادِ الٰہی میں بسر کرتے۔ گھر سے کچھ ستّو اور پانی وغیرہ ساتھ رکھ لیتے اور جب تک یہ ختم نہ ہوتا گھر کا رخ نہ کرتے۔

غارِ حرا کی عزلت گزینی تک ہی حضورؐ کی وہ زندگی ہے جسے قرآنِ کریم نے وَوَجَدَكَ ضَالًّا کہا ہے۔ بلاشبہ یہاں ضالّ کا لفظ ہدایت کے مقابلے میں آیا ہے لیکن ہم اس کا ترجمہ "گمراہ" کرنا سوئے ادب سمجھتے ہیں۔ ضالّۃ کھوئی ہوئی اونٹنی کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپؐ نبوّت ملنے سے پہلے کھوئے ہوئے تھے۔ حیرانی کے عالم میں تھے تلاشِ حق میں وارفتہ و سرگرداں تھے فَهَدىٰ۔ اس کے بعد زندگی کا نصب العین اور اس کی طرف آگے بڑھنے کا راستہ مل گیا۔

بہرکیف اس حرانشینی کا ابتدائی ثمرہ یہ تھا کہ حضورؐ کو اکثر جو خواب آتے وہ مثل فلق الصبح (سپیدۂ فجر) کی طرح اس کا ظہور ہوتا۔ بارِ نبوّت کو اٹھانے کے لیے یہ ابتدائی مشق ہو رہی تھی۔

پہلا سندیس

اب رفتہ رفتہ محمدی ظرف بارِ نبوت کو سنبھالنے کے قابل ہو گیا تھا۔ عمر شریف کا اکتالیسواں سال تھا اور ۹ ربیع الاول کی تاریخ تھی

جو ۱۲؍ فروری ۶۱۰ء اور ۱۷؍ پھاگن سمت ۶۶۶ کے مطابق تھا۔ دوشنبے کا دن تھا اور یہ وہی دن ہے جس میں حضورؐ اس دنیا میں تشریف لائے وقت کیا تھا؟ اللہ کو معلوم۔ بہرحال یکایک ایک صورت ناآشنا نوواردآتا ہے اور آتے ہی فرمائش کرتا ہے کہ اقرأ پڑھیے۔ ایک اُمّی سے پڑھنے کی فرمائش عجیب سی بات تھی۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں۔

یہاں قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہاں کوئی پڑھی جانے والی شے بھی پیش کی گئی ہو۔ ورنہ "پڑھو" کا جواب یہ ہوتا کہ "کیا پڑھوں" بہرکیف روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ نووارد نے کوئی پڑھنے کی چیز بھی پیش کی ہو۔

حضورؐ نے جب یہ جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں تو اس نووارد نے حضورؐ سے خوب بھینچ کر معانقہ کیا اور چھوڑ دیا۔ پھر دوسری بار یہی سوال و جواب اور پُرزور معانقہ ہوا۔ تیسری بار بھی اسی طرح ہوا۔ اس کے بعد اس نے یہ آیات پڑھ کر حضورؐ کے سینے میں اتار دیں:

اقرأ باسم ربك الذی خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقرأ وربّك الاکرم ۝ الذی علّم بالقلم ۝ علم الانسان مالم یعلم ۝

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا انسان کو علق سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب سب سے بڑھ کر کریم ہے۔

---

(۱) ہمارے نزدیک حضورؐ کی بعثت ماہ ربیع الاول میں نہیں بلکہ ماہ رمضان میں ہوئی تھی۔

جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی۔ انسان کو وہ کچھ سکھایا
جسے وہ جانتا بھی نہ تھا۔ ۹۶: ۱ تا ۵

یہ نو وارد ناموسِ ربّانی (جبریل امینؑ) تھا۔ اور یہ پہلی وحی عہدۂ نبوّت کے ساتھ ساتھ آئی۔ معانقہ بیٹھے بیٹھے نہیں ہوتا اس کے لیے قیام ضروری ہے اور غارِ حرا میں قیام کی گنجائش نہیں۔ اس لیے بہت ممکن ہے جبریلؑ صورت بشری میں نہ آئے ہوں اور پہلی وحی کے نزول کی یہ ساری تفصیلات روحانی کیفیات ہوں جن کو تمثیلی زبان میں بیان کیا گیا ہو۔ قرآن و حدیث میں ایسی تمثیلات بہت ہیں جن میں مجردات کو محسوسات کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ خدا نے اپنے نور کی مثال بھی محسوسات ہی کی زبان میں بیان فرمائی ہے۔ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ۔ بہر حال یہ روحانی کیفیات ہوں یا مادّی محسوسات۔ دونوں ہی ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں۔ اور ان کا شمار ان غیوب میں ہے جن پر ایمان بالغیب ہی لایا جا سکتا ہے۔

لمحہ فکریہ

یہاں ذرا اس نکتے پر غور کیجیے۔ کہ سارے عالم کی تعلیم کے لیے اور تمام زمانے کی تدریس کے لیے ایک ایسے اُمّی کو منتخب کیا جاتا ہے جس نے ایک لمحے کے لیے بھی کسی مدرسہ و تعلیم گاہ کی صورت نہ دیکھی اور کسی معلّم و استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا۔ جو دبِستانِ نوشت و خواند سے بلند و بالا اور درس گاہِ قدرت کا سبق آموختہ ہے اور دنیا کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ بعثت معلّما (میں

تو معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں) :

بیتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ ہفت ملّت بشست

پڑھنے کا درس اقراء میں ہے اور لکھنے کا سبق علم بالقلم میں اقراء کی دوبار تکرار ہے اور تعلیم کا بھی دوہی بار ذکر ہے علّم۔ آدم کی فضیلت ملائکہ پر علم ہی کی بدولت ہے۔ علّم آدم الاسماء کلّھا اور اگر شکاری جانوروں کو "تعلیم" دی جائے تو وہ بھی اپنی حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی صف میں آجاتا ہے اور اس کا شکار بے ذبح کیے بھی ویسا ہی حلال ہوتا ہے جس طرح انسان کا ذبح کیا ہوا

وما علمتم من الجوارح مکلبین تعلمونھن مما علمکم اللہ
فکلوا مما امسکن علیکم واذکروا اسم اللہ علیہ ۵: ۴

امام اعظم ابو حنیفہ کا قول ہے کہ ایمان گھٹتا بڑھتا نہیں۔ سیدنا علی مرتضٰے (باب مدینۃ العلم) کا ارشاد بھی اسی کی تائید کرتا ہے کہ: لو کشف الغطاء ما ازددت یقیناً (پردۂ حقیقت اٹھ جانے کے بعد بھی میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا)۔ غرض ایمان بھی ایک مقام پر آکر ٹھہر سکتا ہے لیکن علم؟ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ یہ کہیں جا کر ختم نہیں ہو سکتا۔ حضورؐ جیسے معلّم کو بھی یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ: رب زدنی علماً (اے میرے رب میرے علم میں برابر اضافہ ہی کرتا چلا جا)۔

یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی کا آغاز پڑھنے لکھنے اور تعلیم کے ذکر سے ہوا ہے۔ اس سے کچھ اور زیادہ کہنے کی اجازت دیجیے۔ رسولِ خدا نے اپنے آپ کو مدینۃ العلم فرمایا ہے اور اسلام کے بدترین دشمن

عمرو بن ہشام کو ابو جہل کا لقب دیا ہے۔ یعنی اسلام علم کا نام ہے اور کفر جہالت کا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے کے دور کو دورِ جاہلیت کہتے ہیں۔ اعمالِ صالحہ وجود میں نہیں آ سکتے جب تک پہلے ان کا علم نہ ہو۔

مگر یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ علم محض منطق و فلسفہ، اور فقہ و تفسیر کی چند درسی کتابوں میں بند نہیں۔ ہمارے ہاں کتب درسیہ تمام کرنے والوں کو عالم یا عالم دین کا خطاب مل جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دین میں زندگی کے تمام خانوں کو داخل تصور کیا جاتا ہے اور ہے بھی ایسا ہی۔ لیکن ہمارے ہاں کا "عالم" چند کے سوا سارے علوم و فنون سے ناواقف ہوتا ہے۔ آج دنیا میں بے شمار علوم و فنون شاخ در شاخ ہیں اور ان میں نت نئے اضافے ہوتے جاتے ہیں۔ ان سب کا عالم بھی عالم ہی کہے جانے کا مستحق ہے۔ کوئی عالم عمرانیات ہے کوئی عالمِ تاریخ، کوئی عالم جغرافیہ ہے کوئی عالم حیوانات، کوئی عالم قانون ہے کوئی عالم معاشریات، کوئی عالم حساب ہے کوئی عالم فقہ، بلکہ عالم فقہِ حنفی یا شافعی وغیرہ وغیرہ۔ غرض عالم وہ بھی ہے جس نے فقہ و تفسیر کے علاوہ کوئی اور علم حاصل کیا ہو اور وہ بھی علماء میں شمار ہوگا جو پریکٹیکل سائنس پر عبور رکھتا ہو۔ اگر چاند گہن کی نماز کا طریقہ جاننے والا عالم ہے تو اس سے بڑا عالم ہے وہ جو رصد گاہ میں بیٹھا کیفیاتِ بدر کا بغور مطالعہ کر رہا ہو اور وہ بھی بڑا "علامہ" ہے جو تسخیر قمر کے لیے فضائے بسیط میں راکٹ اڑا رہا ہو۔ صرف عربی زبان پڑھنے والا ہی عالم نہیں۔ دوسری زبانوں کا ماہر بھی عالم ہو سکتا ہے۔ اس لفظِ عالم کو اتنا محدود کیوں کیا جائے؟ مقصد

حصولِ علم ہے خواہ کسی زبان میں ہو۔ حدیث اطلبوا العلم و لو بالصین پر غور کرنا چاہیے۔

مگر ہاں یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ مومن و کافر کے علم میں فقط رجحان (ATTITUDE) اور مقصد و نیت کا فرق ہے۔ ہر علم کا غلط مصرف عالم کو ہلاکت میں ڈالے گا اور صحیح استعمال جنتی زندگی بخشے گا:

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر جاں زنی یارے بود

علم وہی ہے جسے حضورؐ نے نافع فرمایا ہے اور قرآنی نقطۂ نگاہ سے بقا بھی اسی چیز کو ہے جو نفع بخش ہو۔ وَاَمَّا مَا ینفع النّاس فیمکث فی الارض[1]۔ قرآن ہی نے ہمیں "بقائے انفع" کا اصول دیا ہے جو بقائے اصلح سے زیادہ جامع ہے۔

خَلوت و جِلوت

یہاں ایک اور حقیقت پر بھی غور کرتے چلیے جسے زندگی کے بیشمار مراحل پر پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ خدا اپنی صفات کے لحاظ سے بہ ظاہر جامع الاضداد ہے۔ وہ نافع بھی ہے ضار بھی، قابض بھی ہے باسط بھی، عفو بھی ہے ذوانتقام بھی۔ مگر یہ بھی عجیب تضاد ہے کہ تضاد ہوتے ہوئے بھی کوئی تضاد نہیں۔ یہ تمام اضدادی اور غیر اضدادی صفات مل کر ایک وحدت ہو گئی ہیں۔ کچھ یہی شکل اس کی مخلوقات اور خصوصاً

---

(۱) ترجمہ: جو چیز انسانوں کو نفع پہنچاتی ہے اسی کو زمین میں بقا حاصل ہوتی ہے۔

انسان کی ہے۔ جس طرح انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی، اسی طرح اس کی زندگی میں جلوت بھی ضروری ہے اور خلوت بھی۔ اس کے لیے نہ تنہا جلوت ہی جلوت ہے اور نہ محض خلوت ہی خلوت۔ دونوں اپنے اپنے موقعے کے لیے ہیں اور دونوں کے لیے ایک دوسرے کا سہارا ہونا ضروری ہے۔

حضورؐ نے ایک میعاد تک حرا میں خلوت گزینی فرمائی لیکن کیا یہ محض خلوت برائے خلوت تھی؟ نہیں بلکہ یہ خلوت برائے جلوت تھی۔ جناب کلیم اللہ کو بھی چالیس دن طور سینا پر خلوت نشینی کا حکم ہوا تھا لیکن کیوں؟ کیا اس لیے کہ زندگی بھر کے لیے گوشہ نشین ہو جائیں؟ نہیں بلکہ اس لیے کہ اس خلوت میں جو کچھ عطا ہوا ہے اسے بنی اسرائیل کی انجمن میں اور قومی و ملکی جلوت میں لائیں۔ جلوتِ انجمن کا گرد و غبار خلوت میں صاف ہوتا ہے اور خلوت کا تصفیہ جلوتِ انجمن کے کام آتا ہے۔ عمر بھر کے لیے گوشے گیر ہو جانا اور اس کے ثمرات سے انجمن کو محروم رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی برتن کو صرف صیقل ہی کیا جاتا رہے مگر کبھی اس کا کوئی مصرف نہ لیا جائے۔ حضورؐ کی حرا نشینی محض انفرادی تزکیۂ نفس نہ تھی بلکہ:

در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید

خدا کا یہ آخری پیغمبر حرا نشین سادھو بن کر نہیں رہ گیا بلکہ:

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مس خام کو جس کے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

فراستِ خدیجہؓ

عرض یہ پہلا سندیس اور اولین وحی تھی جسے برداشت کر لینے کیلیے حضورؐ کا ظرف پہلے ہی قدرت نے تیار کر دیا تھا لیکن رسول پھر بھی ایک انسان ہوتا ہے۔ دل لرزنے لگا۔ اسی حالت میں گھر واپس تشریف لائے اور لیٹ گئے۔ جناب خدیجہؓ سے فرمایا: مجھے کپڑا اڑھادو۔ پھر فرمایا: مجھے اپنی جان کا خوف ہے۔ خدیجہؓ نے جواب دیا: خدا آپؐ کو غمگین اور بے بس نہ ہونے دے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں۔ دوسروں کا بار اٹھا لیتے ہیں۔ مہمان نواز ہیں اور تمام معاملات میں حق کا ساتھ دیتے ہیں۔"

لمحۂ فکریہ

یہاں جناب خدیجہؓ کے اس بیان کو بار بار پڑھیے۔ ہونے والے پیغمبر کی عمومی زندگی کا یہ ایک سمٹا ہوا نقشہ ہے جو جناب خدیجہؓ نے چند لفظوں میں کھینچا ہے یہی وہ اخلاقی قدریں ہیں جو آگے دنیوی و اخروی انفرادی و اجتماعی زندگی پر پوری وسعت کے ساتھ پھیل کر "اسلام" بنا ہے۔ اس حقیقت کو پھر سامنے لایئے کہ نبی کی زندگی کا رخ ابتدا

ہی سے منزلِ مقصود کی طرف ہوتا ہے۔ یہ وہ "معروف اقدار" ہیں جن کا احترام انسان ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ حضورؐ میں یہ قدریں اتنے کمال کے ساتھ جلوہ گر تھیں کہ محمدیؐ زندگی کی سب سے بڑی رازدار اس کی شہادت دے رہی ہے۔ جناب خدیجہؓ کی زبان سے قدرتی طور پر وہ اصول ظاہر ہو رہا ہے جسے قرآن نے "بقائے انفع" کہا ہے۔ اور آج کے اہل علم بقائے اصلح کہتے ہیں۔ اس رازدارِ جلوت و خلوت رفیقۂ حیات نے حضورؐ کی جتنی صفات بیان کی ہیں وہ نفع خلائق ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور انہی کو بنیاد بنا کر یہ حکم لگا رہی ہیں کہ خدا آپؐ کو ضائع نہ کرے گا۔

ورقہ بن نوفل کی شہادت

ذرا سکون طبع ہوا تو حضورؐ نے تمام واقعہ کہہ سنایا۔ جناب خدیجہؓ حضورؐ کو اپنے عم زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ یہ بزرگ ضعیف، کمزور چشم اور بوڑھے عیسائی تھے۔ آخری عمر بائیبل کے مطالعے میں اور اس کے عربی ترجمے میں گزرتی تھی۔ جناب خدیجہؓ کی فرمائش پر حضورؐ نے غار حرا میں پیش آنے والی تمام سرگزشت بیان فرمائی۔ ورقہ نے کہا: "یہ آنے والا وہی ناموسِ ربانی (جبریل) ہے جو موسیٰ پر اترا تھا۔ کاش میں اس وقت جوان ہوتا اور زندہ رہتا جب تمہاری قوم تمہیں شہر بدر کر دے گی تو اس وقت میں تمہاری ہر ممکن مدد کرتا۔" حضورؐ نے فرمایا: کیا مجھے میری قوم نکال دے گی؟ ورقہ نے کہا: ہاں یہ ناموس ربانی جس کے پاس آتا ہے۔ قوم اس کے ننگ و ناموس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔

لمحۂ فکریہ

تمام روایات و سیر حضورؐ اور ورقہ کے اس مکالمے پر متفق ہیں لیکن مجھے یہ ٹکڑا کھٹکتا رہتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جسے منصب نبوت سونپا جا رہا ہے وہ خود تو نہ سمجھ سکے کہ اس معاملے کی حقیقت کیا ہے اور بائبل کی ورق گردانی کرنے والا ورقہ فوراً سمجھ جائے کہ یہ جبریل ہے جو نبوت کا پیغام لایا ہے۔ یہ تو سمجھ میں آسکتا ہے کہ عبداللہ الخضر جناب موسیٰ کو بعض رازہائے قدرت سمجھا دیں اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حضورؐ کسی خواب کی تعبیر سیدنا ابوبکرؓ سے دریافت فرمالیں۔ لیکن یہ بات مشکل ہی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اصل منصب نبوت ہی سے حضورؐ لاعلم ہوں اور ورقہ فوراً سمجھ جائیں بلکہ ایمان بھی لے آئیں جیسا کہ ان کی بیان کردہ آرزو سے معلوم ہوتا ہے۔

حضورؐ کا یہ تعجب فرمانا کہ کیا قوم مجھے وطن سے خارج کر دے گی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ حضورؐ کو اپنی محبوبیت اور ہر دلعزیزی کا پورا اندازہ تھا۔ اور اس ہر دلعزیزی کے مقابلے میں نبوی پیغام سے پیدا ہونے والی دشمنیوں کا اندازہ کرنے میں تسامح کا امکان بھی موجود تھا کیونکہ ابھی سورۂ علق کی صرف پانچ آیتیں نازل ہوئی تھیں اس کے ساتھ ورقہ کا یہ کہنا بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ قوم آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کرے گی۔ بائبل کے مطالعے اور بہت سے انبیاءؑ کے حالات زندگی پڑھنے کے بعد اس نتیجے پر پہلے ہی پہنچ جانا ورقہ کے لیے دشوار نہ تھا۔ سوال صرف یہ ہے کہ نبی ہو جانے اور جبریل

سے وحی لا چکنے کے بعد بھی حضورؐ کو یہ علم نہ ہو کہ میں نبی ہوں اور ورقہ کو علم ہو جائے کہ یہ پیغامِ نبوّت ہے جو جبریل لائے ہیں، دل میں ایک کھٹک سی پیدا کرتا ہے۔ اس کھٹک کو دور کرنے کے لیے "اجتہادی مسائل" میں اس کی مفصل بحث دیکھیے۔ یہ صحیح نہیں کہ ورقہ کے بتانے سے حضورؐ کو علم ہوا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ کو پہلی وحی کے ساتھ ہی اپنے منصب و مقام کا علم ہو چکا تھا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا۔ مگر اب اس کی تبلیغ کے آغاز کا مرحلہ تھا جس کے لیے قدرت نے ورقہ کو ایک حسین ابتدائی کڑی بنا دیا۔ منصب نبوت کا علم ہونے کے بعد اب ضرورت تھی تصدیق نبوت کرنے والوں کی۔ حضورؐ جناب خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان فرما چکے تھے۔ وہ سوچ میں پڑی تھیں۔ جب ورقہ نے تصدیق کر دی تو خدیجہؓ کے سامنے بھی اصل حقیقت آئینے کی طرح سامنے آگئی اور انہیں اول المومنین ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔

یہ سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے ایمان لائیں لیکن نبوّت کی تصدیق اور جذبۂ نصرت کی آرزو تو سب سے پہلے ورقہ ہی نے کی تھی۔ ورقہ کی چند ہی دنوں بعد رحلت ہو گئی لیکن ان کے تصدیق کے شرفِ اولیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بعض روایات میں حضورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر ورقہ دوزخی ہوتے تو میں ان کو سفید لباس میں نہ دیکھتا۔ بلکہ حضرت عائشہؓ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ:
ورقہ کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ میں نے ان کیلیے ایک یا دو جنتیں دیکھی ہیں (رواہ البزار)
اگر یہ روایات صحیح ہیں تو ان کے اول مومن ہونے میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ عمل و ایثار کے امتحان کا شرف نہ پا سکے

کر سکے اور موت نے یہ مراحل آنے سے پہلے ہی انہیں جا لیا۔

ایمانِ خدیجہؓ

قیاس بھی یہی چاہتا ہے کہ سب سے پہلے جناب خدیجہؓ ہی ایمان لائی ہوں کیونکہ حضورؐ نے سب سے پہلے انہی سے سارا واقعہ بیان فرمایا تھا۔ اور ابھی تک ورقہ کے علاوہ کسی اور کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ جناب خدیجہؓ صرف عورتوں ہی میں سب سے پہلے ایمان نہ لائی تھیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ورقہ کو نظر انداز کر دیجیے تو سارے مرد و زن میں سب سے پہلی مومنہ ہیں۔

لمحۂ فکریہ

ذرا یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھیے کہ جناب خدیجہؓ حضورؐ کی رفیقۂ حیات ہیں۔ دن رات کا ساتھ ہے۔ زمانہ شناس ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز کا تجربہ رکھتی ہیں۔ تجارتی تجربات نے مردم شناسی کا جوہر بھی پیدا کر دیا ہے۔ ازدواجی زندگی کا یہ تیسرا تجربہ ہے۔ شوہر کی زندگی کا ایک ایک گوشہ ان کی نظروں کے سامنے ہے۔ عورت کی نگاہ سے شوہر کا کون سا عیب و ہنر پوشیدہ رہتا ہے؟ عورت پر کس کے تقدس کا جادو چل سکتا ہے؟ پھر عورت بھی خدیجہؓ جیسی زمانہ شناس عورت۔ اس کے سامنے شوہر کا اتنا بڑا عظیم الشان اور انقلابی دعوائے نبوت پیش ہوتا ہے جس کا اسے وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اگر وہ اس دعوائے کو رد کر دے یا خاموش ہی رہے تو اس کا بظاہر کچھ نہیں بگڑتا۔

کیونکہ وہ خود کفیل ہے اور وہ اس دعوے کو قبول کر لے تو زمین و آسمان کی دشمنی مول لینے کا خطرہ سامنے ہے۔ وہ ورقہ کی زبان سے سن چکی ہے کہ، تیری تمام ہر دلعزیزیاں اور محبوبیتیں نظر انداز کر دی جائیں گی، اور تیری قوم ہی تجھے بے وطن کر دے گی ــــ وہ اقرار نبوت کرنے میں اور کچھ نہیں تو کچھ مہلت لے سکتی تھی کہ ذرا اس کی عام مقبولیت و نامقبولیت کا اور اس کے تلخ و شیریں نتائج کا اندازہ کر لے۔ اور اعتراف رسالت کے خطرناک اقدام کو کچھ دیر تک کے لیے معرض التوا میں ڈال دے۔ مگر اس پچپن سالہ بوڑھی عورت کی جواں ہمتی اور پختہ ایمانی کو دیکھیے کہ مستقبل کے تمام نتائج سے بے نیاز ہو کر کسی وقفے کے بغیر سب سے پہلے تنہا ایمان لے آتی ہے۔ اور آگے چل کر نہ فقط اپنی ساری متاع اس مشن پر قربان کر دیتی ہے بلکہ سخت سے سخت امتحانات کے مواقع پر اس کے ایمان میں ادنےٰ سے ادنےٰ لغزش بھی پیدا نہیں ہوتی۔

یہ یقین و ایمان، یہ عزم و پختگی، یہ بے دھڑک اعتراف حق اور حضورؐ کی صداقت پر یہ اعتماد و ایقان جناب خدیجہؓ کے اندر کہاں سے اور کس بنیاد پر پیدا ہو گیا تھا؟ حضورؐ کے کردار میں بصیرت کے کسی گوشے میں اگر ادنیٰ سا خلل یا خلا بھی خدیجہؓ کو نظر آتا تو ایک بیوی کے لیے اپنے شوہر پر ایسا پختہ ایمان لے آنا ممکن نہ تھا۔ محمدؐ کے کردار اور اس کے اخلاقی اقدار کے ثبوت کے لیے صرف اتنی ہی دلیل کافی ہے کہ اس کی صداقت پر سب سے پہلے ایک عورت جو اس کی رازدار و واقف کار بیوی ہے ــــ ایمان لاتی ہے اور دہ

واپسیں تک اس کے اندر سخت سے سخت امتحان بھی لغزش نہیں پیدا کرتا۔

ایک سعید روح (ابوبکرؓ)

سیّدہ خدیجہؓ کے بعد جناب ابوبکر صدیقؓ ایمان لائے۔ یہ حضورؐ سے صرف اڑھائی سال چھوٹے ہیں۔ یہ بھی گویا حضورؐ کے ساتھ کے کھیلے ہیں۔ دن رات کا ساتھ رہا ہے۔ حضورؐ کے کردار کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ زیرکی و فراست کا یہ عالم ہے کہ ساری زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں ملتا جہاں قوتِ فیصلہ نے ٹھوکر کھائی ہو۔ جزرسی ایسی کہ جہاں دنیا کے عقلاسطح پہ ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں وہاں ان کا صاف ذہن لمحوں میں معاملات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے پھر معاملہ کوئی دنیوی کاربار کے نفع و نقصان کا نہیں، صرف ایک صداقت ہے جس پر ایمان لانے کا نتیجہ سر دھڑ کی بازی لگانا اور اپنی ساری متاعِ عزیز کو ایک "معاصر دوست" کے حوالے کر دینا ہے۔ قابلِ غور صرف ان کا ایمان لے آنا نہیں بلکہ بظاہر ایک خشک اور بے مزہ حقیقت کو اس طرح قبول کرنا ہے جس میں ایک منٹ کا بھی تامل، یا وقفہ نہیں۔ حضورؐ نے اسی ادا کا ذکر یوں فرمایا ہے کہ:

تب مجھے کوئی شخص بھی ایسا نہ ملا جس نے میرے پیغام کو قبول کرنے میں کچھ تامل نہ کیا ہو بجز ابوبکرؓ کے۔ (رواہ رزین عن ابی ہریرہ)

ایک بچپنے ۔۔ ۔۔ ساتھ رہنے والے معاصر رفیق کا فوراً بے تامل ایمان لے آنا اور دفعتہً اپنے اور اس کے درجے میں اُمتی و پیغمبر کا غیر معمولی تفاوت قبول کر لینا حضورؐ کی بلند کرداری و صداقت کی وہ پختہ دلیل ہے جو تنہا دوسرے بے شمار دلائل پر بھاری ہے ۔ پھر یہ رفاقت بھی ایسی غیر متزلزل ہے جس کا ہر قدم آگے سے آگے ہی بڑھتا چلا گیا ہے ۔ سچ کہا اقبالؔ نے :

ہمتِ او کشتِ ملّت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر

علی مرتضےٰ رضؓ

ان ہی اوّل اوّل ایمان لانے والوں میں ایک شیر نر بھی ہے جو ہے تو ابھی نو دس سال کی عمر کا لیکن پختہ فہمی، فراست اور حقیقت رسی میں بہتوں سے آگے ہے ۔ جسمانی طور پر مرحلۂ بلوغ نہ طے کیا ہو لیکن عقلِ بالغ کی پختگی رکھتا ہے ۔ اگر بچوں کی طرح اسے پھسلا لینا ممکن ہوتا تو باپ (ابو طالب) زیادہ آسانی سے پھسلا کر اپنی ملت میں رہنے پر آمادہ یا مجبور کر سکتا تھا ۔ لیکن یہ اپنے بچپنے میں بھی اسی طرح سمجھ بوجھ کر اپنے عم زاد بھائیؐ کی صداقت پر ایمان لاتا ہے جس طرح کوئی سن رسیدہ پختہ کار ایمان لا سکتا تھا ۔ یہ تو اپنی کم سنی میں اسلام قبول کرنے پر یوں فخر کرتا ہے کہ :

سبقتکمُ الی الاسلام طرّاً

غلاماً ما بلغت اوان حلمی

(میں نے تو اسلام قبول کرنے میں تم سب پر اس وقت شرف اولیت حاصل کیا ہے جب کہ میں کم سن تھا اور بالغ بھی نہ ہوا تھا)

یہ علی مرتضےٰؓ ہیں جو گویا حضورؐ کی گود میں پلے ہیں۔ عمزاد بھائی ہیں۔ اندر باہر ہر وقت ساتھ ہیں۔ حضورؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ اگر حضورؐ کی پاکیزہ زندگی اور اعلیٰ کرداری کا کوئی گوشہ بھی شک و شبہہ کی گنجائش پیدا کر سکتا تو انہیں کیا پڑی تھی جو ایک شفیق باپ کی ملت کو چھوڑ بیٹھتے اور ساری کائنات کو اپنا دشمن بنا لیتے؟ اگر طفلی کی ناپختہ کاری کی وجہ سے رسمی طور پر ایمان لائے ہوتے تو عقلی پختگی آ چکنے کے بعد انہیں اپنی راہ بدل لینے سے کون سی چیز روک سکتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ علی مرتضےٰؓ کا ایمان اس وقت بھی بڑے سے بڑے فرزانے کے ایمان کے برابر تھا اور یقیناً ان کا شمار بھی حضرت خدیجہؓ اور جناب ابوبکر صدیقؓ کی طرح اوّل المؤمنین ہی میں ہے۔ اور ان کا اسلام بھی حضورؐ کی صداقت و بلند کرداری کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

نگاہِ بازگشت

خدیجہؓ بیوی ہیں۔ ابوبکرؓ جنم کے ساتھی ہیں۔ علیؓ فردِ خاندان ہیں۔ یہ سب حضورؐ کے کردار و سیرت سے اور ایک ایک حرکت و سکون سے واقف ہیں۔ ذرہ برابر بھی حضورؐ کی صداقت میں شبہہ یا سیرت میں کمزوری

نظر آسکتی تو اتنا بڑا دعویٰ کرتے ہی ان کا دستِ جنون حضورؐ کے گریبان تک پہنچ جاتا۔ اور تکذیب سے کوئی چیز روک نہ سکتی تھی۔ حضورؐ تنہا ہوتے اور یہ تمام متحدہ قوتیں ایک طرف ہوتیں۔ لیکن نبوت کا یہ انوکھا اعجاز ہے کہ سب سے پہلے وہی حضرات ایمان لاتے ہیں جو سب سے زیادہ حضور سے قریب رہے ہیں اور جو سب سے زیادہ حضورؐ کے ایک ایک گوشۂ زندگی سے واقف ہیں۔ سچ ہے نیکی گھر سے شروع ہوتی ہے۔ ایمان لانے کا مطلب محض اقرار نہیں بلکہ اس سے ایک لمحے کے اندر اپنی پوزیشن بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ بیوی ہو یا دوست یا بھائی دفعتہً اپنے درجے کو گھٹا کر امتی بن جاتا ہے اور اسی وقت وہ پیغام لانے والے کو نبی مان کر کائنات کا بلند ترین درجہ دے دیتا ہے۔ اپنا آقا و مخدوم اور فرمانروا و مُطاع ہی نہیں بلکہ اپنی محبوب ترین متاع تسلیم کر کے اپنی ساری کائنات اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے حکم کو خدا کا حکم۔ اس کی رضا کو خدا کی رضا اور اس کی محبت کو خدا کی محبت سمجھنے لگتا ہے۔ اور اس کے اس یقین میں کسی وقت کمی نہیں آتی۔ کون معاصر ہے جو کسی صداقت کے بغیر اپنے درجے کو اتنا گھٹانے اور دوسرے کے مقام کو اتنا بلند تسلیم کر لینے کے لیے دفعتہً آمادہ ہو جائے۔ اور اپنی اسی پوزیشن پر فخر و ناز بھی کرے؟ اور وہ بھی کون؟ وہ جو ہر آن ساتھ رہ کر قریب ترین نگاہوں سے ایک ایک ادا کو دیکھتا رہا ہو اور عقل و فرزانگی کی وہ اعلیٰ کسوٹی رکھتا ہو جو دور ہی سے نیتوں اور ارادوں کو کس کر حقیقت کو بھانپ لے اور اسے یہ بھی علم ہو کہ اس کو قبول کرنا ساری کائنات کی دشمنی مول لینا ہے۔

زیدؓ بن حارثہؓ

ان ہی اوّل المومنین میں ایک "زبردستی کا غلام" بھی ہے۔ یہ اپنے والدین سے کہیں بچھڑ گیا تھا۔ دستورِ جاہلیت کے مطابق کسی نے اسے پکڑ کر جناب خدیجہؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور انہوں نے اسے حضورؐ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بی بی خدیجہؓ کے بعد سب سے زیادہ درونِ خانہ سے یہی واقف تھا۔ خدیجہؓ، ابوبکرؓ اور علیؓ پھر بھی صاحب اثر تھے لیکن یہ زیدؓ بن حارثہ غریب بے بس "غلام" تھے آقاؐ کے سوا کوئی خاندانی حمایت انہیں حاصل نہ تھی۔ آگے چل کر مشقِ ستم کی ساری اسکیموں کا آغاز انہی جیسے بے بسوں سے کیا گیا۔ زیدؓ ان شدید خطرات سے بے خبر نہ تھے۔ ان کا شمار بھی انہی اوّل المومنین میں ہے جو سمجھ بوجھ کر ایمان لائے تھے اور یہ صدقہ تھا اس نبوی کردار کا جس کے ایک ایک گوشے کو یہ شروع سے دیکھتے رہے تھے۔ ان پر نبوی سیرت کا جو اثر تھا اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کے مدت سے بچھڑے بھائی (جبلہ بن حارثہ) کو جب اس "یوسف گم گشتہ" کا پتہ چلا تو یہ انہیں لینے کے لیے آئے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ تمہارے ساتھ جائے تو میں اسے نہیں روکوں گا ——— ظاہر ہے کہ جبلہ کو دیکھ کر زیدؓ کا دل بھر آیا ہو گا۔ والدین، اقربا، احباب اور وطن کی یاد نے دل میں ہزار طرح کی گدگدیاں پیدا کی ہوں گی اور جبلہ نے ساتھ چلنے کی ہر ممکن تدبیر کی ہو گی۔ لیکن زیدؓ اس کے جواب میں سید سے حضورؐ

کے پاس حاضر ہوئے اور ایک ایسا جملہ کہا جس میں عشقِ مصطفےٰؐ کی ساری کائنات سمٹ کر آگئی ہے۔ زیدؓ نے عرض کیا، آؤ اختار علیك احداً؟ یا رسول اللہؐ کیا میں حضورؐ کو چھوڑ کر کسی اور کو پسند کر سکتا ہوں؟ اس کے بعد جبلہ کا بیان ہے کہ میں اپنے بھائی کے پاس کئی دن رہا اور اس عرصے میں مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ میری ترغیبِ واپسی غلط تھی اور میرے بھائی زیدؓ کا کہنا درست تھا۔ (رواہ الترمذی عن جبلہ بن حارثہ)۔

جبلہ نے چند دنوں میں جو کچھ محسوس کیا اسے زیدؓ شروع ہی سے چشمِ حقیقت بیں سے دیکھ چکے تھے اور ان کی یہی بصیرت تھی جس نے انہیں بھی اول المومنین ہونے کا شرف بخشا۔ یہ گھر اور باہر کے قریب ترین افراد تھے جو ایمان لائے اور زیدؓ بن حارثہ ان میں چوتھے تھے۔ ان تمام قریب ترین افراد کا اوّل المومنین ہونا ہی حضورؐ کی صداقت و بلندیِ کردار کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

اس کے بعد دنیا کا پانچواں مومنِ صادق وہ مردِ درویش اور مردِ قلندر ہے جسے ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں۔ اختصار کے ساتھ ان کے اسلام لانے کا واقعہ بھی سن لیجیے۔

ابوذر غفاریؓ کا اسلام

جناب ابوذر غفاریؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بیہقی، بخاری،

مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں مختصراً اور مطولاً موجود ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انہیں حضورؐ کے متعلق کچھ اڑتی ہوئی سی خبر اپنے ہی وطن میں مل گئی تھی۔ یہ فطرۃً شرک سے متنفر اور توحید سے قریب تر ہونے کے علاوہ درویش صفت، صاف گو اور اعلیٰ کردار کے حامل تھے۔ حضورؐ کے متعلق سُن گُن پاکر بے چین ہو گئے۔ پہلے اپنے بھائی انیس کو مکے بھیجا تاکہ صحیح معلومات حاصل کر کے لائیں۔ انیس نے واپس آکر بیان کیا کہ "حضورؐ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور وہ جو کلام سناتے ہیں وہ شعر و شاعری نہیں"۔ جناب ابوذرؓ کو اتنی بھر معلومات سے تسکین نہ ہوئی اور خود چل کھڑے ہوئے۔ مکے پہنچ کر کسی سے حضورؐ کے متعلق صرف اتنا ہی دریافت کیا تھا کہ: وہ شخص جسے لوگ صابی کہتے ہیں کہاں ہے؟ اتنا ہی دریافت کیا تھا کہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور جس کے ہاتھ جو کچھ آیا اس سے اس نے مارنا شروع کیا۔ یہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ ہوش آنے کے بعد چاہ زمزم پر گئے زخم دھوئے اور کعبے کے پردے کے پیچھے جاکر چھپ گئے۔ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ رہا تھا اور توکل و خودداری کمال درجے کی رکھتے تھے اس لیے ایک ماہ تک صرف آب زمزم پر ہی گزارا کرتے رہے جس نے نہ فقط ان کی بھوک ہی کو دبائے رکھا بلکہ اس سے ان کا عکنِ بطن بھی دور ہو گیا اور ان کے جسم میں فربہی بھی آگئی۔ ایک چاندنی رات میں یہیں حرم کعبہ میں حضورؐ اور جناب ابوبکرؓ سے ملاقات ہو گئی۔ یہیں وہ اسلام لائے اور جناب ابوبکرؓ ان کو اپنے گھر لے آئے جہاں انہوں نے پہلی بار کچھ کھایا اور یہ

طائف کے متقی تھے۔

یہ روایت مسند احمد کی ہے۔ بخاری کی روایت کے مطابق انہیں جناب علیؓ غریب الوطن سمجھ کر حرم سے اپنے ہاں پچکے سے لے آئے اور کئی دن کے بعد موقع دیکھ کر حضورؐ کے پاس لے گئے جہاں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہاں حضورؐ نے ان سے یہ بھی فرمایا کہ: بہتر ہے کہ تم اپنی قوم میں واپس چلے جاؤ اور وہاں اشاعت دین کرو۔ حضورؐ کا یہ ارشاد اس لیے تھا کہ لوگوں کو ان کے اسلام لانے کا حال نہ معلوم ہو اور ان کو ایذائیں نہ پہنچائی جائیں بلکہ یہ سلامتی کے ساتھ یہاں سے اپنے قبیلے میں پہنچ جائیں اور تبلیغ دین میں اپنے اثر سے کام لیں۔ زیرک ابو ذرؓ اس مصلحت نبوی کو بھانپ گیا۔ ایک طرف یہ مصلحت تھی، اور دوسری جانب ابو ذرؓ کا ایمانی جذبہ اندر سے ابل رہا تھا۔ چند سیکنڈ مصلحت کوشی اور جذبۂ ایمانی میں کشمکش ہوتی رہی۔ جناب ابو ذرؓ کی فراست نے سمجھ لیا کہ یہ حکم نبوی نہیں۔ ایک مشورہ ہے میری ہی بھلائی کے لیے۔ اور کیا عجب کہ یہ امتحان ہو میرے ایمان کا۔ آخر جذبۂ ایمانی غالب آ گیا اور جناب ابو ذرؓ بولے کہ: میں تو ان سب کے سامنے اپنے اسلام کو علی الاعلان ظاہر کر کے رہوں گا۔" یہ کہہ کر جناب ابو ذرؓ حرم میں آئے اور زور دار آواز سے کہا کہ اشهد ان لا الٰه الا الله و اشهد ان محمد رسول الله یہ سننا تھا کہ تمام لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور اتنا مارا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ اتنے میں عباس بن عبد المطلب نے دیکھ لیا تو انہیں بچانے کے لیے ابو ذرؓ پر اوندھے ہو گئے اور

چلائے کہ: بدبختو یہ قبیلۂ غفار کا آدمی ہے۔ تمہارے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے ہوئے غفار ہی کے راستے سے گزرتے ہیں۔ یہ کہا تو لوگ ہٹ گئے۔ دوسرے دن جناب ابوذرؓ نے پھر حرم میں جاکر اسی طرح کڑکتی ہوئی آواز میں کلمۂ شہادت ادا کیا اور لوگ پھر انہیں اسی طرح مارنے پیٹنے لگے۔ اس موقعے پر بھی عباس ہی نے بچایا اور اپنی پناہ میں لے لیا۔

اس کے بعد جب حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے وطن واپس ہوئے تو ان کے بھائی انیس اور ان کی والدہ رملہ بنت ربیعہ بھی ایمان لے آئیں۔ اور چند اور غفاری بھی مشرف باسلام ہو گئے۔ اس قبیلے کے سردار اس وقت خفاف بن ایمار بن رحضہ تھے۔ ایمان لانے کے بعد یہی نو مسلموں کی امامتِ نماز کا فرض ادا کرتے تھے۔

یہاں یہ نکتہ ذہن نشین کر لیجیے جس کی تشریح ہمیں شاید آگے کرنی پڑے گی کہ قریش کے لیڈروں کی مخالفت محض "دین" کی بنیاد پر نہ تھی۔ وہ بڑے دانا تھے اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس "نئے دین" کی وجہ سے ان کی آقائی، ان کا اقتدار، ان کی مرکزیت اور سب سے بڑھ کر ان کا معاشی سلسلہ خطرے میں پڑنے والا ہے۔ مگر ان باتوں کا ذکر وہ ضمناً کہہ دیا کرتے تھے۔ پیش پیش ہمیشہ دین آبا کی عظمت ہی کو رکھتے تھے کیونکہ عوام کو دین ہی کے نام پر بھڑکایا جا سکتا تھا۔ یہاں دیکھ لیجیے جوں ہی عباس نے تجارتی خطرے کا ذکر کیا ان کی "دینی مار پیٹ" ختم ہو گئی۔ اپنے معاشی مقصد کو پس پردہ رکھنا اور دینی خطرے کا نام لے کر عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرنا کوئی نیا طریق کار نہیں۔

جناب ابوذرؓ کی یہی قوتِ ایمانی اور یہی جذبۂ حق گوئی تھا جس نے رسولؐ کی زبان سے یہ کہلوایا کہ، یہ نیلگوں آسمان کسی ایسے انسان پر سایہ فگن نہیں ہوا اور نہ اس خاکدان ارض نے کسی ایسے انسان کو اپنی پشت پر اٹھایا جو ابوذرؓ سے زیادہ سچی زبان رکھتا ہو (ترمذی عن انس)

اوّلیتِ اسلام کی غیر ضروری بحث

یہاں اہل اسلام میں ایک غیر ضروری بحث یہ چھڑ جاتی ہے کہ ان چاروں میں سب سے پہلے کون ایمان لایا؟ جناب خدیجہؓ کی اولیتِ ایمان تو تقریباً سب کے نزدیک مسلم ہے لیکن ان کے بعد مذہبی جانبداری کا جذبہ رکھنے والوں میں ایک گروہ جناب ابوبکرؓ کو اول المومنین کہتا ہے اور دوسرا جناب علیؓ کو اول مومن قرار دیتا ہے۔ ابوحنیفہ کی طرف یہ تطبیق منسوب کی جاتی ہے کہ عورتوں میں سب سے پہلے خدیجہؓ ایمان لائیں۔ مردوں میں ابوبکرؓ۔ بچوں میں علیؓ اور غلاموں میں زیدؓ۔ یہ توجیہہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دو چار گھنٹے یا چند دن کی تقدیم و تاخیر میں کون سا فرق پڑ جاتا ہے؟ اس معمولی سے تقدم و تاخر کی کیا قدر و قیمت ہے؟ اس سے کسی کی سیرت کے کس پہلو پر اثر پڑتا ہے اور کس بات کے فیصلے کا اس پر دار و مدار ہے؟ اگر یہ ہوتا کہ جو ایک گھنٹہ یا ایک دن پہلے اسلام لائے وہ تو شدید امتحان میں پڑ جاتا ہے اور جو ایک ساعت یا ایک دن کی تاخیر سے مسلمان ہو تو اس کی کوئی آزمائش نہیں ہوتی۔ اگر واقعی

یہ بات ہوتی تو چند گھنٹوں کے تقدم و تاخر کو کوئی اہمیت بھی دیتے لیکن جب دونوں ایمان و عمل اور ثابت قدمی و ایثار کا یکساں ثبوت بہم پہنچاتے ہیں تو یہ چند ساعت کا فرق کون سی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے؟

اصلی فرق

اگر کوئی واقعی فرق تقدم و تاخر کا ہے تو یہ وہی فرق ہے جو قرآنِ کریم نے قائم کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ فتحِ مکّہ سے پہلے اور اس کے بعد مالی و جانی جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ جزائے حسن کا دونوں ہی سے وعدہ ہے۔ سورۂ حدید کی دسویں آیت میں ہے۔

لَا یَسْتَوِی مِنْکُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ
دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا ط وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الْحُسْنٰی

یہ فرق تو باقی رہے گا اور رہنا بھی چاہیے۔ یہ فیصلۂ قرآنی عین عدل و عقل کے مطابق ہے اور یہ فرق اکیس سال آگے پیچھے کا فرق ہے۔ لیکن آغاز نبوّت میں ایک دو گھنٹوں یا ایک دو دنوں کا فرق کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ اسے اچھالنا اور اس پر کسی خاص استحقاق کی عمارت کھڑی کر شاعری سے زیادہ نہیں۔

اوّل المومنین کا مطلب

ہمارے نزدیک اوّل المومنین کا یہ مطلب ہی نہیں کہ جو دس بجے ایمان لائے وہ اوّل المومنین ہے اور جو گیارہ بجے مومن ہو وہ "آخر المومنین" ہے۔ اوّلیت کا اصلی فیصلہ وہ وقفہ کرتا ہے جو پیغامِ نبوت پہنچ چکنے کے

بعد اسلام و کفر کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ ایک شخص آج صبح پیغام سنتا ہے اور آج ہی شام کو ایمان لے آتا ہے اور دوسرا ایک ہفتے کے بعد پیغام سنتا ہے اور اسی وقت ایمان لے آتا ہے تو بہ ظاہر زمانی لحاظ سے پہلا شخص اول المومنین نظر آئے گا لیکن درحقیقت اول المومنین دوسرا شخص ہے کیونکہ پہلے شخص کے کفر و اسلام میں چند گھنٹوں کا وقفہ حائل ہے اور دوسرے شخص نے اپنے کفر و اسلام میں کسی توقف کو حائل ہونے کا موقع نہ دیا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضورؐ نے یوں فرمایا کہ: میں نے جس پر بھی اسلام پیش کیا اسے کچھ نہ کچھ ہچکچاہٹ پیدا ہوئی لیکن ابوبکرؓ نے کوئی توقف نہ کیا۔

یہ عدم توقف بڑی چیز ہے لیکن اس سے اوروں کے اول المومنین ہونے پر کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں پڑتا۔ قرآن پاک نے اس ناقابلِ اعتنا فرق کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ وہ ان تمام لوگوں کو ایک ہی گروپ میں شمار کرتا ہے جو تھوڑے بہت دنوں کے فرق سے آگے پیچھے ایمان لائے۔ ارشاد قرآنی یہ ہے کہ: وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ.... ۹ : ۱۰۰

قرآن نے کسی ایک دو فرد کی بجائے پورے گروپ ہی کو سابقون اولون قرار دیا ہے۔ اس لیے ان چاروں ــــ خدیجہؓ، ابوبکرؓ، علیؓ اور زیدؓ ــــ میں ہر فرد ہی اول المومنین ہے بلکہ دوسرے ابتدائی مسلمان بھی مل کر سابقون اولون کا ایک گروپ بنتے ہیں۔

مبلّغِ اوّل کی مساعی

ان تمام ایمان لانے والوں میں صرف جناب ابوبکرؓ ہی تھے جنہوں نے تبلیغ حق کا فریضہ ادا کیا اور اس کے اہل بھی وہی تھے۔ جنابِ خدیجہؓ عورت تھیں۔ جناب علیؓ کمسن تھے اور جناب زیدؓ کا اثر وسعت نہ رکھتا تھا۔ لیکن جناب ابوبکرؓ میں اس وقت وہ تمام عوامل موجود تھے جو تبلیغ کے لیے ضروری ہیں۔ یہ بڑے حسن وخوبی کے ساتھ خاموش تبلیغ کرتے رہے۔ اور چُن چُن کر سعید روحوں کو دین حق کی طرف کھینچنا شروع کیا۔

عشرۂ مبشرہ کی پانچ اور شخصیتیں

حضرت ابوبکرؓ ہی کی تبلیغ سے متاثر ہو کر پانچ وہ اشخاص ایمان لائے جن کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہے۔ یہ ہیں حضرات عثمانؓ ذی النورین، زبیرؓ بن عوام، طلحہؓ، عبدالرحمنؓ بن عوف اور سعدؓ بن ابی وقاص۔

دوسری سعید روحیں

ان کے بعد ابوعبیدہؓ بن الجراح۔ عمارؓ بن یاسر اور خود یاسرؓ۔ خبابؓ بن الارت۔ عبدالاسدؓ بن ہلال۔ عثمانؓ بن مظعون۔ سائبؓ بن عثمان بن مظعون۔ عامرؓ بن فہیرہ ازدی۔ ابوحذیفہؓ بن عتبہ۔ ارقمؓ بن ابی ارقم بلال حبشیؓ۔ عمروؓ بن عنبسہ خالدؓ بن سعد بن عاص۔ سعیدؓ بن زید۔ عبداللہؓ بن

مسعود۔ صہیب رومیؓ۔ وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین۔ قدرے تقدیم وتاخیر سے ایمان لائے۔

خوش نصیب عورتیں

یہ تبلیغ مردوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ عورتوں میں جو سعید روحیں تھیں انھوں نے بھی لبیک کر نعمت اسلام کو اسی یقین وعزم کے ساتھ قبول کر لیا۔ ان میں یاسرؓ کی بیوی اور عمارؓ کی والدہ جناب سُمیہؓ تھیں۔ عباسؓ بن عبدالمطلب کی بیوی اور حضورؐ کی چچی ام الفضلؓ تھیں۔ ابوبکر صدیقؓ کی بیوی اسماءؓ بنت عمیس اور آپؓ کی صاحبزادی اسماءؓ بنت ابی بکر تھیں۔ جناب عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب تھیں۔ ام الفضلؓ کا اپنے شوہر سے پہلے اور فاطمہؓ کا اپنے بھائی سے پہلے اسلام قبول کر لینا یقیناً وہ شرف ہے جو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد و غلام

ان سارے ایمان لانے والوں میں وہ لوگ بھی ہیں جو آزاد ہیں اور کبھی قیدی یا غلام نہ ہوئے اور ان ہی میں وہ افراد بھی ہیں جو اصطلاحی غلام تھے۔ کسی کو لاوارث سمجھ کر پکڑ لیا گیا اور کسی کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔ کسی کمزور قبیلے یا جماعت پر بلاوجہ حملہ کر دیا گیا اور ان کے بقیۃ السیف افراد کو اسیر کر کے کہیں بیچ ڈالا گیا۔ انہی کو غلام یا عبد کہا جاتا تھا۔ دنیا کے

ہر گوشے میں یہ بے بس طبقہ موجود تھا۔ ان کے ساتھ جو ظالمانہ برتاؤ ہوا کرتے تھے ان کے تصوّر سے بھی انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ حد یہ ہے کہ اس مظلوم طبقے کی ذہنیت بھی اتنی گر چکی تھی کہ یہ اپنی اپنی مظلومیت کو قضائے مبرم سمجھے بیٹھا تھا۔ اور بلند نظری کا کوئی تصور بھی اس کے اندر نہ آسکتا تھا۔ آزادوں کے اندر انقلابی قسم کا استحکام پیدا ہو جائے تو زیادہ تعجب نہیں لیکن پیغامِ نبوت نے اس گرے ہوئے بے بس، بے یارومددگار، مجبور و مقہور طبقے میں بلند خیالی، پختہ کرداری اور استقامت کی جو روح پھونکی اس سے زیادہ کوئی محیر العقول اعجاز تصور میں آنا مشکل ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جور و ستم کے جو پہاڑ آزادوں کے سر پر توڑے گئے اس سے زیادہ ہی ان غلاموں کے ساتھ کیا گیا۔ توقع بھی اسی کی ہو سکتی تھی اس لیے کہ آزادوں کے خاندان، قبیلے اور حمایتی بھی تھے اور یہ کچھ نہ کچھ پشتینی اثرات کے بھی مالک تھے لیکن غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے حمایتی اور آقا خود بھی ان پر مشق ستم کرتے تھے اور دوسرے بھی۔ لیکن جو چیز انتہائی طور پر کسی کو حیرت میں ڈال سکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ قبولِ حق کے بعد صبر و استقامت میں آزادوں سے ایک قدم بھی پیچھے نہ رہے۔[1]

---

(۱) ان حقائق کے تفصیلی مطالعے کے لیے طٰہٰ حسین مصری کی الوعد الحق پڑھیے جس میں بڑے دلچسپ انداز میں غلاموں کی ابتلا و استقامت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کا شگفتہ اور رواں ترجمہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے شائع ہو گیا ہے جس کا نام ہے "زیردستوں کی آقائی"۔

اندازِ تبلیغ

خود حضورؐ اور دوسرے اہلِ اسلام کی تبلیغ حق کا جو انداز تھا اس میں دو چیزیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک خفا و پوشیدگی اور دوسری قریب تر سے آغاز۔

اخفائے حال

سارے سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ تبلیغ دین تین سال تک خفیہ خفیہ ہوتی رہی۔ جس کا مرکز دار ارقمؓ بن ابی ارقم تھا۔ اہلِ اسلام اپنی نمازیں بھی پہاڑی گھاٹیوں میں یا دوسرے پوشیدہ مقامات میں ادا کرتے تھے۔ خفیہ تبلیغ کے متعلق یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ انداز اہل کفر کے خوف یا اہل اسلام کی بزدلی پر مبنی تھا؟ شجاعت و مردانگی اور حق پرستی کا تو یہ تقاضا ہونا چاہیے تھا کہ اوّل روز ہی سے اعلانِ حق کر دیا جاتا اور کسی طاقت سے کوئی خوف نہ ہوتا خواہ نتیجہ کچھ بھی ہوتا۔

ظاہراً تو صورت حال ایسی ہی نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اندازِ خفا مبنی بر خوف نہ تھا بلکہ تقاضائے حکمت تھا۔ زندگی میں بے شمار مراحل ایسے آتے ہیں جب دو قدروں کا باہم ٹکراؤ ہو جاتا ہے اور وہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ کسی ایک کو مقدم اور دوسرے کو مؤخر کرنا پڑتا ہے اور اسی تقدیم و تاخیر میں انسانی عقل و فراست

امتحان میں پڑ جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں محض خیر و شر ہی کی کشمکش نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات دو خیروں یا دو شروں کی کشمکش بھی اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ کسی ایک ہی کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت خیر کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دو شروں میں کمتر کو اور دو خیروں میں انفع کو اختیار کر لیا جائے۔ حضورؐ کی بصیرت نے ان دو خیروں —— جرأتمندانہ اعلان اور حکیمانہ پوشیدگی —— میں انفع و اصلح کو اختیار فرمایا۔ اظہارِ شجاعت کا موقع ہر وقت نہیں ہوتا۔ اگر اس کا بے موقع استعمال ہو تو یہ مردانگی "تہوّر" بن جاتی ہے۔ شجاعت و تہوّر میں وہی فرق ہے جو رحم اور بزدلی میں، سخاوت اور اسراف میں یا کفایت شعاری اور بُخل میں ہے۔

ان تمام باتوں سے قطع نظر خوفِ اعدا یا بزدلی کا شبہ تو اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب بعد کے لرزہ خیز جور و ستم شروع ہونے کے بعد کوئی فرد اپنا قدم پیچھے ہٹا لیتا یا کسی مرحلۂ امتحان پر اقرار حق سے باز آجاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان ایمان لانے والوں میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں جس نے انتہائی اذیت و ظلم کے باوجود اعلانِ حق اور اظہارِ ایمان میں کبھی ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ یا تقیہ سازی سے کام لیا ہو۔ اگر آغاز میں اخفائے ایمان بر بنائے بزدلی ہوتا تو یہ کم ہمتی اس وقت بھی ظاہر ہو کر رہتی جب ظالم منکروں کو خود بخود علم ہو گیا اور انہوں نے ان سب "نومسلموں" کے ساتھ شدید ترین انتقامی کارروائی شروع کر دی۔ لیکن ہم تو یہ دیکھتے ہیں ان بے بسوں پر جتنے زیادہ مظالم کیے گئے اسی قدر ان کی جرأتِ ایمانی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اگر آغاز

بزدلی و کم ہمتی سے ہو تو انجام میں یہ شجاعت و مردانگی کہاں سے آسکتی ہے جس کا تصور بھی بڑے بڑے بہادروں کو لرزہ براندام کر دے؟

قریب تر سے آغاز

اندازِ تبلیغ کا دوسرا پہلو یہ تھا آغاز اپنے قریب ترین فرد سے ہو۔ قریب تر ہستی خود انسان کی ذات ہے۔ اس کے بعد اپنے گھر والے ہیں۔ پھر دوسرے افراد خاندان یا قریب ترین دوست احباب پھر محلہ۔ پھر بستی۔ پھر آگے بعید، بعید تر، بعید ترین۔ فطری اور حکیمانہ انداز یہی ہے اور اسی کے مطابق خود حضورؐ اور دوسرے ایمان لانے والے عمل کرتے رہے۔ حضورؐ کو نبوّت کے چند ہی دنوں بعد یہ حکم دیا گیا کہ:

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ ۷۴ : ۱ تا ۷	اے گلیم پوش! اٹھ اور وارننگ دے اور اپنے رب کی کبریائی کا اعتراف کر اور اپنے کپڑوں کو پاک کر اور پلیدی سے کنارہ کش رہ اور کثرت حاصل کرنے کے لیے احسان نہ جتا اور اپنے رب کی خوشنودی کے لیے استقامت اختیار کر۔

ان آیات کا ایک ایک جملہ تزکیۂ نفس کے اتھاہ سمندروں کو اپنے کوزے میں بند کیے ہوئے ہے۔ تکمیل ذات اور اصلاح نفس کے تمام ضروری عناصر ان آیات میں موجود ہیں۔ جو شخص بھی اپنا

تزکیہ چاہے گا اسے انہی مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص ان احکام کا خود پیکرِ عمل نہ ہو تو وہ نہ تو خود ہی مزکّٰی ہو سکتا ہے نہ دوسروں کے لیے مزکّی ہو سکتا ہے۔ کسی حقیقت کا صحیح مبلّغ وہی ہو سکتا ہے جس کی رگ رگ میں وہ حقیقت خود بھی رچی ہوئی ہو۔ دوسروں کی نوبت اپنی ذات کے بعد آتی ہے۔ تبلیغ کے لیے وہ تحریک دروں چاہیے جو اپنے اندر آگ کی طرح ہر آن سلگ رہی ہو۔ وہ دھن اور وہ لگن درکار ہے جو چین سے نہ بیٹھنے دے۔ وہ عشق مطلوب ہے جو جنون کی طرح ہر وقت سر پر سوار ہو۔ یہی وہ شعلہ ہے جو دوسروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

ایک مثال

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ ایک تالاب کے وسط میں ایک ڈھیلا پھینکیے تو پانی اچھل کر ایک چھوٹا سا دائرۂ آب بنا دے گا اور یہ دائرہ آہستہ آہستہ پھیلتا جائے گا اور آخر تالاب کے آخری کناروں تک پہنچ جائے گا۔ یہی صورت تبلیغ کی بھی ہے۔

حضورؐ کا کردار قبل از نبوّت بھی پیغمبرانہ انداز کا تھا، اور تزکیۂ نفس کا میلان پہلے سے موجود تھا جو کھینچ کر غارِ حرا میں لے جاتا رہا۔ اب وحی نے تزکیے کا وہ پروگرام بھی دے دیا جو مندرجۂ بالا آیات میں مذکور ہے۔ اپنی ذات کے بعد ہی دائرہ فطری انداز سے پھیلتا رہا۔ اور الاقرب فالاقرب کو سمیٹتا رہا۔ حضورؐ کی اپنی ذاتِ بابرکات کے بعد قریب تر ذہنی ہم آہنگی رکھنے والے

کھنچے چلے گئے۔ حضورؐ کو قانونِ فطرت کے مطابق اپنی ذات کے بعد توسیع دین کے لیے وحی الٰہی نے یہ پروگرام دیا:

(۱) وانذر عشیرتک الاقربین ۲۶ : ۲۱۴	اپنے خاندان کے قریب ترین افراد کو آنے والے نتائج عمل کی وارننگ دو۔
(۲) ..... لتنذر ام القریٰ ومن حولھا۔ ۶ : ۹۲	مکّے اور پھر اطراف مکّہ میں اس وارننگ کو پھیلا۔
(۳) ..... لانذرکم بہٖ ومن بلغ ۶ : ۱۹	میں تم سب کے علاوہ ہر اس شخص کے لیے نذیر ہوں جس تک میرا پیغام پہنچ سکے

یا یوں کہیے کہ:

(۴) .... کافۃ للنّاس بشیرًا و نذیرًا۔	سارے موجود و آئندہ انسانوں کے لیے بشیر و نذیر۔

یہی فطری پروگرام تھا اور اسی کے مطابق اپنے اپنے موقعے سے یہ احکام نازل ہوتے رہے۔ اور اسی پروگرام کے مطابق حضورؐ بھی تبلیغ فرماتے رہے اور دوسرے مسلمان بھی۔

ایک تشنگی

یہ تو مسلّم ہے کہ حضور اکرمؐ اور دوسرے صحابہ مبلّغین جس کے سامنے بھی اسلام پیش کرتے تھے وہ مخاطب کی ذہنی سطح کے مطابق ہی گفتگو کرتے تھے۔ کوئی ایچ پیچ یا منطقی موشگافیاں نہ

ہوتی تھیں۔ بات دو ٹوک ہوتی تھی اور حشو و زوائد سے پاک، اس کے ساتھ مبلغ کا اپنا کردار اور بدلی ہوئی سیرت ہوتی تھی جس کا اثر ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ اخلاص، بے لوثی اور اقدارِ عالیہ سے وابستگی اس کے علاوہ تھی[1]۔

دل چاہتا ہے کہ کاش ایک ایک ایمان لانے والے کی داستان سامنے ہوتی جس سے یہ معلوم ہوتا کہ آغاز گفتگو کس طرح ہوا؟ اس نے کیا کیا شبہات پیش کیے اور کس جواب سے اسے تسکین ہوئی؟ مبلغ کے کس جملے نے اس پر کیا اثر کیا اور کس بات نے اس کے دل کو پھیر دیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ دل چاہتا ہے کہ یہ تمام تفصیلات سامنے ہوتیں۔ بہت جگہ کچھ تفصیلات ملتی ہیں اور بہت سے مقامات تشنہ ہیں۔ بعض جگہ تبلیغ کی حکیمانہ تفصیلات کی بجائے معجزاتی رنگ زیادہ غالب ہو گیا ہے حالانکہ معجزے کے زور سے کسی کو مسلمان کرنا حضورؐ کی عام روش کے مطابق نہیں۔ معجزے کے وجود سے انکار نہیں لیکن حضورؐ کی اصلی دعوت عقل و حکمت کی دعوت تھی، صدق و صفا کی دعوت تھی اور جذبات کے ان پہلوؤں کی دعوت تھی جو عقل و فہم سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔

بہرحال ہم صرف انہی تبلیغی تفصیلات کو یا کسی کے اسلام لانے کی کیفیات کو بیان کریں گے جو عام طور پر سیرت نگار لکھا کرتے ہیں۔

---

(۱) قرآن نے تخاطب کا انداز یہ بتایا ہے کہ ...... وقل لهم في انفسهم قولاً بليغا ان سب سے ایسی بات کرو جو دل میں اتر جائے۔

پیکرِ صدق وصفا کوہِ صفا پر

تین سال اسی طرح خفیہ تبلیغ حکیمانہ انداز سے ہوتی رہی۔ اس کے بعد وحی الٰہی نے حکم دیا کہ :

وانذر عشیرتک الاقربین۔ — اپنے قریبی خاندان والوں کو وارننگ دو۔

حضورؐ ایک دن کوہِ صفا پر چڑھ گئے اور قریش کے کئی قبائل کو نام لے لے کر پکارنا شروع کیا۔ اس طرح اوپر چڑھ کر آواز دینا اس وقت کے دستور کے مطابق کسی اہم مقصد کے لیے ہوا کرتا تھا۔ پکار سُن کر سب لوگ جمع ہو گئے اور جو نہ آسکا اس نے دریافت حال کے لیے رواج کے مطابق اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ اب پوزیشن یہ ہے کہ حضورؐ ٹیلے کے اوپر کھڑے ہیں جہاں سے ٹیلے کے اِس طرف دیکھ رہے ہیں اور اُس طرف بھی۔ لیکن جو لوگ جمع ہوئے ہیں وہ نیچے ایک طرف دامن کوہ میں کھڑے ہیں اور وہ سب کے سب صرف ایک ہی جانب دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں ٹیلے کے اس پار کی کوئی شے نظر نہیں آسکتی کیونکہ بیچ میں ٹیلا حائل ہے۔ اگر یہ لوگ اس طرف کی کوئی بات معلوم کرنا چاہیں تو اس کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ جو اوپر کھڑا ہر طرف دیکھ رہا ہے وہی انہیں کچھ بتائے۔ اس پوزیشن کو سامنے رکھیے۔ اس کے بعد دیکھیے حضورؐ کیا فرماتے ہیں۔ حضورؐ نے ان تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا :

"اگر میں تم سے یہ کہوں کہ شہ سواروں کا ایک دستہ ٹیلے
کے اس طرف سے (جو تمہیں نظر نہیں آرہا ہے اور
میں دیکھ رہا ہوں) تم پر حملہ آور ہونے والا ہے، تو کیا تم
مجھے سچا سمجھو گے؟"

تمام سننے والوں نے یک زبان ہو کر اس سوال کا جواب دیا کہ:

"آج تک تو ہم سب کا تجربہ یہ ہے کہ آپؐ ہمیشہ سچ
ہی بولتے رہے ہیں۔"

یوں تو اب تک سارے دوست دشمن حضورؐ کو صادق و امین ہی کہتے رہے لیکن آج کا یہ سوال و جواب ایک ایسا عجیب واقعہ ہے جو تاریخ عالم کے سینے پر ہمیشہ ابھرے ہوئے اور کبھی نہ مٹنے والے زریں حروف میں جگمگاتا رہے گا۔ آج ان سب نے صرف یہی نہیں کیا کہ حضورؐ کی صداقت و راستبازی کا غیر مشکوک اعتراف کر لیا بلکہ منکرین نے اپنے لبوں پر بھی اپنے ہاتھوں سے مہر ثبت کر دی۔ اپنی صداقت کا یہ اعتراف کرا لینے کے بعد حضورؐ نے دو ٹوک بات یوں فرمائی کہ:

"اچھا تو سن لو کہ میں (بحکم خداوندی) ایک آنے والے
سخت عذاب کی وارننگ دیتا ہوں۔"

اس وارننگ کو سننے کے بعد منکر اس وقت تک منکر ہی رہے گویا وہ ابھی جسے سچا کہہ رہے تھے اسے جھوٹا سمجھنے لگے۔ یہ درحقیقت ان کے اپنے پہلے قول یا اعتراف کی تکذیب تھی جو انہی پر لوٹتی ہے۔ ابھی سچا کہا اور ابھی اپنے قول کی تردید بھی کر دی۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ

یا تو وہ پہلے جھوٹ کہہ رہے تھے یا اب کہہ رہے ہیں۔
ان تمام منکروں کی نمائندگی کرتے ہوئے حضورؐ کو مخاطب کر کے

ابولہب بولا:

"تیرا سارا دن بربادی میں گزرے۔ کیا تو نے اتنی سی بات (وہ بھی غلط بات) کے لیے یہاں ہم سب کو بلا کر اکٹھا کیا تھا؟"

ابولہب کے الفاظ یہ تھے۔ تبّاً لک سائر الیوم الھذا اجمعتنا؟
اس کے یہ گستاخانہ الفاظ خدا کو بھی پسند نہ آئے اس نے وحی بھیجی کہ:

تبت یدا ابی لھب وتب ٥ ما اغنی عنه ماله وما کسب ٥ سیصلی نارا ذات لھب ٥ وامرأته حمالة الحطب ٥ فی جیدھا حبل من مسد ٥

(پ ۳۰)

ابولہب ہی کے ہاتھ (اقتدار) برباد ہو گیا۔ اس کی دولت اور اس کی کمائی اس کے کوئی کام نہ آئی۔ وہ جلد شعلے والی آگ میں جا گرے گا اور ساتھ ہی اس کی بیوی بھی۔ جو ایندھن کا بوجھ اٹھائے ہو گی اور اس کی گردن میں مونجھ کی رسّی ہو گی۔

لمحۂ فکریہ

ان آیات کی تفسیر اس وقت مقصود نہیں لیکن یہ قابلِ غور بات ہے کہ ابولہب حضورؐ کا سگا چچا ہے۔ مالدار ہے۔ صاحبِ اقتدار ہے۔ اس کی بیوی حمنہ ابوسفیان کی بہن ہے۔ اور تکذیبِ رسالت میں اپنے شوہر سے پوری ذہنی ہم آہنگی رکھتی ہے۔ زبانِ وحی دو باتوں کو صراحتہً

بتا رہی ہے۔ ایک یہ کہ یہ دونوں دولتِ ایمان سے محروم رہیں گے۔ اور دوسرے یہ کہ ان دونوں کی ثروت و شوکت ختم ہو جائے گی۔ آنے والے وقت نے بتا دیا کہ یہ پیش گوئی اپنی ظاہری صورت میں بھی حرف بہ حرف پوری ہو کر رہی۔ بعد میں ابولہب جیسے بے شمار کٹر منکر ایمان لے آئے ہیں۔ آج یہ کس طرح اعلان کر دیا گیا کہ یہ دونوں ایمان سے محروم ہی رہیں گے؟ ان کی ساری دولت دھری کی دھری رہ جائے گی اور ان کا سارا اقتدار فنا ہو جائے گا؟ کیا یہ وہی نبوی نگاہ نہیں جو وحی الٰہی کی دوربین سے زمان و مکان کی حدود کو چیر کر حقیقت کو دیکھتی ہے؟ یہی تو وہ مقامِ نبوّت ہے جس کی عملی تمثیل حضورؐ ٹیلے پر کھڑے ہو کر پیش فرما رہے ہیں۔

مقامِ نبوّت کی عجیب تمثیل

کوہِ صفا کی بلندی پر کھڑے ہو کر حضورؐ نے مقامِ نبوّت کی جو تمثیل دی ہے اس سے بہتر مثال ممکن ہی نہیں۔ اس تمثیل میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ خدا کا فرستادہ پیغمبر ایک ایسے بلند مقام پر کھڑا ہوتا ہے جہاں سے اس کی حدود نا آشنا نگاہیں غیب و شہود کو، دنیا و آخرت کو معاشرۂ انسانی کے حال و مستقبل کو یکساں دیکھتی ہیں۔ اس کا تعلق خلق اور خالق سے یکساں ہوتا ہے۔ اُدھر سے لیتا ہے اور اِدھر پہنچاتا ہے۔ ہر اقدام کے وقت اس کی نظریں زندگی کے ہر پہلو پر اور تمام اقدارِ حیات پر یکساں جمی رہتی ہیں۔ ایک طرف کے دامن کوہ میں کھڑے ہونے والوں کی نگاہیں ایک ہی طرف دیکھ سکتی ہیں لیکن پہاڑی کی بلندی

پر کھڑا ہونے والا پہاڑ کی دونوں سمتوں کو بلکہ ہر چہار جانب دیکھتا ہے۔
یہی وہ فرق ہے نبی اور غیر نبی میں جس کی وضاحت حضورؐ نے ایک سہل الفہم عملی تمثیل سے فرمائی ہے کہ دیکھو ٹیلے کی دوسری جانب تم نہیں دیکھ سکتے اور میں دیکھ رہا ہوں۔ اور اُس پار کی کسی خبر کی تصدیق تم اسی وقت کر سکتے ہو جب مجھے سچا سمجھ کر میری باتوں پر یقین کرو۔ ٹھیک اسی طرح زندگی کی معمولی حیوانی ضرورتوں پر تو تمہاری نگاہ پہنچ جاتی ہے لیکن ان اقدارِ انسانی پر تمہاری نظریں نہیں جاتیں جن کا تعلق زندگی کے انجام (آخرت) سے ہے۔ تمہاری نگاہ صرف مخلوقات پر جاتی ہے۔ خالق پر نہیں پڑتی۔ تم انسانی دماغ پر ہی اپنی زندگی کا دارومدار رکھتے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ صحیح ہدایت نامۂ زندگی خدا کی طرف سے بذریعۂ پیغمبر ہی مل سکتا ہے تمہاری نظریں زندگی کے صرف ایک ناقص پہلو پر ہیں اور میں زندگی کے دونوں سروں کو اسی طرح یکساں دیکھ رہا ہوں جس طرح اس وقت ٹیلے کے بلند مقام سے دونوں بلکہ چاروں طرف نظر دوڑ رہی ہے۔ تمہارے سامنے صرف عالمِ شہود ہے اور وہ بھی ناقص مگر میری نگاہِ رسالت عالمِ غیب پر بھی اسی طرح ہے جس طرح عالمِ شہود پر۔ اس عالمِ غیب (وحی) کی باتوں کی تصدیق اسی وقت ممکن ہے جب مجھے سچا جان کر ایمان لے آؤ۔ نبی کے واسطے کے بغیر محض عقل و فراست عالمِ غیب کی کوئی کوڑی نہیں لا سکتی۔

یہ ہیں وہ حقائق جو حضورؐ نے چند لفظوں میں ایک عملی تمثیل دے کر لوگوں کو سمجھائے ہیں اور ایک نبی کے متعلق عالمِ غیب پر نظر رکھنے کا ایک زندہ ثبوت بھی وہیں مل گیا کہ ابولہب کی گستاخی کے جواب میں

وحی پیغمبری اس کا اور اس کی بیوی کا وہ کچھ انجام بتا دیتی ہے جس کا اس وقت کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا مگر وہ حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ابھی نبوت کا تیسرا سال ہے۔ گنتی کے چند اشخاص ایمان لائے ہیں۔ مسلمان نہایت کمزور حالت میں ہیں۔ لیکن "وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ" کا حکم نازل ہوتے ہی کیسی بے دھڑک جرأت مندی کے ساتھ حضورؐ نے علی الاعلان اپنا پیغام پہنچا دیا۔ اور صرف پیغام ہی نہ پہنچایا بلکہ ایک مالدار و صاحبِ اقتدار متکبر (ابولہب) کو اس کا انجام بھی بے تامل سنا کر اس رابطے کی زندہ شہادت پیش فرما دی جو پیغمبر اور خدا کے درمیان ہوتا ہے۔

زبانِ رسالت سے نکلی ہوئی اس وحی منزل نے آج ایک دنیا کو ایک بڑی اہم قدر بھی عطا کی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر کا رشتے دار ہونا کوئی کام نہ آئے گا:

فَلَآ أَنسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلَا يَتَسَآءَلُونَ - ۲۳: ۱۰۱	بروزِ حشر نسبی فضیلت کوئی کام نہ آئے گی اور نہ اس کے متعلق کوئی سوال و جواب ہوگا۔

کام آنے والی شے صرف ایمان و عمل ہے۔ قرآن پاک نے جہاں پسرِ نوحؑ اور پدرِ ابراہیمؑ کے انجام کا ذکر کیا ہے وہاں اس سے پہلے خود حضورؐ کے چچا اور چچی کا انجام بتا کر حقیقت کی پردہ کشائی کر دی ہے:

حسن ز بصرہ، بلالؓ از حبش، صہیبؓ از روم
زخاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی ست

ابوجہل کی جگہ ابولہب کہیے جب بھی مضمون اسی طرح سچا ہوگا۔ پیغمبر کی یا کسی اور بڑی شخصیت کی محض قرابت پر فخر و ناز یا بھروسہ کر کے حسنِ عمل سے آزاد ہو جانا وہی یہودیانہ ذہنیت ہے جس کی قرآن کریم نے یوں ترجمانی کی ہے کہ:

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ۵:۱۸ ہم تو خدا کے فرزند اور اس کے چہیتے ہیں

ایمان و عمل کا معاملہ تو یہ ہے:

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

غرض یہ پہاڑی کا وعظ محض وعظ نہیں بلکہ بہت سی بنیادی اقدار کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

تبلیغی توسیع

اس پہاڑی اعلان و وعظ کے بعد حضورؐ نے برملا تبلیغ شروع فرما دی۔ ہر گلی کوچے میں، ہر مجلس و اجتماع میں۔ اور ہر میلے ٹھیلے میں جا جا کر آوازِ حق کو بلند آہنگی کے ساتھ پہنچانا شروع کر دیا۔ توحید کی اشاعت فرماتے۔ شرک سے روکتے اور شرک سے پیدا ہونے والی تمام برائیوں کی وضاحت فرماتے۔ اخلاقی برائیوں۔ بت پرستی، بدکاری، چوری، ڈاکے، کذب، قماربازی، قتلِ دختر، اور ظاہری و باطنی نجاستوں سے لوگوں کو روکتے۔ مشہور میلوں مثلاً عکاظ، یعینہ، اور ذوالمجاز میں بھی پہنچ جاتے اور توحید کی تبلیغ فرماتے۔ اکثر مواقع پر ابوجہل اپنی پارٹی

کے ساتھ پیچھے پیچھے جاتا اور یہ اعلان کرتا جاتا کہ: (نقل کفر، کفر نباشد)
"یہ دیوانہ ہے۔ جادوگر ہے۔ تمہیں آبائی دین سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے۔ خبردار اس کی باتیں نہ سنیں"

لمحۂ فکریہ

یہاں یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ حضور جن مذکورہ بالا اخلاقی برائیوں کا ذکر فرماتے تھے ان میں بیشتر چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق ابھی تک مکی زندگی میں باقاعدہ "احکام" نہ نازل ہوئے تھے۔ یہ تمام برائیاں عربوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھیں اور حضورؐ ان سے لوگوں کو روکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ نبی کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے جسے ہم اوپر کئی جگہ واضح کر چکے ہیں۔ دوسرے اگر انسان بالکل ہی گیا گزرا نہ ہو اور ضمیر کی کوئی رمق اس کے اندر باقی ہو تو وہ ان اخلاقی برائیوں کو برائیاں ہی سمجھتا ہے۔ چور چوری کو، جھوٹا جھوٹ کو کبھی نیکی نہیں سمجھتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن "فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا" سے تعبیر کرتا ہے یعنی ہر نفس انسانی میں خدا کا بخشا ہوا اتنا ضمیر موجود ہے جو عام اخلاقی نیکی و بدی میں تمیز کر سکے۔ کسی کے ساتھ ہمدردی کرنے والا اپنے فعل ہمدردی کو یقیناً نیکی سمجھتا ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جب اس کے ساتھ کوئی ہمدردی کرے تو وہ خوشنود و شکر گزار ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک چور چوری کر کے اپنی کامیابی پر خواہ کتنا ہی خوش ہو لیکن جب خود اس کے گھر چوری ہو جائے تو وہ رنجیدہ ہو گا اور چوری کرنے

والے کو ہزاروں صلواتیں سنائے گا۔ اس کا یہ اظہار رنج کیا وہی فطرت کی آواز نہیں جو ضمیرِ انسانی کی شکل میں اسے قدرت نے بخشی ہے؟ اگر فی الواقع وہ چور چوری کے فعل کو کوئی نیکی سمجھتا ہوتا تو اپنے گھر چوری ہونے کے بعد بھی وہ اسے نیکی تصور کرتا اور اس فعل پر مسرور ہوتا۔ شکر گزار ہوتا۔

لہٰذا ظاہر ہے کہ حضورؐ کی وہ اخلاقی تعلیمات جن کے بارے میں ابھی احکام ازل نہ ہوئے تھے غبار آلود اور خوابیدہ ضمیرِ انسانی کو بیدار کرنے کے لیے تھیں اور اس کی بنیاد وہی پیغمبری فطرت تھی جس کا رخ قبل از نبوّت بھی صحیح سمت میں تھا۔ اور جس نے نبوّت سے بہت پہلے ہی "حلف الفضول" کی تشکیل کرائی تھی۔

قریش کی مخالفت

یوں تو اس تین سال کے عرصے میں بھی بعض افرادِ قریش نے ایک "نئے دین" کے اثرات کو فضا میں تیرتا ہوا محسوس کر لیا تھا اور ان کا ماتھا ٹھنک گیا تھا۔ وہ ان "نومسلموں" کی سیرت و کردار کی ایک ایک ادا میں غیر معمولی تبدیلی کو بھانپ رہے تھے لیکن ابھی تک بات ایک حد تک ڈھکی چھپی سی تھی۔ لیکن کوہِ صفا کی دعوت کے بعد پیغامِ نبوت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آ گیا۔ اور کونے کونے میں دعوتِ توحید کی آواز گونج پیدا کرنے لگی۔ قریشِ مکہ کے لیے اس

پیغامِ نبوّت سے زیادہ ناگوار اور کوئی شے نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ بت پرستی اور توہم پرستی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ چوری ڈاکے سے ان کا معاشی مفاد وابستہ تھا۔ دختر کشی ان کی نگاہ میں نشانِ غیرت تھی۔ جنسی بے راہروی صرف سامانِ لذت اندوزی ہی نہ تھا بلکہ تہوّر و غیرت کی طرح یہ بھی ان کے ادب، شاعری اور زبان آوری کی بنیاد تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ خطرہ ان کے سامنے تھا کہ ان کی سیادت و اقتدار چھن جائے گا۔ غرض معاش، آبائی دین، اقتدار اور جنسی آزادی سب کچھ انہیں خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس لیے وہ بھی اب پوری شدّت کے ساتھ پیغامِ حق کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے۔

واقعہ یہ ہے کہ حق و انصاف، عدل و صداقت اور شرافت و اخلاق کی سیدھی سادی باتیں ہر انسان کی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ انسان اگر انسانیت سے، عقل سے، شریفانہ جذبات سے بالکل گیا گزرا ہو تو اور بات ہے ورنہ ہر ضمیرِ انسانی معقول باتوں کی معقولیت کو سمجھ لیتا ہے۔ عام طور پر قریش یا دوسرے لوگوں کا ضمیر اسلام کے ابتدائی پیغام کے حق ہونے کا معترف تھا جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ:

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ۔ ۲: ۱۴۶

یہ منکرین اپنے فرزندوں کی طرح اس کی شناخت رکھتے ہیں۔

اس کے باوجود جب انسان پیغامِ حق کی مخالفت کرتا ہوا خود اپنے ضمیر کے خلاف چلتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ اس سے اپنے بعض مفادات کو خطرے میں محسوس کرتا ہے۔ اور یہ بھی ایک عام قاعدہ ہے کہ عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مذہبی

آڑی جاتی ہے۔ اصلی زد جن مفادات پر پڑتی ہے اسے یا تو ظاہر ہی نہیں کیا جاتا یا موخر رکھا جاتا ہے یا ضمناً غیر مقصود ظاہر کر کے معمولی انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ بہر حال پیش پیش وہی بات رکھی جاتی ہے جو مذہبی جذبات کو برانگیختہ کر سکے۔ یہ طریقہ آج بھی اسی طرح رائج ہے اور خدا جانے کب تک جاری رہے گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ اگر آج آپ جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام کی اصلاح کے لیے کوئی ایسی تجویز پیش کریں جس میں اللہ کے عام بندوں کا فائدہ ہو تو فوراً "اسلام خطرے میں آ گیا" کا الارم بجا دیا جائے گا اور اس غیر عادلانہ نظام کی حمایت میں علمائے کرام اور مفتیان عظام کے فتوے اور کتابچے پیش کر دیے جائیں گے۔ عقل و عدل کی بات کو مہمل قرار دینے کے لیے خود ساختہ مذہب کی غیر عادلانہ و ناعاقلانہ باتوں کو پیش کر کے عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کا دستور ہمیشہ ہی سے رہا ہے۔

اہل مکہ ان ہتھکنڈوں سے بے خبر نہ تھے۔ اس لیے انہوں نے بھی حضور کی مخالفت کے لیے یہی حربہ استعمال کیا۔ وہ اس زد کا ذکر زیادہ نہ کرتے تھے جو ان کے معاش و اقتدار یا آزاد خواہش نفس پر پڑتی تھی وہ زیادہ تر اپنے آبائی دین اور اپنے معبودوں ہی کو پیش پیش رکھتے تھے اور اسی ہتھکنڈے کو مخالفت کا واسطہ بناتے تھے۔ اپنے مفادات کو آسانی سے کون چھوڑتا ہے؟ مفادات کو ترک کرنے کا جرأت مندانہ اقدام تو صرف وہی سعید روحیں کر سکتی ہیں جن کی نگاہوں میں روحانی اقدار کی قیمت ان مفادات سے بدرجہا زیادہ ہو۔ معاندین کی نظروں میں ساری قدر و قیمت کی چیز وہی مادی مفادات کی تھی۔ لیکن عداوت و دشمنی کے لیے انہیں بھی

اپنی خود ساختہ مذہبی اقدار ہی کو پیش پیش رکھنا پڑا۔

ابوطالب سے سوال و جواب

اہل مکہ نے تبلیغ حق روکنے کے لیے پہلے یہ اسکیم تیار کی کہ با اثر لوگوں کا ایک وفد حضورؐ کے چچا ابوطالب کے پاس بھیج کر تبلیغی سرگرمیوں کی روک تھام کرانے پر زور ڈالا جائے۔ ان سب کو یہ علم تھا کہ آمنہؓ اور عبدالمطلب کی وفات کے بعد ابوطالب ہی حضورؐ کی کفالت و پرورش کرتے رہے ہیں۔ حضورؐ ان کے احسان مند ہیں اور حضورؐ پر ان کا خاصا اثر ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ابوطالب بھی اپنے آبائی دین پر ان ہی کی طرح قائم ہیں۔ اور یہ توقع ہے کہ ان کے سمجھانے سے حضورؐ بہ تقاضائے احسان مندی اپنے "نئے دین" کی تبلیغ سے باز آجائیں۔

ان ہی توقعات کو لے کر ایک وفد ابوطالب کے پاس گیا۔ اس وفد کے ارکان میں عتبہ بن ربیعہ، شعبہ، ابوسفیان، عاص بن وائل، عاص بن ہشام، ابوجہل، ولید بن مغیرہ وغیرہ شامل تھے۔ یہ تمام ارکان وفد جہاندیدہ تجربہ کار، بااثر اور گھاگ قسم کے لوگ تھے۔ اور ان کی باتوں کو نظر انداز کر دینا ابوطالب کے بس کی بات نہ تھی۔ ان سب نے مل کر ابوطالب پر زور ڈالا کہ اپنے برادر زادے کو اس "نئے فتنے" کی اشاعت و تبلیغ سے روک دو۔ ابوطالب نے حضورؐ سے بزرگانہ انداز وقار اور مشفقانہ محبت سے کہا کہ: "جانِ عم! مجھ پر اتنا بوجھ تو نہ ڈالو جو میری برداشت سے باہر ہو۔

دیکھو بتوں اور معبودوں کی اہانت سے ساری کی ساری قوم ناراض ہو گئی ہے۔ کیوں نہ تم اپنی موجودہ دینی تبلیغ کو روک دو؟"

ابو طالب کو اب تک نبوّت کے بے پناہ زور و قوت اور اعتماد علی اللہ کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میرا یہ برادر زادہ میری عمر بھر کی حمایت سے مجبور ہو کر میری یہ پہلی فرمائش مان لے گا۔ اور ساری قوم کی ناراضی کا واسطہ دینا اس کے لیے موثر ہو گا۔ ابو طالب کا تصور غالباً یہ تھا کہ یہ "نیا دین" ایک یوں ہی معمولی سی چیز ہے جسے میری ایک ہی فرمائش آسانی سے روک کر ساری قوم کی ناراضی کو ختم کر دے گی۔ مگر حضورؐ نے اپنے اس آخری دنیوی سہارے کی پروا کیے بغیر جو مختصر سا جواب دیا وہ ہمیشہ مقامِ نبوّت کو ظاہر کرتا رہے گا۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ: "میں اس فرض کی ادائگی سے باز نہیں رہ سکتا جس کے لیے بھی میں خدا کی طرف سے مامور ہوں۔"

اس چھوٹے سے جملے نے ابو طالب کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے کہہ دیا کہ: "اچھا تو تم جو کچھ کر رہے ہو کیے جاؤ۔ جب تک میں ہوں تمہاری طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا۔"

ایجادِ ستم

وفد کی اسکیم ناکام رہی۔ اور حضورؐ کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ برابر اسی طرح ایک ایک کے کان میں آوازِ حق پہنچاتے رہے۔ اہل مکہ کو اب

روز بروز اپنے لیے خطرہ زیادہ ہی نظر آنے لگا اور اب انہوں نے اس خدائی آواز کو دبانے کے لیے ایک دوسری اسکیم تیار کی۔ یوں تو انفرادی طور پر پہلے بھی وہ کمزور اور بے بس نومسلموں پر سختیاں کیا کرتے تھے مگر اب باقاعدہ ایک منظم پروگرام ستم ایجادیوں کے لیے بنایا۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جو لوگ اسلام قبول کر چکے ہیں وہ جور و ستم سے مجبور ہو کر ارتداد اختیار کر لیں۔ اور جو لوگ اسلام قبول کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ ان عبرتناک مظالم سے دہشت زدہ ہو کر اسلام لانے کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔

مظالم کا اندازہ یہ رکھا گیا کہ اس کا آغاز ان لوگوں سے کیا جائے جو بے بس اور بے اثر ہوں اور ان کے حمایتی قبائل یا حلیف افراد نہ ہوں جو عربی دستور کے مطابق ہر صحیح و غلط کی حمایت کو اپنا قومی و قبیلوی فرض سمجھتے ہیں۔ دوسرا اندازہ یہ رکھا گیا کہ جو بااثر لوگ ہوں ان کو انہی کے بااثر سرپرستوں کے ہاتھ سے سزائیں دلوائی جائیں تاکہ دوسروں کو مداخلت کا موقع نہ رہے۔

لرزہ خیز سزاؤں اور ایذا رسانیوں کی یہ داستان بڑی طویل اور دلخراش ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں جانے کی بجائے بہت اختصار سے کام لیں گے[1]۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ بلال حبشیؓ امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ انہیں ٹھیک دوپہر کو

---

(۱) طٰہٰ حسین مصری نے الوعد الحق میں تفصیلات درج کی ہیں۔ لیکن وہ صرف غلاموں یا نیم غلاموں سے متعلق ہیں۔ اس کا ترجمہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور سے شائع ہو گیا ہے جس کا نام ہے "زیردستوں کی آقائی"۔

تپتی ہوئی ریت پر لٹاکر سینے پر وزنی پتھر رکھ دیا جاتا تھا تاکہ جنبش نہ کر سکیں کبھی گلے میں رسّی باندھ کر گلی گلی پھرایا جاتا۔ خرد و کلاں کا جمگھٹ ساتھ ساتھ تمسخر بھی اڑاتا جاتا اور سخت جسمانی اذیتیں بھی پہنچاتا۔ کبھی دھکّے دے کر انہیں زمین پر گرا دیا جاتا اور بے رحمی سے گھسیٹا جاتا۔ یہ ساری ایذائیں دیتے ہوئے ان پر دباؤ ڈالا جاتا کہ اب بھی اعترافِ توحید سے باز آجاؤ۔ مگر بلالؓ کی زبان سے جب بھی کوئی آواز نکلتی تو وہ اَحَدٌ اَحَدٌ کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔

۲۔ یاسرؓ کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا گیا اور انہیں تو آگ سے داغ داغ کر پانی میں غوطہ دیا جاتا جس سے جسمانی اذیت کے علاوہ دم بھی گھٹنے لگتا۔ ساتھ ہی شدید قسم کی ضربات لگائی جاتیں اور وہ ایک دن یہ سزائیں بھگت کر دنیا سے چل بسے۔

۳۔ یاسرؓ کے فرزند عمارؓ کے ساتھ بھی بالکل اسی طرح کا سلوک کیا گیا۔ انہیں بھی جلتی ہوئی ریت پر لٹاکر اتنا مارا جاتا کہ یہ بیہوش ہو جاتے۔

۴۔ صہیبؓ رومی کو مار مار کر اتنی تکالیف پہنچائی جاتی کہ ان کے حواس بجا نہ رہتے۔ ہجرت کے وقت ان کا سارا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

۵۔ ابوفکیہہؓ صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ ان کے پاؤں میں رسّی باندھ کر گھسیٹا جاتا، اور گرم گرم ریت پر لٹا دیا جاتا۔ کبھی ان کا گلا گھونٹا جاتا اور کبھی سینے پر اتنا بوجھل پتھر رکھ دیا جاتا کہ ان کی زبان باہر نکل پڑتی۔

یہ تو چند مردوں کی مثالیں ہیں۔ کچھ عورتوں کا بھی حال سنیے:

۱۔ زنیرہ حضرت عمرؓ کی لونڈی تھی (حضرت عمرؓ اس وقت تک ایمان نہ لائے تھے) ابوجہل نے اس مومنہ کو اتنا مارا کہ اس کی آنکھیں جاتی رہیں۔

۲۔ خود حضرت عمرؓ (اپنی حالت کفر میں) لبینہ کو اس طرح مارتے کہ جب مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ ذرا دم لے لوں تو اور ماروں گا۔ وہ مارتے مارتے تھک جاتے اور لبینہ مار برداشت کرتے کرتے نہ تھکتی۔

۳۔ ہندیہ کو بھی اسی طرح کی اذیت رساں سزائیں دی جاتیں۔

۴۔ ام عبیس کو بھی اسی طرح تختۂ مشق ستم بنایا جاتا۔

۵۔ یاسرؓ کی بیوی اور عمارؓ کی والدہ سمیہ پہ وہ سارے ظلم کیے گیے جو اس مومنہ کے شوہر و فرزند پر ہوئے۔ اور اس عورت نے بھی مردانہ وار اپنے شوہر کے ساتھ ہی جان دی اور شہدا میں اسی عورت کا نام سرفہرست ہے۔

یہ تو وہ لوگ ہیں جو مجبور و مقہور تھے بے بس زیر دست تھے جن کا کوئی فرد یا قبیلہ حمایتی یا حلیف یا باز پرس کرنے والا مددگار نہ تھا۔ اگر کوئی تھا تو وہ خود بھی ان ستم ایجادیوں میں بڑھ چڑھ کر عملی حصہ لیتا تھا۔ اور جو ستم دجور بھی ہوتا وہ اس کی مرضی یا تجویز سے ہوتا۔ یہ جور و ستم صرف بے کسوں مجبوروں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ با اثر آزاد بھی اس کی لپیٹ میں لے لیے گئے۔ مثلاً:

۱۔ حضرت عثمانؓ کو ان کا چچا چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے اتنا دھواں دیتا کہ ان کا دم گھٹنے لگتا۔

۲۔ مصعبؓ بن عمیر کو ان کی ماں نے صرف مسلمان ہونے کے جرم میں گھر سے باہر نکال دیا۔

یہ چند نظائر ہیں اور وہ بھی تفصیلات میں گئے بغیر۔ دبعض کا ذکر آگے بھی آئے گا)۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ دوسرے ایمان لانے

والوں کے ساتھ کیا کیا کچھ نہ کیا گیا ہو گا۔ مختصر یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اسلام لایا وہ اہل مکہ کے مظالم و ستم کا نشانہ بنا۔

حضور اکرمؐ پر جفائیں

اس مختصر سی داستانِ جور و ستم سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ یہ سب کچھ صرف نومسلموں کے ساتھ ہوتا رہا اور حضورؐ آرام سے اپنا مشن پھیلاتے رہے۔ نہیں نہیں۔ حضورؐ کو بھی اسی طرح ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی گئیں جس طرح امتیوں کو پہنچائی گئیں۔ چند ایک واقعات ملاحظہ ہوں:

۱۔ حضورؐ کعبے میں نماز پڑھ رہے ہیں اور عقبہ بن مُعیط حضورؐ کی گردن میں کپڑا ڈال کر بل دینا شروع کرتا ہے۔ کپڑے کا پھندا اس قدر کس جاتا ہے کہ حضورؐ کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مگر حضورؐ سجدے میں پڑے تسبیح الٰہی میں مصروف ہیں۔ اتفاقاً حضرت ابوبکرؓ ادھر آ نکلتے ہیں اور یہ جانکاہ منظر دیکھ کر فرماتے ہیں:

اتقتلون رجلا ان یقول ربی اللہ و قد جاءکم بالبینٰت	ظالمو! کیا تم ایک شخص کی جان محض اس جرم میں لے رہے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتا ہے اور اس کے واضح دلائل بھی لایا ہے؟
۴۰:۲۸	

یہ سنتے ہی سب کے سب حضرت ابوبکرؓ پر پل پڑے اور انہیں اتنا مارا کہ ہوش بجا نہ رہے اور لاد کر گھر لائے گئے۔

۲۔ اسی طرح حضورؐ دوسرے موقعے پر حرم میں نماز ادا فرما رہے

تھے کہ ابوجہل کے اشارے پر ایک شخص نے عین حالتِ سجدہ میں اونٹ کا ایک بوجھل اوجھ لاکر اوپر ڈال دیا۔ حسن اتفاق سے حضورؐ کی چھوٹی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ ادھر آگئیں اور اس بوجھ کو ہٹایا۔

۳- ابولہب کی بیوی حمنہ (اس کی کنیت امّ جمیل تھی) حضورؐ کی گزرگاہ پر کانٹا بچھا دیا کرتی اور کبھی حضورؐ کے دروازے پر غلاظت کا ڈھیر ڈال جاتی۔

۴- حضورؐ جدھر نکلتے وہاں کبھی گالیوں، تالیوں اور شور و غل سے استقبال کیا جاتا اور کبھی حضورؐ پر پتھر پھینکے جاتے۔

۵- طائف اور دیگر مقامات پر حضورؐ کو جو اذیتیں پہنچائی گئیں ان کا ذکر اپنے محل پر آگے آئے گا۔

۶- اور یہ بھی ایک سچی حقیقت ہے کہ بمصداق عزیز علیہ ما عنتّم (جو مصیبتیں تم جھیلتے ہو وہ رسول پر بے حد شاق ہیں) حضورؐ کے لیے اپنے ایک ایک امتی کی ایذائیں اتنی زیادہ رنج افزا تھیں کہ کسی انتہائی مشفق ماں باپ پر اپنی محبوب ترین اولاد کی سخت سے سخت تکلیف بھی اتنی گراں نہیں ہو سکتیں۔ حضورؐ نے ایک ہی مختصر جملے میں ان تمام ایذا رسانیوں کو سمیٹ سمو کر یوں ادا فرما دیا ہے:

ما اوذی نبی قط کما اوذیت۔ جتنی تکلیفیں مجھے دی گئی ہیں کسی نبی کو نہیں پہنچائی گئیں۔

برخوانِ غم چو عالمیاں را ندا زدند
اول صلا بہ سلسلۂ انبیا زدند (محتشم)

اور حضورؐ تو سلسلۂ انبیاء کی سب سے آخری اور سب سے اہم کڑی ہیں

نیز اس حقیقت سے کون ظالم بے خبر تھا کہ اس "نئے دین" کی ساری جڑ بنیاد حضورؐ ہی کی ذاتِ گرامی ہے؟ یہ کیسے ممکن تھا کہ معاندین و منکرین فروع ہی کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر دیں۔ اور اصل سے صرفِ نظر کر لیں؟ انہیں یہ پورا علم تھا کہ ان "نومسلموں" کا قبلۂ توجہ اور ان سب کا مرکزی نقطۂ آغاز ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ اپنے ظلم وستم کا نشانہ صرف پروانوں کو بنائیں اور شمع کو گُل کرنے کی فکر نہ کریں۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو وہ حضورؐ کے ساتھ کر سکتے تھے۔

نگہہ بازگشت

لمحہ فکریہ

ان تمام جان لیوا اور روح فرسا مظالم کو سامنے رکھ کر ایک سوال کا جواب تلاش کیجیے۔ ان تمام آزمائشوں اور شدید ابتلاؤں کے باوجود کوئی ایک متنفس بھی نظر آتا ہے جس نے ایک لحظے کے لیے بھی اسلام سے دست بردار ہونے کا اعلان کیا ہو؟ کوئی فرد بھی ایسا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر اس خیال یا شکوے کا شائبہ بھی پیدا ہوا ہو کہ محمدؐ رسول اللہ نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے؟ ایک شخص بھی ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جو محمدؐ اور آپؐ کے پیغام کے مقابلے میں اپنے خاندان، اپنے وقار و عزت، اپنے مال و دولت، اپنے بال بچوں، اپنی جان و روح یا اپنی کسی عزیز ترین متاع کو ترجیح دے کر اسے محفوظ رکھنے کا کوئی خیال

بھی دل میں لایا ہو؟ یا کفر و اسلام کے درمیان کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے مداہنت کا کوئی پہلو اختیار کیا ہو؟

ان تمام سوالات کا جواب نفی اور صرف نفی میں ہے۔ محض نفی ہی میں نہیں بلکہ یہاں یہ نظر آتا ہے کہ ہر آزمائش ایمان میں اضافہ کرتی ہے۔ جتنا زیادہ سخت امتحان ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ اسلامی کردار میں پختگی آتی ہے۔ جس قدر زیادہ دبایا جاتا ہے اسی قدر زیادہ ان کے عشقِ اقدار میں ابھار پیدا ہوتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر سزا و تعذیب میں انہیں کچھ لذت مل رہی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف حالت کفر میں ابوسفیان کو بھی اور ہرقل روم کو بھی کرنا پڑا۔

ابوسفیان سے ہرقل نے پوچھا:

هل يرتد احد منهم عن دينه بعد ان يدخل فيه سخطة له	کیا کوئی ایسا بیرو محمدی بھی ہے جو اس دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے ناراض ہو کر مرتد ہو گیا ہو؟

ابوسفیان نے جواب دیا:

لا۔	ایسا کوئی نہیں

ہرقل بولا:

كذالك الايمان اذا خالط بشاشة القلوب (رواه الشيخان عن ابن عباسؓ)	ایمان دل میں اتر جائے تو اس کی چاشنی ایسی ہی غیر متزلزل ہوتی ہے۔

یہ اعتراف دو ایسے شخصوں کا ہے جن میں سے ایک تو ابھی تک شدید دشمن ہے اور دوسرا دل سے تو قائل ہے مگر حکومت کی کرسی کی خاطر انکار کر گیا۔

پھر ذرا یہ بھی سوچیے کہ ان سارے لرزہ خیز مصائب و آلام کو ہنسی خوشی جھیلنے کے نتیجے میں انہیں کس قسم کے مفاد کی توقع تھی؟ کوئی عہدہ کوئی منصب؟ نہیں۔ کوئی دولت کوئی حکومت؟ نہیں۔ کوئی عزت کوئی جاہ؟ نہیں۔ کوئی زن کوئی زمین؟ نہیں۔ کوئی آرام کوئی راحت؟ نہیں۔ کوئی خطاب کوئی لقب؟ نہیں ـــــ ان ساری چیزوں کی تو قربانی دی جا رہی ہے یہی تو وہ بت ہیں جن کو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی ضرب سے پہلے ہی لمحے میں ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا۔ پھر آخر ان تمام شدائد کو جھیلنے میں کون سا مفاد ان کے پیش نظر تھا؟ اسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو "اقدارِ حیات" کی قدر و قیمت کو جانتا ہو۔ اور اس فرق کو پہچانتا ہو جو مادی مفادات اور اقدار حیات کے درمیان ہے مادی مفادات کو محض حیوانی سطح پر استعمال کرنے کا جہاں تک تعلق ہے ان سب کا رخ کفر و جاہلیت کی طرف تھا۔ اور اِدھر ان اقدار زندگی کی طرف رخ تھا جن کا مرکز قدرالاقدار ـــــ اللہ ـــــ ہے۔ یہ ایک ایسا نظریۂ زیست ہے جسے اپنا لینے کے بعد سارے مادی مفادات کا خود بخود صحیح استعمال ہونے لگتا ہے۔ یہ وہ زاویۂ نگاہ ہے جو ہر مفاد کے استعمال میں انسان کو نری حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پر لے آتا ہے اور اسفل السافلین میں سونے والوں کو بیدار کر کے احسن تقویم کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ جو مومن اس حقیقت کو سمجھ لے اور یہ سمجھنا محض دماغ کا سمجھنا نہ ہو بلکہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جانے والا انداز رکھتا ہو تو اس کی نگاہوں میں جان و مال، ازواج و اولاد اور ہر قیمتی سے قیمتی متاع و مفاد ان اقدارِ زندگی کے سامنے بے حقیقت، بے قیمت اور ہیچ ہو جائیں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون تھا جس نے ان جانبازوں کو نئی اقدارِ زندگی

سے روشناس کرایا؟ کس نے ان سب کو ترک و اختیار کے یہ جدید پیمانے اور پسند و ناپسند کے یہ انوکھے مقیاس بخشے؟ کس نے صحیح و غلط کے یہ انقلاب آفریں معیار صرف سمجھائے ہی نہیں بلکہ دلوں کی آخری گہرائیوں میں اتار دئے؟ کیا یہ محمد عربیؐ ہی نہیں جن کی ساری سیرت ہی بجائے خود اعلیٰ اقدار کا مجسم مظہر ہے؟ اس انسان کی بلندی کردار کا کون اندازہ کر سکتا ہے جس کی ایک نگاہ نے مسِ خام کو کندن بنا کر پوری زندگی کا رخ حقیقت —— بلکہ حقیقۃ الحقائق —— کی طرف موڑ دیا اور زاویۂ نظر میں اتنی غیر متزلزل پختگی پیدا کر دی کہ اس راہ کی ہر آزمائش و ابتلا سرمایۂ لطف و لذت بن گئی۔

استقامت

ان مردانِ خدا کی استقامت بجائے خود ایک ایسی اعلیٰ قدر ہے جس کے اعتراف و قدر دانی میں رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی سند نازل ہوئی۔ ان کے پائے ثبات میں آزمائش کے کسی مرحلے پر بھی لغزش نہ آئی۔ ان میں سے کسی نے بھی ان ابتلاؤں سے بچنے کے لیے کبھی تقیے کی آڑ نہ لی۔ صرف ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے بعض غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے عمار بن یاسر کا۔ مختصراً یہ واقعہ یوں ہے کہ ابو جہل اور اس کے ساتھی بے بس اور زیر دست عمارؓ کو ہر روز مختلف قسم کی سزائیں دیتے تھے تاکہ یہ اسلام سے پھر جائیں۔ ایک دن انہوں نے آگ سے جسم کو جلایا۔ یہ سب کچھ کیا مگر عمارؓ ثابت قدم رہے۔ ایک دن انہوں نے عمارؓ کو پانی میں اس طرح غوطہ دیا کہ ان کا دم گھٹنے لگا اور اس حالتِ اضطرار میں ان کی زبان سے کلمۂ کفر نکل گیا۔ عمارؓ کو سخت پشیمانی ہوئی اور نہ

روتے ہوئے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا: کہ جب وہ ایسا کریں تو تم اسی طرح کہہ کر اپنی جان بچالو۔" اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

من کفر بعد ایمانہ الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضبٌ من اللہِ۔ ولھم عذاب الیمٌ۔ ۱۶ : ۱۰۶	جو ایمان لا چکنے کے بعد کفر کرے اس پر خدا کا غضب نازل ہوگا اور اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ اس سے مستثنےٰ وہ ہے جسے مجبور کر دیا جائے اور اس کا دل ایمان پر جا ہو۔ وہ نہیں جو شرح صدر کے ساتھ کفر کا مرتکب ہو

آیت سے صاف واضح ہے کہ اگر بربنائے ایمان مسلسل جانچ ہو رہی ہو اور اسے برداشت بھی کیا جا رہا ہو تو زندگی پر بعض مرحلے ایسے بھی آتے ہیں کہ جہاں جان پر بن آتی ہے اور زندگی کو مستقبل کے اعلیٰ مقاصد کے لیے محفوظ رکھنا ہی اعلیٰ قدر ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر تقیہ جائز ہے۔ لیکن اگر زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اسے عام (GENERALISE) کر دیا جائے اور وہ بھی کسی آزمائش میں پڑے بغیر محض معمولی خطرے کی بنا پر، تو منافقت اور ایمانی پختگی میں کوئی فرق نہ رہے گا اور استقامت کی تمام قدریں ختم ہو جائیں گی۔

ہجرت حبشہ (۵ نبوی)

تین سال کی خاموش تبلیغ کے بعد یہ دو سال انتہائی مصائب و

آلام کے گزرے۔ مظالم اور جور وستم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اہلِ اسلام کے لیے اگرچہ آزار وستم میں لذت گیری کا ایک پہلو بھی تھا لیکن آخر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ان مسلمانوں کو جتنا آزار پہنچایا جاتا اتنی ہی ان میں پختگی پیدا ہو جاتی اور پھر جس قدر زیادہ ان میں استقامت نظر آتی اسی قدر آزار وستم میں اضافہ ہو جاتا۔ حضورؐ کو اس بڑھتے ہوئے ظلم وستم سے اور ذہنی تکلیف ہوتی۔ اس لیے اس سے اس مختصر سی امت کو محفوظ رکھنے کے لیے مسلمانوں کو کسی امن کی جگہ منتقل ہو جانے کی اجازت دی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: حبشے کا نجاشی (اصحمہ بن ابجر) اگرچہ عیسائی ہے مگر منصف مزاج ہے اور اس سے اہل مکہ جیسے ظلم وستم کی توقع نہیں۔ اس لیے وہیں جا کر عارضی طور پر پناہ لینی بہتر ہے۔

ایمان اور وطنیت کا مقابلہ

حضورؐ کی یہ تجویز بلاشبہ مکے کی اذیت رساں آزمائشوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی لیکن یہ ہجرت اور ترکِ وطن بجائے خود ایک آزمائش تھی۔ مسلمان اب تک ساری آزمائشیں جھیل چکے تھے۔ ہر قسم کی قربانی پیش کر چکے تھے لیکن وطن کو اپنے اعلیٰ نصب العین پر قربان کرنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ وطن خود ایک بت ہے اور اب تو ع

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

وطن وہ "معبود" ہے جس کی راہ میں ہمیشہ ہی دنیا اپنا تن من دھن

قربان کرتی چلی آئی ہے اور ہمیشہ ہی سے اس کی بنیاد پر قومیتوں کی تعمیر ہوتی رہی ہے۔ لیکن "محمدی اسلام" نے جہاں نسل، رنگ، زبان اور پیشے وغیرہ کی بنیادوں پر قومیتوں کی تعمیر کو یکسر ختم کیا وہیں وطنیت کی اساس پر تعمیرِ قومیت کے تصور کو بھی بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ دنیا وطن پر سب کچھ قربان کرتی ہے لیکن تمام انبیا اور خاتم الانبیا نے وطن کو بھی ایک اعلیٰ قدر اور برتر نصب العین پر قربان کرنا سکھایا۔

یہ ہجرتِ حبشہ بھی دراصل اسلام کے اسی زاویۂ نظر کی تکمیل تھی اور ایک آنے والی بڑی ہجرت (ہجرت مدینہ) کی تمہید تھی۔ یہ فقط "مکّے" کے جور و ستم سے محفوظ رہنے کی ہی ایک سبیل نہ تھی بلکہ وطن کو راہِ حق میں قربان کر دینے کا بھی ایک درس تھا جو آگے چل کر زیادہ وسیع پیمانے پر ظاہر ہوا۔

علاوہ ازیں اس پہلی ہجرت میں ایک مصلحت یہ بھی ضرور ہوگی کہ ـــــ جیسا کہ بعد کے واقعات بتلاتے ہیں ـــــ کہ اشاعتِ اسلام کے پروگرام کو باہر بھی پھولنے پھلنے کا موقع میسّر آئے اور اس کی توقع ان عیسائیوں سے زیادہ ہو سکتی تھی جو دینی مزاج میں اسلام سے قریب تر ہیں۔ ان کے اقرب الی المسلمین ہونے کی شہادت خود قرآن میں بھی ہے۔

اوّل اوّل بارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک قافلہ رات کی تاریکی میں بندرگاہ شعیبیہ پہنچا۔ حسنِ اتفاق سے حبشہ جانے والے دو تجارتی جہاز وہاں مل گئے۔ یہ سب لوگ پانچ درہم فی کس دے

کہ دونوں جہازوں میں بیٹھ گئے۔ اور جلد ہی دونوں جلشے روانہ ہو گئے۔ صبح کفارِ مکہ کو معلوم ہوا تو تعاقب میں دوڑے مگر جہاز ان کی دسترس سے باہر ہو چکے تھے۔ اس مختصر سے قافلے میں سیدنا عثمان ذی النورینؓ اور ان کی زوجہ یعنی سیدہ رقیہؓ بنت رسول اللہؐ بھی تھیں۔

کچھ دنوں کے بعد ایک اور بڑا قافلہ بھی جلشے روانہ ہو گیا۔ اس میں تراسی ۸۳ مرد اور اٹھارہ ۱۸ عورتیں تھیں۔ اس قافلے میں سیدنا جعفر طیار بن ابی طالب بھی تھے جنہوں نے آگے چل کر ایک بڑی مہم سر کی ہے۔ یہ دونوں ہجرتیں اسلام میں پہلی ہجرتیں تھیں۔ جس خدا کی راہ میں یہ اہلِ مکہ کے ظلم و ستم جھیل رہے تھے اسی خدا کا نام آزادی و اطمینان سے لینے کے لیے یہ لوگ راہیِ حبشہ ہوئے تھے۔

ابھی بہت سے مسلمان مکے میں موجود تھے۔ ان میں کچھ تو ایسے تھے جن کو بظاہر بے مائگی اور بے سروسامانی نے روک رکھا تھا۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ بہتوں نے حضورؐ کی معیت کے شرف کو ترک کرنا پسند نہ کیا اور بہتیرے ایسے بھی ہوں گے جو لذتِ آزار سے سیر نہ ہوئے تھے۔

قریشی وفد جلشے میں

عربوں کی جلشے میں آمد و رفت کوئی نئی بات نہ تھی۔ عرصۂ دراز سے تجارتی تعلقات قائم تھے۔ نیز وہ دور پاسپورٹ اور ویزا کی

پابندیوں سے آزاد تھا۔ علاوہ ازیں نجاشی حبشہ ایک نیک دل اور فراخ ظرف حکمران بھی تھا۔ اس لیے ان مسلمانوں کا وہاں جا بسنا کوئی ایسی انوکھی بات نہ تھی جس پر وہاں کی حکومت کوئی نوٹس لیتی۔ یہ لوگ وہاں اطمینان سے رہ کر اُن تب اسلامی احکام کی پابندی کے ساتھ زندگی گزارنے لگے جو اس وقت نازل ہو چکے تھے۔ لیکن مکّے والوں کو ان لوگوں کا وہاں اطمینان کی سانس لینا گوارا نہ ہوا۔ قریش نے اپنا ایک وفد عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ(۱) کی سرکردگی میں دربار حبشہ کی طرف روانہ کر دیا۔

بلاشبہ یہ اقدام قریشِ مکّہ کی ضد اور عداوت کی انتہا پر دال ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ان منکرینِ حق کے کمال استقامت کی بھی دلیل ہے۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں عربوں میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ لیکن ان کا استعمال غلط ہو رہا تھا۔ رسول عربیؐ کا یہی کمال ہے کہ ان عربوں کی صلاحیتوں کا رخ موڑ کر صحیح سمت میں لگا دیا اور جس استعداد کا استعمال غلط ہو رہا تھا اسے اس کے صحیح ترین استعمال میں لگا دیا۔ اگر ان عربوں میں اعلیٰ صلاحیتیں موجود نہ ہوتیں تو آگے چل کر یہ نہ اتنی شاندار قوم بنتے نہ اس کارگہِ حیات میں اتنے بڑے بڑے کام کرتے اور نہ امامتِ اقوام ان کے حصّے میں آتی۔

جتنے تک مسلمانوں کا پیچھا کرنا ان اہل مکّہ کے جوشِ عمل، بلند ہمتی،

---

(۱) طبرانی اور بزار نے عبداللہ بن ربیعہ کی بجائے عمارہ بن ولید کا نام لکھا ہے ممکن ہے دونوں ہوں۔

اور تسلسلِ کار اور عزم و استقامت کی دلیل ضرور ہے۔ یہ ساری کارگزاریاں آج اسلام کے خلاف تھیں اور آئندہ یہی صلاحیتیں اقدارِ زندگی کو بلند کرنے میں صرف ہونے والی تھیں۔

یہ وفد اس غرض سے حبشے گیا تھا کہ کسی تدبیر سے ان پناہ گزین مسلمانوں کو وہاں سے نکلوایا جائے اور یہ پھر مکّے میں آنے پر مجبور ہو جائیں اور انہیں پھر ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جائے۔ بعد کے واقعات ان کی اسی نیت کی تائید کرتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ظلم و ستم کی نیچر یہ ہے کہ وہ اپنے نشانہ و ہدف کی تلاش میں رہتا ہے۔ اگر اسے کوئی ہدف نہ ملے تو اس کے اندر ایسی بے چینی سی محسوس ہوتی ہے جو کسی شکاری کو شکار نہ ملنے سے ہوتی ہے۔ ہر شکاری نئے نئے شکار کی تلاش میں رہتا ہے اور اس کے بغیر اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ مکّی ظالموں کی نگاہ میں وہ شکار کافی نہ تھے جو مکّے میں رہ گئے تھے۔ ان کی فطرت ہر روز نت نئے طرزِ ستم کے لیے نئے نئے بیکسوں کا رقصِ بسمل دیکھنے کی عادی ہو رہی تھی۔ وہ اسی لیے حبشے تک تعاقب و تلاش میں گئے کہ قدیم مظلوموں کو کسی طرح واپس لاکر نئی نئی ستم ایجادیوں کی ہوس کو تسکین دے سکیں۔ یہ سب کچھ صحیح ہے۔

لیکن ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف سیرت نگاروں کی نظر نہیں گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اہلِ مکّہ خاصی فراست و دانائی کے مالک تھے۔ وہ بالکل بھولے بھالے بے وقوف نہ تھے۔ وہ دوررس نگاہ رکھتے تھے۔ اور پیغامِ نبوّت کی اندرونی قوت و زور اور اس کے پھیلنے کی بے پناہ فطری طاقت کو خوب سمجھتے تھے۔ وہ مکّے کے اندر دیکھ

چکے تھے کہ ان کی ہزار مخالفتوں اور شدید سے شدید آزار وستم کے باوجود اسلام کس طرح دلوں میں گھر کرتا اور پھیلتا جارہا ہے۔ انہیں خوف صرف یہ تھا کہ کہیں حبشے میں اسلام پھیل کر ایسی منظم طاقت نہ بن جائے جس کی ایک ہی یورش ان کے اقتدار کی کمر توڑ کر رکھ دے۔ دراصل یہی خطرہ قریشی وفد کو حبشے تک لے گیا تھا۔ محض آزار وستم کی جدّت طرازیوں کا شوق پورا کرنا مقصود نہ تھا۔

بہر حال جب یہ وفد حبشے تک پہنچ گیا تو پہلے درباری پادریوں سے ملا۔ انہیں تحائف پیش کیے۔ تحائف اور ڈالیوں میں جو زور ہوتا ہے وہ بڑے بڑے سرکشوں کو رام کر لیتا ہے اور مذہبی قسم کے پیشوا تو اس سے شیشے میں اتر جاتے ہیں۔ ان پادریوں نے اس وفد سے وعدہ کر لیا کہ دربار نجاشی میں تمہاری پوری پوری حمایت و تائید کریں گے۔ اس وفد کے ارکان نے اپنی مطلب برآری کا جو راستہ اختیار کیا وہ یقیناً ان کی دور بینی اور فراست کی شہادت دیتا ہے۔ حبشہ ایک عیسائی حکومت تھا اور اس وقت کے کلیسائی نظام میں پادریوں کا جو اثر و رسوخ تھا وہ کسے نہیں معلوم؟ ان پادریوں کو اپنا مؤید و حمایتی بنا لینے کے معنی ہی یہ تھے کہ تکمیلِ مقصد میں کوئی شک باقی نہ رہا۔

دوسرے دن اس وفد نے اپنی مجوزہ اسکیم کے ساتھ دربار نجاشی میں باریابی حاصل کی اور حرفِ مطلب یوں ادا کیا کہ: "ہمارے شہر مکّہ کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب نکالا ہے۔ ہم نے ان کو نکال باہر کیا تو یہ لوگ یہاں آکر پناہ گزیں ہو گئے ہیں۔ لہٰذا ان مجرموں کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔"

ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں بھی وہی مذہبی حربہ استعمال کیا جارہا ہے جو مکّے کے عوام کو بھڑکانے کے لیے کیا جاتا رہا۔ یہ وفد اس زد کا ذکر نہیں کرتا جو مکّے والوں کی معاش یا اقتدار پر پڑ رہی ہے۔ وہ آگے آگے مذہب ہی کو رکھتا ہے اور اس نفسیات سے بخوبی واقف ہے کہ ایک مذہبی (عیسائی نجاشی) کے جذبات اسی حربے سے برانگیختہ کیے جاسکتے ہیں۔ کون کہتا ہے کہ اہل مکہ نادان و بے وقوف تھے؟ یہ تو وہ حربہ ہے جو پہلے بھی استعمال کیا جاتا رہا اور اب بھی یہی ہوتا ہے کہ:

جو سمجھا مرا کام خطرے میں ہے
تو کہتا ہے اسلام خطرے میں ہے

نجاشی کے سامنے یہ صورتِ واقعہ دفعۃً ہی آئی تھی۔ مذہبی انسان کے لیے کسی نئے مذہب کا ذکر قدرتی طور پر باعثِ دلچسپی ہو جاتا ہے۔ نجاشی کو ایک تو یہ شوق ہوا کہ ذرا اس نئے مذہب کا حال چال تو معلوم کریں۔ دوسرے اس کے جذبۂ عدل نے یہ گوارا نہ کیا کہ یک طرفہ بیان سن کر فیصلہ دیدیا جائے اور دوسرے فریق کا کوئی بیان ہی نہ سنا جائے۔ چنانچہ نجاشی نے دریافت حال کے لیے مسلمانوں کو بلوا بھیجا۔

سیدنا جعفر بن ابی طالب مسلمانوں کے نمائندے بن کر گئے۔ دربار سجا ہوا ہے۔ مجمع اس انوکھے مقدمے کی کارروائیاں دیکھنے سننے کا مشتاق ہے۔ قریشی وفد کو اپنے حامی پادریوں کی تائید و وکالت پر اعتماد اور مقدمہ اپنے حق میں ہونے کا یقین ہے۔ ادھر رسول اللہ کا عمزاد بھائی جعفر طیار اپنی بے پناہ قوتِ یقین و ایمان کا لشکر اپنی جلو میں لیے ہوئے پہنچ جاتا ہے۔ اُدھر ساری خدائی ہے اور اِدھر

صرف ایک خدا۔ جعفرؓ نے نجاشی کو سلام تو کیا لیکن رائج الوقت درباری آداب کے مطابق سجدہ نہ کیا۔ نجاشی نے پوچھا، تم بادشاہ کو سجدہ کیوں نہیں کرتے؟ فرمایا: ہم لوگ اللہ کے سوا اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ پوچھا: یہ کیوں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا ہے جس نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہ کریں اور اسی نے ہمیں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے ——— گفتگو چل پڑی اور نجاشی نے حقیقت حال دریافت کی تو یہ نڈر بندۂ خدا ہاشمی بلاغتِ زبان کو اور اس سے زیادہ ایمانی جرأتِ صاف گوئی کو حرکت میں لایا۔ غیر مسلم ابوطالب کے اس نومسلم طالبِ حق فرزند نے دربارِ نجاشی میں اپنے حق پرستانہ خطبے کی ایک ایسی گونج پیدا کی جسے اہلِ بلاغت نے "ابلغ الخطبات" کی سند بخش دی۔ اس نے کہا:

"اے فرمانروا! ہم لوگ جاہلیت والی قوم تھے۔ بُت پرست تھے اور مردار خوار۔ بے حیائی کے مرتکب ہوتے قطع رحمی کرتے اور پڑوسی کا کوئی حق نہ پہچانتے تھے۔ طاقتور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ آخر اللہ نے ہماری طرف ایک رسول بھیجا۔ جس کے نسب، صداقت، امانت اور پاکدامنی سے ہم اچھی طرح واقف تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا کہ اس کی توحید کے قائل ہو جائیں۔ اسی کی عبادت کریں۔ اس کے سوا جن پتھروں اور بتوں کی ہمارے اسلاف عبادت کیا کرتے تھے ان کو ترک کر دیں۔ نیز اس نے ہمیں سچائی، امانت داری، صلۂ رحمی، حسن ہمسائگی کا حکم

دیا اور بے حیائی، خوں ریزی، جھوٹی گواہی سے، نیز یتیم کا مال کھانے اور کسی پاک دامن پر تہمت لگانے سے روکا۔ ہمیں اس نے یہ بھی حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔"

پھر جعفر نے کئی اسلامی احکام بیان کرنے کے بعد کہا:

"پھر ہم نے اس رسول کی تصدیق کی۔ اس پر ایمان لائے اور اس کے احکام کی پیروی اختیار کی۔ مگر ہماری قوم نے ہم پر ظلم شروع کر دیے۔ ہمیں سزائیں دیں۔ ہمیں ہمارے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ اور ہم پر جفائیں کرتے رہے۔ آخر ہم لوگ آپ کی سرزمین پر آ گئے اور دوسروں پر آپ کو ترجیح دی اور آپ کی ہمسائگی کو اس توقع پر پسند کیا کہ یہاں ہم پر ظلم نہ کیا جائے گا۔"(۱)

جعفر کی اس تقریر سے مجمع کا رنگ بدل گیا۔ نجاشی کو کچھ اور معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس نے پوچھا: وہ شخص جو پیغام وحی لایا ہے اس کا کوئی حصہ تمہارے پاس ہے؟ جعفر نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے چند آیات قرآنی تلاوت کیں۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ان پانچ سالوں میں قرآن کریم کے بہت سے حصے نازل ہو چکے تھے لیکن جعفر نے

---

(۱) رواہ الطبرانی فی الکبیر و البزار

ان سب میں سے ایسی آیات کا انتخاب کیا جو ان کی موقع شناسی اور بلاغت کے کمال کی دلیل ہے۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ جعفر ایک مسیحی فرمانروا کے سامنے سوال و جواب کر رہے ہیں۔ اس کا ذہن فطری طور پر مسیحؑ و مریمؑ ہی کے ذکر کو پسند کر سکتا تھا۔ جناب جعفرؓ نے اس کے سامنے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات تلاوت کیں جو حسن اتفاق سے ماضی قریب ہی میں نازل ہوئی تھیں۔

مسیحی فرمانروا کا دربار اور جعفرؓ کی زبان دُربار اور تلاوت بھی سورۂ مریم کی۔ کیا سماں بندھا ہوگا؟ اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ نتیجہ یہ ہوا کہ نجاشی اور اس کے وہ سارے پادری جو وفد قریش کے تحائف لے کر حمایت کا وعدہ کر چکے تھے۔ اپنی آنکھوں پر قابو نہ پا سکے اور بے اختیار آنکھوں سے گنگا جمنا بہنے لگی۔ نجاشی کی روح کی گہرائیوں میں جو تاثر پیدا ہوا وہ یہ الفاظ بن کر زبان پر آیا کہ: "یہ کلام اور وہ کلام جو موسیٰ پر اترا تھا دونوں کے دونوں ایک ہی منبع نور سے نکلی ہوئی شعاعیں ہیں۔"

پھر وفد قریش کے دونوں رئیسوں سے کہا کہ: "تم چلے جاؤ۔ میں کبھی ان لوگوں (مسلمانوں) کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔" اور پھر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ: تم جا کر میری مملکت میں امن کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ پھر تین بار کہا کہ: تمہیں کوئی گالی بھی دے گا تو اس پر تاوان لگے گا۔

دیکھیے وفد قریش کیا امیدیں باندھ کر آیا تھا اور نتیجہ کیا نکلا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں اسلام جلتے میں اثر انداز نہ ہو۔ لیکن اس کے لیے راستے

کو ان کے وفد نے اپنے ہی ہاتھوں سے ہموار کر دیا۔

روایت کی یہ نوعیت تو طبرانی اور بزار کی ہے لیکن طبرانی ہی کی ایک دوسری روایت عبداللہ بن مسعود سے اور نیز مسند احمد میں ام سلمہ سے مذکور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور واقعہ بھی ہوا جو دوسرے دن پیش آیا ہوگا۔ یہ ظاہر ہے کہ وفد قریش کو اپنے مقصد میں رسوا کن ناکامی ہوئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور پھر قسمت آزمائی کے لیے دربارِ نجاشی میں رسائی حاصل کی۔ اس وقت اس وفد نے ایک بڑی نفسیاتی چال چلی۔ نجاشی کو یہ کہہ کر برانگیختہ کرنا چاہا کہ: "حضرت عیسیٰ کے متعلق جو عقیدہ آپ رکھتے ہیں اس کی یہ لوگ مخالفت کرتے ہیں"۔ ایک مسیحی کو برانگیختہ کرنے کے لیے اس سے بہتر حربہ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال نجاشی نے دریافت کیا کہ، تم لوگ جناب عیسیٰ اور حضرت مریم کے متعلق کیا کہتے ہو؟" مسلمانوں نے جواب دیا کہ: "ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ نے کہا ہے یعنی وہ اللہ کا کلمہ اور روح اللہ ہیں جسے اللہ نے مریم عذرا بتول کی طرف القا فرمایا۔ مریم کو کسی بشر نے مَس نہیں کیا اور نہ انہیں اس سے پہلے کوئی ولادت ہوئی"۔ یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ: "اے پادریو، اور راہبو! اس بیان کردہ حقیقت پر تم لوگ جو اضافہ و مبالغہ کرتے ہو وہ اس تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا (یعنی مسیحؑ اتنا ہی بھر ہیں جتنا یہ مسلمان بیان کرتے ہیں)۔ پھر نجاشی نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"مسلمانو! میں تمہیں اور تمہارے لائے ہوئے پیغامِ محمدیؐ کو خوش آمدید کہتا ہوں بلکہ اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور یہ وہی ہے جس کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں،

اور جس کی بشارت حضرت عیسیٰ نے دی ہے۔ تم جاؤ اور جہاں چاہو رہو۔ اگر میں حکومت کے جھنجھٹ میں نہ پھنسا ہوتا تو خود حاضر ہو کر اس کی جوتیاں اٹھاتا اور اس کے لیے وضو کا پانی لاتا"

اس کے بعد نجاشی نے حکم دیا کہ اس قریشی وفد کے تمام تحائف واپس کر دیے جائیں۔ جناب ام سلمہ کی روایت میں ایک اہم چیز کا اور بھی ذکر ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ:

"اس کے بعد ہم لوگ وہاں بہترین ملک میں بہترین پڑوسی کے ساتھ مقیم رہے۔ اس دوران میں نجاشی کا ایک دشمن حبشے پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت ہم مسلمانوں نے بھی (نجاشی کی طرف سے) جنگ میں شرکت کی اور یہ جنگ ہمارے لیے سب سے زیادہ اہم جنگ تھی کیونکہ ہمیں اس وقت یہ خوف تھا کہ نجاشی تو ہمارے حقوق کو جانتا پہچانتا تھا۔ اس پر کہیں ایسا شخص غالب نہ آ جائے جو ہمارے حقوق کو پہچانتا ہی نہ ہو۔"

لمحۂ فکریہ

حبشہ کے ان تمام بیان کردہ واقعات میں دو ایک نکتے قابلِ غور ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جناب جعفر کی اس تقریر میں جو انہوں نے نجاشی کے دربار میں کی تھی نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کے حکم کا بھی ذکر ہے (بعض روایات میں روزے کا بھی ذکر ہے) سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت، تو ہجرتِ مدینہ کے بعد ۲ھ کے لگ بھگ نازل ہوئی تھی۔ پھر یہ کون سی

زکوٰۃ ہے جس کا جعفر طیار ذکر کر رہے ہیں؟ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مکی آیات میں دس بارہ جگہ زکوٰۃ کی ترغیب موجود ہے۔ مثلاً قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُون ... وھم للزکوٰۃ فاعلون وغیرہ۔ حکم تو کسی کی آیت میں نہیں مگر بڑی زوردار ترغیبات موجود ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کس قسم کی زکوٰۃ تھی جس کا کئی جگہ مکی آیات میں ذکر ہے اور جس کا جناب جعفر اپنی تقریر میں ذکر فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں زکوٰۃ کی وہ نوعیت نہ تھی جو مدنی زندگی میں متعین ہوئی۔ مدنی زندگی میں اس کی نوعیت یہ رکھی گئی کہ اتنے سونے میں اتنی زکوٰۃ، اتنی چاندی میں اتنی، اتنے اونٹوں، گایوں اور بکریوں میں اتنی اور اتنی پیداوار میں اتنی زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے اور اس میں بھی فلاں فلاں شرطیں ہیں۔ یہ تفصیلات نہ قرآن میں ہیں اور نہ مکی زندگی میں تھیں۔ اس کے باوجود وہ بھی زکوٰۃ ہی تھی اور جو تفصیلات مدنی زندگی میں آنے کے بعد احادیث سے معلوم ہوتی ہیں وہ بھی زکوٰۃ ہی ہے۔ یقینی بات ہے کہ مکی زندگی میں زکوٰۃ کا سسٹم کچھ اور ہوگا اور مدنی زندگی میں اس کا نظام کچھ اور ہوگیا۔ لیکن زکوٰۃ دونوں ہی کو کہا گیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ قرآن کریم نے جو زکوٰۃ کی تفصیلات نہیں بتائیں اور مکی و مدنی دونوں زکوٰتوں کو زکوٰۃ ہی قرار دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تفصیلات و شرائط متبدّل قدریں ہیں۔ ابدی اور غیر متبدّل اقدار نہیں۔ زمان و مکان اور احوال و ظروف کے تقاضوں سے ان کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ زکوٰۃ کا حکم اور اس کی اسپرٹ تو وہی رہے گی جو شروع سے ہے لیکن اس کے سسٹم میں بوقتِ ضرورت ردّ و بدل کی گنجائش رہے گی۔

نماز کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے کہ نمازِ پنجگانہ ہجرت سے ایک

سال قبل شبِ اسرا میں فرض ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس سے بارہ سال پہلے تک نمازِ پنجگانہ نہ تھی۔ غالباً صبح شام کی تھی اور وہ بھی نماز ہی تھی۔

یہاں پھر ہم اسی بات کو دہراتے ہیں کہ نماز و زکوٰۃ وغیرہ اگرچہ دیر میں فرض ہوئی ہوں لیکن پیغمبر کا رُخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے۔ ہمیں بہت سے احکام ایسے ملتے ہیں جن پر حضورؐ عمل پہلے ہی سے کرتے رہے اور اس کی آسمانی توثیق (CONFIRMATION) بعد میں ہوئی۔ حضورؐ نے ہجرت کے بعد مدینے پہنچنے سے پہلے قبا میں پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ اس وقت تک جمعہ فرض نہ ہوا تھا لیکن بعد میں وحی الٰہی نے نمازِ جمعہ پر مہرِ توثیق ثبت کر دی۔

قتال فی سبیل اللہ کی بحث

دوسرا نکتہ واقعاتِ حبشہ میں یہ ہے کہ بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ایک عیسائی کی حمایت میں دشمن حملہ آور سے جنگ کی۔ لیکن جہاں تک ہم غور کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ جنگی شرکت اسی وقت ہوئی ہے جب نجاشی تصدیقِ نبوت کر چکا تھا۔ اس کی تصدیق ہی کی وجہ سے حضورؐ نے غزوۂ خیبر کے موقعے پر وفاتِ نجاشی کی خبر سن کر اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی تھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے جس نجاشی نے قریشیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حمایت کی اور امن سے رہنے کی اجازت دی وہ اور ہے۔ اور جو اسلام لایا اور جس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی وہ دوسرا ہے جو پہلے کا جانشین ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ یہی درست ہو لیکن سر دست اس قسم کی

تفاصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ اگر پہلے نجاشی کی طرف سے مسلمانوں نے جنگ کی ہو یا اس کا ارادہ کیا ہو تو یہ احسان مندی اور شکر گذاری کا ایک تقاضا تھا اور اس وقت جب کہ قتال کا کوئی تفصیلی حکم نازل نہ ہوا تھا، اہلِ اسلام کا جنگ کرنا ایک ایسا اجتہادی فعل تھا جو تقاضائے حکمت کے مطابق تھا۔ یہ جنگ غیر اسلامی عیسائیت کی حمایت کی نیت سے نہ تھی بلکہ یہ حمایت تھی "کافر" کی "اکفر" کے مقابلے میں۔ اور کافر بھی وہ جو نیکدل ہے۔ شریف ہے، محسن ہے۔ اسلام کی تعلیمات سے اور اہل اسلام کے کردار سے متاثر ہے اور بڑے کافروں کے مقابلے میں اہل اسلام کے احترام و حمایت کا اعلان کرتا ہے۔ اس جنگ یا ارادہ جنگ کو کسی طرح بھی "قتال فی سبیل الطاغوت" کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اور نہ "قتال فی سبیل الکفر" کے جواز کے لیے اسے سند بنایا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس وقت تک قتال کے متعلق کوئی حکم ہی نازل نہ ہوا تھا اور نہ فی سبیل اللہ اور فی سبیل الطاغوت کے فرق کو ممتاز کرنے والے مفصل احکام بتائے گئے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ قتال درحقیقت اپنی امتِ مسلمہ کے تحفظ کی نیت سے تھا جسے دوسرے لفظوں میں "قتال فی سبیل المسلمین" کہا جا سکتا ہے۔ یہ مسلمانانِ حبشہ کا ایک اجتہاد تھا اور صحیح اجتہاد تھا۔ حضورؐ کے فیض یافتوں میں ابتدا ہی سے اس صلاحیتِ اجتہاد کا پایا جانا کون سی تعجب کی بات ہے؟

بصیرتِ نبوی

یہاں یہ چیز بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حضورؐ کبھی حبشے تشریف نہیں لے گئے۔ دوسرے اہل مکہ آتے جاتے رہتے تھے۔ لیکن حبشے کو

ہجرت کے لیے انتخاب کرنے میں حضورؐ کی بصیرت و فراست کتنی صحیح ثابت ہوئی اور قریش کا اندازہ کتنا غلط نکلا۔ حضورؐ صرف صاحب وحی ہی نہ تھے عقل و بصیرت بھی کمال درجے کی رکھتے تھے اور زندگی کے ہر مرحلے پر اس کی شہادت ملتی ہے۔ اور بات صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ حضورؐ کا اصلی کمال یہ تھا کہ اپنی امت میں بھی وہی عقل و بصیرت اور وہی فہم و فراست پیدا کر دی جو انہیں امامتِ اقوام کا اہل بنا دے۔ مسلمانانِ حبشہ کا جنگی اجتہاد بھی اسی تربیتِ نبوی کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا۔ نری کورانہ تقلید نبوی تعلیم کے سراسر منافی ہے۔ خدا خود اپنے احکام کی کورانہ تقلید نہیں پسند فرماتا تو نبی کس طرح پسند فرما سکتا تھا۔ خدا بھی بار بار انسانوں کی عقل و بصیرت کو دعوت دیتا ہے اور اپنے احکام کی ایسی پیروی چاہتا ہے جو سمجھ بوجھ اور عقل و بصیرت کی بنیاد پر ہو۔ وہ عباد الرحمٰن کا انداز و وصف یوں بیان فرماتا ہے کہ:

وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ۝ ۲۵: ۷۳	رحمٰن کے بندے وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں آیاتِ ربانی یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے (بلکہ عقل و بصیرت سے اس کی حکمت کو بھی سمجھتے ہیں)۔

جب خدائی احکام کا یہ حال ہو تو تا بہ دیگراں چہ رسد؟ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات جب کورانہ تقلید اور نیچے اتر کر شخصیت پرستی تک پہنچ جائے اور اپنی عقل و بصیرت کو سوخت کر دے تو انسان میں مشرک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جزئیات میں بھی اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وہ کورانہ تقلید ہے جس کے متعلق مولانا رومی نے کہا

ہے کہ:

چندصد لعنت بریں تقلید باد

تقلید کا ایک ضروری پہلو

لیکن تقلید کا یہ پہلو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ہر کس و ناکس اجتہاد کا اہل نہیں ہوسکتا۔ ہر ایک کے لیے ابتدائی مراحل میں تقلید ضروری ہے۔ عقلی ناپختگی کی حالت میں تقلید ہی تنہا سہارا ہوتی ہے۔ لیکن تقلید مقصود نہیں ہوتی بلکہ اسی تقلید کی مدد سے بتدریج اسے اجتہاد کے مقام پر پہنچانا مقصود ہوتا ہے۔ دنیا کی بے شمار اقدار ایسی ہیں جو اپنی متضاد قدروں کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ جنگ بجائے خود بدامنی ہے لیکن اسی ذریعے سے امن کا قیام عمل میں آتا ہے۔ آپریشن موجب صد آلام ہے لیکن آرام اسی کے وسیلے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی صورت اجتہاد کی بھی ہے۔ یہ بھی تقلیدی تربیت ہی کے واسطے سے پیدا کیا جاتا ہے۔ مقصد مقام اجتہاد کا حصول ہے اور تقلید صرف ایک گزرگاہ ہے۔ مقصود نہیں۔ ایک خام عقل بچے کے لیے والدین یا استاد کی ہر ہر مرحلے پر تقلید ضروری ہے لیکن یہ کُلّی تقلید ہوتی ہی اس لیے ہے کہ تدریجاً وہ اپنی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی پیدا کرتا جائے اور تقلید سے آزاد ہوتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ وہ چند اصول کا پابند رہ کر جزئیات میں خود مختار "مجتہد" ہو جائے اور اپنے مربیوں کی تقلیدی پابندیوں کا محتاج نہ رہے۔ دوسری اقدار کی طرح یہ عمومی اختیار بھی ایک ایسی قدر ہے جو اپنی متناقض قدر ـــــ جبر ـــــ سے شروع ہوتی ہے اور بتدریج اختیار پر آکر ختم ہوتی ہے۔ تقلید و اجتہاد بھی اس سے کچھ مختلف چیز نہیں۔

ہمارا موضوع "سیرتِ رسول ؐ میں اقدار کی محافظت" ہے اس لیے تقلید و اجتہاد پر تفصیلی بحث ہمارے موضوع میں داخل نہیں لیکن نبوی سیرت میں چونکہ متعدد مراحل پر یہ چیز سامنے آئے گی اس لیے یہاں ایک بات اور بھی کہنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن میں کہیں یہ مذکور نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے۔ احادیث میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ حدیث معاذ تو اس کی سراسر نفی کرتی ہے۔ وہ مختصراً یوں ہے کہ جب حضور ؐ نے ان سے یہ سوال کیا کہ اگر تمہیں کوئی مسئلہ کتاب اور سنت دونوں میں نہ ملے تو اسے کس طرح حل کرو گے؟ جناب معاذ بن جبل نے جواب دیا کہ: اجتھد رأیی ولا آلو یعنی "اس وقت میں (کتاب و سنت کی اصولی روشنی میں) اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہ کروں گا۔" اس جواب پر حضور ؐ نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی عن معاذ)۔

اب سوال صرف یہ ہے کہ جب خدا نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا اور رسول ؐ نے اس دروازے کو (اجتہاد کے اہل کے لیے) کھول دیا تو یہ اصول کب، کیسے، کیوں اور کہاں سے بن گیا کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا اور اب ہر معاملے میں تقلید شخصی یا فرقی ہی ضروری ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اصول کہ "اب اجتہاد کا دروازہ بند ہے" خود ایک اجتہاد ہے۔ لہذا پہلے یہی دروازہ بند ہونا چاہیے۔ اگر اجتہاد کا دروازہ ہی بند تھا تو یہ اجتہاد کیوں کیا گیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے؟

حقیقت یہ ہے سیرتِ رسول ؐ نے سب سے بڑی قدر یہی قائم فرمائی ہے کہ انسانی عقل و بصیرت کو بیدار کیا ہے اور اسے کورانہ تقلید کی

تاریکیوں سے نکالا ہے۔ اور اسی کے تقاضے کے مطابق معاشرۂ انسانی کو آمریت کے جال سے نکال کر ایسی جمہوریت کی راہ پر ڈال دیا ہے جہاں کسی فرد کی حریتِ ضمیر کو کچلا نہیں جاتا۔ آگے چل کر آپ متعدد مواقع پر دیکھیں گے کہ حضورؐ نے حریتِ ضمیر کا کتنا احترام فرمایا ہے اور کس طرح اپنی رائے پر دوسروں کے مشورے کو ترجیح دی ہے۔ یہی تو وہ اقدار ہیں جن سے دنیا کو سب سے پہلے حضورؐ نے روشناس کرایا ہے اور آج صدیوں کے بعد دنیا کی بیدار قومیں اسی کو قبول کرتی جا رہی ہیں۔ اور ہماری قوم ابھی تک سیاسی اعتبار سے ملوکانہ آمریت اور مذہبی لحاظ سے شخصی تقلید کی جکڑبندیوں میں گرفتار ہے اور اسی کو عین اسلام سمجھے بیٹھی ہے۔

ترہیب کے بعد ترغیب کا نیا انداز

زورِ دارِ حق کو ہمیشہ پہلے جبر و اکراہ سے، ڈراووں اور دھمکیوں سے یا ظلم و ستم ہی سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جب اس تدبیر سے کام نہیں چلتا تو اسے ہر طرح کا لالچ دلا کر تالیفِ قلب کے ذریعے خریدنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بہادر اور ضدی ظلم و اکراہ سے دبنے کی بجائے عموماً اور زیادہ پختہ و مستقل مزاج ہو جاتا ہے لیکن انتہائی نازک موقعِ امتحان وہ ہوتا ہے جب اسے تالیفِ قلب سے خریدنے کی کوشش کی جائے۔ اس وقت بڑے بڑے استقامت پسندوں کے قدم لغزش کھا جاتے ہیں۔ یہ کردار و سیرت کے لیے شدید ترین وقتِ امتحان ہوتا ہے۔ دنیا کے بے شمار افراد

سختیاں جھیلتے ہی اس لیے ہیں کہ ان سے مطلوبہ مالی فوائد حاصل ہو جائیں۔ قریش مکہ نے جب یہ اچھی طرح تجربہ کر لیا کہ ان کی سخت گیریاں اور روح فرسا سزائیں ایک متنفس کو بھی اسلام سے برگشتہ نہ کر سکیں تو انہوں نے اپنی تدبیر اور طرزِ عمل کا رخ بدل دیا اور اب سختی کی بجائے ترغیبات سے خریدنے کی اسکیم بنائی۔ مکے کا بڑا رئیس اور سخن ساز لیڈر عُتبہ باہمی مشوروں کے بعد خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور ایک ڈپلومیٹ کی طرح ہمدردانہ لہجے میں اپنی خدمات یوں پیش کیں۔ اس نے کہا:

"اے ابنِ عم! اگر اس نئے دین کی اشاعت سے تمہارا مقصد مال و دولت جمع کرنا ہے تو ہم تمہیں مالا مال کر دیتے ہیں۔ اگر عورتوں کی خواہش ہے تو حسین ترین عورتیں حاضر کر سکتے ہیں، اور اگر قیادت و سرداری مطلوب ہے تو ہم سب تمہیں اپنا سب سے بڑا لیڈر تسلیم کرنے پر راضی ہیں مگر تم اپنی یہ تبلیغ ترک کر دو۔ اور اگر یہ کوئی خللِ دماغی ہے تو ہم اس کا علاج بھی کرنے کو تیار ہیں۔"

عُتبہ کی اس "ہمدردانہ تقریر" سے زیادہ اور کوئی ایسی چیز شاید ہی مل سکے جو کفر اور اسلام کے اندازِ فکر اور زاویہ ہائے نگاہ کے فرق کو واضح کر سکے۔ کفر ایک ایسی زندگی کا نام ہے جو تمام انسانی جدوجہد کا مآل انہی مادی فوائد کو ٹھہراتی ہے اور اس کے نزدیک انسانی کامیابیاں اس حیوانی سطح تک پہنچنے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کا تصور زر، زمین، زن اور اقتدار سے آگے نہیں بڑھتا۔ بلند انسانی اقدار کو اپنانا بلکہ انہیں سمجھنا بھی کفر کے حیطۂ فکر سے باہر ہے۔ اہلِ کفر کی نگاہ میں حضورؐ کی ساری جدوجہد اور مسلمانوں کی تمام قربانیوں کا آخری

مقصد یہی حیوانی سطح کے مطلوبات تھے۔ ان کا یہ گمان یا یہ غلط فہمی اس لیے تھی کہ اب تک ان کی زندگی کا آخری نصب العین یہی حیوانی و مادی مفادات تھے۔ اس لیے عتبہ نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے ان ہی مفادات کو حضورؐ کے سامنے پیش کیا۔ ان کی سمجھ میں ابھی تک یہ نکتہ نہ آسکا تھا کہ اسلامی آئیڈیالوجی انہی جکڑوں سے نکال کر انسان کو بلند نظری اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے روشناس کرانے کے لیے تھی اور زندگی کے متعلق نیا زاویۂ نگاہ عطا کر کے روحانی قدروں سے وابستہ کرنا اس کا اصل مقصد تھا۔

عتبہ نے جو "خطبہ" دیا اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا:

"میرے متعلق تمہاری جو خوش فہمیاں ہیں وہ بے سروپا اور غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ میں خدا کا پیغامبر ہوں۔ اصل حقیقت تمہیں ان آیاتِ قرآنی سے معلوم ہو سکے گی۔"

اس کے بعد حضورؐ نے یہ آیات تلاوت فرمائیں:

حٰمٓ ۚ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۚ كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۙ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ ۴۱: ۱تا۴	حم۔ یہ رحمان و رحیم کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات مفصل ہیں۔ عربی زبان کی ایک خواندگی ہے عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔ یہ بشیر بھی ہے اور نذیر بھی۔

عتبہ یہ کلامِ خدا رسولِ خداؐ کی زبان سے سن کر مبہوت و ششدر سا ہو گیا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر واپس چلا آیا۔ قریش کا مجمع اپنے اس نمائندے کی زبان سے سرگزشت سننے کے لیے بے چینی سے منتظر تھا۔ ایسے اہم اور فیصلہ کن مواقع پر باہمی گفتگو۔ سوال جواب اور مفاہمانہ فیصلے کی تفصیلات

سننے کا اشتیاق جس شدت کے ساتھ ہوا کرتا ہے اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ اب تک تو صرف مظالم کے حربے استعمال ہوتے رہے تھے لیکن آج ایک ایسا جدید تجربہ کیا جا رہا تھا جو پہلے نہیں کیا گیا تھا۔ ایک ایسا حربہ آزمایا جا رہا تھا جو اس سے قبل نہیں آزمایا گیا تھا۔ تخویف اور ترہیب کے سارے تجربے ناکام ہو چکے تھے اور آج آزمائش و امتحان نے اپنا رخ بدل کر ایک نئے انوکھے موڑ پر اپنا قدم رکھا تھا۔ کسی کو کامیابی کا یقین ہوگا اور کوئی ناکامی پر پہلے ہی یقین کر چکا ہوگا اور کتنے ایسے بھی ہوں گے جو بیم و رجا کی درمیانی کیفیت میں اٹکے ہوئے ہوں گے۔ ہر ایک اپنے اپنے قیاسات کے گھوڑے دوڑا رہا ہوگا اس لیے کہ آج کفر و اسلام کی زور آزمائی ایک نیا پیرہن پہن کر انوکھے انداز سے آئی ہے۔ عتبہ حضورؐ کے پاس سے روانہ ہوا۔ مجمع قریش نے دور ہی سے مضطرب نظروں اور ہمہ تن اشتیاق و انتظار کی نگاہوں سے اسے آتا ہوا دیکھا۔ عربوں میں بہتوں کو یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ دلوں کی تحریر کو پیشانی کی لکیروں میں پڑھ لیتے تھے۔ آواز سے اور چشم و ابرو کی گردش سے نیتوں کو تاڑ جاتے تھے۔ عتبہ کو دور ہی سے دیکھ کر ایک من چلے سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہہ ہی دیا کہ: "عتبہ جو چہرہ لے کر گیا تھا اس سے مختلف چہرہ لے کر واپس آرہا ہے۔" سننے والوں کا ماتھا ٹھنک گیا۔ اب ان سبھوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ عتبہ کا چہرہ جاتے وقت اور تھا اور اب اس کا نقشہ و رنگ بدلا ہوا ہے۔ مگر تفصیلات سننے کا اشتیاق سب کو بے چین کیے ہوئے تھا۔ عتبہ سے پوچھا گیا کہ، کہو کیا گزری؟ جواب میں عتبہ نے جو کچھ کہا اس سے اس قیافہ شناس کا اندازہ صحیح ثابت ہوا جس نے عتبہ کے بدلے ہوئے چہرے کو سب سے پہلے بھانپ لیا تھا۔ عتبہ نے قریشیوں کے سوال

کے جواب میں کہا:

"اے ابنائے قریش! ابھی میں نے محمدؐ کی زبان سے جو کلام سنا ہے وہ نہ کہانت ہے نہ جادو اور نہ شعر۔ میری رائے یہ ہے کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ قریش کا یہ سارا مجمع چلا اٹھا کہ: یہ لو عتبہ پر بھی محمدؐ کا جادو چل گیا۔"

ذرا اس شہادت پر غور کیجیے یہ وہ عتبہ ہے جس کی رگ رگ میں عربی خون کی طرح عربی ذہانت، عربی ثقافت، عربی بلاغت، رچی ہوئی ہے۔ اس نے جادو منتر بھی سنے ہیں۔ الفاظِ کہانت سے بھی آشنا ہے اور شعر و سخن تو اس کے گھر کی لونڈی ہے۔ نثر، نظم، کہاوت، ضرب الامثال، تعریض وطنز، مدح وہجو، عشق وتشبیب، غرض جتنی بھی اقسام سخن اور اصنافِ کلام ہو سکتی ہیں ان سب سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ قرآن کی چند آیات سن کر جو فیصلہ کرتا ہے وہ یہ ہے کہ: "یہ کلام جادو منتر نہیں، کہانت نہیں، شاعری نہیں۔ یہ تو کوئی اور ہی چیز ہے۔" یہ کون کہہ رہا ہے؟ وہ جہاندیدہ، زمانہ شناس وزمانہ ساز، رئیس وممتاز، جو پورے قریش کا نمائندہ بن کر اپنی ایمان شکن ترغیبات وتحریصات کی پیش کش لے کر تبلیغِ دین کی کمر توڑنے کے غیر متزلزل عزم کے ساتھ گیا تھا۔ اور اب واپس آکر سارے قریش کے طعنے سننا گوارا کر لیتا ہے مگر جو اثر لے کر واپس آتا ہے اسے برملا ظاہر کرنے میں پس وپیش نہیں کرتا۔

متحدہ الٹی میٹم

آج قریش کے ایک ایک فرد کو معلوم ہو گیا کہ ایک مومن کی نگاہ میں ایمانی

اقتدار کی جو قوت ہے اس کے مقابلے میں ترہیب و تعذیب کی طرح کی کوئی تحریص و ترغیب پرکاہ کے برابر بھی نہیں۔ ان کا ایمان نہ کسی سختی سے ختم کیا جاسکتا ہے نہ کسی قیمت کے عوض خریدا جا سکتا ہے۔ دنیا میں یہی دو گرم و سرد تدبیریں کارگر ہوا کرتی ہیں لیکن یہاں دونوں بے اثر ثابت ہوئیں۔

اس ناکامی نے قریش کی آتش غیظ و غضب کو اور بھڑکا دیا۔ اب انہوں نے اس دین کو ختم کرنے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ اب ان کے سارے یا اکثر قبائل نے مل کر ابوطالب کو ایک متحدہ الٹی میٹم دیدیا اور غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا کہ:

"اے ابوطالب تمہارا برادر زادہ ہمارے معبودوں کو علانیہ برا بھلا کہتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کی بھی تنقیص کرتا ہے۔ اب ہمارا پیمانۂ صبر چھلک چکا ہے۔ اب صرف دو صورتیں ہیں جن میں ایک کو تم قبول کرلو۔ یا تو محمدؐ کو ہمارے حوالے کردو ہم اس سے خود سمجھ لیں گے یا جبراً اسے اس نئے دین کی اشاعت سے روک دو۔"

ساری قوم کا ناراض ہو جانا کوئی ایسی معمولی بات نہ تھی جس کی پروا نہ کی جاتی۔ معاملہ اب انتہائی نزاکت اختیار کرچکا تھا۔ ابو طالب نے حضورؐ کو ساری قوم کی ناراضی کا واسطہ دیا۔ اور اس کے نتائج سے ڈراتے ہوئے ایک بار پھر فرمائش کی کہ ہمارے معبودوں کی تنقیص نہ کرو۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے بھی ایک بار ایک وفد ابوطالب کے پاس آکر ایسی ہی فرمائش کرچکا تھا۔ اس وقت حضورؐ نے صرف اسی قدر جواب دیا تھا کہ: "جس فرض کے لیے میں خدا کی طرف سے مامور ہوں اسے ترک نہیں کرسکتا۔" لیکن اب کے صورت حال ذرا مختلف تھی۔

ایک تو یہ بات تھی کہ اس بار تبلیغی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے تصویر کا دوسرا رخ بھی آزمایا جاچکا تھا اور ان سبھوں نے دیکھ لیا تھا کہ انتہائی مظالم کی طرح تخریص وترغیب بھی ویسی ہی ناکام ثابت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس آخری تدبیر کی ناکامی نے قریش کی آتش غیظ وغضب کو اور زیادہ بھڑکا دیا ہوگا اور اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے پہلے سے زیادہ زوردار انداز سے اب کے متحدہ الٹی میٹم دیدیا۔ اس وقت قوم پہلے سے زیادہ مشتعل تھی۔ اور ان کے اشتعال نے ابوطالب کو پہلے سے زیادہ مجبور کیا ہوگا اور ابوطالب نے بھی حضور پر اب کی مرتبہ پہلے سے زیادہ دباؤ ڈالا ہوگا۔ جب ہی تو قوم نے ایک ایسا مطالبہ پیش کردیا جو اس سے پہلے نہ کیا تھا۔ صرف دو ہی متبادل مطالبے تھے: یا حوالگی یا زبان بندی۔ پہلی چیز ابوطالب کی فطری محبت وشفقت کے بھی خلاف تھی اور عربی غیرت اور روایتی وقار کے بھی۔ اس لیے انہوں نے دوسرے ہی مطالبے کی تکمیل پر اپنا زور صرف کیا کیونکہ ان کے نزدیک اسلام کی اشاعت روک دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس سے ان کے موجودہ مشرب ومذہب کی بھی تائید ہوتی تھی۔ اور ساری قوم کی خفگی بھی دور ہوسکتی تھی۔ اسی لیے انہوں نے دو ہی باتوں کا ذکر کیا۔ ایک ساری کی ساری قوم کی ناراضی اور دوسرے اس ناراضی کی اصلی بنیاد یعنی "معبودوں" کی تنقیص۔

یہ فرمائش آج دوسری بار ایک ایسے چچا کی زبان سے ہورہی ہے جو آٹھ سال کی عمر سے اب تک اس یتیم کو اپنے فرزندوں سے زیادہ محبت ودلداری کے ساتھ رکھتا رہا ہے۔ اس احسان مندی کا بوجھ اس خفگی سے کہیں زیادہ ہے جس کا اظہار ساری قوم کررہی ہے۔ اگر قوم کا ایک

فرد بھی ناراض نہ ہوتا جب بھی اس محسن چچا کی کوئی بات ٹالی نہ جا سکتی تھی۔ اگر دنیا میں کوئی آخری بزرگانہ سہارا ہے تو یہی ابوطالب ہے۔ یہ اپنے برادرزادے سے اپنے تمام عمر کے محسنانہ برتاؤ کے سہارے قوم کی خفگی کا خوف دلا کر صرف ایک فرمائش یا اپیل کرتا ہے کہ "ہمارے بتوں کی تنقیص ترک کر دو"۔

اس فرمائش کے تیور اور الٹی میٹم کے انداز بتا رہے ہیں کہ اب کی بار پہلے سے کہیں زیادہ سیاسی اور جذباتی دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ مگر آج حضورؐ نے ابوطالب اور ان کی قوم کو جو جواب دیا ہے اسے تاریخ اپنے سینے پر ہمیشہ ابھرے ہوئے زریں حروف کی شکل میں محفوظ رکھے گی۔ اس جواب کا ایک ایک حرف مقامِ نبوت کی رفعتوں کو آشکار کر رہا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

"سنو چچا جان! اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند لا کر رکھ دیں جب بھی اپنے فرض میں کوتاہی نہیں کروں گا۔ اس راہ میں اگر میری متاعِ جان بھی جاتی ہے تو احکام خداوندی میں کوئی ردّ و بدل نہیں کروں گا۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ابوطالب کو اس سے پہلے کی گفتگو سے حضورؐ کی عزیمت و استقامت کا اور مقامِ نبوت کی بے پناہ قوتوں کا پورا اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ تاہم اُس جواب سے بھی خاصے متاثر ہوئے تھے۔ لیکن آج کے پُر جلال جواب نے حضورؐ کے غیر متزلزل عزم کے متعلق ان کے آخری شکوک یا توقعات کی رگوں کو بھی منقطع کر دیا۔

یہ بھی ایک بڑی اعلیٰ قدر ہے کہ جس نوعیت و وزن کا سوال ہو اسی نوعیت و وزن کا جواب بھی دیا جائے۔ پہلے ابوطالب کے پاس صرف ایک

وفد آیا تھا۔ اور اس کی فرمائش پر حضورؐ نے اتنے ہی وزن کے جواب پر اکتفا فرمایا۔ مگر آج ایک زوردار، خطرناک اور متحدہ چیلنج تھا۔ یہ الٹی میٹم جتنا زوردار تھا اتنا ہی پُرجلال جواب بارگاہِ نبوت سے ملا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابوطالب جتنا پہلے متاثر ہوئے اس سے زیادہ آج اثر پذیر ہوئے۔ انہوں نے حضورؐ کا دوٹوک جواب سن کر کہا:

"جانِ عم! تم جو چاہو کرو۔ میں تمہاری حمایت سے دست کش نہ ہوں گا۔"

حمایتِ ابوطالب کی نوعیت

یہ قریشی قبائل ابوطالب کو اپنا ہم مذہب سمجھ کر یہ الٹی میٹم لائے تھے انہیں توقع ہوگی کہ ابوطالب ان کے دو مطالبوں میں سے ایک کو مان لیں گے۔ لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ابوطالب بھی حضورؐ کی حمایت میں ہیں تو انہیں رائج الوقت عربی ذہنیت کے مطابق یہی گمان ہوا ہوگا کہ باوجود اعلانِ اسلام نہ کرنے کے ابوطالب کی حمایت کی نوعیت وہی ہے جو تمام عربوں میں ہوتی ہے جسے قبیلوی عصبیت کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صحیح وغلط یا حق و باطل سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ بس یہ جذبہ ہوتا ہے کہ یہ آدمی ہمارے قبیلے کا ہے لہذا اس کی حمایت ضرور کرنی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے حمیة الجاھلیة (کافرانہ حمایت) کہتے ہیں۔ حضورؐ کی اور دوسرے مسلمانوں کی ایسی حمایت اور بھی بہتیرے اشخاص نے کی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ اس نوعیت کی کوئی حمایت اگر کوئی شخص

کرے خواہ وہ قبیلوی بہ اوری کے اندر رہو یا اس سے باہر تو یہ ایک انسانی شرافت کہی جائے گی اور اس کے احسان کا بدلہ زیادہ بہتر احسان سے دیا جائے گا۔ اس دنیا میں اس کو قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ بہت سی دنیوی رعایتیں دی جائیں گی۔ یہ سب کچھ ہوگا لیکن اس کا شمار نہ تو حزب اللہ میں ہوگا نہ جماعت مومنین میں۔ لہذا آخرت میں اس کی کوئی قیمت یا وزن نہ ہوگا (فلا نقیم لھم یوم القیٰمۃ وزنا)

ابو طالب عرب کے اس قبیلوی جذبہ و ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ لہذا اپنے ہاشمی وقار کو قائم رکھنے کے لیے تمام ابنائے ہاشم کو محمدؐ بن عبداللہ (نہ کہ محمد رسول اللہؐ) کی حمایت کے لیے ایک مرکز پر جمع کر لیا۔ صرف ابولہب الگ رہا۔ باقی سارے کافر و مسلم ہاشمیوں کو سمیٹ لیا۔ اس سے ایک وقتی فائدہ تو حاصل ہو گیا لیکن دینی نقطۂ نگاہ سے ایک بڑا نقصان بھی ہوا۔ اب یہ سارا دینی جھگڑا ایک قبیلوی اور "کمونل مسئلہ" بن گیا۔ منکرین کو بھی یہ شبہ ہونے لگا کہ یہ جنگ صنم پرستی اور خدا پرستی کی یا کفر و اسلام کی نہیں بلکہ خاکم بدہن یہ سارا کھیل اقتدارِ ہاشمیت کی بقا کے لیے کھیلا جا رہا ہے ورنہ سارے مومن و کافر ہاشمی محمدؐ بن عبداللہ کی حمایت کیوں کرتے؟ بہر حال ابو طالب کی یہ حمایت ایمان و عمل اور نجات کی کسوٹی پر پوری اترے یا نہ اترے لیکن اس دنیا میں مستحق تشکر و امتنان ضرور ہے۔

اس مرحلے پر حضورؐ جس طرح بعد میں دوسرے غیر ہاشمی منکروں کی حمایت پر خاموش رہے (جس کا ذکر آگے آئے گا) اس موقعے پر بھی خاموشی اختیار فرمائی۔ اس خاموشی سے غیر مسلموں کی انسانی حمایت قبول کرنے کا پہلو تو نکلتا ہے لیکن حمیۃ الجاھلیۃ کو درست سمجھنے کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

ایمانِ حمزہؓ

ان ہی تائید ہاشمیت کرنے والے غیر مسلموں میں حضورؐ کے چچا حمزہؓ بھی تھے۔ یہ اب تک ایمان نہ لائے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے سامنا ہو گیا۔ ابوجہل عداوتِ رسولؐ میں سب سے پیش پیش تھا اور اسلام قبول کرنے والوں پر جتنے سخت سے سخت مظالم ہوئے ان میں ابوجہل ہی سب سے بڑا ہیرو تھا۔ اس کا خون یوں تو ہر وقت ہی کھولتا رہتا تھا۔ آج جو حضورؐ کو دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا۔ حضورؐ کو پہلے تو بہت بُرا بھلا کہا۔ حضورؐ کی خاموشی سے اس کا خون اور کھولنے لگا تو اس نے ایک پتھر اٹھا کر زور سے حضورؐ کی طرف پھینکا۔ یہ پتھر حضورؐ کے سر مبارک میں لگا اور سر کھُل گیا۔ اور خون بہنے لگا۔ اس کی اطلاع حمزہؓ کو پہنچی تو ان کا جوشِ ہاشمیت ابھر آیا۔ انہیں اس وقت تک نبوّت و رسالت کی تائید و حمایت سے کوئی بحث نہ تھی۔ ان کے سامنے ہاشمیت کے وقار کا سوال تھا۔ ہاتھ میں ایک کمان لیے ہوئے باہر آئے اور ابوجہل کے سر پر اس زور کی ضرب لگائی کہ اس کی کمر کمان ہو کر رہ گئی۔ اس کے بعد حمزہؓ حضورؐ کے پاس آئے اور اپنا یہ قبیلوی انتقامی کارنامہ بیان کیا۔ حمزہؓ اپنی حمیتِ جاہلیہ کی کارگزاری بیان کر کے منتظر ہوں گے کہ حضورؐ اس حرکت کی تائید و توصیف میں کچھ حوصلہ افزا کلمات فرمائیں گے۔ مگر حکیم امتؐ اور معلمِ حکمتؐ کی انگلیاں اس وقت حمزہؓ کی نفسیاتی نبض پر تھیں۔ اس وقت حضورؐ کو ایک زرّیں موقع ہاتھ آ گیا۔ اور دو لفظوں میں حمیتِ جاہلیہ اور حمیتِ اسلام کا فرق نمایاں کر دیا۔ فرمایا:

"چچا جان! میں اس انتقامی کارروائی سے خوش نہیں ہوا۔
خوش تو جب ہوتا کہ تم اسلام لے آتے۔"

حمزہ اس وقت تک تو ابوطالب کی اس پارٹی کے رکن تھے جس کی بنیاد ہاشمیت کی قبیلوی تائید پر تھی۔ مگر اب کیا ہوا؟ حضورؐ نے دو جملوں میں حمیتِ دینی اور حمیتِ قبیلوی کا فرق حمزہؓ کے دل میں اتار دیا۔ حمزہؓ نے ابھی ابوجہل کے سر پر آہنی کمان ماری تھی اور حضورؐ نے حمزہؓ کے دل پر نگاہِ نبوت کا تیر چلا دیا۔ وہ کمان بے اثر رہی اور یہ تیر ٹھیک نشانے پر پیوست ہو گیا۔ حمزہؓ اسی وقت ایمان لے آئے۔ اب ان کا زاویۂ نظر بدل گیا اور حمایتِ ہاشمیت تائیدِ حق میں تبدیل ہو گئی۔

فرزندِ خطابؓ کا ایمان

جناب حمزہؓ ایک با اثر شخصیت کے مالک تھے ورنہ ابوجہل کا جواب دینے کی ہمت کب کرتے؟ ان کی شجاعت کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ ہزار بہادروں پر بھاری سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے ان کے قبولِ اسلام نے کفارِ قریش میں ایک کھلبلی پیدا کر دی۔ ہاشمی عصبیت کی بنیاد پر تو حمزہؓ پہلے بھی حضورؐ کی حمایت کر رہے تھے لیکن اس سے اہلِ کفر میں کوئی قابلِ توجہ بے چینی نہ تھی۔ اس لیے کہ اس قسم کی قبیلوی حمیتِ جاہلیت سے وہ بہت پہلے سے آشنا تھے۔ مگر اب اسلامِ حمزہؓ نے انہیں جو چوکنا کر دیا اس کی ایک اور ہی وجہ تھی۔ آج انہیں نبوت کی قوتوں کا یہ

غیر معمولی تجربہ ہوا کہ ایک حقیقی چچا بھی جو سن میں بہت بڑا ہے اپنے برادر زادے کی نبوت کے آگے جھک گیا۔ آج کے اس غیر متوقع واقعے نے اہل کفر کو حیرت و استعجاب کا مجسمہ ہی بنا کر نہ رکھ دیا بلکہ انہیں یہ خطرہ بھی محسوس ہونے لگا کہ دوسرے غیر مسلم ہاشمی بھی اپنی قبیلوی حمایت سے بالاتر ہو کر کہیں دینی حمایت نہ شروع کر دیں۔ قبیلوی عصبیت و حمایت ان کی نگاہوں میں کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی لیکن دینی حمایت و تائید کا اندازہ انہیں ایک ایک مسلمان کی بے پناہ استقامت سے بارہا ہو چکا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دینی حمایت کی قوتوں کے مقابلے میں قبیلوی حمایت کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ قبیلوی حمایت کا جذبہ ہر خاندان میں موجود ہے۔ لیکن دینی حمایت کی غیر متزلزل قوتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ان ہی وجوہ سے اسلامِ حمزہؓ کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی اور سارے معاندین آگ بگولا ہو گئے۔ فوراً ہی باہمی مشورے ہونے لگے اور ان کے بڑے لیڈر ابو جہل نے ایک زوردار تقریر کرتے ہوئے ان کی غیرت پر تازیانے لگائے اور ترغیب کا بھی ایک انوکھا انداز اختیار کیا۔ اس نے کہا:

"تف ہے تم پر۔ ایک شخص برملا تمہارے معبودوں کی تنقیص کرے اور تم اس کا کوئی علاج نہ کر سکو۔ اب ایک آخری بات اور آخری علاج سن لو۔ جو شخص محمدؐ کا سر کاٹ کر لائے گا اسے میں اپنے پاس سے ایک ہزار اوقیہ چاندی اور سو اونٹ انعام میں دوں گا۔"

اس مجمعے میں خطاب کا فرزند عمرؓ بھی موجود تھا۔ ابو جہل کا غیرت افزا خطاب سن کر ابن خطاب اٹھا۔ اس کے سوا اس کام کی جرأت بھی کون کر سکتا تھا؟

خطاب کا یہ آتش اندر نعل فرزند بولا: "گھبراؤ مت، میں ابھی محمدؐ کا سارا قصہ ہی پاک کیے دیتا ہوں۔" ابن خطاب اس مجمع سے روانہ ہو کر گھر پہنچا۔ اپنی برہنہ شمشیر نکالی اور چل پڑا۔

آج تاریخ کائنات کی ایک ایسی دلچسپ اور عجیب و غریب ساعت آئی ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرہ ہمہ تن چشم اشتیاق بن کر ابن خطاب پر اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہے۔ آج کفر و ایمان کا ایک ایسا انوکھا معرکہ ہو رہا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ پسر خطاب کہاں جا رہا ہے؟ محمدؐ کی طرف۔ اس کے ہاتھ میں کیا ہے؟ شمشیر بے نیام۔ کیا ارادے ہیں؟ خاکم بدہن محمدؐ کا سر کاٹ کر لانا چاہتا ہے۔ کیوں؟ ایک ہزار اوقیہ چاندی اور سو اونٹ کا انعام حاصل کرنے اور اسلام کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے۔

خطاب کے اس جوشیلے فرزند کو کیا معلوم تھا کہ خالق کائنات نے اسے کس لیے پیدا کیا ہے؟ قدرت مسکراتی ہوئی اسے کشاں کشاں ایک ایسی منزل کی طرف لیے جا رہی تھی جہاں خود اس کی گردن کفر اڑنے والی تھی۔ جہاں وہ ایک دن شمشیر بکف یہ اعلان کرنے والا تھا کہ: "جو شخص رسول اللہ کو مردہ کہے گا اس کی گردن اڑا دوں گا۔" جہاں کفر و شیطنت اس کے نام سے لرزہ براندام ہوں گے۔ جہاں کروڑوں اوقیہ سونا چاندی اس کے قدموں میں آئیں گے اور وہ ادھر رخ بھی نہ کرے گا۔ جہاں وہ فرماں روائی کی ایسی اعلیٰ اقدار عطا کرے گا جو ہمیشہ آئیڈیل کا کام دیتی رہیں گی۔

آگے کیا ہوا اس کی تفصیلات احادیث و سیر کی تمام صحیح روایات میں موجود ہیں۔ لیکن ہم ان سب کو چھوڑ کر بزار کی وہ روایت نقل کرتے ہیں

جس میں سیدنا عمرؓ اپنے اسلام کا قصہ خود اپنی زبان سے بیان فرماتے ہیں جس کی داستان ہے۔ اسی کی زبان سے سنیے۔ جناب عمرؓ فرماتے ہیں:

"میں حضورؐ کے حق میں (قبل از اسلام) سب سے زیادہ سخت انسان تھا۔ ایک دن میں مکّے کے ایک راستے میں تھا کہ ایک قریشی[1] نے مجھے دیکھا اور پوچھا: کدھر جا رہے ہو ابن خطاب! میں نے جواب دیا: اس شخص (حضورِ اکرمؐ) کے قتل کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے کہا: تم یہ کہہ رہے ہو اور خود تمہاری بہن[2] اسی کے راستے پر لگ گئی ہے۔ میں غصے میں بھرا ہوا وہاں سے لوٹا اور بہن کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا — حضورؐ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی بے مایہ شخص اسلام لاتا تو ایک یا دو آدمی کو کسی کے سپرد فرما دیتے جو اس نومسلم کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرتا۔ ایسے دو نومسلموں کو میرے بہنوئی[3] کے سپرد بھی فرما دیا تھا — خیر جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے آواز آئی: کون ہے؟ میں نے کہا: عمر۔ اس وقت ان کے ہاتھوں میں ایک صحیفہ تھا جو وہ پڑھ رہے تھے۔ میری آواز سنی تو اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک جگہ چھپ گئے[4] اور کتاب

---

(۱) ان کا نام نعیم بن عبداللہ ہے (۲) فاطمہؓ بنت خطاب (۳) سعید بن زید (۴) ان میں حضرت خباب بھی تھے جو بعد میں حضرت عمرؓ کو ساتھ لیکر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے ہیں۔ جناب فاطمہؓ بنت خطاب انہی (خبابؓ) سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔

وہیں چھوڑ دی۔ جب میری بہن نے دروازہ کھولا تو میں نے کہا: اپنی جان کی دشمن! تو صابئی[1] ہو گئی ہے؟ یہ کہہ کر میں اس کے سر پر مارنے لگا۔ وہ رو رو کر کہنے لگی: ابن خطاب! تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ میں تو اسلام قبول کر چکی ہوں ــــــ میں وہاں سے ہٹ کر تخت پر بیٹھ گیا اور صحیفے پر نظر پڑی۔ میں نے پوچھا یہ صحیفہ کیسا ہے؟ بہن نے کہا: اسے رہنے دو تم نہ غسل جنابت کرتے ہو نہ طاہر رہتے ہو۔ اسے صرف پاکیزہ لوگ ہی چھوا کرتے ہیں۔ میں اصرار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے مجھے وہ صحیفہ دے دیا۔ اس میں لکھا تھا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں نے جب الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھا تو مجھے معاً وہ لفظ یاد آ گیا جس سے یہ دونوں لفظ مشتق ہیں[2]۔ پھر میں متوجہ ہوا تو یہ پڑھنے لگا سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ پڑھتے پڑھتے میں اس آیت پر پہنچا:۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ پس میں بے اختیار کہہ اٹھا کہ:۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہ سن کر چھپے ہوئے آدمی باہر نکل آئے اور خوشی کے مارے تکبیر بلند کرنے لگے

---

(۱) مسلمانوں کو کفار عموماً صابی کہا کرتے تھے۔ آگے چل کر حضرت عمرؓ نے بھی اپنے اسلام کا اظہار اسی لفظ سے کیا ہے جو یا تو طنزاً ہے یا نقلاً۔ (۲) یعنی لفظ رحیم جس میں رحم مادر اس کی رحمت اور صلۂ رحمی سب ہی کے تصور موجود ہیں۔

اور کہا کہ: اے ابن خطاب! مبارک ہو۔ اس دو شنبے کو حضورؐ نے دعا فرمائی تھی کہ "اے اللہ! عمر بن خطاب اور عمر بن ہشام (ابو جہل) میں سے جو تجھے زیادہ پیارا ہو اس کے ذریعے سے اس دین کو تقویت پہنچا۔" ہم سبھوں کو یہی توقع تھی کہ اس دعائے نبوی کی قبولیت تمہارے ہی حصے میں آئے گی۔ میں نے کہا کہ "مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ حضورؐ کہاں تشریف فرما ہیں؟ جب ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں سچے دل سے ایمان لا چکا ہوں تو مجھے حضورؐ کی خدمت میں لے کر روانہ ہوئے۔ جب میں وہاں[1] پہنچا تو دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی نے پوچھا: کون ہے؟ میں نے جواب دیا عمر۔ ان لوگوں کو علم تھا کہ میں حضورؐ کے حق میں بہت سخت ہوں لیکن ابھی تک انہیں میرے اسلام لانے کا حال معلوم نہ تھا اس لیے کسی نے دروازہ کھولنے کی جرأت نہ کی۔ آخر حضورؐ نے فرمایا: کھول دو دروازہ۔ اگر اللہ اس (عمر) کی بھلائی چاہے گا تو اسے ہدایت دے گا۔[2] "غرض دروازہ کھلا اور

---

(۱) اس وقت ارقم بن ابی ارقم کے گھر پر تھے۔ یہی تبلیغی مرکز تھا۔ (۲) ایک روایت میں ہے کہ حضرت حمزہؓ بھی یہیں موجود تھے اور انہوں نے جرأت سے کہا کہ: "دروازہ کھول دو۔ اگر عمر بُرے ارادے سے آیا ہے تو اسی کی تلوار ہو گی اور اسی کی گردن۔" جناب حمزہؓ کی یہ وہ شجاعت تھی جس نے ان کے اسلام لانے کے بعد منکروں میں کھلبلی پیدا کر دی تھی۔

دو آدمیوں نے میرے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا اور میں حضورؐ کے قریب آگیا۔ حضورؐ نے فرمایا: انہیں چھوڑ دو پھر میں حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضورؐ نے میرے گریبان کو پکڑ کر فرمایا: "ابن خطاب! اسلام لے آؤ۔ (پھر دعائیہ انداز سے فرمایا) اے اللہ انہیں ہدایت دے۔ میں بیساختہ بول اٹھا کہ: اشھد ان لا الٰہ الا اللہ و اشھد انک رسول اللہ ۔ پھر تو مسلمانوں نے وہ نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ مکے کی گلیوں میں آواز گونجنے لگی۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت تک "ستر" ہو چکی تھی۔ اس وقت جب کوئی اسلام قبول کرتا اور لوگوں کو اس کا علم ہوتا تو لوگ اسے ٹھونکتے تھے اور اگر اس کا بس چلتا تو وہ بھی (اپنے بچاؤ کے لیے) جواب دیتا۔ میں اسلام لانے کے بعد ایک شخص کے پاس آیا اور دروازہ کھٹکھٹایا وہ باہر آیا تو میں نے کہا: "تجھے معلوم ہے میں "صابی" ہو گیا ہو گیا ہوں۔ وہ یہ کہتا ہوا گھر میں گھس گیا کہ "ایسا نہ کرنا" اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں دوسرے کے پاس گیا اور وہاں بھی بالکل اسی طرح کا سوال و جواب ہوا اور اس نے بھی دروازہ بند کر لیا۔ میں نے کہا: "یہ تو کوئی لطف کی بات نہ ہوئی۔" آخر ایک شخص نے مجھ سے کہا: کیا تم یہ چاہتے ہو

---

(۱) دوسری روایتوں میں یہ تعداد ۳۹ ہے جن میں ۳۳ مرد اور ۶ عورتیں تھیں۔

(۲) اس کی مثال بہت کم ہے کہ مسلمانوں نے بھی جواب میں کسی کو مارا ہو۔

کہ لوگوں کو تمہارے اسلام لانے کا علم ہو جائے؟ میں نے کہا: ہاں ہاں۔ اس نے بتایا کہ: جب لوگ حجر کعبہ کے پاس جمع ہوں تو تم فلاں آدمی سے یوں کہو کہ "دیکھو یہ بات میرے تمہارے درمیان ہی رہے۔ میں صابی ہو گیا ہوں۔ سمجھ گئے؟" وہ آدمی کسی بات کو راز میں رکھنے کا عادی نہیں۔ غرض میں نے اسی رائے پر عمل کیا تو وہ شخص کھڑا ہو کر بڑے زور سے چلایا کہ: ارے سنتے ہو لوگو! عمر بھی صابی ہو گیا ہے۔ یہ سن کر سب کے سب مجھ پر جھپٹ پڑے۔ دیر تک وہ سب مجھے ٹھونکتے رہے اور میں ان کی مرمت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ میرا ماموں بھی آ گیا اور اسے بتایا گیا کہ عمر بھی صابی ہو گیا ہے۔ بس اس نے حجرہ میں کھڑے ہو کر آواز دی کہ: ہاں خبردار! میں نے اپنے بھانجے کو پناہ دے دی ہے۔ یہ سن کر لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ مگر میں یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی دوسرا مسلمان پٹتا رہے اور میں اس کا تماشا دیکھتا رہوں۔ میں نے سوچا کہ یہ کوئی لطف کی بات نہیں کہ مسلمان پٹتے رہیں اور میں نہ پٹوں۔ لہٰذا جب لوگ حجر میں اکٹھا ہوئے تو میں نے اپنے ماموں کے پاس آ کر کہا کہ: تیری پناہ تجھ ہی کو مبارک ہو۔ میں اسے قبول ہی نہیں کرتا۔ اس نے کہا: ارے ایسا نہ کرو۔ مگر میں نے اس کی بات مانی ہی نہیں۔ اس کے

بعد یہ ہوا کہ میں برابر پٹتا بھی رہا اور پیٹتا بھی رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب کر دیا۔"

ہم نے سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے کے واقعے کی تفصیل بزّار کی روایت سے اس لیے لی ہے کہ یہ خود سیدنا عمرؓ کی زبانی ان کی اپنی کہانی ہے اور ان کے مزاج سے خاصی مطابقت رکھتی ہے۔ فنِ حدیث کے لحاظ سے اس روایت میں وہ قوت نہیں جو دوسری روایتوں میں ہے۔ اس لیے ہم نے جابجا فٹ نوٹوں میں بعض ضروری باتیں اضافہ کر دی ہیں۔ بہر حال یہ ہے وہ واقعہ جس کے بعد عمرؓ ساری عمر کے لیے بندۂ بے دام ہو گئے اور دینی سیاست عملی، اسلامی شوکت، ودبدبہ، بے لاگ عدل وانصاف اور بے داغ امامت (لیڈرشپ) کا سب سے اعلیٰ نشان ثابت ہوئے۔

سیدنا حمزہؓ کے اسلام لانے کے صرف تین دن بعد سیدنا عمرؓ ایمان لائے۔

کعبے میں علانیہ نماز

اس وقت تک انتالیس (۳۳ مرد اور ۶ عورتیں) نفوسِ قدسیہ ایمان لا چکے تھے جن میں ابو بکرؓ جیسے با اثر وزیرک، حمزہؓ جیسے شجاع و باہمت، علیؓ جیسے نڈر شیر بھی تھے۔ لیکن ابھی تک نبوّت کی شانِ جمالی ایک مظہرِ شانِ جلال کی تلاش میں تھی۔ جناب عمرؓ کی واحد ذات نے

اسلام لاکر تصویر نبوت کا یہ دوسرا رخ بھی بے نقاب کر دیا۔ مسلمان اب تک گھروں میں یا پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپ چھپ کر نمازیں ادا کرتے تھے لیکن آج اس ذات گرامی کے قبولِ اسلام کے بعد مسلمانوں کا یہ مختصر گروہ پہلی بار جوش و خروش اور جرأت و ہمت کے ساتھ علانیہ کعبے میں داخل ہوا اور ڈنکے کی چوٹ نمازِ باجماعت ادا کی۔ یہ وہی کعبہ ہے جہاں چند دنوں پہلے عین حالتِ سجدہ میں ابوجہل نے حضورؐ پر اونٹ کا اوجھ ڈلوایا تھا مگر آج عمرؓ کے دبدبے کے سامنے وہ بجود کھڑا ایک ایک مسلمان کو وہیں نماز ادا کرتے سن رہا ہے اور اس کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

شعب بنی ہاشم کی محصوری

ایمانِ جناب عمرؓ کوئی ایسا معمولی اور ناقابلِ توجہ واقعہ نہ تھا جو کفارِ قریش کو چونکا کر نہ رکھ دیتا۔ ان کے قبولِ اسلام سے جماعتِ مومنین کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس کی وجہ سے منکرین اور زیادہ انگاروں پر لوٹنے لگے۔ ادھر اہلِ اسلام کا ایک جدید باشوکت دور شروع ہوا اور اُدھر اہلِ کفر میں ایک نئی تحریک کی لہر دوڑ گئی۔ اب ہم ۷ نبوت میں قدم رکھ رہے ہیں جب کہ مسلمانوں کو عموماً اور ابنائے ہاشم کو خصوصاً ایک شدید قسم کے دورِ ابتلاء و امتحان سے گزرنا پڑا اور مسلسل تین سال (۱۰ نبوت) تک روح فرسا آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ ابو طالب نے ہاشمی اقتدار کو (نہ کہ اسلامی وقار کو) باقی رکھنے کے لیے تمام ہاشمیوں کو ـــــ جس سے صرف ابولہب مستثنیٰ رہا ـــــ اپنی حمایت کے لیے ایک مرکز پر جمع کر لیا تھا۔ اس میں قبیلوی رواج کے مطابق مومن و کافر سب شریک تھے۔ ابو طالب کی اس تحریک سے وقتی طور پر منتشر قوتیں یکجا ہو گئیں لیکن دینی زاویۂ نگاہ سے غیر مسلم ہاشمیوں کی یہ حمایت ایک قبیلوی عصبیت سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ سیدنا عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد اہل کفر کی مجموعی قوت نے ابو طالب کی اس تحریک حمایت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس خالص دینی تبلیغ کو فی الواقع قبیلوی رنگ دے دیا اور اب اسلام و کفر کی یہ جنگ ہاشمی و غیر ہاشمی کی جنگ بن گئی۔ اس سے اہل کفر نے فائدہ یہ اٹھایا کہ (تمام مسلمانوں کے نہیں بلکہ صرف) بنی ہاشم کے مقاطعے کی تحریک پیش کر دی۔ اس مقاطعے میں انھوں نے ابولہب کے سوا مومن و کافر کسی کی تخصیص نہ رکھی۔ جو ہاشمی تھا وہ مقاطعے کا مستحق سمجھا گیا خواہ وہ مومن ہو یا کافر۔ اور زیادہ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جو ہاشمی نہ تھا ـــــ خواہ وہ مومن و مسلم ہی کیوں نہ ہو ـــــ مقاطعے کا سزاوار نہ سمجھا گیا۔

کافرانہ سیاست

مکی اور قریشی اہل کفر کچھ ایسے بھولے بھالے نہ تھے جو معاملات کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر رہتے۔ یہ بڑے گھاگ سیاست داں تھے۔

مقاطعے کا یہ فیصلہ یوں ہی رواداری میں نہیں کیا تھا اور خاص کر بنی ہاشم کے مقاطعے کی تخصیص بلا وجہ نہ دی۔ یہ ان کی اتنی گہری سیاسی نکتہ رسی تھی کہ اس کے بعد تائید ایزدی اور اہل ایمان کی بے پناہ قوتِ صبر و استقامت نہ ہوتی تو کفر کے غالب آجانے میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔

ذرا سوچیئے ان اہل کفر نے خاص طور پر بنی ہاشم ہی کو کیوں نشانہ بنایا؟ سارے مسلمانوں کو اس لپیٹ میں کیوں نہ لے لیا؟

۱۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابوطالب کی تحریکِ حمایت (بربنائے ہاشمیت) نے خود ہی اسلام کی عالمگیر حیثیت کو ہاشمی قبیلوی رنگ دے دیا تھا۔ ظالموں نے اسی سے فائدہ اٹھایا اور انہیں یہ پروپیگنڈے کا موقع مل گیا کہ یہ صرف اقتدارِ ہاشمیت کی قبیلوی تحریک ہے۔ کوئی دینی تحریک ہوتی تو غیر مسلم ہاشمی کیوں حمایت کے لیے کھڑے ہو جاتے؟

۲۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ غالباً وہ تمام مسلمانوں کا دفعتاً بائیکاٹ کرنے میں ایک بڑا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ اور کس کس کو مقاطعے کی لپیٹ میں لیتے؟ اگر جناب عمرؓ کا بائیکاٹ کرتے تو صرف آلِ خطاب ہی نہیں بلکہ عرب کی قبیلوی ذہنیت کے مطابق سارے ورنہ اکثر بنی عدی بھی عمر بن خطاب کی حمیت جاہلیت پر اتر آتے۔ اگر جناب عثمانؓ سے مقاطعہ کرتے تو بہتیرے یا سارے بنی امیہ ان کی حمایت میں کفارِ قریش کا ساتھ چھوڑ دیتے۔ اسی طرح جس جس قبیلے کا کوئی فرد اسلام لایا تھا اس سے مقاطعہ کرنے کا مطلب ان تمام خاندانوں اور قبیلوں کو دعوتِ مقابلہ دینا تھا اور وہ سب کے سب نہیں تو بیشتر افراد اپنے قبیلے کے مسلم فرد کی اسی طرح حمایت

کرنے پر آمادہ ہو جاتے جس طرح ابو طالب کی آواز پر تمام مسلم و کافر ہاشمی حمایت کے لیے مجتمع ہو گئے۔ ان سب کا مقابلہ و مقاطعہ قریش کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے بڑی دانائی کے ساتھ ابو طالب کی تحریک سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مقاطعے کو صرف بنی ہاشم تک ہی محدود رکھا۔

۳۔ مقاطعے کا یہ دائرہ محدود رکھنے میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر یہ کامیاب ہو گیا تو رفتہ رفتہ دوسرے قبائل کے مسلمانوں کو بھی اسی طرح لپیٹ میں لے لیا جائے گا۔ گویا یہ ایک پہلا تجربہ تھا جو بعد میں دوسروں پر بھی آزمایا جاتا۔

۴۔ ایک بڑا سبب مقاطعۂ بنی ہاشم کی تخصیص کا یہ بھی تھا کہ اہل کفر کو جو کچھ دشمنی تھی وہ دراصل محمدؐ رسول اللہ سے تھی۔ بنی ہاشم کے غیر مسلم بے شک ان منکروں کے ہم مذہب تھے لیکن ان سے ان کو اتنی ہمدردی نہ تھی جتنی دشمنی حضورؐ سے تھی۔ وہ یہ جذبہ رکھتے تھے کہ ان کی بلا سے غیر مسلم ہاشمی بھی ختم ہو جائیں لیکن ان کے ساتھ اگر رسول ہاشمیؐ کو بھی بے بس کر دیا جائے تو خود بخود سارا قصہ پاک ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے بھی اپنی ساری توجہ بنی ہاشم ہی کے مقاطعے پر مرکوز کر دی۔

۵۔ ایک اور مصلحت یہ بھی تھی کہ اب اسلام کچھ قوت پکڑ چکا تھا۔ عمرؓ اور حمزہؓ جیسے انسان اسلام لا چکے تھے۔ اب پہلے کی طرح صرف چند بے بسوں کا معاملہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں سختی و ظلم کی یہ شکل زیادہ آسان تھی کہ ہر ایک پر الگ الگ ظلم کیا جائے تاکہ حتی الامکان ایک دوسرے سے بے خبر رہے یا کم از کم اپنی آنکھ سے نہ دیکھے۔ اس کی یہی

صورت تھی کہ بنی ہاشم کو عام مسلمانوں سے کاٹ کر الگ کر لیا جائے تاکہ یہ عام مسلمانوں سے اور عام مسلمان ان سے بے خبر رہیں۔ اور جو مسلمان اس مقاطعے سے باہر رہیں ان پر الگ الگ سختیاں کی جائیں تاکہ جو ڈھارس اجتماعی مظلومیت میں ہوتی ہے وہ بھی نہ باقی رہے۔

۶۔ غرض یہی سب خطرات یا مصالح تھے جن کی وجہ سے معاندین نے مقاطعے کے لیے ابتداءً صرف بنی ہاشم کو نشانہ بنایا ایک بہت بڑی وجہ، جسے اصلی وجہ کہنا چاہیے، یہ تھی کہ رائج الوقت عرب کے قبیلوی دستور کے مطابق حضورؐ کو کفار قریش کے حوالے کر دینے کی ذمے داری صرف بنی ہاشم پر آتی تھی جس سے حضورؐ کے چچا اور بنی ہاشم کے سردار ابو طالب نے صاف انکار کر دیا جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کی نگاہ میں اصلی مجرم بنی ہاشم تھے جن کے تمام افراد کو ابو طالب نے اپنی قبیلوی حمایت پر اکٹھا کر لیا تھا۔ رہے دوسرے مسلمان تو ان کا جرم ان کی نظروں میں ثانوی حیثیت رکھتا تھا اور وہ ان سے بعد میں بھگت لینے پر اپنے آپ کو قادر سمجھ رہے تھے۔

غرض یہ تھی وہ کافرانہ سیاست جس نے تمام کے تمام ابنائے ہاشم کو خاص طور پر ہدف مقاطعہ بنا دیا۔

مقاطعے کی شکل

ان سب غیر ہاشمی کفار قریش نے ایک حلف نامہ لکھا کہ ان تمام بنی ہاشم سے (بجز ابو لہب کے) سلام، کلام، خرید، فروخت، اعانت، امداد، مناکحت، رشتے داری غرض ہر چھوٹے بڑے معاملے میں کامل ترک تعلق

کر لیا جائے۔ اس حلف نامے پر تمام ذمے دار اشخاص کے دستخط لیے گئے اور یہ حلف نامہ کعبے کے دروازے پر اس اعلان کے ساتھ آویزاں کر دیا گیا کہ یہ حلف نامہ اس وقت تک آویزاں رہے گا جب تک بنی ہاشم محمدؐ کو قریش کے حوالے نہ کر دیں۔

محصوری کے مصائب و آلام

تمام قبائلِ قریش کے اس اعلانِ مقاطعہ کے بعد بنی ہاشم اپنا سامانِ خورد و نوش وغیرہ لے کر ایک تنگ گھاٹی میں محصور ہو گئے۔ اور اس محصوری کے نتیجے میں دوسرے غیر ہاشمی مسلمان بھی اپنے اپنے گھروں میں گویا محصور سے ہو گئے۔ یہ مقاطعہ اور یہ محصوری تین سال (سنہ نبوی) تک جاری رہی۔ بنی ہاشم کا غلہ اور سامانِ خورد و نوش ختم ہو گیا۔ بھوک کی شدت میں درختوں کے پتے تک انہیں کھانے پڑے۔ بچے بھوک سے روتے تو ان کی آوازیں گھاٹی سے باہر تک پہنچ جاتیں۔ بعض مسلمان چوری چھپے کچھ غلہ پہنچا آتے۔ اور یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ بعض اوقات وہ کفار بھی غلہ پہنچا دیتے جن کے دل میں رحم اور انسانیت و شرافت کی رمق موجود تھی۔

منکرینِ حق ہزار ظالم و بے رحم ہوں لیکن ان سب کا یکساں ہونا ضروری نہیں۔ ان میں کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو انسانیت و شرافت کا جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ دینی یا قبیلوی اختلاف سے کسی وقت بالاتر ہو جاتے ہیں اور انسانی رحم دلی، نیکی اور ہمدردی کے تقاضے پورے کرنے میں وہ تامل نہیں کرتے۔ یہ دراصل ایسی اخلاقی قدریں ہوتی ہیں جو انہیں بہ نسبت دوسروں کے اسلام سے قریب تر رکھتی ہیں اور مستقبل

میں ان کا قبولِ اسلام زیادہ متوقع ہوتا ہے۔ اسلام ایسی نیکیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام نجاتِ اخروی کا دار و مدار صرف انہی ہی باتوں پر نہیں رکھتا، وہ آگے بھی بہت کچھ چاہتا ہے۔ لیکن جہاں تک دنیوی زندگی کے فوز و فلاح اور حسن جزا و مراعات کا تعلق ہے اسے بڑی ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ بلکہ حکیم بن حزام نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ:

"میں جاہلیت کے ایام میں کئی ایک نیک کام کیا کرتا تھا مثلاً صلوٰۃ، غلاموں کی رہائی اور صدقہ وغیرہ۔ تو کیا اب اسلام لانے کے بعد ان نیکیوں کا اجر ملے گا؟ حضورؐ نے جواب دیا کہ: جو نیکیاں تم کر چکے ہو ان ہی کی برکت سے تم نے اسلام قبول کر لیا ہے (رواہ الشیخان، عن حکیم بن حزام)۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کی نیکیاں ضائع نہیں جاتیں بلکہ ان کی وجہ سے وہ اسلام سے قریب تر رہتے ہیں اور ان ہی کی بدولت انہیں دولتِ اسلام نصیب ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ کلیہ نہیں لیکن غالب توقع یہی ہوتی ہے کہ حالت کفر کی نیکیاں اسلام کی طرف لے آئیں۔ اب رہا اخروی نجات کا معاملہ تو ایک روایت اس کے متعلق بھی سن لیجیے۔ عبد اللہ بن مسعود حضورؐ کی ایک حدیث یوں بیان فرماتے ہیں کہ:

"کوئی شخص بھی خواہ وہ مسلم ہو یا کافر جب نیکی کا کوئی کام کرے گا تو اس کا صلہ دیا جائے گا۔" ہم لوگوں نے پوچھا کہ: یا رسول اللہ مسلمان کو جو ثواب سے بہرہ مند کیا جاتا ہے اس کا تو ہمیں علم ہے لیکن کافر کو ثواب کیوں کر مل سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ:

جب وہ عطا و بخشش کرتا ہے یا صلۂ رحمی کرتا ہے یا اور کوئی نیک کام کرتا ہے تو دنیا میں اللہ تعالےٰ اسے مال و منال اور اولاد کی صورت میں اس کا صلہ دیتا ہے اور آخرت میں اس کے عذاب میں تخفیف کر دیتا ہے۔ (بزار)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے اہل کفر کو ثواب دنیا تو ضرور ملتا ہے اور آخرت کا ثواب نجات کی شکل میں نہ ہو لیکن تخفیف عذاب کی صورت پیدا کر دی جاتی ہے۔

آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ بہت سے اور منکرین اسلام نے بھی کئی موقعوں پر اہل اسلام کے ساتھ اپنی شرافت و ہمدردی کا ثبوت دیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلامی فیصلہ وہی ہے جو ان دو روایتوں سے مستنبط ہوتا ہے۔ یعنی دنیاوی نعمتوں میں اضافہ اور اخروی عذاب میں بقدر نیکی تخفیف۔ لیکن نجات کے لیے توحید اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ لازمی ہے۔ شرک کے ہوتے ہوئے نجات کے متعلق صاف قرآنی فیصلہ یہ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ...... الخ

خدا اس بات کی تو مغفرت ہی نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ "شرک" کیا جائے ....

محصوری کا اختتام

مقاطعے اور محصوری کے یہ تین سالی انتہائی آزمائش کے دن تھے،

(۱) توحید اور شرک اور ایمان و عمل اور ان کے تقاضے ایک طویل تفصیل چاہتے ہیں جس کا یہ محل نہیں۔

لیکن اس دوران میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی مرد و زن کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو یا اس کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی کفر و اسلام کے درمیان مصالحت پیدا کرنے کا خیال آیا ہو۔ یہ ایمان کی پختگی، یہ اسلامی استقامت، یہ غیر متزلزل عزیمت، یہ بلند حوصلے، ان پروانہ ہائے شمع نبوت میں کس نے پیدا کی؟ یہ تربیت تھی محمدِ عربی کی۔ یہ بلند ترین کیرکٹر تھا جناب رسالت مآبؐ کا، جسے وہ ابتدا سے دیکھتے چلے آئے تھے اور جس سے زیادہ ان کی نگاہ میں کوئی اور شے قابل اعتماد نہ تھی۔ اگر حضورؐ کی صداقت و استقامت میں انہیں ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ بھی ہوتا تو ان کے لیے ساتھ چھوڑ دینے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہ تھا۔ کون ہے جو کسی کے لیے اپنی ہر متاعِ عزیز کو اس طرح خطرے میں ڈال دے اور تین سال تک لگاتار ایسی شدید آزمائش میں بھی ثابت قدم رہے؟

ہاں ایک سوال یہاں ضرور ہو سکتا ہے کہ اسی قسم کی استقامت کا ثبوت تو ان ہاشمیوں نے بھی بہم پہنچایا جو مومن نہ تھے۔ ان میں یہ ثباتِ قدم کس نے پیدا کیا تھا؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اہل کفر اور اہل اسلام کے زاویہ ہائے نظر کا مابہ الامتیاز فرق معلوم کرنا ضروری ہے۔ اہل کفر ہونے کا یہ مفہوم بالکل نہیں کہ ان کے اندر کوئی اچھی صفت ہوتی ہی نہیں۔ یقیناً ان کے اندر بھی اعلیٰ قدریں موجود ہوتی ہیں۔ ان کا جرم صرف اسی قدر ہے کہ یا تو وہ ان اعلیٰ اقدار کے سرچشمۂ حقیقی (خدائے قدر الاقدار) سے بے تعلق ہوتے ہیں یا پھر اپنی ان اقدار کا استعمال غلط کرتے ہیں۔ ایک کافر بھی سخی ہو سکتا ہے، بہادر اور ثابت قدم ہو سکتا ہے۔ رحم دل اور ہمدرد ہو سکتا ہے صاحب علم

و حکمت ہو سکتا ہے۔ عادل و منصف ہو سکتا ہے۔ وہ کیا نہیں ہو سکتا؟ وہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کی ان تمام صلاحیتوں کا رخ کدھر ہے؟ اور وہ اپنی ان قوتوں کو کس مقصد کے حق میں صرف کر رہا ہے؟ کفر و اسلام کا فیصلہ اسی مقام پر آکر ہوتا ہے۔ بلاشبہ ہاشمی کافروں نے بھی بہ ظاہر وہی استقامت دکھائی جو مسلمان ہاشمیوں نے دکھائی۔ لیکن دونوں میں بہت بڑا اساسی فرق یہ تھا کہ مسلمانوں کی استقامت فقط خدا کی راہ میں تھی اور کافروں کی ساری ثابت قدمی صرف وقار ہاشمیت کے لیے تھی۔ دیکھنے میں پیتل بھی ویسا ہی چمکتا ہے جیسے سونا۔ لیکن پیتل پیتل ہے اور سونا سونا۔

قیاس یہ کہتا ہے کہ اس دوران محصوری میں شدائد سے گھبرا کر کافروں نے حضورؐ کو اور دوسرے مسلمانوں کو ملامت بھی کی ہو گی اور اسلامی تقاضوں کو ترک کرنے یا اس میں مداہنت پیدا کرنے کی ترغیب بھی دی ہو گی۔ لیکن قدرت کو یہ منظور تھا کہ یہ زیادہ سے زیادہ قریب رہ کر حضورؐ کے کیرکٹر، اعلیٰ کردار و اقدار، صداقت و استقامت اور حق پرستی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوں اور مستقبل میں ان ہی منکروں کی ثابت قدمی اپنا رخ بدل کر اسلام کے کام آئے۔

موسیٰ بن عقبہ عن الزہری، ابن لہیعہ عن ابی الاسود عن عروۃ بن الزبیر اور ابن اسحاق وغیرہ کی روایت کے مطابق اس تیسرے سال کے آخر میں قریش کے اس حلف نامۂ مقاطعہ کو دیمک چاٹ گئی اور اس کی خبر بھی حضورؐ نے ابو طالب کو دیدی تھی۔ یہ بھی ایک قدرتی مدد ہو گئی۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک نفسیاتی اصول ہے کہ بعض اوقات بڑے

سے بڑے ظالم کے اندر بھی ظلم کے ردِ عمل کے طور پر انسانی ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ کچھ تو بنی ہاشم کی غیر معمولی استقامت و مظلومیت نے خاموش اثر کیا اور کچھ مترکائے مقاطعہ کے اندر ردِ عمل پیدا ہوا اور ان کے ضمیر نے احساسِ ندامت کی چٹکی لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اندر ہی اس ظلم مقاطعہ کے خلاف جذبات ابھرنے لگے۔ ابوالبختری بن ہشام، مطعم بن عدی، زہیر بن ابی امیہ بن مغیرہ، زمعہ بن اسود، ہشام بن عمرو بن حارث نے اعلان کر دیا کہ: "ہم لوگ اس حلف نامے کے پابند نہیں"۔ یہ تحریک سب سے پہلے ہشام بن عمرو ہی کے دل میں پیدا ہوئی تھی اور اسی نے باقیوں سے بھی اس کا ذکر کیا اور انہوں نے اس کا ساتھ دیا۔ ابوجہل نے شدید مخالفت کی مگر موثر نہ ہوئی۔ آخر مقاطعہ ختم ہو گیا۔ تمام مسلم و کافر بنی ہاشم گھاٹی (شعب بنی ہاشم) کے حصار سے باہر نکل آئے اور باہمی قبیلوی روابط پھر قائم ہو گئے۔

محصوری سے باہر آنے کے بعد

ظاہر ہے کہ اس سہ سالہ محصوری کی ذہنی اور جسمانی آزمائشوں نے سارے محصورین کو کمزور، نحیف اور خستہ حال کر دیا ہوگا۔ حضورؐ کا حال ان سے کچھ مختلف نہ ہوگا۔ دل چاہتا ہوگا کہ کچھ آرام کر لیا جائے اور تین سال کی کمی پوری ہو جائے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں مادّی لحاظ سے جتنی آزمائشیں ہوئیں اتنا ہی زیادہ ایمانی پختگی اور عزیمت و استقامت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حصار سے باہر آتے ہی حضورؐ کی تبلیغی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ ہر گلی کوچے اور ہر مجمعے میں بے خطر پہنچ جاتے اور تبلیغِ حق کا فرض ادا فرماتے رہتے۔ ابوجہل نے جابجا پہرے بٹھا دیے اور خود بھی حضورؐ کے پیچھے پیچھے جاتا اور کہتا پھرتا

کہ: (خاک بدہنش) اس دیوانے کی بات کوئی نہ سنے ورنہ برباد ہو جائے گا۔"
اس سب کے باوجود اسلام روز بروز دلوں میں گھر کرتا اور پھیلتا گیا۔

آزمائش کا ایک اور دور (ابو طالب کی وفات)

محصوری اور مقاطعے کی بے پناہ تکلیفوں کے بعد بھی آزمائشوں کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا۔ ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ شوال سنہ ۱۰ نبوی میں حضورؐ کے شفیق چچا ابو طالب اسّی سال کی عمر میں راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ حضورؐ کو اپنے اس فداکار و جاں سپار اور بے پناہ الفت رکھنے والے چچا سے محبت نہ ہو گی۔ چچا بھی وہ جس نے حضورؐ کو آٹھ سال کی عمر سے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ اپنے فرزندوں سے بڑھ کر خیر خواہانہ کفالت کا فرض ادا کیا۔ ہر سرد و گرم میں ساتھ دیا۔ کفارِ قریش کے متحدہ الٹی میٹم کے بعد بھی حضورؐ کو ان کے حوالے نہ کیا اور سارے بنی ہاشم کو خاندانی حمایت پر اکٹھا کر لیا اور تین سال تک گھاٹی میں محصور رہ کر وہ ساری مصیبتیں جھیلیں جو دوسرے مسلمان جھیلتے رہے۔ کیا یہ تصور میں بھی آ سکتا ہے کہ حضورؐ کو ان سے غایت درجے کی احسانمندانہ محبت نہ ہو گی؟

اسی محبت اور قلبی لگاؤ کی وجہ سے حضورؐ کی دلی خواہش تھی کہ ابو طالب کی آخرت بھی ٹھیک ہو جائے۔ یقیناً حضورؐ نے اور بھی بہت سے مواقع پر انہیں اسلام لانے کی ترغیب دی ہو گی لیکن آج جب کہ یہ شفیق و مہربان چچا اپنے بسترِ مرگ پر پڑا چند لمحوں کا مہمان تھا حضورؐ نے ایک

بار پھر آخری کوشش کی کہ یہ مہربان چچا بھی کسی طرح ایمان لے آئے اور کم از کم لاالٰہ الا اللہ تو اپنی زبان سے کہہ دے۔

ایک ناخوشگوار بحث

اس مقام پر آکر تقریباً سب ہی مورخین اور سیرت نگاروں کو ایمانِ ابوطالب کی بحث میں الجھنا پڑا ہے۔ بخاری کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاتمہ ایمان پر نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے ایک بات تو یہ کہی کہ:
میں لاالٰہ الا اللہ ضرور کہہ دیتا لیکن قریش طعنہ دیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔
نیز ان کا یہ قول بھی منقول ہے کہ: میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔
نیز ایک حدیث یہ بھی ہے ابوطالب آگ کے کھولتے چشمے میں ٹخنوں ٹخنوں کھڑے ہیں جس سے ان کا دماغ پکتا رہتا ہے (یہ تخفیفِ عذاب ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں)۔ اسی طرح طبقات ابن سعد، ابوداؤد اور نسائی کی روایتوں میں بھی حضرت علیؓ کا یہ قول منقول ہے کہ مَاتَ عَمُّكَ كَافِرًا (حضورؐ! آپؐ کے چچا کی موت کفر پر ہوئی)۔

البتہ ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ: مرتے وقت ابوطالب کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ عباس بن عبدالمطلب نے (جو ابھی تک دینِ کفر ہی سے وابستہ تھے) کان لگا کر سنا اور حضورؐ سے کہا "آپؐ نے جس کلمے کی تلقین کی تھی یہ اسی کو دہرا رہے ہیں۔"

اگر ابوطالبؓ جیسا شریف انسان نجات یافتہ مومن ثابت ہو سکے تو یہ ان کے جہنمی کافر ثابت ہونے سے بدرجہا بہتر ہے۔ چنانچہ جناب مولانا شبلی نعمانی یہی رجحان رکھتے ہیں اور ابن اسحاق کی روایت سے ایمانِ ابوطالبؓ

ثابت کرنا زیادہ بہتر تصور کرتے ہیں۔ "اسنی المطالب فی ایمان ابی طالب" میں بھی مومن ہی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ابن کثیر دمشقی نے "البدایۃ والنہایہ" میں کفر ابی طالب پر بہت سے دلائل کا روایتی انبار جمع کر دیا لیکن ایک نکتے کی طرف نہ ابن کثیر کی نظر جا سکی ہے نہ مولانا شبلی کی۔ اور وہ ہے کتاب اللہ کا فیصلہ۔ یہ تو سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ آخری وقت میں حضورؐ نے انہیں کلمۂ توحید کی تلقین فرمائی۔ ایسے وقت میں اگر کوئی ایمان لے بھی آئے تو قرآنی فیصلہ اس کے بارے میں یہ ہے:

لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ	توبہ ایسے لوگوں کے لیے نفع بخش ہی
السَّيِّئَاتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ	نہیں جو برائیاں کرتے رہیں یہاں تک کہ
اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ	ان میں سے کسی پر موت آنے لگے تو وہ
تُبْتُ الْاٰنَ .. النساء (۴: ۱۸)	کہہ دے کہ اب میری توبہ .....

موت سر پر کھڑی دیکھ کر کوئی توبہ قابل قبول ہو سکتی ہے یا نہیں اس کے متعلق قرآن نے ایک اور واضح واقعے کا ذکر یوں فرمایا ہے کہ:

فَلَمَّآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ	جب فرعون ڈوبنے لگا تو پکار اٹھا کہ
اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا	میں ایمان لے آیا کہ جس خدا پر بنی اسرائیل
الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا	ایمان لائے ہیں اس کے سوا کوئی دوسرا
اِسْرَآءِيْلَ ...	الٰہ نہیں۔

بلاشبہ ابو طالب نے آٹھ سال کی عمر سے حضورؐ کی کفالت محبت کے ساتھ کی لیکن فرعون نے اسی طرح شیرخواری سے تقریباً تیس سال تک سیدنا موسیٰؑ کی کفالت کی ہے۔ وہاں تو ابو طالب کے سامنے

ہاشمیت اور برادرزادگی کی مجبورانہ عصبیت تھی اور یہاں تو جناب موسیٰؑ سے فرعون کا کوئی رشتہ خاندانی بھی نہ تھا۔ مرتے ہی وقت وہ بھی ایمان لائے اور مرتے ہی وقت فرعون بھی ایمان لایا۔ ابو طالب کا ایمان لانا ابن اسحاق کی روایت سے ثابت ہوتا ہے دراں حالیکہ بہت سی روایتوں سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اور یہاں فرعون کا ایمان لانا ایک ایسی "خدائی روایت" سے ثابت ہے جسے آیتِ قرآنی کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں دنیا کی اور کوئی روایت پیش کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔

یہ تو مسلّم ہے کہ اگر ابو طالب پہلے اسلام لا چکے ہوتے تو آخر وقت میں حضورؐ ان سے اقرار توحید کا مطالبہ نہ کرتے۔ علاوہ ازیں کوئی وجہ نہ تھی کہ کفار ان کے ساتھ بھی وہی برتاؤ نہ کرتے جو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے رہے۔ مگر ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ کفار قریش نے ان سے یہ باز پرس کبھی نہ کی کہ تم مسلمان کیوں ہو گئے؟ ان کا مطالبہ صرف یہ ہوتا رہا کہ تم اس دین کی تبلیغ کو روکتے کیوں نہیں یا محمدؐ کو ہمارے حوالے کیوں نہیں کرتے؟

بلاشبہ ابو طالب جیسے محسن عم رسولؐ کو غیر مسلم کہتے ہوئے روح لرزنے لگتی ہے۔ لیکن یہی تو وہ نازک مقامات ہوتے ہیں جہاں دینی اقدار کی پرکھ ہوتی ہے۔ رسول ہاشمیؐ اپنا ایجاد کردہ کوئی دین نہیں لائے تھے نعوذ باللہ۔ حضورؐ خدا کا دیا ہوا دین لائے تھے اور حضورؐ کی اقدار صداقت وعدالت کی صحیح پرکھ ہی یہاں ہوتی ہے کہ جو خدا کی دی ہوئی ایمانی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا اسے حضورؐ نہ مومن قرار دیتے ہیں نہ اسے دوسرے

مومنین کی طرح نجات یافتہ بتاتے ہیں حالانکہ اس سے بڑا دنیوی محسن شاید کوئی اور نہیں۔ ان جیسا محبت کرنے والا بھی اور کون ہو سکتا ہے لیکن رشتے کی بشری محبت اور چیز ہے اور دینی محبت بالکل جداگانہ شے ہے رسولؐ کی صرف محبت بے اتباع کیا کام آسکتی ہے جب کہ خدا کی محبت بھی اتباعِ محمدؐ کے بغیر بے سود ہے۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (کہہ دو اے رسول کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو پھر تو تم (صرف محب خدا ہی نہیں بلکہ) محبوب الٰہی بھی بن جاؤ گے)۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ حضورؐ کو بھی اپنے چچا ابو طالب کی جدائی کا بے حد صدمہ تھا اور اسی لیے حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے تھے لیکن یہ بھی بشری محبت تھی اور تقاضائے احسان مندی تھا۔ یہ ویسی ہی بشری محبت بھی جیسی سیدنا نوحؑ کو اپنے فرزند سے تھی۔ حضرت نوحؑ کو کنعان سے ایسی ہی محبت تھی کہ اس کے ڈوبنے کا منظر نہ دیکھا گیا اور بے ساختہ فریاد کرنے لگے کہ ۔۔۔۔۔ ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق (۱۱: ۴۵) (میرا فرزند بھی میرے "اہل" سے ہے اور تیرا وعدہ (اہل کو نجات دینے کے متعلق سچا ہے)۔ یہ بھی بشری فطری محبت تھی لیکن خدا کی بتائی ہوئی کسوٹی پر نوحؑ کا وہ محبوب فرزند پورا نہ اتر سکا کیونکہ بشری محبت اور شے ہے اور دینی محبت چیزے دگر۔

سیدنا علیؓ کے متعلق غلط فہمی

اس باب میں دو گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو ابو طالب کو صرف اس لیے مومن ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ حضرت علی رضؓ کے

والد تھے۔ اور دوسرا محض اس لیے کافر ثابت کرنے کے درپے رہتا ہے کہ وہ سیدنا علیؓ کے باپ تھے۔ یہ دونوں رجحانات غلط ہیں۔ ان دونوں گروہوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ابوطالب کے ایمان سے سیدنا علیؓ کی منزلت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور ان کے کفر سے جناب علیؓ کی ادنیٰ سے ادنیٰ تنقیص کا بھی کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر باپ کے کافر ہونے کے باوجود بیٹا مومن کامل ہو تو اس فرزند کا یہ ایسا ہی کمال ہے جیسا سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کا تھا کہ باپ بت پرست ہے اور فرزند بت شکن ہے۔ یہ مومن کی تنقیص نہیں بلکہ کمالِ ایمانی ہے۔ لہٰذا ایمانِ ابوطالب یا کفرِ ابوطالب کو اس زاویۂ نظر سے دیکھنا ہی سرے سے غلط ہے۔ صحیح نقطۂ نگاہ وہی ہے جو کتاب اللہ پیش کرے یا اس کے مطابق صحیح روایات۔

ایک پیچیدہ سوال

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرتے وقت کا ایمان مقبول نہیں تو حضورؐ نے ایسے وقت میں ابوطالب سے اقرارِ توحید کا مطالبہ ہی کیوں فرمایا؟ درآں حالیکہ نفسے چند باقی تھے اور محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق جناب عباس کو ان کے ہلتے ہوئے لبوں کی آواز سننے کے لیے کان لگانے پڑے۔ ایسی آخری گھڑی میں حضورؐ نے انہیں مسلمان کرنے کی کوشش ہی کیوں فرمائی؟ ہماری سمجھ میں اس پیچیدگی کا جو حل آسکا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت تک وہ آیت ہی نازل نہ ہوئی تھی جس میں بوقتِ مرگ توبہ کے نامقبول ہونے کا ذکر ہے۔ وہ آیت مدنی ہے اور یہ واقعہ

کی۔ پس حضورؐ کی تلقینِ توحید کی وہی صورت تھی جو حضرت ابراہیمؑ کی تھی۔ آپؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ: سأستغفر لك ربی (۱۹: ۴۷) (میں تیرے لیے اپنے رب سے مغفرت طلب کروں گا)۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ قرآن کی زبان سے سنیئے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا إِيَّاهُ. فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ.. (۹: ۱۱۴)

ابراہیمؑ کا اپنے باپ کے لیے مغفرت طلب کرنا اس لیے تھا کہ آپؑ نے اس سے اس کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن جب یہ واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہی ہے تو آپ اس سے دستبردار ہو گئے۔

تقریباً یہی صورت حضورؐ کے ساتھ بھی پیش آئی کہ ایک منافق (عبداللہ بن ابی بن سلول) کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور اگرچہ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ "تم ستر بار بھی استغفار کرو گے تو خدا انہیں بخشے گا۔" لیکن رحمتِ نبویؐ کا تقاضا ستر بار سے بھی زیادہ مغفرت طلب کرنے پر مصر تھا۔ آخر جب صاف لفظوں میں ممانعت آگئی تو حضورؐ باز آگئے۔ وہ ممانعت یہ تھی:

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَّسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبٰى... (۹: ۱۱۳)

نبی یا مومنوں کے لیے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے خواہ وہ ان کے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں دعائے مغفرت کریں۔

جونہی رحمت صاف ممانعت آنے سے پہلے مشرکوں اور منافقوں تک کو اپنی رحمت دعا سے محروم نہ کرے وہ اگر ایک مرتے ہوئے محسن کو اقرارِ توحید کی ترغیب دے تو کونسی تعجب کی بات ہے؟ تقاضائے رحمت

منوی اور شے ہے اور اس کا نافع نہ ہونا الگ چیز ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ نے اس خیال سے اقرارِ توحید پر زور دیا ہو کہ خواہ مرنے والے کے لیے یہ سودمند نہ ہو مگر دوسرے زندوں کے لیے ایک بڑی ترغیب کا ذریعہ بن جائے گا۔

امتحان پر امتحان (وفاتِ خدیجہؓ)

ابھی ابوطالب کی ابدی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ اس کے تین ہی دن کے بعد ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ بھی داغِ جدائی دے گئیں۔ یہی وہ رفیقۂ زندگی ہے جو اول المومنین والمومنات ہے۔ یہی وہ بیوی تھی جس نے اپنی پچیس سالہ رفاقت میں ایک دن بھی اپنے شوہر کو آزردہ ہونے کا موقع نہ دیا۔ یہی وہ زوجِ صادقہ ہے جس نے اپنا تن من دھن اور اپنی ہر متاعِ عزیز کو حضورؐ پر نچھاور کر دیا۔ یہی پرستارِ زوج ہے جس نے ہر مرحلۂ امتحان پر پوری ثابت قدمی سے رسولؐ کا ساتھ دیا اور کبھی ماتھے پر بل نہ لائی۔ یہی وہ مومنۂ صدیقہ ہے جس کی زوجی رفاقت ہر جوڑے کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ تنہا رفیقۂ زندگی ہے جس کے بطنِ اطہر سے رسولؐ کی نسلی نشانیاں باقی رہیں۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس صدمۂ جانکاہ کا جو ان کی ابدی مفارقت سے رسول اللہ کو پہنچا ہوگا؟ بلاشبہ یہ مومنۂ صادقہ اپنے ظاہری حسن و جمال کی بہاریں کھو چکی تھی۔ پینسٹھ سال کی عمر ہو چکی تھی اور چہرے پر جھریاں آگئی تھیں لیکن اس کی جھریوں کی ایک ایک

شکن اس کی وفا، ایمان، ایثار اور استقامت کا نہ مٹنے والا نشان تھا۔

رسول اکرمؐ جن اقدار زندگی کو دنیا میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ اس بے پناہ محبت سے کیجیے جو خدیجہؓ کی زندگی ہی میں نہیں بلکہ ان کی جدائی کے بعد بھی حضورؐ ظاہر فرماتے رہے۔ حضورؐ اکثر اس پنج و شانزدہ سالہ کا ذکر خیر اس طرح فرمایا کرتے کہ حضرت عائشہؓ تقاضائے رشک سے پوچھ بیٹھتیں کہ کیا دنیا میں اور کوئی قابل ذکر عورت نہیں جو حضورؐ اسی مردہ بڑھیا کا ذکر کیے جاتے ہیں۔ اس پر حضورؐ فرماتے کہ اس میں فلاں اوصاف تھے اور فلاں خوبیاں تھیں (شیخین و ترمذی عن عائشہؓ)۔ حضورؐ بعض اوقات کوئی بکری ذبح کرتے تو اس میں سے خدیجہؓ کی سہیلیوں کے لیے بھی حصہ بھیجتے۔

ذرا غور کیجئے اس گزری ہوئی بڑھیا کو حضورؐ کیوں یاد فرمایا کرتے تھے؟ کیا اس کے حسن و جمال کی وجہ سے؟ نہیں۔ پھر اس کی دولت مندی کے سبب سے؟ یہ بھی نہیں۔ پھر؟ صرف اس کی سیرت، بلند کرداری، ایمان، جاں سپاری، ایثار، وفاشعاری، استقامت، بردباری۔ یہ تھیں وہ اقدار جس نے حضورؐ کے دل میں خدیجہؓ کے لیے قابل رشک جگہ پیدا کر لی تھی۔ یہاں خدیجہؓ کی صورت سامنے نہ تھی ان کی اعلیٰ سیرت کی کشش تھی۔

تین چار دن کے اندر اندر حضورؐ کو یہ دو صدمے ہوئے ابو طالب جیسے ہمدرد و پشت پناہ کی موت اور خدیجہؓ جیسی مومنہ صادقہ اور رفیقۂ زندگی کی جدائی۔ یہ شدید ابتلا اور آزمائش تھی۔ اس لیے حضورؐ اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرماتے تھے۔ (بعض روایتوں میں ہے کہ وفات خدیجہؓ پہلے اور

وفاتِ ابوطالب بعد میں ہوئی)۔

صدمات کے بعد تبلیغی سرگرمیاں

ایک انسان کی ہمتوں کو پست کرنے کے لیے یہ دو عظیم الشان صدمے ــــ وہ بھی تین دنوں کے فصل سے ــــ بہت کافی ہیں۔ لیکن پیغمبر کو انسانی اقدار کے قیام سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ حوادث سے وہ اتنا ہی بھر متاثر ہوتا ہے جو اس کے اصلی مشن کو مجروح نہ کرے چنانچہ ان دو صدموں کے بعد حضورؐ کی تبلیغی سرگرمیوں میں نہ فقط یہ کہ کوئی کمی نہ آئی بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض وہ اضافے ہو گئے جو پہلے نہیں ہوئے تھے۔ ان دو ہمدردوں اور پشت پناہوں کا سایہ اُٹھ جانے کے بعد کفارِ قریش اپنی ایذارسانیوں میں اور زیادہ آزاد ہو گئے۔ اور اسی نسبت سے حضورؐ اپنی سرگرمیوں میں اور زیادہ کمربستہ ہو گئے۔

ارضِ حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی

اس درمیان میں ایک واقعہ اور بھی پیش آیا اور وہ یہ تھا کہ مہاجرین حبشہ کو یہ خبر ملی کہ مکے میں اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان مصالحت یا مفاہمت ہو گئی ہے یعنی یا تو اہل کفر اسلام لے آئے ہیں یا سوشل (معاشرتی مفاہمت

ہو گئی ہے اس لیے حبشے سے کوئی تینتیس زن و مرد مکّے واپس آ گئے۔ واقعہ یوں ہوا کہ ایک موقعے پر حضورؐ نے سورت نجم تلاوت فرمائی۔ اس وقت بہت سے مشرکین بھی اس مجمعے میں موجود تھے۔ حضورؐ نے آخری آیت (جو آیت سجدہ ہے) تلاوت فرمائی تو معاً سجدے میں چلے گئے۔ جو مسلمان وہاں موجود تھے وہ بھی سجدے میں گر پڑے اور ساتھ ہی اس مجمعے کے مشرکین بھی سربسجود ہو گئے۔

یہ واقعہ بخاری، مسند احمد، نسائی وغیرہ میں موجود ہے اور اس میں ذرا بھی استبعاد نہیں۔ سورۂ نجم پڑھتے پڑھتے حضورؐ پر، اور سنتے سنتے اہل اسلام پر ایک خاص کیف طاری ہو جانا اور معاً سربسجود ہو جانا کوئی بعید از عقل بات نہیں ہو سکتی۔ اور اس وقت مشرکین کا اس کلام سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور اس ہمہ گیر فضا و ماحول میں از خود رفتہ ہو کر سب کے ساتھ سجدے میں گر جانا بھی بالکل قرین قیاس ہے۔ گزشتہ صفحات میں آپ نے کئی واقعات ایسے پڑھے ہیں اور آئندہ صفحات میں اس کا ذکر آئے گا کہ شدید معاندانہ اور منکرانہ جذبے کے ساتھ آنے والوں کے دل حضورؐ کی زبان سے قرآن سن کر ہاتھوں سے نکل گئے۔ پھر یا تو وہ اسی وقت ایمان لے آئے یا بدلے ہوئے چہروں کے ساتھ واپس ہو گئے۔ کلام حکیم کی اس بے پناہ تاثیر سے کون انکار کر سکتا ہے؟ مشرکین کے اس وقتی اور بے خودانہ سجدے کی خبر کسی خاص رنگ میں سن کر اگر کچھ مہاجرین حبشہ نے اگر یہ اندازہ لگایا ہو کہ مکّے کے اہل کفر اور اہل اسلام میں مصالحت یا مفاہمت ہو گئی ہے تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔ وہ لوگ یہ تو نعوذ باللہ گمان ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کفر و اسلام میں کوئی مفاہمت ہو گئی ہے لیکن اہل کفر اور

اہل اسلام میں کوئی سوشل قسم کی مفاہمت کا گمان پیدا ہو گیا ہو تو اس میں کوئی استبعاد نظر نہیں آتا۔

افسانوی رنگ

لیکن اس واقعے میں بعض مفسرین نے جو افسانوی رنگ پیدا کیا ہے اسے ہم چھوڑتے ہیں تاہم یہ ضروری ہے کہ جن روایات سے نبوی اقدار کے مجروح ہونے کا شائبہ بھی پیدا ہو ان پر آزادانہ اظہار خیال کی جرأت پیدا ہو۔ جس جرأت سے ہم صحیح روایات کو قبول کرتے ہیں اسی جرأت کے ساتھ ناقابل یقین روایتوں کو رد بھی کر دینا چاہیے خواہ وہ کتنی ہی مستند کتاب میں اور کیسی ہی قوی اسناد سے ہو۔ ایسی روایتیں اگر متصل مسند بھی ہوں تو اس پر آزادانہ اظہار رائے کی اجازت ہونی چاہیے۔ ہماری تحقیق میں تلك الغرانيق العلى والی روایت ناقابل اعتماد ہے۔ اس کے ذکر کی بھی ضرورت نہیں۔

جناب ابوبکرؓ کا ارادۂ ہجرت حبشہ

یوں تو جناب ابوبکر صدیقؓ کو بارہا کفار کے ہاتھوں سخت سے سخت جسمانی و ذہنی اذیتیں اٹھانی پڑی تھیں (جن کے تفصیلی ذکر کو ہم نے حذف کر دیا ہے) لیکن بنی ہاشم کی محصوری کے بعد ظالموں کے ظلم نے زیادہ شدت اختیار کر لی۔ جناب ابوبکرؓ بھی اس سے محفوظ نہ رہے۔ آخر ان مظالم سے عاجز آ کر آپ نے بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح ہجرت حبشہ کا ارادہ کر لیا اور حضورؐ سے اجازت لے کر چل کھڑے ہوئے۔ ایک دو دن چلے ہوں گے

کہ برک الغماد کے پاس ابن الدغنہ (۱) ملا۔ یہ اس وقت احابیش (۲) کا سردار تھا اور اسلام نہ لایا تھا۔ اس نے پوچھا کہ: ابو بکرؓ! کدھر کا ارادہ ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: میری قوم مجھے نکال رہی ہے جس نے مجھے تکلیفیں پہنچا پہنچا کر میری زندگی تنگ کر دی ہے۔ ابن الدغنہ نے کہا:

"ابو بکرؓ! تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے۔ تم بے کسوں کے کام آتے ہو۔ صلہ رحمی کرتے ہو۔ دوسروں کا بار اپنے سر لیتے ہو۔ مہمان نواز ہو اور تمام پیش آنے والے حوادث میں حق کی حمایت کرتے ہو —— میں تمہیں پناہ دیتا ہوں۔ واپس چلو اور اپنے شہر (مکہ) ہی میں رہ کر اپنے رب کی عبادت کرو۔"

ابن الدغنہ جناب ابو بکرؓ کو مکے واپس لے آیا اور اپنی پناہ کا اعلان کر دیا۔ قریش نے اس کی پناہ کو توڑا نہیں گیا مگر ابن الدغنہ کے ذریعے جناب ابو بکرؓ سے فرمائش کرائی کہ وہ نماز و تلاوت اپنے گھر ہی میں کریں اور آواز بلند نہ کریں کیونکہ اسے سن کر ہماری عورتیں اور بچے فتنے میں پڑ جاتے ہیں (یعنی متاثر ہوتے ہیں جس سے ان کے اسلام لے آنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے)۔

فنا فی الرسول کا مقام

آگے چلنے سے پہلے ذرا ان الفاظ کو بار بار پڑھیے جو ابن الدغنہ نے

---

(۱) اس کا نام واقدی حارث بن یزید بتاتے ہیں اور سہیلی مالک بن الدغنہ (۲) احابیش سے مراد بنو کنانہ، خزیمہ اور خزاعہ اور قریش کے وہ افراد ہیں جو اسفل مکہ کے ایک پہاڑ حُبشی نامی کے پاس ایک قوم کی حیثیت سے یکجا تھے۔ بخاری کی روایت کے مطابق ابن الدغنہ قبیلہ قارہ کا سردار تھا۔ یہ ایک بڑا تیر انداز قبیلہ تھا۔

جناب ابوبکرؓ کی سیرت و کردار کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس نے قریش کے سامنے پناہ کا اعلان کرتے ہوئے انہی الفاظ کو دہرا کر انہیں شرم دلائی ہے کہ تم ان صفات کے انسان کو شہر بدر ہونے پر مجبور کرتے ہو؟ ایسا انسان نہ نکل سکتا ہے اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ بہرکیف یہاں قابلِ غور مقام یہ ہے کہ جو الفاظ آغاز وحی کے بعد ــــ جب کہ حضورؐ کو اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا تھا ــــ حضورؐ کو تسکین دیتے ہوئے جناب خدیجہؓ نے حضورؐ کے متعلق فرمائے تھے آج حرف بہ حرف ان ہی الفاظ سے ابن الدغنہ سیرتِ ابوبکرؓ کی شہادت دے رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جناب خدیجہؓ اول المومنین والمومنات تھیں اور ابن الدغنہ ابھی تک پکا کافر ہے مگر سیرتِ صدیق کا اس کے دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر ہے کہ یہ اس کا حرف اعتراف ہی نہیں کرتا بلکہ قریش کے سامنے یہی اوصاف بیان کر کے انہیں غیرت دلاتا ہے اور برک الغماد سے ان ہی صفاتِ حمیدہ کی بنیاد پر واپس لاتا اور اپنے پناہ دینے کا اعلان کرتا ہے۔

صوفیائے کرام کے ہاں "فنا فی الرسول" کا کیا مقام ہے اس کا ادراک ہماری رسائی سے باہر ہے لیکن اتنی بات ضرور عرض کی جا سکتی ہے کہ اس فنائیت فی الرسول کی قوی ترین اساس یہی سیرت کی ہم آہنگی ہو سکتی ہے جس کی شہادت ابن الدغنہ دے رہا ہے۔

واپسی کی خدائی مصلحت

جناب ابوبکرؓ جانے کو تو بظاہر روانہ ہو گئے تھے لیکن قدرت ابن الدغنہ کو بہانہ بنا کر واپس لے آئی۔ وہ حبشہ یا کسی اور جگہ کیونکر جا سکتے تھے جب کہ

انہیں قدرت ایک اور بڑے کام کے لیے منتخب کر چکی تھی۔ انہیں حبشے کی طرف نہیں جانا تھا۔ انہیں تو مدینے کی طرف ہجرت کرنی تھی اور حضورؐ کے ساتھ تنہا یہ سفر کرنا تھا۔ ایک ایسی رفاقت میں خلا کیسے پیدا ہو سکتا تھا جسے بچپنے سے لے کر قبر تک قائم رہنا تھا:

ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

پناہ کی واپسی

ابھی آپ اوپر یہ پڑھ چکے ہیں کہ قریش کے کہنے سے ابن الدغنہ نے جناب ابوبکرؓ سے یہ فرمائش کی تھی کہ اپنے گھر کے اندر نماز اور تلاوت میں آواز نہ بلند کریں کیونکہ اس سے ہمارے عورتیں بچے متاثر ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے چند دن تو اس فرمائش کی تعمیل میں پابندی قائم رکھی لیکن جب ذوق و شوق غالب ہوا تو جس طرح بوقتِ تلاوت اپنی آنکھوں پر قابو نہ تھا اسی طرح اپنی آواز پر بھی اختیار نہ رہا۔ سننے والے پھر ان کے گرد جمع ہونے لگے اور قرآنی تاثیر اپنا کام کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر قریش نے ابن الدغنہ سے شکایت کی۔ اس نے آپ کو ادھر توجہ دلائی تو آپ نے فرمایا کہ: بھئی! مجھے تمہاری یہ شرط منظور نہیں اس لیے تم اپنی پناہ واپس لے لو۔ حضرت ابوبکرؓ کی اس جرأت کو ذہن نشین کر لیجیے۔ شاید آگے حضورؐ کی "پناہ طلبی" کی بحث میں اس کا بھی ذکر آئے۔

ضماد ازدی کا اسلام

چہ شد یارب کہ زاہد بر درِ میخانہ می رقصد

نظر بر روئے ساقی دار و و رندانہ می رقصد

ضماد ازد شنوءہ کے قبیلے کے ایک فرد تھے۔ یہ ٹونے ٹوٹکے اور جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ دل اچھا پایا تھا اور کچھ اللہ پر بھی بھروسہ رکھتے تھے اس لیے اپنے "کرتب" پر بہت زیادہ ادعا نہ تھا۔ یہ گھومتے پھرتے کہیں مکے میں آ گئے۔ لوگوں کو کہتے سنا کہ (خاک بدہن ایشاں) محمدؐ دیوانہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ: اگر میں اس سے ملوں تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ میرے ہی ہاتھوں سے اسے شفا بخش دے۔" یہ حضورؐ کی طرف روانہ ہوئے اور قدرت مسکرانے لگی کہ: دیکھ تو محمدؐ کے جنون کا علاج کرنے جا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عشقِ محمدؐی کا جنون خود تجھ پر سوار ہو جائے۔" یہ حضورؐ کے پاس آئے اور بڑی سنجیدگی سے کہنے لگے کہ: اے محمدؐ! میں اپنی جھاڑ پھونک سے کام لیتا ہوں اور میرے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے شفا دیتا ہے۔ آپ اپنی شکایت بیان کیجیے۔ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ حضورؐ نے ان کی باتوں کا جواب دینے سے پہلے یہ الفاظ فرمائے:

ان الحمد للہ نحمدہ و	حمد اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی حمد
نستعینہ ونستغفرہ من	کرتے ہیں۔ اسی سے مدد طلب کرتے
یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن	ہیں اور اسی سے مغفرت چاہتے ہیں۔
یضلل فلا ھادی لہ۔ و	وہ جسے ہدایت دے اسے کوئی گمراہ
اشھد ان لا الہ الا اللہ	نہیں کر سکتا۔ اور جسے وہ گمراہ کر دے
وحدہ لا شریک لہ	اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ میں
واشھد ان محمدا	اس حقیقت کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ

عبدہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَمَّا بعد

کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں اور اس بات کی بھی شہادت دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ اما بعد۔

"اما بعد" فرما کر حضورؐ ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے کچھ اور فرمانا چاہتے تھے کہ ضماد ازدی کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اپنی جھاڑ پھونک بھول گئے۔ توحید کا یہ مرقع ان کے سامنے پہلی بار آیا تھا۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں کا ایک ایک لفظ ان کے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا اور حق پسندی کا فطری جذبہ ابھرتا جا رہا تھا۔ آگے کچھ اور باتیں سننے کا انتظار نہ کر سکے۔ ان ہی جملوں کی تاثیر میں کھو گئے۔ ایک طرف جذبۂ امارہ اپنی طرف عزتِ نفس کا واسطہ دے کر کھینچ رہا تھا اور دوسری طرف ایک انوکھا پیغام جذبۂ حق پسندی کو ابھار رہا تھا۔ نفسی کش مکش ابھی کسی آخری فیصلے پر نہ پہنچی تھی۔ حقیقت طلبی کی پیاس اور تیز ہو گئی۔ وحدتِ ربانی کے حقائق پر دوبارہ غور کرنے کے لیے ایک بار پھر فرمائش کر دی کہ: ذرا ان کلمات کو ایک بار اور تو فرمایئے۔" حضورؐ نے پھر وہی کلماتِ توحید دہرائے جو ضماد کے کانوں نے اس سے پہلے نہیں سنے تھے۔ اس کے بعد حضورؐ نے "اما بعد" فرما کر کچھ اور کہنا چاہا ہو گا کہ ضماد ان مختصر سے "جادو بھرے" کلمات کو ایک بار اور سننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ پھر فرمائش کی کہ: ایک بار اور اس نرالے پیغام کو دہرایئے۔" حضورؐ نے پھر انہی کلمات کا اعادہ فرمایا۔ اب ضماد اپنی نفسیاتی کش مکش سے بتدریج بلند ہو کر اس مقام پر آ چکا تھا جہاں ایک فیصلہ کن اعتراف کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ ابھی حضورؐ "اما بعد" کے بعد کچھ اور فرمانا چاہتے ہوں گے کہ ضماد کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ نفسی کیفیتِ کش مکش

سے باہر نکل آیا۔ کچھ اور سننے سے پہلے بول اٹھا:

"میں نے کاہنوں کے جادو منتر بھی سنے ہیں۔ میں جادوگروں کے ٹونے ٹوٹکے بھی سن چکا ہوں اور میں نے شاعروں کے اشعار بھی بہت سنے ہیں مگر آپ کے ان پاکیزہ کلمات جیسی کوئی چیز سننے میں نہیں آئی ہے۔ یہ کلمات تو حقیقت کی گہرائیوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اپنا ہاتھ لائیے کہ میں اس مبارک ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر لوں۔"

ضماد اب کلمۂ شہادت ادا کر چکے تھے۔ محمدؐ ہی جنونِ عشقِ الٰہی نے انہیں بھی جنونِ عشقِ حق کا سرشار بنا لیا تھا۔ وہ "جنونِ حق" کا علاج کرنے آئے تھے اور خود ان کے "جنونِ کفر" کا علاج ہو گیا۔ مکے والوں کے لیے یہ حادثہ کچھ کم تعجب خیز نہ ہوا ہوگا۔ ان میں اپنی ناکامی کی شرمندگی کے ساتھ ساتھ جذباتِ غیظ و غضب بھی اور بھڑک اٹھے ہوں گے اور اسی نسبت سے مظالم نے بھی اور شدت اختیار کر لی ہوگی۔ قیاس اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اہلِ اسلام نے اس ازدی اول المومنین کی رعایت میں جن انسانی اقدار کو ملحوظ رکھا اس کا اندازہ صرف اس واقعے سے کیا جا سکتا ہے کہ مدنی زندگی میں حضورؐ نے جب ایک "سریہ"[1] کہیں بھیجا تو یہ سریہ قبیلۂ ازد کی طرف سے بھی ہوتا ہوا گزرا۔ امیرِ لشکر نے دریافت کیا کہ: کیا تم لوگوں نے اس قوم کی کوئی چیز بھی اپنے قبضے میں لی ہے؟ ایک شخص نے بتایا کہ: ہاں مجھے ایک لوٹا ملا ہے۔ امیرِ لشکر نے کہا کہ: اسے فوراً واپس کرو کیونکہ یہ لوگ ضماد کی قوم میں سے ہیں۔

---

(۱) جیش یا لشکر جس میں عموماً حضورؐ خود نہ ہوتے۔

طفیل بن عَمرو دَوسی کا قبولِ اسلام

طفیل بن عمرو قبیلۂ دَوس کے سردار تھے اور صرف رسمی سردار نہ تھے بلکہ ان کے دلوں پر بھی ان کی حکومت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ خود ان کی بیوی جب ان سے گفتگو کرتی تو دورانِ گفتگو میں عموماً "فدا لک ابی و امی" (آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں) کہا کرتی تھی۔ یہ ایک طرف تو بڑے ہوش گوش کے مالک تھے اور دوسری جانب غیر معمولی بلیغ شاعر بھی تھے۔ یہ جب مکّے میں آئے تو اہلِ مکّہ نے ان کے اثر و رسوخ کے مطابق ان کا شاندار استقبال کیا۔ اور تمام با اثر لوگوں نے مل کر حضورؐ کے خلاف اس قدر ان کے کان بھرے اور اتنا مؤثر پروپیگنڈا کیا کہ انھوں نے یہ طے کر لیا کہ جب کبھی بیت اللہ کے احاطے میں آؤں گا تو کانوں میں روئی دپنبہ، ٹھونس لیا کروں گا یہ فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اور کسی جگہ تو اہلِ مکّہ حضورؐ سے ملنے کا کوئی موقع پیدا ہی نہ ہونے دے سکتے تھے لیکن بیت اللہ کا اتنا احترام اب بھی ان کے دلوں میں موجود تھا کہ حضورؐ کو یہاں آنے سے نہ روک سکتے تھے۔ اس لیے یہ امکان تھا کہ کسی موقعے پر طفیل کا حضورؐ سے سامنا ہو جائے اور حضورؐ کی کوئی بات ان کے کانوں میں پڑ جائے۔ حضورؐ کی تاثیرِ کلام کا خوف ان کے دل میں اس قدر بٹھا دیا گیا تھا اور انھیں نفرت و گریز کے ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا کہ یہ چاہتے ہی نہ تھے کہ میرے کانوں میں حضورؐ کی آواز پڑے۔ لہٰذا یہ جب بیت حرام میں جاتے تو اپنے کانوں میں اچھی طرح روئی ٹھونس لیتے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ یہ بیت اللہ میں گئے تو دیکھا کہ حضورؐ نماز ادا فرما رہے

ہیں۔ طفیل نے اس کعبہ حقیقت کو کعبۃ اللہ کے پاس مصروف نماز دیکھا۔ ایک نور مجسم نور السماوات والارض کی یاد میں غرق و محو تھا اور در و دیوار اس کی نورانی شعاعوں سے منور ہو رہے تھے۔ اس کے روحانی انعکاس نے اپنی غیر محسوس مقناطیسی کشش طفیل کے قلب پر ڈالی جس کے طفیل یہ طفیل بھی کھنچ کر حضورؐ کے قریب آ گئے۔ دل میں کہا میں کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہیں۔ اعلیٰ درجے کا شاعر ہوں۔ عقل و شعور کا مالک ہوں۔ اچھی اور بری باتوں میں امتیاز کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا ہوں۔ ذرا سنوں تو سہی کہ اس شخصؐ کے ہلتے ہوئے ہونٹوں سے کیا کلمات نکل رہے ہیں؟ —— یہ سوچ کر طفیل نے اپنے کانوں سے روئی نکال لی اور حضورؐ کی زبانِ اقدس سے وہ کلمات سنے جو اس سے پہلے سننے میں نہیں آئے تھے۔ ظاہر ہے نماز کے یہ کلمات کچھ قرآنی ہوں گے اور کچھ ماثورہ۔ یہ سارا کلام آج بھی وہی ہے جو اس وقت تھا۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ تاثیر صرف کلام کی نہیں تھی۔ اس کلیمؑ کی زبان و روح کا بھی اس اثر میں خاصا دخل[1] تھا۔ کیا خوب کہا ہے کسی نے،

اس میں کچھ کچھ مری نگاہ بھی ہے
حسن تنہا نظر نہیں آتا

---

(۱) کہتے ہیں حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ نے ایک ڈھیلے پر سورۂ اخلاص پڑھا تو وہ سونا بن گیا جو کسی مفلس کو دے دیا۔ اس معتقد نے باہر جا کر اس عمل کو آزمایا مگر ڈھیلا ڈھیلا ہی رہا۔ اس نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ بھئی قل ھو اللہ تو وہی ہے مگر زبانِ فرید بھی تو کوئی چیز ہے؟ یہ روایت جیسی بھی ہو لیکن اس میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کی صداقت میں کوئی شک نہیں۔

بہرکیف جب حضورؐ نماز سے فارغ ہو کر چلے تو ایک نامعلوم کشش طفیل کو بھی پیچھے پیچھے لے چلی۔ انہوں نے حضورؐ کو بتایا کہ: "مجھے یہاں کے لوگوں نے آپؐ کے خلاف اتنا بھڑکایا تھا اور ایسی ایسی باتیں کہی تھیں کہ میں اپنے کانوں میں پنبہ ٹھونس کر بیت اللہ میں آتا تھا کہ آپؐ کی کوئی آواز بھی میرے کانوں میں نہ پڑنے پائے لیکن آج خدا نے آپؐ کی زبان سے کچھ پاکیزہ کلمات سنوا ہی دیے۔ اب میں آپؐ سے آپ کا پیغام سننا چاہتا ہوں"۔ حضورؐ نے انہیں اسلام کا پیغام پہنچایا اور آیاتِ قرآنی سنائیں۔ ابھی تو طفیل نے کانوں سے صرف روئی نکالی تھی مگر اب غفلتِ کفر کی ڈاٹ بھی بلا ارادہ نکل گئی۔ یہاں سے اسلام کی دولت لے کر اپنے قبیلے میں واپس آئے۔ یہاں ان کے والد (عمرو) نے اور پھر ان کی بیوی نے بھی اسلام کا پیغام سن کر قبول کر لیا۔ یہی طفیل جو اپنے کانوں میں اس لیے روئی ٹھونسے رہتے تھے کہ محمدؐ کی کوئی آواز کانوں میں نہ پڑنے پائے، ایک ایک کے کانوں تک آوازِ محمدؐ کو پہنچانے لگے۔ ان کی قوم نے ان کے پیغام کو قبول نہ کیا۔ یہ عاجز آ کر خدمتِ نبویؐ میں پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: "میری قوم زناکاری میں بہت گرفتار ہے اس کے لیے بددعا فرمایئے"۔ حضورؐ نے بددعا کی بجائے یوں دعا فرمائی کہ: "خداوندا! قبیلۂ دوس کو ہدایت دے اور ان سب کو میرے پاس لے آ"۔ پھر طفیل سے فرمایا کہ: "اپنی قوم میں واپس جاؤ اور اسے نرمی سے دعوتِ اسلام دو"۔——

طفیل واپس آ کر اپنا کام کرتے رہے اور ستر، اسّی گھرانوں کو مشرف باسلام کر کے مدینے لائے۔ یہ سب غزوۂ خیبر (۷ھ) میں بھی شریک ہوئے اور غنائم میں حصے دار ہوئے۔ پھر یہی طفیل فتح مکہ تک حضورؐ کے ساتھ رہے۔ بلکہ وفاتِ نبوی کے وقت بھی مدینے میں موجود تھے۔ فتنۂ ارتداد پھیلنے کے بعد

یہ کئی جگہ جنگوں میں بھی شریک رہے۔

طائف کا رُخ

اب تک حضورؐ کا دائرۂ عمل وانذر عشیرتک الاقربین سے آگے لتنذر ام القریٰ تک پھیلا تھا۔ اب اس دائرے نے بفحوائے ومن حولھا اور زیادہ وسعت پیدا کی اور حضورؐ نے طائف کا رخ فرمایا۔ یہاں بیشتر آبادی بنی ثقیف پر مشتمل تھی۔ ان لوگوں کی درشتیِ مزاج اور ان کے کردار سے حضورؐ ناواقف نہ تھے۔ حضورؐ کو دس سال کا یہ بھی اچھی طرح تجربہ تھا کہ پیغامِ توحید مشرکوں کے عقیدہ و مذہب پر کیسی شدید ضرب ہے؟ کس طرح وہ پیغام سن کر بوکھلا جاتے ہیں؟ پیغام دینے والوں اور قبول کرنے والوں کو کیسی کیسی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ اور کس طرح اہل ایمان کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں؟ ان سب باتوں کا محض قیاسی نہیں بلکہ تجربی علم حضورؐ رکھتے تھے۔ طائف والوں سے اسی قسم کی خطرناک، توقعات ہو سکتی تھیں۔ لیکن اعتماد علی النفس، توکل علی اللہ اور ہمت مردانہ کا کیسا عجیب نمونہ حضورؐ نے پیش فرمایا کہ اس پُرخطر آبادی کے الاؤ میں بے خطر کود پڑے۔ صرف ایک اول المومنین زید بن حارثہؓ ساتھ تھا اور کوئی سامانِ تحفظ نہ تھا۔

اس ہمتِ نبوی کی حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے جو یقین، صداقت،

اخلاص اور عشقِ انسانیت کی بے پناہ قوتوں کو جانتا ہو۔ جس انسان کے دل میں ان اقدار کی آگ سلگ رہی ہو اس کی نگاہ میں بڑی سے بڑی جانی والی آزمائشوں کی بھٹی بھی گلزار خلیلؑ بن جاتی ہے۔ زید بن حارثہ جیسا محبوب فداکار اگر ساتھ نہ بھی ہوتا تو حضورؐ کے عزم و ہمت میں کوئی کمزوری نہ آتی اور تنہا نکل کھڑے ہوتے۔ زید کے عشقِ رسالت نے اسے ساتھ رہنے پر مجبور کیا اور حضورؐ نے اس کے شوقِ ہمراہی کو اس لیے پورا ہونے دیا کہ ایک شاہد عینی امت کے سامنے ان تمام مصائب کی گواہی دے سکے جو حضورؐ کو راہِ حق کی تبلیغ میں جھیلنی تھیں۔ راہِ خدا میں شدائد کا تحمل کرنے والے امتیوں کے لیے اس سے بڑا ڈھارس اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان کا ملجا و ماوی بھی تمام مصائب و آلام کو مردانہ وار جھیل رہا ہے مگر اپنے فرائض میں سر مو فرق نہیں آنے دیتا۔

حضورؐ طائف پہنچنے سے پہلے ان تمام قبائل کو بھی آوازِ حق سناتے رہے جو راستے میں جابجا موجود تھے۔

طائف کی آبادی بنی ثقیف پر مشتمل تھی۔ ان کے رئیس قبیلہ تین بھائی تھے۔ عبد یالیل، مسعود اور حبیب۔ یہ تینوں عمرو بن عمیر بن عوف بن عقدہ بن غیرہ بن عوف بن ثقیف کے فرزند تھے۔ حضورؐ سب سے پہلے ان ہی تینوں کے پاس تشریف لے گئے اور پیغام حق پہنچایا۔ مگر ان کی طرف سے بڑا مایوس کن اور طنز آمیز جواب ملا۔ ایک نے کہا: کیا تمہارے سوا خدا کو کوئی اور نہ ملا تھا جو وہ اپنا رسول بناتا؟ رسول تو کسی سردارِ قوم کو ہونا چاہیے تھا نہ کہ تمہیں جسے کوئی سواری بھی نصیب نہیں۔ دوسرے نے کہا: کعبۃ اللہ کی اس سے بڑی کوئی توہین نہیں کہ تم جیسا شخص رسول ہو——

تیسرے نے کہا: اگر تم سچے ہو تو تمہاری باتوں کا جواب دینا خلافِ ادب ہے اور اگر جھوٹے ہو تو تم سے بات کرنا میری کسرِ شان ہے یعنی دونوں حالتوں میں تم لائقِ تخاطب نہیں ہو۔

مظلومیت اور استقامت کا مقابلہ

ان مایوس کن جوابات کے بعد یقیناً حضورؐ کو یہاں کی پوری آبادی کے مزاج کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ اس اندازے کے بعد فطری تقاضائے بشریت یہی ہو سکتا تھا کہ یہاں مزید وقت نہ ضائع کیا جائے۔ لیکن جس کے اندر ایک بلند نصب العین کی لگن سما گئی ہو وہ مایوسی کو پاس نہیں آنے دیتا۔ حضورؐ کو تو بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ کے مطابق اپنا فریضۂ تبلیغ بہرحال ادا کرنا تھا خواہ کسی شکل میں اس کا نتیجہ نکلے۔

حضورؐ نے طائف میں دس دن قیام فرمایا۔ جہاں جہاں ممکن تھا جا جا کر لوگوں کے کانوں میں آوازِ حق پہنچائی۔ مگر ایک شخص نے بھی اس آواز پر لبیک نہ کہی۔ معاملہ صرف انکارِ حق تک ہی محدود نہ رہا بلکہ یہاں وہ وہ ایذائیں پہنچائی گئیں جو بعض حیثیت میں اہلِ مکہ کی ایذاؤں سے بھی بڑھ گئیں۔ یہاں کے سرداروں نے لڑکوں، غلاموں اور بدمعاشوں کو حضورؐ کے پیچھے لگا دیا۔ حضورؐ جہاں تبلیغ کے لیے کھڑے ہوتے وہاں یہ سب شور و غل کرتے، گالیاں دیتے اور پتھروں سے مارتے۔ حضورؐ کے پائے مبارک لہولہان ہو گئے۔ حضورؐ نے ایک باغ میں پناہ لی جو ربیعہ کے دو بیٹوں عقبہ اور شیبہ کا تھا۔

یہاں حضورؐ پر ایک بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ زید بن حارثہؓ

نے زخموں کو دھویا۔ پانی کے چھینٹے چہرۂ انور پر ڈالے۔ حضورؐ ہوش میں آئے تو زبانِ اقدس پر یہ الفاظ تھے:

مولا! اپنی بے بسی و بے کسی کی فریاد تیرے آگے پیش کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! مجھے تو نے کن لوگوں کے سپرد کیا ہے؟ ایسے دشمنوں کے حوالے کیا ہے جو ترش روئی سے پیش آئیں؟ یا ایسے اپنوں کے سپرد کیا ہے جن کو تو نے میرے معاملات پر متصرف بنا دیا ہے؟ اگر یہ تیری ناراضی نہیں تو مجھے ان تکالیف کی کوئی پروا نہیں۔ تیری دوسری نوازشیں میرے لیے وسیع ہیں۔ میں تیرے اس نورِ ذات کی پناہ لیتا ہوں جس سے تاریکیاں بھی چمک اٹھتی ہیں اور جس کی برکت سے دنیا و آخرت کے تمام معاملات درست ہو جاتے ہیں۔ پناہ اس بات سے کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو یا تیری ناراضی۔ میری رضا تیری ہی رضا کے ساتھ پیوستہ ہے۔ ہر حرکت اور ہر قوت اللہ ہی کی توفیق سے وابستہ ہے۔

لمحۂ فکریہ

حضورؐ کو اور بھی بہت سے مواقع پر سخت سے سخت ایذائیں پہنچائی گئی ہیں۔ لیکن صحیحین کی روایت (عن عائشہؓ) کے مطابق طائف سے زیادہ حضورؐ کی نگاہ میں اور کسی موقعے کی ایذائیں نہ تھیں۔ اور اس کا ثبوت اس فریاد سے ملتا ہے جو حضورؐ نے اس موقعے پر بارگاہِ خداوندی میں پیش فرمائی ہے۔ یہ ایک ایسے دکھے ہوئے دل کی فریاد ہے جو اگر کنگرۂ عرش میں زلزلہ ڈال کر

طائف کے دونوں پہاڑوں کو بھی ہلا دیتا جو یہاں کی ساری آبادی کو پیس کر رکھ دیتا تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ طائف کے سراسر ظالمانہ اور منافیِ انسانیت سلوک سے اگر حضورؐ میں مایوسی کے جذبات پیدا ہو جاتے جب بھی یہ تقاضائے بشریت ہی ہوتا لیکن یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں انسان کی دو متضاد جذباتی قوتوں کے تقابل کا امتحان ہوتا ہے۔ ایک طرف مایوسی کے تمام عوامل بنیانِ مرصوص کی طرح درمیان میں حائل ہوتے ہیں اور دوسری جانب رجائیت کی اعلیٰ قدریں مایوسی کی دیواروں کو ہی نہیں بلکہ زمان و مکان کی حدود کو بھی چیرتی ہوئی آگے نکل جاتی ہیں۔ رحمتِ الٰہی سے مایوسی تو شیوۂ کفر ہے۔ لَا تَایۡـَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ وہ مصلحِ اعظمؐ جو ساری انسانی اقدار کی اقامت کا بار اپنے سر پر لیے ہوا اپنی رجائی قدروں کو کیونکر ایک لمحے کے لیے بھی ترک کر سکتا تھا؟

انسانی سرشت تو یہ ہے کہ معمولی اذیت اور تھوڑی سی مایوسی پر بھی زبان قابو میں نہیں رہتی۔ وہ درست کلامی کی بجائے درشت کلامی پر اُتر آتا ہے اور بد دعائیں دے کر اپنے انتقامی جذبات کا بخار نکالنے لگتا ہے۔ رجائیت اس کی مایوسی سے مغلوب ہو جاتی ہے اور زبان سے وہ کلمات نہیں نکلتے جو متوازن حالت میں نکلتے ہیں۔ مگر اس بے کس، انتہا سے زیادہ ستائے ہوئے مظلوم فریادی کی اس فریاد کو بار بار پڑھیے۔ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ اس کے کسی لفظ میں توازن کا بگاڑ ہے؟ کہیں سخت کلامی ہے؟ کسی جگہ ظالموں کے لیے بد دعا ہے؟ کسی ٹکڑے سے مایوسی کا کوئی شائبہ پیدا ہوتا ہے؟ بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ ان دل کو ہلا دینے والی فریاد کا ایک ایک لفظ بے شمار بنیادی قدروں کو اپنی

آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ صحیح بندگانہ عجز و انکسار، خدا کی رحمت پر کامل اعتماد، اس کی ناراضی سے پناہ طلبی، اس کی بے شمار نعمتوں کا اعتراف، دنیا اور آخرت میں رجائی قدروں کا اظہار، کامل تفویض اور سپردگی کا اعلان، راہِ حق میں ہر مصیبت کو بے پروائی سے جھیلتے رہنے کا عزم۔ اللہ اللہ یہ محض ایک فریاد ہی نہیں۔ یہ پیغمبرانہ مشن اور اس کی قدروں کا ایک پورا سمٹا ہوا سمندر ہے جو ان چند لفظوں میں سمو دیا گیا ہے۔ پیغمبری عظمت و رفعت کا اندازہ کرنے کے لیے صرف یہ طائفی فریاد ایک مستقل اور کامل نمونہ ہے۔

ایک نبی کی رجائی قوت کا اندازہ حضورؐ کے اس جملے سے بھی کرنا چاہیے جس نے رجائیت کی ایک نئی قدر دنیا کو بخشی ہے۔ حضورؐ نے اس موقعے پر فرمایا:
"مجھے امید ہے کہ (اگر یہ لوگ ایمان نہ لائیں تو) ان کی آئندہ نسل سے ایسے لوگوں کو اللہ پیدا فرما دے گا جو اسی کی بندگی کریں اور کسی شے کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں" (شیخین عن عائشہؓ)[1]

عداس کی عقیدت

مظلومیت جب انتہا کو پہنچ جائے تو اس کا کچھ نہ کچھ ردِ عمل بھی ہوتا ہے۔ حضورؐ کے ساتھ جو کچھ بھی انسانیت کش برتاؤ اہلِ طائف کی طرف

---

(۱) شیخین کی روایت کے مطابق حضورؐ نے یہ جملہ اس وقت فرمایا تھا جب ملک الجبال نے عرض کیا کہ اگر حضورؐ فرمائیں تو میں یہاں کی آبادی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں۔

سے ہو رہا تھا اسے عتبہ اور شیبہ دونوں بھائی دیکھ رہے تھے اور خوشی کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ لیکن آخر ان کا ضمیر بیدار ہوا اور دل بھر آیا۔ پھر حضورؐ نے جب ان ہی کے باغ میں پناہ لی تو یہاں ان دونوں کا دل مظلومیت کو دیکھ کر بھر آیا تھا وہاں عرب کا ایک متوارث جذبۂ مہمان نوازی بھی ابھر آیا۔ انہوں نے ایک طشت میں کچھ انگور رکھ کر اپنے ایک نصرانی غلام "عداس" کو حضورؐ کے پاس بھیجا۔ عداس نے حضورؐ کی خدمت میں انگور پیش کیے۔ حضورؐ نے "بسم اللہ" فرما کر کھانا شروع کیا۔ اس کے بعد یوں گفتگو ہوئی:

"یہاں کے لوگ تو یہ لفظ استعمال نہیں کرتے۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا کیا دین ہے"

"نصرانی ہوں اور نینوا کا باشندہ ہوں"

"ہاں وہیں کے رہنے والے تو میرے صالح بھائی یونس بن متی بھی تھے"

"آپ کو یونس بن متی کے متعلق یہ معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟"

"بھئی وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔"

عداس یہ سن کر آگے جھکا اور حضورؐ کے ہاتھ پاؤں اور سر کو بوسہ دیا۔ عتبہ اور شیبہ دونوں دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: یہ غلام ہمارے ہاتھ سے گیا۔ جب عداس واپس آیا تو ان دونوں بھائیوں نے پوچھا کہ: تم اس شخص کے سر اور ہاتھ پاؤں کو کیوں چوم رہے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ: آقایانِ من! اس شخص سے بہتر روئے زمین پر کوئی شے موجود نہیں۔ اس نے مجھے بعض وہ باتیں بتائی ہیں جو ایک پیغمبر ہی بتا سکتا ہے۔ یہ سن کر دونوں بھائی بولے کہ: خبردار ایسا نہ ہو کہ یہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دے۔ تمہارا دین اس کے دین سے بہتر ہے۔

عداس والی یہ پوری روایت ابن اسحاق کی ہے۔ بعض سیرت نگاروں نے اسے بہ نظرِ اختصار حذف کر دیا ہے لیکن ہم نے اسے اس لیے درج کیا ہے کہ اس سے حضورؐ کی اس قوتِ یقین اور جذبۂ تبلیغ کا اندازہ ہوتا ہے جس سے حضورؐ کا ایک لمحہ بھی خالی نہ رہا۔ اتنی مصیبتوں، ایسی سخت آزمائشوں اور اذیتوں کے بعد بھی یہ پیغام پہنچانے میں کہ 'یونس بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں' ادنیٰ تامل بھی نہ فرمایا۔

ایک محلِ نظر روایت (حضورؐ کی پناہ طلبی)

حضورؐ جب طائف سے واپس آئے تو ایک شب مقام نخلہ میں قیام فرمایا۔ یہاں ابن کثیر نے (مغازی اموی کے حوالے سے) ایک روایت درج کی ہے جسے دوسرے سیرت نگاروں نے بھی اپنی کتابوں میں بے تکلف لے لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے یہاں سے اُریقط کو پہلے اخنس بن شریق کے پاس بھیجا کہ وہ حضورؐ کو اپنی پناہ میں لے لے۔ اس نے انکار کیا تو پھر سہیل بن عمرو کے پاس بھیجا۔ اس نے بھی انکار کیا تو مطعم بن عدی کے پاس بھیجا اور اس نے حضورؐ کو اپنی پناہ میں لے لیا (انتہی ملخصاً)

مجھے یہ روایت محلِ نظر معلوم ہوتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت، استقامت، خودداری اور کردار سے یہ بہت بعید ہے کہ مکے میں آنے سے پہلے کافروں اور دشمنوں سے پناہ طلب کی اور اس کے پناہ دینے کے بعد حضورؐ مکے میں تشریف لائے۔ اس واقعے سے پہلے مکے میں پورے دس سال کی نبوی زندگی ساری کی ساری ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اس عرصے میں بڑی سے بڑی آزمائشیں ہوئیں لیکن کسی سے بھی پناہ طلب کرنے کا کوئی واقعہ ظہور میں

نہیں آیا۔ خود طائف میں حضورؐ نے کسی سے پناہ نہیں طلب کی حالانکہ وہاں شدید اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تین سال تک شعب بنی ہاشم میں محصور رہ کر سخت سے سخت امتحان اور معاشری مقاطعے کا مقابلہ کیا لیکن کسی سے پناہ طلب نہیں کی حتیٰ کہ جب ابو طالب نے حضورؐ سے یہ فرمائش کی کہ مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو تو حضورؐ نے ابو طالب کو صاف جواب دیدیا کہ اگر تمہیں اپنی حمایت ترک کرنی پڑے تو ترک کر دو۔ لیکن میں اشاعت حق سے باز نہیں آسکتا۔ خواہ یہ لوگ شمس و قمر کو میرے ہاتھوں پر کیوں نہ رکھ دیں۔ ایسے رسول سے یہ توقع کرنا بعید از فہم ہے کہ طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی سے پناہ مانگی ہو گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الدغنہ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکرؓ بھی حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی غرض سے روانہ ہو گئے ہیں تو دوڑا دوڑا۔ برک الغماد سے اپنی حفاظت و پناہ میں لے آیا کہ تم جیسا شریف انسان مکے سے نہیں جا سکتا۔ صرف ایک شرط رکھی کہ قرآن بلند آواز سے نہ پڑھا کرو۔ کیونکہ اس سے تمام سننے والے متاثر ہوتے ہیں۔ چند دنوں تک اس کی پابندی رہی۔ آخر ذوق و شوق غالب آیا تو تلاوت میں آواز بھی بلند ہونے لگی۔ ابن الدغنہ نے شکوہ کیا تو آپ نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ اپنی پناہ واپس لے لو۔

حضرت عمرؓ نے جب کعبے کے پاس اعلانِ اسلام کیا تو تمام لوگ مارنے کو دوڑ پڑے اور مار دھاڑ شروع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر آپ کے ماموں نے پناہ دینے کا اعلان کر دیا۔ لوگ ہٹ گئے۔ اس کے چند دنوں بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مسلمان تو ہر جگہ پٹ رہے ہیں۔ اور میں آرام سے بیٹھا ہوں، یہ کوئی لطف کی زندگی نہیں۔ فوراً جا کر اعلان کر دیا کہ تیری

پناہ تجھے مبارک ہو، مجھے نہیں چاہیے۔

علاوہ ازیں جب قبیلہ عضل اور قارہ کی درخواست پر حضورؐ نے دس مبلّغین کو عاصم بن ثابت کی قیادت میں بھیجا تو رجیع کے مقام پر بنولحیان کے دو سو آدمیوں نے (جن میں ایک سو تیر انداز تھے) حملہ کر دیا۔ یہ دس آدمی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ تیر اندازوں نے آواز دی کہ تم اتر آؤ، ہم تمہیں پناہ دیں گے۔ تو عاصم نے صاف جواب دیا کہ ہمیں کافروں کی پناہ مطلوب نہیں۔

غرض اس طرح کی پناہ طلبی اکثر صحابہ سے بھی متوقع نہیں تو حضورؐ سے کیوں ہو؟ بات دراصل یوں ہو سکتی ہے کہ کفار و مشرکین میں بھی کچھ لوگ ایسے تھے جن میں بعض محض اپنی شرافت کی وجہ سے، اور بعض اپنی خاندانی حمایت کی وجہ سے از خود پناہ کی پیش کش کیا کرتے تھے۔ ابن الدغنہ ابوبکرؓ کی شرافت سے متاثر تھا۔ اور اس نے خود اپنی طرف سے پناہ کی پیش کش کی۔ عمرؓ کے ماموں نے اپنی خاندانی عصبیت کی وجہ سے آپ کو پناہ دی۔ اب سوچیے کہ وہ کون سا انسان تھا جو حضورؐ کی سیرت سے متاثر نہ تھا؟ اگرچہ کچھ ایسے تھے جن کے اس تاثر کے اظہار پر کفر بہت زیادہ غالب تھا۔ تو ان ہی میں ایسے لوگ بھی تھے جو ابن الدغنہ کی طرح اس تاثر کو عملاً ظاہر کر دیا کرتے تھے۔ مطعم بن عدی بھی ان ہی لوگوں میں تھا جو کفر کے باوجود اپنے اندر کچھ جوہر شرافت بھی رکھتا تھا۔ جب ابنائے ہاشم کے مقاطعے اور محاصرۂ شعب بنی ہاشم کو ختم کرنے کا سوال اٹھا تو سب سے پہلے مطعم ہی تھا جس نے ہشام بن عمرو اور زہیر بن ابی امیہ کی تائید کی تھی۔ پھر یہی مطعم تھا جس نے مقاطعے کے عہد نامے کو اپنے ہاتھوں سے چاک

کیا تھا۔ اور یہی مطعم تھا جو چند ہمراہیوں کے ساتھ جا کر ابنائے ہاشم کو گھاٹی سے نکال لایا تھا۔ پس صورتِ حال یقیناً یہی ہوئی ہو گی کہ حضورؐ کی مظلومیت کا حال سن کر مطعم نے از خود پناہ دینے کا اعلان کیا ہو اور حضورؐ نے اس پیش کش کو منظور فرما لیا ہو۔ کسی کی پیش کشِ پناہ کو قبول کر لینا اور بات ہے۔ اور کسی سے پناہ طلب کرنا دوسری بات۔ دونوں میں بڑا فرق ہے اور دونوں کے نتائج میں بڑا بل ہے۔ بظاہر ذرا سا لفظی فرق ہے پناہ قبول کرنے اور پناہ مانگنے میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیان کرنے والے نے اس باریک مگر دور رس فرق کو ابتداءً محسوس نہ کیا اور بات چل پڑی۔

اس کے کچھ دنوں بعد ہجرتِ مدینہ کا واقعہ پیش آیا اور یہ شریف النفس کافر مطعم بن عدی وفات پا گیا۔ ایسے کافروں کے انجام کے متعلق ہم گزشتہ صفحات میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ مغفرت ہو یا نہ ہو لیکن آخرت میں ایسی نیکیاں کرنے والے کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی اور دنیا میں ان کے ساتھ احسانمندانہ سلوک کیا جائے گا۔ چنانچہ فتح بدر کے دن حضورؐ نے فرمایا کہ: "اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان قیدیانِ بدر کو مجھ سے مانگتا تو میں ان سب کو اس کے حوالے کر دیتا (یعنی بغیر کوئی فدیہ لیے ہوئے)۔"

طائف کے بعد کی تبلیغی سرگرمیاں

طائف کے تلخ اور مایوس کن تجربے کے بعد بشری فطرت کا تقاضا یہ تھا کہ دل بیٹھ جاتا، مایوسی غالب آجاتی اور تبلیغِ حق کی سرگرمیاں سرد پڑ جاتیں مگر نبوّت کی بے پناہ قوتِ عمل عام انسانی فطرت سے بہت بلند و بالا ہوتی ہے۔ مایوسی اس کے سامنے آکر خود مایوس ہو جاتی ہے حضورؐ پر طائف کے تجربات نے اُلٹا اثر کیا اور اس کے ردِّ عمل نے تبلیغی سرگرمیوں میں اور زیادہ چُستی و تیزی پیدا کردی۔ اگر رجائی استقامت بھی کوئی اعلیٰ قدر ہے — اور یقیناً ہے — تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اس کا سب سے برتر عملی نمونہ حضورؐ ہی کی ذات ہے۔

طائف سے واپس آکر حضورؐ کی تبلیغی سرگرمیوں میں دوچند اضافہ ہو گیا۔ اب حضورؐ ایک ایک کے گھر جاکر پیغامِ حق پہنچانے لگے۔ ہر میلے میں، ہر مجمعے میں، ہر بازار میں، ہر گلی کوچے اور ہر قبیلے میں بے خوف و خطر گھُس کر حق کی آواز سناتے۔ بنی عامر بن صعصعہ، بنی محارب، بنی فزارہ، بنی غسان، بنی مرہ، بنی حنیفہ، بنی سلیم، بنی عبس، بنی نصر، بنی کندہ، بنی کلب، بنی حارث بن کعب، بنی عذرہ اور بنی حضرم، غرض ایک ایک قبیلے کے سردار، خواص اور عوام سے مل مل کر دعوتِ حق دیتے رہے۔ کہیں مباحثہ ہوا، کہیں مذاق اڑایا گیا، کہیں دھمکیاں دی گئیں، کہیں ایذائیں

پہنچائی گئیں اور کہیں جان کے لالے پڑ گئے۔ اکثر جگہ ابولہب یا ابوجہل اور ان کے ساتھی شور مچانے اور لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے ساتھ ہوتے مگر ایک موقع بھی ایسا نظر نہیں آتا جہاں حضورؐ کے عزم واستقامت میں کوئی فرق آیا ہو یا غیر متوازن کلمات زبان پر آئے ہوں۔ چند جگہ بعض سعید روحیں متاثر بھی ہوئی ہوں گی مگر عام طور پر ہر جگہ انکار سے جواب ملا لیکن ادائے فرض میں کوئی کوتاہی نہیں آئی اور دعائے ہدایت کے سوا اعدا سے شکایت کا کوئی حرف زبان پر نہ آیا۔ یہ فوق العظمت اقدار ایک نبی کے سوا اور کس میں ہو سکتی ہیں ؟

دائرۂ تبلیغ کی وسعت، ... وَمَنْ حَوْلَهَا، سلسلۂ نبوّت

حضورؐ کی اس مزید سرگرمی کے بعد بہ ظاہر اہل مکّہ کے لیے کوئی پیغام مؤثر نہیں رہا تھا کیونکہ منکرین کی شدتِ انکار میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہو رہا تھا جس نسبت سے حضورؐ کی سرگرمیِ تبلیغ میں اضافہ ہوا تھا۔ جہاں تک لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی کے فریضے کا تعلق تھا وہ حضورؐ نے سو فی صد پورا فرما دیا بلکہ طائف کے سفر نے وَمَنْ حَوْلَهَا میں بھی ابتدائی قدم رکھ دیا تھا اور امّ القریٰ سے باہر تبلیغ دین کے دوسرے قدرتی مواقع بھی پیدا ہو گئے تھے۔ یعنی ایک طرف تو مہاجرین حبشہ نے تبلیغی فرائض انجام دیے اور دوسری طرف یہ ہوا کہ باہر سے جو سلیم الفطرت انسان مکّے میں آتے اور ان کو حضورؐ کا پیغام سننے کا اتفاق ہوتا وہ ایمان لے آتے مثلاً ابو ذر

غفاری، ضماد ازدی، طفیل بن عمرو دوسی وغیرہ۔ گویا اہرالقربی کے ساتھ ہی وطن حوالیا بھی تدریجی رفتار سے تبلیغی دائرے میں شامل ہو رہا تھا۔

مگر اب اس دائرے کی وسعت نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کی وجہ سے اہل اسلام کے لیے ایک نئے دورِ زندگی کی بنیاد پڑ گئی۔ حضورؐ نے ایک ایک کے کان میں حکمت، موعظت اور مجادلۂ حسنہ[1] کے تمام پہلوؤں سے آوازِ حق پہنچانے کے بعد اب خاص طور پر باہر سے آنے والوں (خواہ وہ زائرین ہوں یا تجار) کی طرف اپنی توجہ مرکوز فرمائی۔

جاہلیت میں بھی ہمیشہ سے رسمِ حج ادا کی جاتی تھی اور لوگ ہر طرف سے حج و زیارت کے لیے ہر سال موسمِ حج میں آیا کرتے تھے۔ کسی نہ کسی شکل میں سیدنا ابراہیمؑ کی یہ دعا قبولیت کا رنگ دکھاتی رہتی تھی کہ واجعل افئدۃ الناس تھوی الیھم (خداوندا! لوگوں کے دلوں کو ان ساکنانِ صحرا کی طرف مائل کر دے)۔ کعبۃ اللہ کی یہ مرکزیت بڑی قوت کے ساتھ ہمیشہ مسلسل باقی رہی۔ یہی وہ پُرزور مرکزیت تھی جسے توڑنے کے لیے ابرہہ نے اپنے ہاتھیوں اور ہیل تن ساتھیوں کے ساتھ ناقابلِ مقاومت حملہ کیا تھا اور حملے سے پہلے ہی سارا لشکر بھونسے کی طرح اڑ گیا۔ یہ اتنا بڑا اور ناقابلِ

---

(۱) قرآنی حکم ہے کہ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دینے میں حکمت اور موعظۂ حسنہ سے کام لو اور مباحثے کا بہترین انداز رکھو) درحقیقت یہ انسانوں کی تین قسموں کا ذکر ہے کسی طبقے کے لیے حکمت کی باتیں مؤثر ہوتی ہیں۔ کسی کے لیے موعظۂ حسنہ اور کسی کے لیے اعلیٰ اندازِ مباحثہ۔

یقینی قسم کا واقعہ تھا کہ اس سنہ کا نام ہی "عام الفیل" رکھا گیا اور قرآن پاک میں سورۃ فیل اسی اعجوبۂ روزگار واقعے کی یاد دہانی کے لیے نازل ہوئی۔ ظاہر ہے اس واقعے کے بعد کعبۃ اللہ کی مرکزیت اعتقاداً اور عملاً دو چند ہو گئی ہو گی۔ خدا نے بھی اسی کو مرکز عالم بنانا پسند کیا اور اسی مرکز ابراہیمی کو دعائے ابراہیمی (۔۔۔ وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا الخ) کی قبولیت گاہ بنایا۔

یہاں حج اور عمرہ ادا کرنے کے لیے ہر طرف سے زائرین آیا ہی کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ نے اب ان آنے والوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ منکرین نے شروع ہی میں یہ پکا بندوبست کر لیا تھا کہ باہر سے کوئی آنے والا حضورؐ سے نہ ملنے پائے۔ کسی کے کانوں میں کوئی آواز اسلام نہ پڑنے پائے۔ وہ ہر آنے والے کو حضورؐ کے خلاف پوری طرح کان بھر کر پہلے ہی ورغلا چکتے تھے اور ان کی ایک جماعت مستقل اسی کام پر لگی رہتی تھی کہ اگر کوئی موقع ایسا آئے تو شور، غل، استہزا اور مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے سے کوئی دریغ نہ کرے۔ ان حالات میں حضورؐ کا علانیہ کسی کو تبلیغ کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ لہذا قدرت نے اس مقصد کے لیے ایک خاص موقع پیدا کر دیا کہ ایک شب حضورؐ مقام عقبہ سے گزر رہے تھے کہ یثرب (مدینہ منورہ) کے قبیلہ خزرج کے کچھ آدمیوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کے نام یہ ہیں: ابو امامہ اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک بن عجلان، ابو الہیثم، مالک بن تیہان، عقبہ بن عامر، قطبہ بن عامر، جابر بن عبد اللہ، معاذ بن عفراء، ذکوان بن عبد قیس، عبادہ بن صامت، ابو عبد الرحمان، یزید بن ثعلبہ، عویم بن ساعدہ، رافع بن مالک بن عفراء۔

یہ کل تیرہ ہو تے ہیں لیکن روایتیں یہ کہتی ہیں کہ یہ چھ یا آٹھ تھے۔ پھر ان چھ یا آٹھ کے ناموں میں بھی اختلاف ہے کہ کون کون تھے؟ بہر حال اس وقت اس کی تحقیق ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ صرف اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ ان میں دو ــــ عویم اور ابوالہیثم قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دونوں خزرجی نہیں ہیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ اس موقعے پر صرف خزرجی زائرین نہ ملے تھے بلکہ ایک یا دو اوسی بھی تھے خواہ ایک ساتھ ہی ملے ہوں یا الگ الگ، اور یہی سبب تھا کہ دوسرے سال اسی جگہ مزید اوسی بھی آئے۔

حضورؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش فرمایا اور کچھ قرآن سنایا۔ اور ان چھ یا آٹھ آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا۔

خزرج و اوس

یہاں ایک ضروری چیز بھی سُن لینی چاہیے۔ اوس اور خزرج مدینے کے دو بڑے اہم قبیلے تھے۔ ان دونوں میں ایک ایسی خونریز جنگ ہوئی تھی جو ایک سو بیس سال تک جاری رہی۔ جھگڑا اس بات پر شروع ہوا تھا کہ گھڑ دوڑ میں ایک گھوڑا دوسرے سے آگے نکل گیا تھا۔ مدینے کے قریب ایک مقام ہے جسے بُعاث کہتے ہیں[1]۔ یہی مقام میدانِ جنگ تھا جس کی وجہ سے اس کا نام جنگِ بعاث پڑ گیا۔ اس جنگ میں ابتداءً تو خزرج کو فتح ہوئی تھی لیکن بعد میں انہیں سخت شکست ہوئی۔ لہٰذا یہ

---

(۱) مجمع البحار میں بُعاث کو اوس کے ایک قلعے کا نام بتایا ہے۔

مکے میں اس لیے آئے تھے کہ قریش کو اپنا حلیف بنائیں اور اوس سے انتقام لیں۔

یہ دونوں قبیلے قحطان کی اولاد ہیں۔ مدینے اور اطراف کے یہودیوں سے بھی ان کا جنگ و صلح کا تعلق قائم تھا جس میں کبھی فتح ہوتی اور کبھی شکست ان اہلِ کتاب (یہودیوں) سے تعلق و ربط کی وجہ سے اوس و خزرج کے کان بھی ایک نبی آخرالزمان کے ذکر سے آشنا ہو گئے تھے اور وہ بھی گویا یہود ہی کی طرح اس کے ظہور کے منتظر تھے۔ یہود کو یہ یقین تھا یہ نبی آخرالزمان تمام دوسرے پیغمبروں کی طرح بنی اسرائیل ہی میں ظہور پذیر ہوگا۔ چنانچہ وہ بعض اوقات اپنے دشمنوں کو (اوس و خزرج کو خصوصاً) یہ کہہ کر دھمکیاں دیتے تھے کہ: ذرا ٹھہرو۔ وہ آنے والا جب آئے گا تو ہم اس کی اُمت بن کر تم سے انتقام لیں گے۔" لیکن معاملہ کچھ الٹا سا ہوگیا۔ بعد میں یہود تو اس لیے حضورؐ کے مخالف ہو گئے کہ نبی آخرالزمان اور رسولِ منتظرؐ کا ظہور بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں کیوں ہوا؟ اور ادھر یہ ہوا کہ مقام عقبہ پر جب خزرجیوں نے حضورؐ کا پیغام اور ساتھ ہی قرآن سُنا تو معاً ایک نبی منتظرؐ کا نقش لوحِ دل پر ابھر آیا اور سب کے سب اسلام لے آئے۔

انسانی تاریخ میں یہ المیّہ ہر جگہ نظر آئے گا کہ بعض اوقات راہبر خود بھٹک جاتا ہے اور راہرو منزلِ مقصود پالیتا ہے۔ خزانے کا پتہ بتانے والا خود اس سے محروم رہتا ہے اور سننے والا دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ کر اپنا جیب و دامن بھر لیتا ہے۔ ان انصارِ مدینہ کو نبی منتظرؐ کی خبر یہود ہی نے دی تھی لیکن وہ خود اپنی کج عقلی اور اسرائیلی عصبیت و جنبہ داری

کی وجہ سے اس فیضِ عام سے محروم رہے اور ان ہی سے سننے والے اوس و خزرج نے اس دولتِ کونین سے اپنے خزانے پُر کر لیے۔ ان یہودیوں میں صرف چند سعید روحیں تھیں جنہوں نے حضورؐ کو اور حضورؐ کے پیغام کو صدقِ دل سے قبول کر لیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر آگے آئے گا۔

مصعب بن عمیر کی روانگیِ مدینہ اور حکیمانہ تبلیغ

یہ خزرجی (اور اغلب ہے کہ دو ایک اوسی بھی) اسلام لانے کے بعد یثرب (مدینے) واپس گئے۔ (اسلام لانے کے بعد ان ہی دونوں قبیلوں کا لقب "انصار" ہوگیا)۔ اس نئے پیغام کے زور و قوت کا یہ اثر تھا کہ ان کے مدینے پہنچنے کے بعد تمام انصار کے گھروں میں حضورؐ ہی کا چرچا ہونے لگا اور ہر ایک انصاری دیدارِ نبوی کا مشتاق ہوگیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا تھا مگر یہ پورا سال اس شدید بے چینی میں گزارنا مشکل تھا اور دینی معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ابھی نہ یہ خود آسکتے تھے نہ اکثر انصار کے قبولِ اسلام سے پہلے حضورؐ کو آنے کی دعوت دینا مناسب سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے معاذ بن عفرا اور رافع بن مالک کو خاموشی کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں بھیج کر درخواست کی کہ: کسی کو دینی تعلیم کے لیے ہمارے پاس بھیج دیجیے۔ حضورؐ نے مصعب بن عمیر کو بھیج دیا جو مدینے میں اسعد بن زرارہ کے مہمان ہوئے۔(۱)

---

(۱) بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دوسرے سال (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جناب مصعب مدینے پہنچ کر ہر روز کسی نہ کسی انصاری گھرانے میں جاتے اور تبلیغ کرتے اور شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو گا جس میں ایک دو نئے مسلمان نہ ہو جاتے ہوں۔

ایک دن اسعد بن زرارہ اور مصعب بن عُمیر بنی عبد الاشہل اور بنی ظفر کے محلوں کی طرف گئے۔ بنی عبد الاشہل کے سردار اس وقت سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر تھے۔ سعد بن معاذ اور اسعد بن زرارہ باہم خالہ زاد بھائی تھے۔ اسعد اور مصعب بنی ظفر کے محلے میں ایک کنوئیں (جس کا نام بئر مرق تھا) کے پاس بیٹھ گئے اور چند نو مسلم بھی وہیں جمع ہو گئے۔ یہ اطلاع پاکر سعد بن معاذ نے اُسید بن حضیر سے کہا کہ: تم ذرا ان دونوں (اسعد اور مصعب) کو جا کر دیکھو۔ یہ ہمارے محلے میں کمزور طبع لوگوں کو بیوقوف بنانے اور بہکانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ انہیں جاکر ڈانٹ دو کہ ہمارے محلے میں نہ آیا کریں۔ یہ اسعد (بن زرارہ) میرا عزیز (خالہ زاد بھائی) نہ ہوتا تو میں اسے مزہ چکھا دیتا لیکن اس عزیزداری کی وجہ سے میرا بس نہیں چلتا۔" یہ سُن کر اسید اپنا ہتھیار سنبھال کر چل پڑے۔ ان دونوں کو پہلے تو خوب صلواتیں سنائیں پھر کہا کہ: اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو یہاں کے کم عقلوں کو اور بیوقوف بنانے کی غرض سے یہاں پھر قدم نہ رکھنا۔" مصعب نے بڑی شرافت اور نرمی سے کہا: کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ آپ ذرا بیٹھ جائیں اور دو چار باتیں سُن لیں؟

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) بارہ انصار عقبہ پر آئے تب حضورؐ نے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کر دیا۔ بہر حال مصعب جب بھی گئے ہوں اس سے اصل مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اگر کوئی بات پسند آئے تو مان لیجیے گا اور اگر ناپسند ہو تو ٹھکرا دیجیے۔" اُسید یہ کہتے ہوئے کہ "بات تو انصاف کی کہی" قریب آ کر بیٹھ گئے۔ جناب مصعب بن عمیر ابتدائی اسلام لانے والوں میں تھے اور حضور اکرمؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ مدینے آ کر اپنی تبلیغی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتے تھے اور اس دوران میں خاصے تبلیغی تجربات حاصل کر کے "رسولانہ انداز" بھی پیدا کر چکے تھے۔ انہوں نے اسید کے سامنے ایسے حکیمانہ اور مخلصانہ انداز سے اسلام پیش کر کے قرآن سنایا کہ ان کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ قبولِ اسلام کی غمازی کرنے لگا جسے اسعد نے بھی بھانپ لیا۔ اُسید نے کہا کہ: "کتنے پاکیزہ حقائق تم نے سنائے ہیں۔ اچھا اس دین میں داخل ہونے کے لیے کیا کرنا پڑتا ہے۔" مصعب نے کہا: بس غسل کر لو، کپڑے پاک کر لو۔ پھر کلمۂ شہادت ادا کر کے نماز ادا کر لو۔" اسید نے اسی وقت یہ سب کچھ کر کے کلمۂ شہادت پڑھا اور دو رکعت نماز بھی ادا کر لی۔ پھر کہا: میرے پیچھے ایک آدمی اور ایسا ہے کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو اس کی ساری قوم ہی اسلام لے آئے گی۔ وہ ہے سعد بن معاذ۔ میں ابھی اسے کسی بہانے تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔" اُسید روانہ ہو گئے اور سیدھے سعد بن معاذ کے پاس پہنچے جہاں ان کے اور بھی بہت سے اہلِ قبیلہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ذرا عربوں کی ذہانت و فطانت ملاحظہ فرمایئے۔ اُسید کو دور ہی سے دیکھ کر سعد بن معاذ بول اُٹھے: میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسید جو چہرہ لے کر یہاں سے گیا تھا وہ چہرہ لے کر واپس نہیں آ رہا ہے۔" اسید جب قریب آئے اور سعد نے کیفیت دریافت کی تو انہوں نے بتایا کہ: میں نے اسعد اور مصعب میں کوئی خاص خرابی تو نہیں پائی ہے۔ دونوں کو میں نے جھا دیا

ہے اور وہ مان بھی گئے ہیں۔ البتہ یہ معلوم ہوا ہے کہ بنی حارثہ تمہارے خالہ زاد بھائی (اسعد بن زرارہ) کو صرف تمہاری تحقیر کی غرض سے قتل کرنا چاہتے ہیں۔" سعد کو یہ سن کر غصّہ آیا اور وہ اپنا ہتھیار سنبھال کر ان دونوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے بھی بُرا بھلا کہہ کر وہی باتیں کہیں جو اس سے پہلے اسید نے کہی تھیں۔ پھر تقریباً اسی انداز سے مصعب ان سے پیش آئے اور سعد بھی اسید ہی کی طرح اسلام لے آئے اور اپنی قوم میں واپس آ گئے۔ اسید نے بھی دور ہی سے دیکھ کر وہی کہا جو سعد نے اسید کے بارے میں کہا تھا کہ: بخدا یہ وہ چہرہ لے کر واپس نہیں آ رہا ہے جو لے کر گیا تھا۔"

لیکن جو نئی بات ہوئی وہ یہ تھی کہ سعد نے اپنی قوم سے پہلے ایک سوال کیا کہ: میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ: ہمارے سردار ہو۔ سب سے افضل ہو۔ المین النقیبہ ہو۔" قوم کے اس جواب کے بعد سعد بن معاذ نے اپنے پُروقار لہجے میں اپنے آخری فیصلے کا یوں اعلان کر دیا کہ: سُن لو آج سے تمہارے تمام مرد و زن سے گفتگو مجھ پر حرام ہے تاآنکہ تم سب اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ۔" اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن شام ہونے سے پہلے پہلے بنی عبدالاشہل کے تمام مرد و زن نے اسلام قبول کر لیا۔

اس کے بعد سعد بن معاذ اور مصعب بن عمیر دونوں اسعد بن زرارہ کے گھر آ گئے اور سب نے مل کر تبلیغی مہم شروع کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں چند ایک قبائل کو چھوڑ کر انصار کے ہر گھر میں اسلام بڑی تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا۔

لمحۂ فکریہ

یہاں آگے چلنے سے پہلے دو نکتوں پر غور کر لیجیے ۔ پہلی چیز ہے رسولِ خدا صلعم کی نظرِ انتخاب ۔ مدینے میں مبلّغ، معلّم یا مقریٔ(۱) کی حیثیت سے حضورؐ نے جس ذاتِ گرامی کو منتخب فرمایا وہ تھے سیدنا مصعب بن عمیر۔ یہ انتخاب کتنا لاجواب تھا اس کا اندازہ اوپر کے واقعات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے ۔ ان ہی کے حکیمانہ طرز تبلیغ کا نتیجہ تھا کہ بہت تھوڑے عرصے میں انصار کے تقریباً سارے گھرانوں میں اسلام پھیل گیا۔ کاش اُن گفتگوؤں کا ریکارڈ محفوظ ہوتا جو جناب مصعب تبلیغ کے موقعے پر کیا کرتے تھے تو آج ہر مبلّغ کے لیے وہ بڑا ہی کارآمد ہوتا۔

دوسری قابلِ غور چیز یہاں یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں وحدتِ انسانی کا جو پیغام ہے اس کا ایک مختصر مگر اعلیٰ نمونہ وہ اتحاد ہے جو صرف اسلامی پیغام ہی نے نہیں بلکہ حضورؐ کی شخصیت نے اوس و خزرج کے درمیان قائم فرمایا تھا۔ ابھی آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ ان دونوں قبیلوں کے درمیان بہت معمولی سی بات پر جو جھگڑا شروع ہوا تو پشتوں تک دونوں میں خونریز جنگ ہوتی رہی ۔ لیکن کتنے پاکیزہ دل تھے یہ انصارِ مدینہؓ کہ قبولِ اسلام کے بعد پھر کبھی ان دونوں میں کوئی جنگ نہ ہوئی بنی امیہ اور بنی ہاشم میں تو جھگڑے زندہ ہوئے ۔ بنی عباس اور بنی فاطمہ

---

(۱) حضرت مصعب بن عمیر مدینے میں مقریٔ کے لفظ سے یاد کیے جاتے تھے ۔ مقریٔ کے معنٰی ہیں پڑھانے والا۔

میں بھی ہاتھا پائی ہوتی رہی بلکہ ایک آدھ مواقع پر خود مہاجرین و انصار کی کش مکش نے بھی سر اٹھایا اور فوراً دب گئی۔ لیکن اوس و خزرج میں پھر کبھی کوئی آویزش سننے میں نہ آئی۔ یہ کمال جہاں اسلامی پیغام کا، خود حضرت اکرمؐ کی عملی تعلیمات کا اور نیز مصعب و اسعد جیسے مبلغین کا تھا وہاں ان سارے انصارِ مدینہ کے ایمان و اخلاص کا بھی تھا۔

پہلی بیعتِ عقبہ اور "بیعتِ نساء"

دوسرے سال ۱۲ نبوی میں حسب وعدہ دس خزرجی اور دو اوسی حج کے لیے آئے۔ حضورؐ سے اسی مقام عقبہ پر ملے اور اسلام لائے۔ ان میں پانچ وہ بھی تھے جو گزشتہ سال آئے تھے۔ یعنی اسعد، عوف، رافع، عقبہ اور قطبہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس بیعت کو دوسری بیعت عقبہ کہنا چاہیے لیکن تمام سیرت نگار اسے پہلی بیعتِ عقبہ ہی کہتے ہیں اس لیے ہم بھی اسے اسی لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے موقعے پر تو چھ (یا آٹھ)، انصار صرف ایمان لائے تھے اور تصدیق کی تھی۔ لیکن اس دوسرے موقعے پر باقاعدہ بعض خاص باتوں پر بیعت لی گئی تھی۔ یہ بیعت ان باتوں پر تھی کہ شرک نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے۔ زنا نہ کریں گے۔ قتلِ اولاد نہ کریں گے۔ افترا و بہتان طرازی نہ کریں گے اور معروف میں رسول کی نافرمانی نہ کریں گے۔

لمحۂ فکریہ

سورۂ ممتحنہ کی ایک آیت ہے:

یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝	اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ شرک باللہ نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کوئی ایسا بہتان نہ تراشیں گی جس کا تعلق ان کے ہاتھوں اور پاؤں کی افترا پردازی سے ہو[1] اور معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی تو تم ان کی بیعت لے لو اور ان کے لیے اللہ سے بخشش طلب کرو۔ اللہ تو بلاشبہ غفور، رحیم ہے۔

یہ آیت بلکہ پوری سورت ممتحنہ مدنی ہے، جو بہت بعد میں نازل ہوئی ہے۔ ان شرائط بیعت کا تعلق خاص طور پر عورتوں سے ہے۔ چنانچہ اس نوع

---

(۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کسی اور کی ہو اور اسے منسوب کسی اور کی طرف کیا جائے۔ ہاتھوں اور پاؤں کا ذکر ایک لطیف کنایہ ہے۔ عورت اولاد کو اپنے دونوں پاؤں کے درمیان سے جنتی ہے اور اسے گود میں اپنے دونوں ہاتھوں سے سنبھالتی ہے۔

کی بیعت کا نام ہی بیعۃ النساء ہے۔ یہاں قابلِ غور چیز یہ ہے کہ حضورؐ اس آیت کے نزول سے بہت پہلے ان ہی شرائط پر انصار کی بیعت لے رہے ہیں۔ (مذکر کے صیغوں کے سوا) ساری باتیں ان ہی الفاظِ آیت اور اسی ترتیب سے حضورؐ فرما رہے ہیں۔ ہم پچھلے صفحات میں کئی جگہ بہ تکرار اس حقیقت کو واضح کر چکے ہیں کہ پیغمبر کی زندگی ابتدا ہی سے صحیح رخ پر ہوتی ہے۔ خدائی ہدایات کے بعد جو حقیقت واضح طور پر شعور کی گرفت میں آجاتی ہے وہ قبل از نبوّت لاشعور کے پردوں میں مستور ہوتی ہے۔ نبی کی دماغی ساخت اور اس کا فکری سانچہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ہر قدم قدرتی طور پر اسی طرف اٹھتا ہے جدھر اسے بعد میں جانا ہے۔ قبل از نبوت اس کی مثال اس راہ رو کی ہوتی ہے جو ہر چوراہے پر پہنچ کر اپنے وجدانی بصیرت یا تحرّی سے کسی ایک راہ پر چل پڑتا ہے اور ابھی کچھ دور جاتا ہے کہ اسے کوئی بتانے والا بتا دیتا ہے کہ تم ٹھیک رستے پر جا رہے ہو۔ جب تک توثیق کرنے والا توثیق نہیں کرتا اس وقت تک اگرچہ وہ صحیح راہ پر ہی چل رہا ہوتا ہے لیکن وہ ایک لحاظ سے کھویا ہوا سا ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ لاشعوری طور پر صحیح راہ رَو تھا اور بعد میں وہ شعوری یقین حاصل کر لیتا ہے۔ ایک نبی کی بھی تقریباً یہی صورت ہوتی ہے کہ وہ بغیر وحی کے بھی ٹھیک راہ پر چلتا ہے خواہ نبوّت سے پہلے ہو یا بعد از نبوّت کسی معاملے میں حکمِ خداوندی نازل ہونے سے پہلے ہو، لیکن یہ رہنمائی صرف عقل و بصیرت اور فطری افتادِ مزاج کی ہوتی ہے۔ اس میں امکانِ خطا کا ایک پہلو بھی موجود ہوتا ہے مگر اس کے بعد جب وحی اس کی تصدیق کر دیتی ہے تو اس

توثیق (CONFIRMATION) کے بعد ایک ایسا شعوری یقین پیدا ہو جاتا ہے جس میں خطا کا امکان نہیں باقی رہتا۔ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے وہ یہ ہے کہ "وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ" میں جس "ضلال" کا ذکر ہے وہ وہی عبوری راہروی ہے جو توثیق وحی سے پہلے ہوتی ہے۔ یہ راہروی گمراہی (بھٹک جانا) نہیں ہوتی بلکہ صحیح راہروی ہوتی ہے۔ وحی صرف اس کی توثیق و تصدیق کر کے اسے امکانِ غلط روی کے شائبوں سے پاک کر دیتی ہے اور حقیقت کو آئینے کی طرح واضح شعور کے سامنے لے آتی ہے۔

شروع میں بھی آپ نے اس کی کئی مثالیں پڑھی ہیں اور اب یہ "بیعت النساء" بھی آپ کے سامنے ہے۔ حضورؐ کی زبان سے آج وہی شرائطِ بیعت ادا ہو رہی ہیں جو برسوں کے بعد قرآن بن کر نازل ہونے والی تھیں۔ آج یہ الفاظ محمد رسول اللہ کے ہیں لیکن کل یہ وحی الہٰی کے الفاظ بننے والے تھے۔ اس وقت جو شرائط حضورؐ نے پیش فرمائی تھیں وحی نے ان پر کوئی اضافہ نہیں کیا۔ صرف تصدیق و توثیق کی مہر ثبت کر دی۔

آپ کو آئندہ صفحات میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جن سے ہمارے پیشِ نظر، نظریّے کی تائید ہوگی۔ مثلاً یہ کسے نہیں معلوم کہ حضورؐ نے مدینۂ منورہ پہنچنے سے پہلے مقامِ قبا میں جمعہ پڑھا اور خطبۂ جمعہ بھی دیا۔ اس وقت تک جمعے کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حکم بہت بعد میں آیا مگر عمل پہلے ہو گیا۔ یعنی حضورؐ کی پسند پہلے ہوئی اور قرآنی توثیق بعد میں۔ ان مثالوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کی زندگی کا رخ ابتدا سے صحیح سمت میں ہوتا ہے اور پیغمبر ہو چکنے کے بعد کوئی وحی آنے سے پہلے بھی اس کا قدم

صحیح منزل ہی کی طرف اٹھتا ہے۔

تقاضائے بشریت

ہاں یہ صحیح ہے کہ کبھی مواقع پر حضورؐ کے بعض طرزِ عمل میں لغزش بھی واقع ہوئی جس کی نشاندہی اور اصلاح وحی الٰہی نے کی۔ قرآن کریم میں یہ تصریحات موجود ہیں اور اس وقت ان پر تبصرہ مقصود نہیں۔ (عفا اللہ عنک لم اذنت لھم الخ ۔۔۔ قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا الخ۔ ۔۔۔ اور عبس وتولّی الخ وغیرہ کی تفسیر اور نوعیت واقعات کو ملاحظہ فرمایئے) لیکن اس قسم کے چند استثنائی واقعات سے ہمارا کلیہ نہیں ٹوٹتا۔ مستثنیات کسی کلیے کو توڑتے نہیں بلکہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ کوئی کلیہ ضرور موجود ہے جس سے چند مثالیں مستثنیٰ ہیں۔ علاوہ ازیں ان لغزشوں کی جلو میں اس قدر حسن و جمال اور اتنے افادی پہلو ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لغزشیں بھی نبوی سیرت کا ایک بڑا اہم باب ہیں۔ تفصیلی گفتگو کا یہ محل نہیں بس اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ:

۱۔ اگر انسان سے لغزش نہ ہو تو وہ یا تو حیوان ہوگا جن سے غلطی نہیں ہوتی یا پھر خدا ہوگا جو غلطیوں سے پاک ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی پوزیشن بھی حضورؐ کو نہیں دی جا سکتی۔ انسانی کمال صرف اسی قدر ہے کہ اس سے لغزشیں کم سے کم ہوں اور جب ہوں تو

۲۔ ان کی تلافی کرکے وہ آگے بڑھ جائے۔ یہی تلافیِ لغزش تو انسانی ارتقا کو جاری رکھتی ہے۔ حیوانات غلطی نہیں کرتے اس لیے وہاں ارتقا بھی نہیں۔

۳ - یہی چند وہ بشری لغزشیں ہیں جو حضورؐ کی صداقت کا کمال ظاہر کرتی ہیں۔ ادھر وحی نے لغزش کی نشاندہی کی اور ادھر حضورؐ نے بے کم و کاست سارے عالم پر واضح فرما دیا۔ امانت، وحی کی محافظت، طاعتِ الٰہی اور عبد و معبود کے فرق و امتیاز کے قیام کی اس سے بڑی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے ان لغزشوں کے ذکر کو قیامت تک کے لیے صحیفۂ قرآنی میں محفوظ کر دیا اور وہ بھی یہ جاننے کے باوجود کہ ابد تک اربوں انسانوں کی نگاہ سے یہ ذکر گزرتا رہے گا۔ ایک پیغمبر کے سوا اور کس میں یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ اپنی خامیوں کو بھی حشر تک بے نقاب رہنے دے؟ اور اپنے اس طرزِ عمل سے آئندہ نسلوں تک کو اس عجیب و غریب قدر کی محافظت پر آمادہ کر دے؟

بہرحال کہنا یہ ہے کہ یہ بشریت کے تقاضے ہیں اور ان سے مذکورہ کلیے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک بالائی نگران قوت ایسی موجود ہے جو ایک نبی کو کسی غلط سمت میں نہیں جانے دیتی اور جب وہ اپنی فطرتِ سلیمہ یا بے مثال عقل و بصیرت سے صحیح راہ پر چل پڑتا ہے، تو بعد میں وہی قوت اس کی تصویب و توثیق کر دیتی ہے اور زیادہ تر اکثر و بیشتر یہی ہوتا رہا۔ چند مستثنیات اس اصول پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

مقامِ رسولؐ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :

۱ - کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایسا نہیں جو ایک ڈاکیے کا مکتوب الیہ

کے ساتھ ہوتا ہے کہ خط اس کے حوالے کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے اور کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ حضورؐ و بالمومنین رؤف رحیم اور رحمۃ للعلمین ہیں اور رحمت کے وہ تمام تقاضے پورے فرماتے رہے جو اعلیٰ درجے کے بے لوث مہربان والدین اپنی چہیتی اولاد کے حق میں پورے کر سکتے ہیں نہیں تو بہ! ماں باپ کیا چیز ہیں؟ ان سے بڑھ کر۔ حضورؐ ان سے کہیں بڑھ کر ــــ اپنی امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بابا انتا ھو وامھا تنا

۲- اسی طرح یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حضورؐ کی حیثیت و مقام یہ نہیں کہ قبل از نبوّت "کچھ بھی" نہ ہوں اور نبوّت کے بعد "سب کچھ" ہو گیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ نبوّت کی تمام صلاحیتیں روز اوّل ہی سے حضورؐ کو سونپ دی گئی تھیں۔ قدرت حضورؐ کی خاموش تربیت کر کر کے وہ ظرف تیار کر رہی تھی جو نبوّت کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس نے حضورؐ کو ابتدا ہی سے وہ افتادِ مزاج، وہ ذوقِ سلیم اور وہ فطری راستی عقل بخشی تھی کہ جو قدم بھی اٹھے اس کا رخ درست ہی سمت میں اٹھے۔ نبوّت تو وہ ہدایت ــــ اور لازمی ہدایت ربانی ــــ ہے جو برگ و بار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر گٹھلی کھجور کی ہو گی تو اس کے نمو کا ہر اقدام کھجور ہی کے برگ و بار کی شکل لیے ہوئے ہو گا۔ اس کی ہر پنکھڑی، ہر شاخ، ہر پتّا، ہر پھول اور ہر پھل کھجور ہی سے متعلق ہو گا۔ اس کی کوئی شے بھی آم کی نمائندگی نہیں کرے گی۔ ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے آم ہو اور وحی آنے کے بعد دفعۃً کھجور بن جائے۔ پیغمبر کی عقل سلیم عام نیک طینت انسانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کی عقل عام انسانی عقل کی طرح بھٹکتی نہیں۔ بس کہیں کہیں بہ تقاضائے بشریت خفیف سی لغزش ہو جاتی ہے اور وہ

بھی ایسی لغزش ہوتی ہے جو اپنی آغوش میں ہزار رحمتیں لیے ہوئے ہوتی ہے۔ ایسی رحمتیں جو اگر وہ لغزش نہ ہوتی تو انسان ان رحمتوں سے محروم رہتا۔

۳۔ ایسی ہی ایک مثال ہے وہ بیعت النساء جو مقام عقبۂ اُولیٰ پر انصار سے لی گئی تھی۔ یہ رسولؐ ہی کی وہ عقل و فراست یا بصیرت و وجدان ہے جس کی سرحدیں وحی کی مملکت سے قریب تر ہوتی ہیں۔ نبیؐ پہلے کچھ کہتا یا کرتا ہے اور وحیِ خداوندی بعد میں اس کی تصویب و توثیق کرتی ہے۔ اگر ظہار کے معاملے میں اَوس بن صامت کی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کی بات کی تصویب میں قد سمع اللہ قول التی تجادلك الخ نازل ہو سکتا ہے اور اگر جناب عمرؓ کی کئی باتوں کی تائید میں وحی الٰہی نازل ہو سکتی ہے تو صرف رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کے متعلق تصویبِ وحی میں کیوں شک ہو؟ اور محض چند مستثنیات کو آگے رکھ کر اس کلیے کو کہ ——— نبیؐ کی زندگی کا رخ ابتدا ہی سے صحیح سمت میں ہوتا ہے ——— کیوں توڑا جائے؟ رسولؐ کی تربیت جناب عمرؓ کو اللہ ینطق علی لسان عمر (بخاری)، کا بلند مقام عطا کر سکتی ہے تو خود خدا کی تربیت رسولؐ کو یہ بلند مقام کیوں نہیں بخش سکتی کہ وہ کہے اور کرے پہلے اور اس کی تصویبِ وحی ہو بعد میں؟ ——— خدا کرے کہ ہم صحیح مقامِ نبوّت کو پہچان سکیں۔

دوسری بیعتِ عقبہ

ان گیارہ بارہ انصار کی بیعت اور واپسی کے بعد مدینے میں اشاعتِ

اسلام اور بھی تیز ہو گئی اور دوسرے سال ۱۳ نبوی میں تہتر آدمی آئے۔ ان میں دو عورتیں ـــــ ام عمارہ نسیبہ بنت کعب اور ام منیع اسماء بنت عمرو ـــــ بھی تھیں۔ یہ لوگ مسلمان تو مدینے ہی میں ہو چکے تھے لیکن اب حج کے بہانے مکے میں اس لیے آئے تھے کہ حضورؐ کو ترک وطن کر کے مدینے میں (جو اب تک یثرب ہی تھا) آباد ہو جانے کی دعوت دیں۔ ان لوگوں نے عقبے پر بیعت کی۔ اس موقعے پر حضورؐ نے جس بات پر ان سے بیعت لی وہ یہ تھی کہ:

الف۔ طبیعت کی چستی اور سستی دونوں میں سمع و طاعت اختیار کرو گے۔

ب ۔ تنگی و فراخی دونوں حالتوں میں اِنفاق (خرچ) کرو گے۔

ج ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو گے۔

د ۔ اللہ کی بات کہنے میں کسی کی ملامت کی پروا نہ کرو گے۔

ی ۔ میرے یثرب آنے کے بعد میری مدد و حمایت اسی طرح کرو گے جس طرح اپنے بال بچّوں کی کرتے ہو۔

ان شرائط کی پابندی کے عوض تمہیں جنّت حاصل ہو گی۔

یہ روایت مسند احمد کی ہے جو جابرؓ سے مروی ہے۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اس موقعے پر حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب بھی حضورؐ کے ساتھ تھے۔ یہ اگرچہ ابھی تک اسلام نہ لائے تھے لیکن ہاشمی عصبیت رکھتے تھے۔ یہاں سب سے پہلے جناب عباس ہی نے گفتگو شروع کی اور ان انصار سے مخاطب ہو کر کہا:

ہماری نگاہ میں محمدؐ کا جو مقام ہے وہ تم جانتے ہو۔ یہ اپنی قوم

میں باعزت ہیں۔ ہم اپنی قوم کے ہم مذہب ہونے کے
باوجود ان کی حمایت کرتے رہے ہیں اور ان کی اس شہر
میں حفاظت کرتے رہے ہیں۔ اب یہ تمہارے پاس جاکر
تمہارے ساتھ رہنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ لہذا اگر تم یہ سمجھتے
ہو کہ جس مقصد کے لیے انہیں اپنے ہاں بلا رہے ہو اس
میں وفا سے کام لو گے اور ان کے مخالفوں کے مقابلے
میں ان کی حمایت وحفاظت کر سکو گے تو اس ذمے داری
کو اٹھاؤ اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان کے وہاں پہنچ جانے کے
بعد تم انہیں دشمنوں کے حوالے کر کے الگ ہو جانے پر مجبور
ہو جاؤ گے تو ان کو ابھی سے چھوڑ دینا بہتر ہے۔ یہاں
بہر حال وہ اپنی قوم اور شہر میں محفوظ ہیں۔

انصار نے یہ تقریر سُن کر کہا کہ: ہم آپ کی باتیں تو سن چکے اب
رسول اللہ فرمائیں کہ اللہ کے لیے اور اپنے لیے کیا چاہتے ہیں؟ حضور
نے تلاوت فرما کر اسلام کی طرف مزید رغبت دلائی اور فرمایا کہ: میں
اپنے لیے تم سے صرف یہ شرطِ بیعت لیتا ہوں کہ جس طرح تم اپنے
بال بچوں کی حمایت کرتے ہو اسی طرح میری حمایت بھی کرو۔ یہ سن کر
براء بن معرور نے حضور کا ہاتھ پکڑ کر عرض کیا کہ: اس ذاتِ پاک کی قسم
جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے ہم آپ کی اسی طرح حفاظت
وحمایت کریں گے جس طرح آپ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہماری بیعت لے لیجیے۔
بخدا ہم بھی تلوار کے دھنی ہیں اور جنگ ہمیں ورثے میں ملی ہے۔

براء کی بات کاٹ کر ابو الہیثم بن تیہان بولے کہ: یا رسول اللہ!

ہمارے اور یہود کے درمیان کچھ تعلقات ہیں جنہیں اب منقطع کرلیں گے۔ اگر ہم یہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ حضورؐ کو غلبہ عطا فرما دے تو ایسا تو نہ ہوگا کہ حضورؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس آجائیں گے؟— حضورؐ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ: میری زندگی اور موت تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں تمہارا اور تم ہمارے ہو گئے۔ جس سے تمہاری جنگ ہوگی اس سے میری بھی جنگ ہوگی جس سے تمہاری صلح ہوگی اس سے میری بھی صلح ہوگی۔"

اس کے بعد حضورؐ نے سب کی بیعت لے کر ان ہی میں سے بارہ نقیب مقرر فرمائے جن کے نام یہ ہیں:

ابو امامہ اسعدؓ بن زرارہ، سعدؓ بن الربیع، عبداللہؓ بن رواحہ، رافعؓ بن مالک، براءؓ بن معرور، عبداللہؓ بن عمرو بن حرام، عبادہؓ بن صامت، سعدؓ بن عبادہ، منذرؓ بن عمرو، اسیدؓ بن حضیر، سعدؓ بن خثیمہ، رفاعہؓ بن عبدالمنذر (یا ابوالہیثم بن تیہان)۔

ان میں نو متقدم الذکر خزرجی ہیں اور تین متاخر الذکر اوسی۔ ان بارہ نقیبوں کے انتخاب کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ: میں تو اپنی ساری قوم کا کفیل ہوں اور تم اپنی قوم کے اسی طرح کفیل ہو جس طرح بارہ حواری عیسیٰؑ کے کفیل تھے۔

ابن اسحاق کی ایک دوسری روایت میں جو عبداللہ بن ابی بکر سے مروی ہے یوں ہے کہ جب یہ انصار بیعت کے لیے جمع ہوئے تو عباس بن عبادہ انصاری نے کہا کہ:

> اے خزرجی (اور اوسی) بھائیو! تمہیں یہ علم ہونا چاہیے کہ حضورؐ کی بیعت کا کیا مطلب ہے؟ یہ سارے عرب و عجم سے جنگ کا اعلان ہے۔ اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ مالی اور جانی نقصانات کی وجہ سے تم حضورؐ کو دوسروں کے حوالے کر دوگے تو ابھی اس

کا فیصلہ کرلو اور یہ بھی سمجھ لو کہ ایسا کرنا دنیا و آخرت کی رسوائی کا سبب ہو گا۔ اور اگر تمہیں یہ یقین ہو کہ تم حضورؐ کو جس مقصد کے لیے اپنے ہاں بلا رہے ہو اس کی خاطر تم اپنے تمام جانی و مالی نقصانات کو برداشت کر لوگے اور اپنی وفا پر قائم رہو گے تو حضورؐ کی بیعت کرو اور یہ بھی سمجھ لو کہ یہ اقدام دنیا و آخرت کی سب سے بڑی خیر ہے۔"

تمام انصار نے جواب دیا کہ ہم حضورؐ کے لیے تمام جانی و مالی خطرات کو قبول کرتے ہیں مگر حضورؐ یہ فرمائیں کہ اگر ہم اس وفا پر قائم رہیں تو ہمیں اس کا کیا صلہ ملے گا؟ ــــــ حضورؐ نے فرمایا: جنّت۔ اس کے بعد ان کی درخواست پر حضورؐ نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور سب نے بیعت کر لی۔

بیہقی کی روایت (جو عامر شعبی سے مروی ہے) کا مضمون یہ ہے کہ حضورؐ سے ابوامامہ اسعد بن زرارہ نے سوال کیا کہ: اللہ کا اور اپنا جو کچھ حق مطلوب ہو وہ بھی بیان فرمایئے اور اس کا اجر بھی۔ حضورؐ نے فرمایا:

"میں تم سے اللہ کا یہ حق چاہتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور کسی شے کو اس کا شریک نہ کرو۔ اور اپنے اور نیز اپنے اصحاب کے لیے یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی جانوں کی طرح ہم کو بھی ٹھکانا دو اور ہماری حمایت و مدد کرو۔"

انصار نے پوچھا:

"اگر ہم یہ سب کچھ کریں تو ہمیں کیا صلہ ملے گا؟"

حضورؐ نے جواب دیا:

"جنّت"

بیہقی میں رفاعہ سے بھی اسی قسم کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

ہم نے فلاں فلاں باتوں پر "جنّت کے عوض" حضورؐ کی بیعت کی۔

لمحۂ فکریہ

ہم نے یہاں عقبۂ اولیٰ کی بیعت کی چند روایتیں درج کی ہیں۔ بعض مجمل ہیں اور بعض مفصل۔ لیکن ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ ازخود یا انصار کے سوال پر حضورؐ نے شرائطِ بیعت کی تکمیل کی جو جزا بتائی ہے وہ ہے جنّۃ۔ ہمارے خیال میں یہ مقام اپنے اندر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آج اس اہم بیعت کے وقت بھی اور اس سے پہلے بھی ہمیں کوئی موقع ایسا نہیں ملتا جہاں حضورؐ نے ایمان، اسلام یا بیعت کی جزا میں جنّت سے نیچے کسی پست چیز کا ذکر فرمایا ہو۔ ذرا خوب غور سے دیکھیے۔ کیا حضورؐ نے کسی سے زن، زر، زمین، اقتدار کا کوئی وعدہ فرمایا؟ کسی کو دولت، حکومت، غورت، منصب، عہدے کا لالچ دیا؟ کسی اور دنیوی عیش و طرب یا انعام یا دوسرے مادی فوائد کے حصول کا یقین دلایا جن کی طرف انسان فطری طور پر لپکتا اور اس کے حصول کے لیے سر توڑ کوشش کرتا ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب حرفِ نفی میں ہے۔ ایک ظاہر پرست یہ کہہ سکتا ہے کہ جس کے قبضے میں ایسی کشش رکھنے والی کوئی چیز ہی موجود نہ ہو وہ دوسروں سے اس قسم کا وعدہ ہی کیونکر کر سکتا تھا؟ لیکن سوال یہ ہے کہ "نادیدہ جنّت" کے وعدے پر وہ کس طرح بے تامل مطمئن ہو گئے اور کس یقین نے انہیں بیعت کے لیے ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا؟ پھر ذرا یہ حقیقت بھی سامنے رکھیے کہ ہر ایمان لانے والا جانتا ہے کہ قبولِ اسلام سر دھڑ کی بازی لگانا ہے:

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے

انصار کے نمائندے عباس بن عبادہ بھی واشگاف لفظوں میں لوگوں کو بتا رہے ہیں کہ: "یہ بیعت عرب و عجم سے جنگ کا اعلان ہے۔" ان کو یہ بھی علم ہے کہ مکے میں ایمان لانے والوں کے ساتھ کیا کیا ظالمانہ برتاؤ ہوئے، اور ہو رہے ہیں اور ہر نومسلم کو کن کن سخت آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ چکے ہیں کہ جن مادی فوائد کی طرف انسان ہمیشہ لپکتا ہے اسلام تو ان ہی کی قربانیاں چاہتا ہے۔ ان مفادات کے حصول کا وعدہ تو الگ رہا، یہاں تو ان کی قربانی کا مطالبہ ہے۔ ان تمام حقائق کے علم کے باوجود آخر حرف 'جنت' کے وعدے میں کون سی کشش تھی جو ہر اعلیٰ و ادنیٰ، ہر کہ و مہ پروانہ وار، بے اختیارانہ اِدھر لپک رہا ہے اور ہر متاعِ عزیز کی بازی لگانے کے لیے دستِ مبایعت بڑھا رہا ہے؟

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اہلِ مکہ یا اہلِ یثرب اتنے بھولے بھالے بیوقوف تھے کہ ایک شخص نے جہاں اٹھ کر یہ کہہ دیا کہ "فلاں بات مانو یا فلاں قربانی دو تو تمہیں جنت مل جائے گی" اور وہ فوراً بات بھی مان لیں اور قربانی پر بھی آمادہ ہو جائیں۔ ایمان لانے والوں کی عقل و فراست کا ثبوت، ان کی آئندہ زندگی کی ایک ایک حرکت و سکون سے ملتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ دنیا کے بے شمار لیڈر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے اپنی قوم میں بے پناہ ایثار و قربانی کی روح پھونکی ہے۔ لیکن ان کے سامنے کوئی محسوس مفاد رہا ہے اور اس طرز کے دوسرے لیڈروں کی کامیابی کا علم ان کو رہا ہے۔ ان کے سامنے اپنی قوم کا اقتدار، اپنے ملک کی سربلندی، اپنے نظامِ زندگی کی کامیابی وغیرہ رہی ہے جس کے متعلق ان کو یقین رہا ہے کہ ہم یا ہماری اولاد یا ہماری قوم اس مقصد سے ہم کنار ہو گی۔ نیز اگر کامیابی نہ ہو سکی تو کوئی دوسرا

لیڈر چن لیا جائے گا اور ہماری آج کی قربانی اسی دنیا میں کل کام آجائے گی۔ مگر یہاں جس "جنّت" کا وعدہ کیا جا رہا ہے اس کی یہاں کوئی تصدیق و تکذیب نہ زندگی میں ہو سکتی ہے نہ مرنے کے بعد۔ کون جانتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا؟ اگر کچھ نہ ہوا تو کون جھٹلانے اور باز پرس کرنے آئے گا؟

یہ صحیح ہے کہ ان نومسلموں میں "جنّت" کا تصوّر کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا ورنہ وہ جنّت کا ذکر سنتے ہی سوال کر بیٹھتے کہ یہ کیا چیز ہے جس کا وعدہ کیا جا رہا ہے؟ ہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ انصار میں یہ تصوّر کب سے اور کہاں سے آیا؟ انصار کے تعلقات یہود کے ساتھ عرصۂ دراز سے تھے اور جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ایک آنے والے نبی کا تصوّر ان ہی کی بدولت انصار میں آیا تھا لیکن یہود میں آخرت فلہذا جنّت آخرت ـــــ کا کوئی تصور موجود نہیں اور "عہد نامۂ عتیق" اس ذکر سے خالی ہے۔ اس لیے گمان یہی ہوتا ہے کہ انصار میں آخرت و جنّت کا تصور اہل مکّہ کے میل جول سے پیدا ہوا تھا۔ جاہلیت کے اشعار میں نفیاً یا اثباتاً آخرت کا تصوّر ملتا ہے۔ مثلاً:

أموتٌ ثم بعثٌ ثم نشرٌ؟

فتلك خرافةٌ يا امَّ عمرو

(کیا موت کے بعد بعث و نشر ہو گا؟ اے ام عمرو! یہ سب باتیں خرافات ہیں)

بہر کیف کہنا یہ ہے کہ انصارِ مدینہ میں قبولِ اسلام سے پہلے (غالباً اہل مکّہ کے میل جول سے) آخرت اور جنّت کا تصور موجود تھا۔ اور جو چھ انصار اوّل اوّل ایمان لاکر مدینے واپس گئے تھے انہوں نے آخرت اور جنّت کے تصور کو اور بھی اجاگر کیا ہو گا۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اس جنّت کے حصول کی ایسی زبردست لگن کس طرح پیدا ہو گئی کہ اس کی خاطر اپنا سب کچھ

قربان کرنے کو آمادہ ہو گئے؟ اگر فطری طور پر وہ جنت کی خواہش رکھتے تھے اور سب ہی رکھتے ہیں تو انہیں یہ کس طرح یقین آگیا کہ اس انسان ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر یہ جنّت حاصل ہو جائے گی؟ پھر یقین بھی ایسا کہ آئندہ کے ایک نادیدہ اور بہ ظاہر "غیر مصدقہ" حقیقت کی قربان گاہ پر اپنی موجودہ اور حاصل شدہ تمام نعمتوں کو بھینٹ چڑھانے پر بخوشی راضی ہو جائیں اور عاجل کو آجل پر قربان کر دینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ پیدا ہونے دیں۔

اس سوال کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ سب کچھ ایک لازمی کرشمہ ہے ذوقِ یقین کا اور جذبۂ ایمان کا جو دو چیزوں نے پیدا کیا تھا۔ ایک تھا کلام اور دوسرا تھا کلیم۔ کلام تو وہ پیغام ہے جو عقلِ سلیم کی ہر کسوٹی پر پرکھے جانے کے بعد کھرا نکلتا ہے۔ لیکن دین محض عقلیت کا نام نہیں۔ اس کے ساتھ ایک خاص نوع کا جذبۂ عشق بھی ہو تو ایمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایمان و یقین محض پیغام سے نہیں آتا۔ بلکہ اس میں بڑا حصہ پیغام لانے والے کے کردار کا ہوتا ہے۔ کوئی پیغام اس وقت تک قبول نہیں ہوتا جب تک خود پیغام دینے والے کی عملی زندگی اس پیغام کے مطابق نہ ہو۔ اہلِ مکہ ہوں یا اہلِ مدینہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا یا یقینی اطلاع سے معلوم کر لیا کہ اس پیغام برؐ کی پوری زندگی ان اقدار کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جن کا پیغام یہ دوسروں کو دے رہا ہے اور اس کی ہر ادا، ہر حرکت و سکون، ہر گفتار و کردار ان ہی افکار و کردار کا آئینہ ہے جن کو یہ دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنے سچے پیغام سے اتنی فنائیت کے ساتھ عشق ہے کہ یہ اس کی خاطر ہر پیش کش کو ٹھکرا رہا ہے اور ہر بڑی سے بڑی قربانی کو پیشانی پر بل لائے بغیر جھیلتا چلا رہا ہے۔ محض وعدۂ جنت میں کہاں سے اتنی کشش آ سکتی ہے کہ انسان اپنا سب کچھ قربان کرنے

پر بخوشی راضی ہو جائے؟ قربانی پر آمادگی صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب بڑی سے بڑی قربانی کا عملی نمونہ بھی سامنے موجود ہو اور وہ اسوۂ قربانی پیش کرنے والے کی ساری زندگی عقل و فراست، اخلاص و صداقت، اور امانت و استقامت کی قابلِ اعتماد چلتی پھرتی تصویر ہو۔ کسی پیغامبر کے پیچھے چلنے اور اپنا سب کچھ اس کے ہاتھ بیچ ڈالنے (بیعت کرنے) کے لیے پہلی شرط ہے غیر متزلزل اور کامل اعتماد و اعتقاد۔ اور یہ اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک اس پیغام کی عقلی راستی کے ساتھ خود پیغامبر کی عقل و فراست، اخلاص و امانت، قربانی و ایثار، سیرت و کردار، ناقابلِ خرید و بے خوف استقامت، ان تھک سرگرمی، اور بے پناہ قوتِ عمل نہ ہو۔ یہی وہ نبوی کردار ہے جس نے دیکھنے والوں اور سننے والوں میں نورِ یقین پیدا کیا۔

اس ایمان و یقین کی حدود صرف اس دنیا کی زندگی ہی تک محدود نہ تھیں بلکہ انہوں نے اس پیغامبر کو ایک ایسا راستباز صاحبِ وحی مان لیا کہ یہ جو کچھ کہے وہ صحیح ہے۔ جو خبر دے وہ درست ہے۔ انہوں نے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی کہ پہلے دنیا میں کسی وعدے کی آزمائش کر لی جائے اور وہ صحیح ثابت ہو پھر آخرت کے وعدے کو بھی اس پر قیاس کیا جائے۔ بس رسالت پر ایمان لائے تو اس یقین کے ساتھ لائے کہ یہ جو کچھ کہتا ہے اس میں شائبۂ کذب کا کوئی ادنٰے سے ادنٰے امکان بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ دنیا کے متعلق جو وعدہ کرے گا یا خبر دے گا وہ بھی سچ ہو گا۔ اور جو کچھ آخرت کے متعلق بیان کرے گا وہ بھی یقیناً درست ہی ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ رسالت پر ایمان لانے کے بعد نہ دنیاوی معاملات میں کوئی تذبذب ہو سکتا تھا نہ اخروی مواعید میں۔

ایک نکتہ اور بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ ہے کہ ان ایمان لانے والوں میں

جنّت کا وہ تصور نہ تھا جو عرصۂ دراز سے ہم سمجھ رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک جنّت کا تعلق صرف مرنے کے بعد کی اُخروی زندگی سے ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اور قرآنی تصورِ جنّت اس سے مختلف ہے۔

دنیا آخرت کی کھیتی (مزرعۃ الاخرۃ) ہے۔ اس لیے جنّت ہو یا دوزخ دونوں کا آغاز اسی زندگی سے ہوتا ہے۔ وجود کا پہلا رُخ یہ دنیوی زندگی ہے اور دوسرا رُخ حیاتِ اُخروی۔ بجز تبدیلِ مکان یا تبدیلِ لباس کے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں رُخ ایک ہی جوئے رواں کے دو حصے ہیں۔ جس چیز کو ہم موت کہتے ہیں وہ دراصل ایک نئی زندگی کا نام ہے۔ بچپن کے بعد جوانی آتی ہے اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ طفلی مرگئی تو شباب زندہ ہوا۔ جس طرح طفلی کی موت کا نام شباب ہے اسی طرح جوئے حیات کے پہلے حصۂ رواں (دنیوی زندگی) کے تمام ہونے کے بعد اس کا دوسرا حصہ (اُخروی زندگی) شروع ہوتا ہے۔ پہلے حصے میں زندگی کا جو نقشہ ہوگا وہی ارتقا یافتہ شکل (DEVELOPED FORM) اختیار کرکے دوسرے حصۂ زندگی میں نمودار ہوگا۔ آخرت کی جنتی زندگی انہی لوگوں کو حاصل ہوگی جنھوں نے پہلے دنیا میں جنّتی زندگی کا ارتقا پذیر نمونہ تیار کیا ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک قوم دنیا میں ذلیل و خوار اور مغلوب و مقہور رہے اور آخرت میں اسے اعزاز و سربلندی حاصل ہوجائے۔ اس تصور کی قرآن نے سخت تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو تم ہی سربلند رہو گے

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

اس وقت ہم اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ دنیا کی جنتی زندگی کس طرح کی ہوتی ہے۔ اس کے لیے کسی علیحدہ صحبت کا انتظار کرنا چاہیے۔ مختصراً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن میں جنّت کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اسی زندگی کو حاصل کرنا انسان

کا نصب العین ہے لیکن تقاضائے عدل کے ساتھ۔ یعنی دنیا کے ہر انسان کو یہ زندگی حاصل ہو نہ کہ چند افراد یا خاص طبقوں کو۔ ابھی کاروانِ انسانیت اس دَور سے گزر رہا ہے کہ ایک فرد یا طبقہ استحصال EXPLOITATION کے بغیر جنتی زندگی حاصل ہی نہیں کر سکتا۔ اور یہ استحصال جہاں عدل کی قدروں کو ختم کر دیتا ہے وہاں خود استحصال کرنے والوں کی زندگی کو بھی آخر کار جہنم بنا دیتا ہے۔ اس لیے جب تک سب کو یہ جنتی زندگی میسر نہ ہو اس وقت تک نظامِ زندگی چلانے والے ذمے داروں کو اپنی زندگی الفقر فخری کے مطابق ہی بسر کرنا پڑے گا۔ تقاضائے عدل ایک ایسی قدر ہے جو جنّت کی ضمانت ہے۔ اسے پہلے اپنانا پڑے گا۔ بلاشبہ اقدار کے حصول کی خاطر آزمائش کی بھٹیوں سے گزرنا پڑے گا۔ لیکن جہنم کے پُل سے گزرے بغیر جنت حاصل نہیں ہو سکتی۔ جنّتِ آخرت میں داخل ہونے کے لیے بھی اسی پُل سے گزرنا ہو گا اور جنّتِ ارضی حاصل کرنے کے لیے بھی اولاً اسی "جہنم" کو عبور کرنا ہو گا۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا۔ عزیمت و استقامت رکھنے والے اہلِ ایمان اس پُل سے اس طرح گزرتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی زندگی انہیں دو قدم پر دکھائی دیتی ہے اور اس کی طرف جو انہیں لپک ہوتی ہے وہ اس عبوری گزرگاہ کو بھی عین جنت بنا دیتی ہے۔ وہ ہنسی خوشی اس پُل سے گزر جاتے ہیں اور جو لوگ اقدار کی قدر و قیمت کو نہیں پہچانتے اور انجامِ حیات سے بے خبر رہتے ہیں اور صرف اپنی زندگی کو جنت بنانے کے لیے عدل کے تقاضوں کو برطرف کر دیتے ہیں وہ آخر کار جہنم ہی کے غار میں جا گرتے ہیں۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا

پس جو لوگ اقدار کو جنّت سمجھ کر قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں ان کو صرف آخرت ہی کی جنت حاصل نہیں ہوتی بلکہ دنیا کا قید خانہ بھی ان کے لیے بہشت ہو جاتا ہے۔ ان

کی مادی زندگی بہ ظاہر جہنم کے پُل سے گزر رہی ہوتی ہے لیکن ان کی روح اسی دنیا میں بہشت کی سیر کر رہی ہوتی ہے کیونکہ انہیں چند ہی قدم کے فاصلے پر جنت دکھائی دیتی ہے۔ ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں کہ محلوں میں رہنے والے اپنے تمام سامانِ عیش کی فراوانیوں کے باوجود جہنم کی زندگی گزارتے ہیں اور کٹیا میں رہنے والا فاقہ کش اللہ مست درویش جنّت کے مزے لوٹتے ہیں۔ اُس کی روح بے چین، دماغ مضطرب اور دل پریشان رہتا ہے، اور اس کی روح مطمئن، دماغ پُرسکون اور دل شگفتہ رہتا ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس شگفتگی وسکون میں کہیں کہیں مجبورانہ تصنع کو بھی دخل ہوتا ہے لیکن یہ درویش بھی مصنوعی ہی ہوتے ہیں۔ اعلیٰ اقدار کو اپنانے والا مومن ہر وقت جنتی زندگی میں ہوتا ہے اور اس کی یہی جنت آگے آنے والی زندگی میں ارتقا یافتہ بہشت کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ غرض جب جنت و جہنم کا یہ تصور ہو کہ جنت کی زندگی دنیا ہی میں شروع ہو کر آخرت میں پھلتی پھولتی ہے اور جنتِ ارضی کا تصور بھی عام تصورات سے الگ ہو تو یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ انصار یا دوسرے اہلِ ایمان نے صرف جنتِ آخرت کے وعدے پر کیوں قناعت کر لی اور دنیا کی کسی جنت کا بھی وعدہ کیوں نہ لیا؟ حضورؐ نے نہ آخرت کا ذکر فرمایا ہے نہ دنیا کا بلکہ صرف الجنۃ کو صلہ قرار دیا ہے اور یہ دونوں ہی جنتوں پر مشتمل ہے۔

ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ خدامست مومن اس دنیا میں بھی جنت ہی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ محض انگور کو کھٹّا مان کر تسکینِ دل کا سامان پیدا کر لیتا ہو۔ پیغمبر ہوں یا ان کی روش پر چلنے والے یہ عقلی صلاحیتوں سے محروم نہیں ہوتے یہ دنیا پرستوں سے بہت زیادہ عقل و فراست کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ اگر اپنی قوتوں کو دولت یا اقتدار حاصل کرنے کی طرف لگاتے تو بڑی آسانی سے اعلیٰ درجے کے دولت مند و ذی اقتدار بن سکتے تھے لیکن یہ اپنی صلاحیتوں کو ایسے پست مقاصد کی

طرف نہیں لگاتے۔ ان کی ساری توجہ اعلیٰ اقدار کے حصول میں صرف ہوتی ہے نتیجے میں دنیا پرست اپنی زندگی کو جہنم بنالیتا ہے اور یہ فقر کی اعلیٰ قدروں کی بہارِ بے خزاں میں جنت کے مزے لوٹتے رہتے ہیں۔ مادی اور روحانی قدروں میں بس یہی زاویۂ نظر کا فرق ہے۔ اہلِ ایمان میں حبِ رسول کی نظر کیمیا اثر یہ زاویۂ نگاہ پیدا کر دے تو صرف وعدۂ جنت کے بعد اور کس نعمت کا انہیں انتظار ہوتا؟ بس رسولؐ کی رسالت پر ایمان لائے اور اس نے جو کچھ کہا اس پر بھی کسی مزید تفصیل طلبی کے بغیر ایمان لے آئے اور کسی تاخیر کے بغیر بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ جذبۂ ایمان والیقان پیدا ہو چکنے کے بعد عقلی و منطقی موشگافیوں کی گنجائش ہی کہاں رہ سکتی تھی؟

نئے دورِ زندگی (ہجرت) کا آغاز

اس اہم بیعت کے بعد اہلِ مکہ کے کانوں میں بھی اس کی بھنک پہنچ گئی اور اسے یہ رنگ دیا گیا کہ حضورؐ نے اہلِ مدینہ سے سازش کی ہے کہ اہلِ مکہ پر چڑھائی کر دی جائے۔ اس افواہ کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ مکہ کا خون کھولنے لگا اور جذبۂ مدافعت نے جذبۂ انتقام کی شکل اختیار کر لی اور ظلم و ستم کے نئے نئے طریقے ایجاد ہونے لگے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف پانی سر سے گزر چکا تھا اور دوسری طرف قدرت نے ایک نئی پناہ گاہ کا راستہ کھول دیا تھا۔ یوں تو اب سے آٹھ سال پہلے حضورؐ نے اہلِ اسلام کو حبشے کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دے ہی دی تھی مگر اب مظالم کی انتہا ہو جانے کے بعد حضورؐ نے عام اجازت دے دی کہ مسلمان ہجرت کر جائیں خواہ یثرب (مدینے) کی طرف ہو یا کسی اور طرف ہو۔ حبشے میں ایک تو بہت

سے مسلمان پہلے سے موجود تھے۔ دوسرے وہاں کا سفر نسبتاً دشوار بھی تھا کیونکہ سمندر عبور کیے بغیر سفر نہیں ہو سکتا تھا۔ تیسرے وہاں کسی ذمے دار جماعت نے قبولِ اسلام کے بعد معاہدۂ نصرت کے ساتھ آنے کی دعوت نہ دی تھی۔ اس لیے قدرتاً مسلمانوں کا رجحان ایک نئے مامن یعنی یثرب ہی کی طرف ہوا اور اہلِ اسلام ایک ایک دو دو کر کے خاموشی اور پوشیدگی کے ساتھ ہجرت کرنے لگے۔

حقیقتِ ہجرت

ہجرتِ مدینہ کے واقعات سننے سے پہلے یہاں ایک بڑی اہم حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھ لینا چاہیے۔ یہ حصہ ایک ایسا لمحۂ فکریہ ہے جس کے لیے ہمیں علیحدہ عنوان قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اسلام کے پیغام کا نچوڑ وحدتِ انسانی ہے۔ وہ انسانوں کو ہزار فطری اختلافات کے ہوتے ہوئے ایک مرکزِ وحدت پر جمع کرنا چاہتا ہے۔ بنی آدم کے باہمی فطری اختلافات بے شمار ہیں۔ رنگ، زبان، پیشہ، رجحان، خاندان، مزاج، ثقافت، رسوم، غرض بہت سی چیزوں میں ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اسی طرح ایک قوم بھی دوسری قوم سے جدا ہوتی ہے۔ یوں ہی ملک و وطن بھی جدا جدا ہوتے ہیں۔ بس یہی چند بنیادیں ہیں جن پر قومیتوں کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اور فی الواقع ان بنیادوں پر جو قومیں بنتی ہیں وہ "قومیں" ہی ہوتی ہیں۔ اسلام انہیں اقوام تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرتا۔ لیکن اس نے اس قسم کی تمام قومیتوں سے بلند تر ایک اور تصورِ قومیت بھی دیا ہے اور وہ اتنا ہمہ گیر ہے جس میں ساری دوسری قومیتیں گم ہو جاتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنے تمام اہلِ کفر ہم وطنوں یا ہم خاندانوں کو یٰقوم ہی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔

قومیت کی یہ ساری بنیادیں جتنے انسانی افراد کو اپنے دائرے میں سمیٹ سکتی ہیں اس سے زیادہ افراد کو اپنے دائرۂ قومیت سے خارج کر دیتی ہیں۔ ایک محدود طبقہ تو اس میں داخل ہو جاتا ہے اور ساری دنیا اس سے خارج ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تنگ و محدود انداز کی قومیت اسلام کے پیغام وحدتِ انسانی کی طرح ہمہ گیر نہیں ہو سکتی ہے۔ اس باب میں سب سے زیادہ فیصلہ کن آیت وہ ہے جس میں سیدنا ابراہیمؑ اور آپؑ کے رفقائے کار کا آخری الٹی میٹم ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ	(اے مسلمانو!) تمہارے لیے ابراہیم اور ان
فی ابراھیم والذین معہ اذ	کے رفقا میں حسین اسوہ ہے جبکہ انہوں نے
قالوا لقومھم انا برءٰوا	اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم (اہلِ ایمان) تم سے بھی
منکم ومما تعبدون من	بیزار ہیں اور ان تمام غیر اللہ سے بھی جن کی تم
دون اللہ کفرنا بکم وبدا	بندگی کرتے ہو۔ ہم تم سے انکاری ہیں اور
بیننا وبینکم العداوۃ	ہمارے تمہارے درمیان اس وقت تک
والبغضاء ابدا حتی	عداوت و بغض کی دیوار حائل رہے گی جب
تؤمنوا باللہ وحدہ (۶۰:۴)	تک تم تنہا خدا پر ایمان نہ لے آؤ۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ حضرت ابراہیمؑ اپنی منکر قوم کو "میری قوم" ہی کہہ کر مخاطب کرتے رہے اور خدا بھی ان کو قومھم (ابراہیم اور ان کے رفقا کی قوم) کہتا ہے۔ لیکن اس قومیت یا ہم قومی کی حقیقت کیا ہے اس کا جواب آیت کے ایک ایک لفظ میں موجود ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر قومیت بر بنائے وطنیت مقصود ہوتی تو کیا اپنی ہی قوم کو اس طرح کا آخری الٹی میٹم دیا جاتا؟

یہی وجہ ہے اسلام نے تمام انبیاء کی طرح قومیت کی ساری فطری بنیادوں سے ایک اعلیٰ تر اساس بخشی ہے یعنی خدا کے پیش کردہ نظریۂ زیست پر ایمان لانا، یہی

بلند وحدتِ تصور یا ہم خیالی وہ وسیع اساسِ قومیت ہے جس میں سارے بنی آدم سمٹ کر آ سکتے ہیں۔ اور جس میں تمام دوسری بنیاد ہائے قومیت اپنی انفرادیت کے باقی رہتے ہوئے بھی سما کر گم ہو سکتی ہیں۔ قومیت کی باقی ساری بنیادیں وحدتِ انسانی کو پارہ پارہ کرنے والی ہیں۔ صرف آئیڈیالوجی اور تصور ہی قومیت کی ایسی ہمہ گیر اساس بن سکتا ہے جو تمام انسانوں کو اپنی آغوشِ قومیت میں لے کر انہیں ایک ہی خاندان کے افراد بنا لے۔

اسلام ان فطری اختلافاتِ قومی کو فنا نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ ان "متنوع آیات" کو ایسے گلدستے میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جس کے تمام پھول رنگ و بو اور شکل و خاصیت کے اختلافات کے باوجود ایک بلند مقصد ــــ زینتِ گلدستہ ــــ کے لیے ایک وحدت بن جائیں۔

انبیاء کا پیغام قومیت یہی ہوتا ہے اور اہلِ ایمان اسی پر ایمان رکھتے ہیں لیکن یہ باتیں صرف فلسفیوں کے تخیلات یا شاعرانہ تصورات یا خطیبانہ نکتہ آفرینیاں نہیں ہوتیں بلکہ ان کو اپنی زندگی پر اس طرح مسلّط کرنا پڑتا ہے کہ اگر اس تصورِ قومیت سے کوئی دوسری بنیادِ قومیت ٹکرائے تو اسے ختم کر دیں یا خود ختم ہو جائیں۔ اس دورِ امتحان سے ہر پیغمبر اور اس کی امت کو گزرنا پڑا ہے۔ ان کو خدا کی راہ میں ہر متاعِ عزیز سے دستبردار ہونا پڑا ہے اور بہت بڑا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اپنے وطنِ عزیز کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔

وطن کسے عزیز نہیں ہوتا؟ آج اس روشن خیالی کے دور میں بھی وطنیت کے بت کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ جان، مال، عزت، دل، دماغ، وقت غرض ہر شے وطن پر قربان کر دی جاتی ہے۔ اور وطنیت کی بنیاد پر جو قومیت تیار ہوتی ہے اس کی سربلندی کے لیے تمام صلاحیتیں اور قوتیں وقف ہو جاتی ہیں۔ لیکن انبیا جو اپنا

عملی نمونہ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جس وطن پر متاعِ عزیز قربان کر دی جاتی ہے ہم اس وطن کو بھی رضائے الٰہی جیسے بلند ترین مقصد پر سو بار قربان کر دیتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ایک مہاجر الی اللہ ابراہیمی للکار سے یہ اعلان کرتا ہے کہ: انی مہاجر الی ربی۔ یہ مہاجرت ایک سرزمین سے دوسرے خطۂ ارض کی طرف نہیں ہوتی بلکہ ہر محبوب شے سے خدا کی طرف ہوتی ہے۔ غرض ہجرت دراصل وطنیت کے بُت کو توڑنے کا ایک عملی امتحان ہے۔

ہجرت کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن پاک میں بیس بچیس جگہ مختلف انداز سے ہجرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور مہاجرین وانصار اور ان کے متبعین کو واشگاف لفظوں میں رضائے الٰہی کا پروانہ اور جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

والسبقون الاولون من المھجرین	اوّل اوّل سبقت کرنے والے مہاجرین و
والانصار والذین اتبعوھم	انصار اور حسن کاری کے ساتھ ان کا اتباع
باحسان رضی اللہ عنھم و	کرنے والوں سے خدا راضی ہے اور وہ خدا سے
رضوا عنہ واعد لھم جنت	راضی ہیں اور ان کے لیے اس نے ایسے باغ
تجری تحتھا الانھر ۹: ۱۰۰	مہیا کر رکھے ہیں جن کے تحت نہریں جاری ہیں۔

تمام قرآن میں "تجری" کے بعد "من تحتھا الانھر" آیا ہے لیکن یہی صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں "من تحتھا الانھر" کی بجائے صرف تحتھا الانھر آیا ہے۔ ان مہاجرین وانصار اور ان کے حُسن کار متبعین کی شان چونکہ ساری دنیا سے نرالی ہے اس وجہ سے ان کے انعام کے لیے اندازِ بیان بھی نرالا ہی رکھا گیا ہے۔

ایک اور حقیقت پر بھی غور فرمایئے۔ حضورؐ کے لیے جن عورتوں سے رشتۂ نکاح کو جائز کیا گیا ہے ان میں حضورؐ کی چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں بھی

ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لیے بھی ایسی بہنوں سے مناکحت جائز ہے لیکن ان تمام قسم کی بہنوں سے حضورؐ کا ازدواج ایک ضروری شرط کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے ہجرت میں بھی حضورؐ کا ساتھ دیا ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے:

وبنت عمك وبنت عمتك و	... ہم نے اے رسول تمہارے لیے حلال
بنت خالك وبنت خلتك التي	کیا ہے تمہارے چچا پھپھی، ماموں اور خالہ کی اُن دختروں
هاجرن معك ۳۳: ۵۰	کو جنہوں نے ہجرت میں تمہارا ساتھ دیا ہو...

اللہ اکبر! ہجرت کتنی عظیم الشان اہمیت رکھتی ہے جس کا اثر براہِ راست رسولؐ کے نکاحی رشتوں پر بھی پڑتا ہے۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے زیادہ اپنا حضورؐ کا اور کون ہو سکتا تھا۔ یہ سیدنا علی مرتضےٰؓ کی ہمشیر ہیں لیکن حضورؐ کے لیے ان سے رشتۂ مناکحت صرف اس لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے کہ ام ہانیؓ نے ہجرت نہیں کی تھی۔ یہ ایمان ہی لائی ہیں فتح مکہ کے بعد۔

واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے بعد ہی اسلامی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی تھی اور ہجرت ہی کے بعد ایک اسلامی نظامِ سلطنت کی بنیاد پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمرؓ کے دورِ خلافت میں اسلامی سنہ رکھنے کی تجویز کی گئی تو ہجری سنہ کو اسلامی سنہ قرار دیا گیا۔ اور محرم کو پہلا مہینہ قرار دیا گیا کیونکہ آغازِ ہجرت محرم ہی میں ہوا تھا۔ اہل اسلام کے لیے حضورؐ کی ولادت یا حضورؐ کی نبوت کچھ کم اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ سنہ میلاد اور سنہ نبوت کو بھی اسلامی سنہ قرار دے سکتے تھے یا عربوں کے سنہ عام الفیل کو ہی باقی رکھ سکتے تھے لیکن ان تمام مہاجرین و انصار نے سارے سنین کو چھوڑ کر سنہ ہجری ہی کو منتخب کیا۔ اس انتخاب سے ہجرت کی عظمت و اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ ہجرت ایک کسوٹی ہے یہ دیکھنے کے لیے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ محبوب ہے یا وطن زیادہ پیارا ہے؟

مگر مسلمان قوم کی ایک عالمگیر بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ ہر سال سنہ ہجری کا آغاز ہوتے ہی کچھ ایسی تقریبات، ایسی پُرشور رسمیں اور ایسی ہنگامہ آرائی شروع ہو جاتی ہے جس میں ہجرت کی تمام قدریں مدغم ہی نہیں بلکہ فنا ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہمارے صحائف و جرائد اور ہماری نشریات سب خاموش رہتے ہیں اور کسی جگہ بھی ہجرتِ مدینہ جیسی اہم اور انقلابی یادگار تقریبی حیثیت نہ اختیار کر سکی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی تمام اقدار مسلمانوں کے ذہن سے محو ہو چکی ہیں۔ دنیا میں اصول کو فروع کی خاطر ختم کرنے کی کوئی مثال اس سے بڑھ کر شاید نہ مل سکے گی۔

آغازِ ہجرت

اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کس نے ہجرت کی۔ یہ مسلّم ہے کہ قریشی مخزومیوں میں سب سے پہلے ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد نے ہجرت کی لیکن یہ ہجرت بیعتِ عقبۂ ثانیہ سے ایک سال پہلے ہی کی تھی۔ یہ جب حبشے سے خبرِ مفاہمت سُن کر آئے تو انہیں مکے میں روک لیا گیا اور بہت تکلیفیں دی گئیں، اور موقع پاتے ہی یہ نکل کھڑے ہوئے اور مدینے جا کر دم لیا۔ دوسرا نام مصعب بن عمیرؓ اور عبداللہ بن ام مکتوم، کا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بہت پہلے کی بات ہے۔ یہ تو انصارِ مدینہ کی درخواست پر بحیثیت معلّم کے بھیجے گئے تھے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ یہاں ہم اس ہجرت کا ذکر کر رہے ہیں جو انصار کی دعوت و بیعت کے بعد ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ دونوں ہجرتیں میرے موضوع سے خارج ہیں۔ البتہ اول الذکر کے ہم کنیت ایک اور ابوسلمہ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اور یہ ہیں عامر بن ربیعہ۔ ممکن ہے

بھی صحیح ہو۔

بہرکیف اس معمولی تقدم و تاخر کا فرق کوئی قابلِ ذکر فرق نہیں۔ قرآن نے ان سب کو ملا کر السّٰبقون الاوّلون کا لقب دیا ہے۔ اللہ کے لیے وطن کو چھوڑنا اگرچہ خود ایک بڑا امتحان ہے لیکن بہت سے لوگوں کو چلتے چلتے بھی بعض سخت آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

ان ہی میں اول الذکر ابوسلمہ (عبداللہ بن عبدالاسد) بھی ہیں۔ یہ روانہ ہونے لگے تو بنی مغیرہ نے ان کی بیوی ام سلمہ کو یہ کہہ کر ان سے چھین لیا کہ ہم اپنے خاندان کی لڑکی کو تمہارے ساتھ کیوں جانے دیں؟ اور بنی عبدالاسد نے ان کے بچے سلمہ کو یہ کہہ کر قبضے میں لے لیا کہ ہم اپنے خاندان کے بچے کو تمہارے ساتھ نہیں جانے دیں گے ـــــ ابوسلمہ کے لیے یہ کس قدر سخت ابتلا کا موقع تھا اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جسے کبھی ایسی آزمائش میں پڑنے کا اتفاق ہوا ہو۔ بیوی صرف بیوی نہیں بلکہ ایک مومنہ بھی ہے۔ مومن والدین کی آغوشِ تربیت میں پلنے والا بچہ بھی یقیناً مومن ہی ہونے والا ہے۔ بیوی اور بچہ دونوں محبوب ہیں۔ آج یہ دونوں ابوسلمہ سے چھین لیے جاتے ہیں مگر تحفظِ دین کی خاطر ابوسلمہ اس کی کوئی پروا نہیں کرتے اور کمال یہ ہے کہ بیوی بھی تحفظِ دین کا وہی جذبہ رکھتی ہے اس لیے وہ بھی اپنے شوہر کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی۔ دونوں ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے رخصت کرتے ہیں۔ شوہر، بیوی اور بچے کو کچھ نہیں معلوم کہ یہ ایک دوسرے کو پھر کبھی دیکھ سکیں گے یا نہیں۔ زوج کی خاطر بڑے سے بڑا سفر ہو سکتا ہے لیکن کونسا جوڑا ہے جو ایک دوسرے سے محض اللہ کے لیے جدا ہو کر سفر اختیار کر لے؟ ابوسلمہ کا ایمان بیوی بچے کی محبت پر غالب آگیا اور بیوی نے بھی شوہر کی جدائی پر صبر کر لیا۔

شوہر رخصت ہو گیا اور بیوی ہر روز اسی جگہ آتی جہاں سے شوہر رخصت ہوا تھا۔ وہ اپنے بے سہارا بچے اور اس کے مہاجر باپ کو یاد کر کر کے آنسو بہاتی اور خدا سے فریاد کرتی۔ یہ روزانہ کا مشغلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ آخر ایک فرد بنی مغیرہ کو اس پر ترس آ گیا اور اس نے اس مظلومہ کو بنی مغیرہ سے ہجرت کی اجازت دلوا دی۔ اور بنی عبد الاسد سے اس کا بچہ بھی واپس دلوا دیا۔ ام سلمہ اپنے بچے سلمہ کو لے کر ایک اونٹ پر سوار ہو گئیں اور مدینے روانہ ہو گئیں۔ کوئی انسان یا راہبر ان کے ساتھ نہ تھا۔ جب یہ کوہ تنعیم کے پاس پہنچیں تو عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ عبدری سے جو اونٹ کی مہار تھام کر پیدل ہی منزلیں طے کرنے لگے۔ یہ عثمان بن طلحہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے مگر اپنے اندر جوہر شرافت وحیا رکھتے تھے۔ راستے بھر کسی جگہ بھی ان کے دل میں کوئی جذبہ خیانت نہیں پیدا ہوا۔ اپنی آنکھوں پر بھی پورا قابو رکھتے رہے۔ خود ام سلمہ کہتی ہیں کہ: عثمان بن طلحہ سے زیادہ شریف ساتھی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تین سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد جب مقام قبا میں یہ مسافر پہنچے تو بنی عمرو بن عوف کے محلے کے قریب پہنچ کر انہوں نے ام سلمہ سے کہا کہ تمہارا شوہر یہیں مقیم ہے۔ اللہ کا نام لے کر اب تم روانہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد وہ خود مکے آ گئے۔

دیکھنے میں یہ ایک معمولی سا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ ذرا سوچیے آج کون ہے جو کسی پر بے لوث ترس کھا کر تین سو میل پیدل جائے اور آئے اور تنہائی کے ہزار موقعے ملنے کے باوجود اپنی عصمت اور ایک بے بس عورت کی عفت کی محافظت بھی کرتا رہے؟ بلاشبہ عثمان ابھی ایمان نہ لائے تھے لیکن اپنے اندر غیر معمولی جوہر شرافت رکھتے تھے۔ اور اسی کی برکت سے انہیں صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لا کر ہجرت کرنے کی توفیق نصیب ہوئی اور فتح مکہ کے بعد انہیں کو کلید بردار کعبہ بنایا گیا۔

مفصل ذکر فتح مکہ کے بیان میں آئے گا۔ یہ تمام واقعات ہجرت خود ام سلمہ کی زبانی ابن اسحاق نے بیان کئے ہے

صہیب رومی کی ہجرت

ابن ہشام نے ابو عثمان نہدی سے ہجرت صہیب کی جو روایت نقل کی ہے وہ یوں ہے کہ سب سے آخر میں جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو کفار قریش نے کہا کہ: تم جب یہاں آئے تھے تو بالکل مفلس وقلاش تھے لہذا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم یہاں سے اپنی جان بھی لے جاؤ اور مال بھی۔ صہیب نے کہا اگر اپنا سارا مال دے دوں تو مجھے جانے دو گے؟ انہوں نے کہا: ہاں۔ چنانچہ صہیب نے اپنا سب کچھ دے کر بے سرو سامانی کو اپنا زادِ راہ بنالیا اور چل کھڑے ہوئے:

بے برگ و بے نوائی ساماں شدہ ست مارا

یہ حضورؐ سے قبا میں جاکر مل گئے۔ حضورؐ نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا: صہیب (اپنا سارا مال دینے کے بعد بھی) نفع میں رہا۔"

اسی طرح جس کی ہجرت کی بھنک قریش کو پہنچی اسے مقدور بھر آخری اذیت پہنچائی۔ ہشام بن عاص جانے لگے تو انہیں پکڑ کر قید کر لیا۔ بلکہ کمال تو یہ کیا کہ عیاش بن ربیعہ کو ایک دھوکا دے کر مدینے سے واپس لے آئے اور قید کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ اکا دکا کر کے خاموشی کے ساتھ ہجرت کر گئے۔

حضرت عمرؓ کی دلچسپ ہجرت

لیکن سیدنا عمرؓ کی ہجرت توقع کے مطابق ذرا دلچسپ رہی۔ کسی سے ڈرنا تو ان کی فطرت ہی میں نہ تھا۔ ابھی چند ہی مسلمانوں نے ہجرت کی تھی کہ یہ ایک دن

حرم میں پہنچے اور ایک اونچی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ اپنا تیر کمان مجمع قریش کو دکھا کر للکارتے ہوئے فرمایا: "سُن لو۔ میں ہجرت کر رہا ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ ڈر سے بھاگا جا رہا ہوں۔ جس کی یہ خواہش ہو کہ اس کی ماں اس کی لاش پر روئے وہ مجھے حرم سے باہر روک کر تماشا دیکھ لے۔" یہ اپنے خاندان اور قبیلے کے بیس افراد کو لے کر روانہ ہو گئے اور قبا میں رفاعہ بن عبدالمنذر کے پاس ٹھہر کر حضورؐ کا انتظار کرنے لگے۔

دارالندوہ میں سازشِ قتل

اب تقریباً تمام مسلمان ہجرت کر چکے تھے۔ مشہور صحابہ میں سیدنا ابوبکرؓ اور سیدنا علیؓ رہ گئے تھے۔ کفارِ قریش کا غصہ روز بروز تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اب اپنے لیے زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جس مشن کو اور اس کے حاملین کو فنا کرنے کے درپے تھے ان کو ایک محفوظ ٹھکانا (یثرب) ہاتھ آ گیا ہے۔ کل کلاں کو یہ اور طاقت پکڑ لیں گے تو ہماری معاش اور اقتدار دونوں ہی کا صفایا ہو جائے گا۔ ان کے سامنے اب بظاہر میدان بھی صاف تھا۔ نہ عمرؓ جیسا دبدبے والا انسان موجود تھا نہ دوسرے جاں نثار مکے میں باقی رہے تھے۔ صرف چند ہی رہ گئے۔ یہ سوچ کر انہوں نے ایک دن مشورہ کیا۔ یہ شوریٰ دارالندوہ میں ہوئی۔ دارالندوہ قصی بن کلاب کے محلے میں گویا پارلیمنٹ ہاؤس تھا جہاں تمام اہم امور کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اس شوریٰ میں بہت سے قریشی شریک ہوئے تھے، جن میں چودہ[۱۴] سردارانِ قریش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عُتبہ، شیبہ، ابوسفیان، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، زمعہ بن اسود، حکیم بن حزام، ابوجہل بن ہشام، نبیہ بن حجاج، منبہ بن حجاج اور امیہ بن خلف۔ بعد میں ان کے تین افراد ابوسفیان، جبیر بن مطعم اور حکیم بن حزام تو ایمان

لے آئے اور باقی سب کے سب بدر میں ہلاک ہوئے۔

اس کمیٹی میں ایک شخص اور بھی شریک ہوگیا تھا جس کے متعلق روایتوں میں ہے وہ ابلیس تھا اور صورت بشری اختیار کر کے آگیا اور اپنے آپ کو "شیخ نجدی" بتایا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ حصہ زیب داستان کے طور پر شامل کر لیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انتہائی خبیث اور بدطینت انسان کو بھی "شیطان و ابلیس" کہتے ہیں۔ اس پوری کمیٹی میں کون تھا جو ابلیس یا شیطان نہ ہو؟ اگر ایک نجدی ابلیس بھی اس مشورے میں شریک ہوگیا ہو تو کون سی تعجب کی بات ہے جو اسے "غیر مرئی ابلیس بہ صورت بشری" ہی قرار دیا جائے؟ دوسرے شرکائے شوریٰ بھی تو انسانی ہی شکل کے شیاطین و ابالسہ تھے۔

اس مشورے میں ایک شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ: محمدؐ کو لوہے میں جکڑ کر ایک کمرے میں بند کر دو اور باہر سے دیوار کو چن دو کہ وہ خود اپنی موت مر جائے۔ شیخ نجدی نے اس تجویز کے متعلق اپنی رائے یوں دی کہ: یہ تجویز معقول نہیں کیونکہ یہ خبر پوشیدہ نہیں رہ سکے گی اور اس کے رفقا تم پر حملہ کر کے اسے چھڑا لیں گے۔" پھر ایک دوسری تجویز یہ پیش کی گئی کہ: اسے ایک سرکش اونٹ پر بٹھا کر وطن بدر کر دو۔ پھر اس کا جہاں جی چاہے چلا جائے مگر ہم لوگ تو امن و عافیت میں ہو جائیں گے۔ شیخ نجدی نے اس تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا: تم کو اس کی سحر بیانی اور دلوں کو موہ لینے والی گفتگو کا اندازہ نہیں؟ وہ جس عربی قبیلے میں بھی جا گھسے گا اسے اپنا گرویدہ بنا لے گا پھر تم سب کو روند ڈالے گا اور تمہارا اقتدار چھین کر جو چاہے گا کرے گا۔"

اس کے بعد ابو جہل نے رائے دی کہ: ہر ہر قبیلے میں سے ایک ایک پھرتیلا، بہادر نوجوان لے لو۔ یہ سب موقع پا کر محمدؐ پر ایک ساتھ تلوار سے حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیں۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ اس خون کے ذمے دار تمام قبائل ایک ساتھ شمار ہوں گے اور

بنی عبد مناف ان سارے قبائل سے جنگ نہ کر سکیں گے اور آخر انہیں خوں بہا پر راضی ہونا پڑے گا جو ہم سب مل کر ادا کر دیں گے۔

اس تجویز پر سب کا اتفاق ہو گیا اور اسی دن شب کے وقت کاشانۂ نبوت کو خاموشی کے ساتھ گھیر لیا گیا۔

ہجرت کی تیاری پہلے سے تھی

یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ حضورؐ نے صحابہ کو ہجرت کی اجازت اس لیے ہرگز نہ دی تھی کہ وہ سب کے سب چلے جائیں اور حضورؐ خود مکے ہی میں رہ جائیں۔ غرض تو یہ تھی کہ پہلے امّت کے لیے ٹھکانا ہو جائے پھر اپنی فکر کریں۔ محمد بن اسحٰق وغیرہ کی روایت ہے آغازِ ہجرت سے چار چھ ماہ پہلے جناب ابوبکرؓ نے بھی ہجرت مدینہ کی اجازت چاہی تھی لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ: جلدی نہ کرو شاید اللہ تمہارے لیے ایک ساتھی کا بھی سامان فرما دے ـــــ زیرک و فہیم ابوبکرؓ نے اشارہ سمجھ لیا اور دو اونٹنیاں اسی وقت خرید لیں جن کی قیمت واقدی کی روایت کے مطابق آٹھ سو درہم تھی۔ ان سواریوں کو آپ نے خوب کھلا پلا کر پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ دار الندوہ کی شوریٰ سے چند دن پہلے ہی حضورؐ خلافِ معمول حضرت ابوبکرؓ کے پاس دوپہر کو پہنچے اور اطلاع دی کہ اللہ نے مجھے ہجرت کا حکم دیدیا ہے۔ اور ساتھ ہی جناب ابوبکرؓ کے استفسار پر یہ بھی بتا دیا کہ تمہیں رفاقت کا شرف حاصل ہو گا۔ اس خوش خبری کو سن کر حضرت ابوبکرؓ خوشی سے رونے لگے اور فرمایا کہ میں نے یہ دو سواریاں پہلے ہی سے مہیا کر رکھی ہیں۔

شبِ ہجرت

آج خون کے پیاسے رات کی تاریکی میں کاشانۂ نبوی سے باہر فجر کا انتظار

کر رہے ہیں کہ حضورؐ باہر تشریف لائیں تو دفعۃً سب کے سب ایک ساتھ اپنی اپنی سیفِ بے نیام کے جوہر دکھائیں اور اس ناکردہ گناہ معصوم ہستی پر اپنی تلواریں آزمائیں جس نے آج تک کسی ظالم دشمن پر بھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ یہ اس کے خون سے زمینِ حرم کو رنگین کرنا چاہتے ہیں جس سے زیادہ کسی نے انسانی خون کا احترام نہیں کیا۔ آج کائنات کی نظریں اس مرکزِ کائنات پر لگی ہوئی ہیں اور معاملے کی نزاکت اپنے انتہائی نقطۂ عروج (CLIMAX) پر پہنچ چکی ہے۔ زندگی آج ایک بالکل نئے موڑ پر قدم رکھنے والی ہے۔

ان عربوں میں کفر کے باوجود رسم و رواج کی اتنی بھر رعایت موجود تھی کہ بے دھڑک کسی کے گھر کے اندر گھس جانا معیوب سمجھتے تھے۔ اس لیے باہر ہی انتظار کرتے رہے اور وہاں مقصودِ کائناتؐ نے ایک مشتِ غبار اٹھا کر سورۂ یٰسین کی آیات فھم لایبصرون تک تلاوت فرمائی اور مشتِ خاک ان کی طرف پھینک دی۔ اب تک تو وہ بصیرت کے لحاظ سے فھم لایبصرون کے مصداق تھے۔ اب تھوڑی دیر کے لیے ان کی بصارت پر بھی فھم لایبصرون کا پردہ پڑ گیا اور حضورؐ خاموشی سے نکل کر اپنے رفیق (ابوبکرؓ) کے گھر پہنچ گئے۔

گھر سے باہر آتے وقت حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ "تم میرے بستر پر میری یہ دھرمی سبز چادر سر سے پاؤں تک اوڑھ کر سو رہو۔ تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ میں ہجرت کر رہا ہوں۔ میرے پاس فلاں فلاں کی امانتیں ہیں۔ یہ ساری امانتیں واپس کر کے تم بھی روانہ ہو جانا۔"

لمحۂ فکریہ

ذرا اس مقام کو غائر نگاہوں سے دیکھیے۔ ایک نمونہ وہ تھا کہ صہیب رومی

سے ان کی ساری کمائی اہلِ مکہ چھین لیتے ہیں اور ابو سلمہ سے ان کی بیوی بچے کو بھی لے لیتے ہیں۔ اور ادھر اقدارِ انسانی کا یہ مظاہرہ ہو رہا ہے کہ خون کے پیاسوں کی امانتیں واپس کی جا رہی ہیں۔ اپنے اول المومنین بھائی (علیؑ) کی جان کو اس پرخطر ماحول میں اس لیے چھوڑا جا رہا ہے کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر دی جائیں۔ جہاں جان خطرے میں پڑ رہی ہو وہاں ان انسانی قدروں کا کون لحاظ رکھ سکتا تھا؟ وہی رسولِ امینؐ جس کی بعثت کا مقصد ہی ان اخلاقی اقدار کا قیام تھا۔ یہ بھی قابلِ غور حقیقت ہے کہ ہزار عداوتوں کے باوجود دشمنوں کو بھی حضورؐ پر یہ اعتمادِ کامل تھا کہ یہ امانت میں کبھی خیانت نہیں کر سکتے۔ حضورؐ کے پاس ان میں سے ہر شخص اپنی جان اور اپنے مال کو محفوظ ہی یقین کرتا تھا۔ جو حقیقت یہ نہیں سمجھ سکے وہ یہ تھی کہ بندوں کا امین پیغامِ الٰہی اور انسانیت کا بھی سب سے بڑا امین ہے۔

مرتضوی ایمان

حضورؐ نے جناب علیؑ کو یہ حکم دیا تھا کہ میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو رہو اور ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی دے دی کہ تمہیں کوئی گزند نہ پہنچے گی۔ پھر یہ بھی فرما دیا کہ امانت والوں کی امانتیں واپس کر کے تم بھی چل کھڑے ہونا۔ ایسی بھیانک رات میں کیسے نیند آ سکتی ہے جب کہ جان و ایمان سے بڑھ کر محبوب جدا ہو رہا ہو اور باہر تلواریں خون کی پیاس سے بے تاب ہو رہی ہوں؟ بہ ظاہر اوپر تلواروں کی نوکیں ہیں اور نیچے کانٹوں کا فرش ہے۔ مگر تعمیلِ حکم کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں۔ اور صرف تعمیلِ ارشاد ہی نہیں اس خوش خبری پر اتنا یقین بھی ہے کہ آرام

کی نیند سو جاتے ہیں۔ ایسی میٹھی اور خوشگوار نیند جو شاید اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ ایمان کی یہ پختگی اور قلب کا یہ ایمان علی مرتضےٰؓ کے سوا اور کسے حاصل ہو سکتا تھا۔

مکّے سے روانگی

حضورؐ محاصرۂ کفار سے خاموشی کے ساتھ نکل کر جناب ابوبکرؓ کے ہاں پہنچے جناب ابوبکرؓ نے دو سواریاں تو پہلے ہی سے مہیا کر رکھی تھیں۔ لیکن ہجرت کی خدمات صرف دو سواریوں تک محدود نہ تھیں۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ہجرت کا سارا کریڈٹ نہیں تو اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ جناب ابوبکرؓ کے گھرانے ہی کو ملتا ہے۔ آپؓ نے ان دونوں سواریوں کو عبداللہ بن اُریقط دوَمِلی کے سپرد کر دیا تھا کہ جب اور جہاں ضرورت ہو اسے لے آئے۔ اور وقتِ ضرورت تک ان کو چراتا اور ان کی حفاظت کرتا رہے۔ یہ ابن اریقط مشرک تھا مگر حضرت ابوبکرؓ کا رازدار تھا۔ اسے آپ نے کہہ رکھا تھا کہ تم سے کسی وقت مدینے کا راستہ بتانے کا کام لیا جائے گا۔

لمحۂ فکریہ

زندگی کے اتنے نازک موڑ پر ایک مشرک کو رازدار بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ عام اصولِ زندگی تو یہی ہے کہ اپنے خاص معاملات میں غیر مسلموں کو شریک نہ کیا جائے لیکن اگر کسی کے طرزِ عمل اور دوسرے قوی قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وقتِ معین تک رازدار رہے گا اور اس وقت کے بعد اگر افشا بھی ہو جائے تو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تو اس پر اعتماد کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ زندگی میں ایسے مراحل بھی آ سکتے ہیں کہ ایک غیر مسلم کسی معاملے میں ایک مسلمان سے زیادہ

رازدار اور قابلِ اعتماد ثابت ہو۔ خود حاطب بن ابی بلتعہ جیسے بدری اور ابولبابہ جیسے صحابی سے بعض اہم ترین راز فاش ہو گئے (تفصیل غزوۂ بنی قریظہ اور فتحِ مکہ کے بیان میں دیکھیے)۔ اور ہجرت کے موقعے پر عبداللہ بن اریقط اور عباس بن عبدالمطلب نے جو اب تک مسلمان نہ ہوئے تھے پوری رازداری سے کام لیا۔ ہماری مملکت پاکستان میں یہ بحثیں کئی موقعوں پر سامنے آئی ہیں کہ غیر مسلم کو کوئی کلیدی منصب دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس معاملے میں اقتضائے احوال کے مطابق ہر ممکن احتیاط تو مقدم اصول ہے لیکن کسی موقعے پر حضورؐ یا جناب ابوبکرؓ کے طرزِ عمل سے ہمیں روشنی مل سکتی ہے۔

بہر حال عبداللہ بن اریقط کو جناب ابوبکرؓ نے رازدار دلیلِ راہ بنانے کے علاوہ اپنے صاحبزادے عبداللہ بن ابوبکر کے سپرد یہ ڈیوٹی کی کہ اہلِ مکہ کی سرگرمیوں کی اطلاع شب کی تاریکی میں آکر غارِ ثور میں دیا کریں۔ نیز اپنے غلام عامر بن فہیرہ کے ذمے یہ کام کیا کہ دن بھر اِدھر اُدھر بکریاں چراتا رہے اور رات کو انہیں ہنکا کر غار کے پاس لے آئے اور دودھ فراہم کرے اور گوشت بھی۔ عبداللہ بن ابی بکر شب کو ضروری خبریں پہنچا کر واپس آجاتے اور عامر بن فہیرہ بکریاں اسی راستے پر لے جاتے تاکہ ان کے نشانِ قدم مٹ جائیں۔ مزید برآں حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماء کے سپرد یہ خدمت ہوئی کہ وہ شب کو کھانا پہنچا جایا کریں۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق جناب ابوبکرؓ اپنی اندوختہ رقم بھی، جو پانچ یا چھ ہزار درہم تھے ساتھ لیتے گئے تھے۔ لیکن یہ قرینِ قیاس نہیں کہ اس بے سروسامانی اور ایسی پریشانی کی حالت میں وہ اتنا بوجھ اپنی پیٹھ پر لاد کر لے گئے ہوں خصوصاً جب کہ انہیں بعض مواقع پر خود حضورؐ کو اپنی پشت پر لاد کر لے چلنا پڑا ہے۔ ہاں یہ عین ممکن اور اس لیے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ راہنما، یا فرزند یا دختر کے سپرد یہ کام کیا ہو کہ فلاں وقت

فلاں جگہ یہ رقم لے کر پہنچ جانا۔

غرض یہ تمام انتظامات حضرت ابوبکرؓ نے کر لیے تھے اور خود سائے کی طرح حضورؐ کے ساتھ ساتھ رہے۔

اہلِ مکہ نے جس شب کو محاصرہ کیا تھا وہ تاریک رات تھی یعنی ماہ صفر ۱۲ سنہ نبوی کی ستائیسویں شب (مطابق ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء)۔ غالباً یہ وقت اس لیے انہوں نے رکھا تھا کہ چاندنی میں محاصرے کا علم آسانی سے ہو جاتا۔ مگر حضورؐ کو ان کے محاصرے سے صاف بچ نکلنے میں اسی تاریکی نے مدد دی۔ حضورؐ نے جناب ابوبکرؓ کے گھر پہنچ کر فوراً تیار ہونے کا حکم دیا۔ اسماء بنتِ ابی بکرؓ نے جھٹ پٹ کچھ کھانے کی چیزیں مہیا کیں اور ایک تھیلی میں رکھ دیں۔ تھیلی کا منہ باندھنے کو کوئی رسی نہ ملی تو اپنے پٹکے کو بیچ سے پھاڑ کر دو حصے کر لیے اور ایک سے تھیلی کا منہ باندھ دیا۔ ان کی یہ ادا کچھ ایسی پسندیدہ ہوئی کہ ان کا لقب ہی ذات النطاقین ہو گیا یعنی ایک پٹکے کو پھاڑ کر دو کرنے والی۔

اس تاریک شب میں حضورؐ اپنے رفیق کے ساتھ پیدل روانہ ہو گئے۔ مکے سے باہر جا کر ایک حسرت بھری نگاہ کعبۃ اللہ پر ڈالی اور فرمایا:

"اے بیت اللہ! تو مجھے بہت عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔"

رات کی تاریکی اپنی سیاہ چادر میں لپیٹے ان دونوں رفیقوں کو لیے جا رہی ہے جن میں ایک سید الانبیاء ہے اور دوسرا افضل الناس۔ مستقبلِ کائنات اور مستقبلِ انسانیت کا سارا انحصار ان دو ہستیوں پر ہے۔ ان دونوں کا یہ سفر کون و مکاں کی زندگی میں ایک ایسا موڑ TURNING POINT ہے جس سے زیادہ نازک مرحلہ کبھی پیش نہیں آیا۔ قدم قدم پر یہ صدیقِ عجیب عجیب انداز سے

اپنا حقِ رفاقت ادا کر رہا ہے۔ اسے نہ اپنا ہوش ہے نہ اپنی ہستی کی فکر۔ شمعِ نبوت خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ کائنات کی ساری قوتیں اس سراجِ منیر کی محافظت پر متعین ہیں مگر اس رفیق کی بے چینی، اضطراب، شیفتگی اور دیوانگی دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ کبھی آگے ہو جاتا ہے، کبھی پیچھے، کبھی دائیں آ جاتا ہے کبھی بائیں۔ بس ایک پروانہ ہے جو اپنی شمع کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور استفسارِ نبوی پر خود ہی اس کی وجہ بھی بتا دیتا ہے کہ جدھر سے خطرے کا وہم بھی گزرتا ہے یہ پروانہ ادھر ہی جاں نثاری کے لیے لپک پڑتا ہے:

من دل گرفتا شدیم چہ باک   غرض اندر میاں سلامت اوست

چلتے چلتے حضورؐ کے پائے مبارک میں آبلے یا خراش پیدا ہو گئی۔ یہ کیفیت دونوں ہی کی ہوئی ہو گی لیکن صدیقؓ نے اس تاریکی میں حضورؐ کے اندازِ رفتار سے اسے محسوس کر لیا اور حضورؐ کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ نوکیلے سنگریزوں اور پتھروں نے اب جناب ابوبکرؓ کے پاؤں کو اور زیادہ مجبور کرنا شروع کیا ہوگا لیکن اب یہ رفیق پہلے سے زیادہ چستی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ کارِ نبوت کو (حضورؐ کے بعد) وہی سنبھال سکتا تھا جو آج بارِ نبوت کو سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس رفیق نے کتنی مسافت اس طرح طے کی اور راستے میں کتنے نشیب و فراز کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن یہ بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ابوبکرؓ کے اس محشر بداماں اور رحمت بدوش خرام کے ایک ایک قدم پر زندگی کی ساری عبادتیں قربان ہیں۔ صدیقؓ نے خود اس شرف سے سبک دوش ہونے کی کوئی خواہش نہ کی ہو گی۔ اگر حضورؐ کو اتارا ہو گا تو خود حضورؐ ہی کے اصرار سے اتارا ہو گا۔

لمحۂ فکریہ

مکے سے کوئی چار میل پر ایک پہاڑ ہے جس کا نام ثور ہے۔ اس کی بلندی پر ایک

غار ہے جسے غار ثور کہتے ہیں۔ پہاڑ کی بلندی کے بعد نشیب میں ایک ڈھلوان اور دشوار گزار راستہ ہے جس کے اختتام پر یہ غار ہے۔ یہ دونوں آقا و خادم اس کے دہانے پر پہنچ گئے۔ جناب ابوبکرؓ حضورؐ کو باہر ہی ٹھہرا کر پہلے خود اندر گئے۔ اس کے اندر بیٹھ کر بلکہ گویا رینگ کر جانا پڑتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں دو ہی غار ہیں جن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ایک ہے غار حرا، جہاں پہلی وحی آئی تھی اور دوسرا ہے غار ثور جہاں حضورؐ اور صدیقؓ نے تین دن گزارے تھے۔ غار حرا کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں مگر غار ثور کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے غار کے اندر جاکر پہلے اسے صاف کیا۔ صاف کرتے ہوئے ان کی انگلی بھی زخمی ہو گئی۔ جہاں درزیں نظر آئیں ان کو پتھروں یا کپڑوں سے بند کیا۔ پھر حضورؐ کو اندر بلالیا۔ حضورؐ بہت تھک گئے تھے اس لیے اپنے رفیق کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ گویا:

رکھی ہوئی رحل پہ خدا کی کتاب ہے

تلاش اور تشدد

فجر ہوتے ہی محاصرین نے بستر پر حضرت علیؓ کو پایا۔ پوچھا: محمدؐ کہاں ہیں؟ آپ نے جواب دیا: مجھے کیا معلوم؟ اس جواب پر انہیں غصہ آیا۔ جناب علیؓ کو کچھ مارا پیٹا اور تھوڑی دیر حرم میں محبوس رکھ کر چھوڑ دیا۔ یہ ظالم غصے میں حضرت علیؓ کو قتل بھی کر سکتے تھے۔ لیکن اولاً تو ان کا مقصد علیؓ نہ تھے۔ یہ تو اس ہستی کو ختم کرنا چاہتے تھے جو اس مشن (اسلام) کا مرکز ہے۔ دوسرے انھوں نے سوچا کہ جتنا وقت علیؓ سے پوچھ گچھ کرنے یا ان پر تشدد کرنے میں صرف کیا جائے گا

وہی وقت حضورؐ کی تلاش میں کیوں نہ لگایا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ادھر لگے رہیں اور اصلی شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ اس لیے انہوں نے حضرت علیؓ کو تو وہیں چھوڑ دیا اور ہر طرف مکے میں حضورؐ کو ڈھونڈنے کے لیے بکھر گئے۔ انہیں علم تھا کہ جناب ابوبکرؓ ہی سب سے بڑے رفیق و رازدار ہیں اور سب سے زیادہ سراغ بیت صدیق ہی سے مل سکتا ہے۔ اس لیے پہلے یہیں پہنچے۔ اور دیکھا تو ابوبکرؓ بھی غائب تھے۔ جناب اسماء بنت ابی بکرؓ سے سراغ لیا گیا تو انہوں نے بھی لاعلمی ظاہر کی۔ اس پر ابوجہل نے تاؤ کھا کر اس زور کا طمانچہ رسید کیا کہ اسماءؓ کے ایک کان کی بالی نیچے گر پڑی۔ ان کا مقصود اسماءؓ بھی نہ تھیں اس لیے انہیں وہیں چھوڑ کر حضورؐ کی تلاش میں مکے کا کونا کونا ڈھونڈ مارا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ حضورؐ مکے میں نہیں بلکہ باہر جا چکے ہیں تو مکے سے باہر تلاش کے لیے نکلے۔

دشمن سر پر

عربوں کو بعض وجدانی قسم کے علوم و فنون میں بڑی مہارت تھی۔ مثلاً علمِ قیافہ کے یہ بڑے ماہر تھے۔ ہماری فقہ اسلامی تک کے بعض مسائل کا دارومدار اس علم پر رکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ زید بن ثابت کا پاؤں دیکھ کر ایک قائف نے فیصلہ دے دیا تھا کہ ثابت کا فرزند ہے۔ اسی طرح بعض عرب بڑے اعلیٰ درجے کے عرّاف بھی تھے جو نہ فقط انسان کے نقشِ قدم کو پہچان لیتے تھے بلکہ گھوڑے کے نشانِ سُم کو دیکھ کر اس کی نسل کا حال بتا دیتے تھے۔ یہ فن اب تک وہاں موجود ہے۔ ہمارے ملک کے "کھوجیوں" کی طرح نشانِ قدم سے مجرم کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اس وقت اس فن کا بڑا ماہر سراقہ بن جعشم تھا۔ یہ ایک جماعت کے ساتھ چلا اور ان دونوں (حضورؐ صدیقؓ) کے پورے، ادھورے، نمایاں اور مٹے ہوئے پنجوں اور ایڑیوں کے

نشان کی مدد سے کوہِ ثور کی بلندی پر پہنچ گیا جہاں سے دہانۂ غار کا فاصلہ ابن عساکر کی روایت کے مطابق دو سو ہاتھ رہ گیا۔ اس سے آگے انہیں کوئی نشانِ قدم نہ ملا غالباً اس لیے کہ وہ کوہی راستہ پتھریلا تھا، مٹی یا ریت سے خالی تھا۔ یہاں وہ حیران کھڑے سوچتے رہے۔ سامنے ڈھلوان میں غار نظر آیا اور سیدھا ادھر ہی روانہ ہو گئے۔ کوئی پچاس ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ ابو بکرؓ نے انہیں دیکھ لیا اور رونے لگے۔ انہیں اپنی فکر نہ تھی۔ جو کچھ فکر تھی حضورؐ کی تھی۔

معاملے کی نزاکت اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ گویا موت اپنا بھیانک جبڑا کھولے آگے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ جناب صدیق بلاشبہ اتنا بڑا ظرف رکھتے ہیں کہ وفاتِ نبوی کے بعد کوئی انسان ان کے سوا ایسا نہ تھا جس نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھا ہو۔ اس کے باوجود اس وقت صدیق بھی تقاضائے بشریت سے مغلوب ہو گیا۔ یہی وہ اہم مقام ہے جہاں ایک نبی اور غیر نبی کے ظرف میں واضح فرق کا پتہ چلتا ہے۔ صدیقؓ گھبرا گیا۔ اپنے لیے نہیں حضورؐ کے لیے مگر پیغمبر کا اطمینان اور ظرفِ ایقان دیکھیے۔ وہ اپنے رفیق سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ:

"یہاں صرف ہم دو ہی نہیں۔ ایک تیسرا بھی ہے اور وہ خدا ہے لہٰذا لاتحزن اللہ معنا۔ کوئی فکر نہ کرو خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔"

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جناب صدیقؓ کا دل بھی انوارِ سکینہ کے نزول میں ہمرنگِ رسول ہو گیا۔ یہ مقام تاریخِ انسانی کا اتنا اہم موڑ تھا کہ بعد میں قولِ رسولؐ اور صدیقؓ کے نزولِ سکینہ کا ذکر قرآن نے بھی یوں کیا:

اذ اخرجہ الذین	خدا نے رسول کی اس وقت بھی مدد کی جب
کفروا ثانی اثنین اذ ھما	اہلِ کفر نے اسے نکالا اور وہ دو میں ایک

فی الغار اذ یقول لصاحبه لا تحزن ان اللہ معنا فانزل اللہ سکینتہ علیہ وایدہ بجنود لم تروھا۔ ۹ : ۴۰

تھا۔ اس وقت وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اور وہ (رسول) اپنے ساتھی (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا کہ فکر نہ کر خدا ہم دونوں کے ساتھ ہے۔ (بس یہ کہتے ہی) خدا نے اپنی سکینت اس (ابوبکر) پر نازل فرما دی اور اس کی تائید ایسے (کائناتی قوتوں کے) لشکروں سے کی جو تمہیں نظر نہیں آسکتے تھے۔ . . .

معارف وحقائق کا ناپیدا کنار سمندر اس آیت کے کوزے میں سمو دیا گیا ہے۔ اس کی تشریح اس وقت پیش نظر نہیں لیکن چند نکات سن ہی لینا چاہیے۔

۱۔ ثانی اثنین کہہ کر واضح کر دیا گیا ہے کہ دونوں کا مشن ایک ہی تھا۔ روح و جان ایک ہی تھی اور قالب دو تھے۔

۲۔ لصاحبہ فرما کر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ جناب ابوبکرؓ کی صحابیت کاملہ کا منکر قرآنی ارشاد کا منکر ہے کیونکہ دنیا کی کوئی اور ہستی نہیں جو جناب ابوبکرؓ کے علاوہ رفیق غار تسلیم کی گئی ہو۔

۳۔ لاتحزن الخ سے یہ واضح ہے کہ ہزار بار فنا فی الرسول ہونے کے باوجود بھی مقام نبوت اصل اور مقام صدیقیت اسی کی فرع ہے۔

۴۔ علیہ سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ ابوبکرؓ ہی کا سینہ انوار سکینت کا مہبط تھا کیونکہ رسولؐ تو پہلے ہی صاحب سکینت تھا۔ اس سکینت کی ضرورت تو ابوبکرؓ کو تھی نہ کہ رسول کو۔

۵۔ لہذا۔ وایدہ بجنود لم تروھا بھی جناب صدیقؓ ہی کے متعلق ہے یہ جنود ــــ نظر نہ آسکنے والے لشکر ــــ وہی کائناتی قوتیں ہیں جن کو ہم

ملائکہ بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ انوار ہیں جو ثباتِ قلب بخشتے ہیں۔

یہ غار کی رفاقت وہ رفاقت ہے جس کی وجہ سے رفاقتِ کاملہ کے لیے "یارِ غار" ہمیشہ کے لیے ایک یادگار محاورہ بن گیا۔ ہجرت کی یہ رات اور جنابِ ابوبکرؓ کی یہ فدویت ایسی عجیب انداز کی تھی کہ جناب عمرؓ فرماتے تھے کہ: ابوبکرؓ کی یہ رات عمرؓ اور عمرؓ کے سارے خاندان کے اعمالِ حسنہ پر تنہا بھاری ہے۔ یہ رات ہی نہیں بلکہ ابوبکرؓ کا ایک دن بھی عمر اور آلِ عمر سے بہتر ہے (رواہ البیہقی)

سامانِ محافظت

ذرا اس منظر کو آنکھوں کے سامنے لایے کہ دہانۂ غار سے چند گز کے فاصلے پر خون کے پیاسے کھڑے ہیں جن کو یہ دونوں بزرگوار نشیب غار سے دیکھ رہے ہیں۔ خود جنابِ ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ: اگر یہ لوگ اپنے پیروں کو جھک کر دیکھتے تو ہمیں بھی دیکھ لیتے۔" اس نازک مرحلے پر خدا نے محافظت کا جو سامان کیا اس کے بیان میں رنگِ داستاں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی اسی وقت دہانۂ غار پر ایک درخت اُگ آیا اور حسنِ اتفاق سے دو جنگلی کبوتر اس کے اندر سے اڑتے ہوئے نکلے۔ اور ان ہی کبوتروں کی نسل آج حرم میں ہے۔ نیز ایک مکڑی نے جالا بھی دہانۂ غار پر تان دیا اور ان سب علامتوں کو دیکھ کر تلاش کرنے والوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس غار میں کوئی موجود نہیں۔

یہ روایت ابن عساکر اور ابونعیم کی ہے لیکن یہ بالکل ضعیف روایتیں ہیں تاہم اس کا ایک حصہ ایسا ہے جو روایۃً بھی حسن ہے اور درایۃً بھی قرینِ قیاس ہے۔ یہ روایت مسند احمد کی ہے کہ: جب یہ لوگ دہانۂ غار پر پہنچے تو وہاں ایک مکڑی کا جالا دیکھا اور یہ سوچا کہ اگر یہاں اندر کوئی جاتا تو جالا سلامت نہ رہتا۔

اس روایت میں صرف تارِ عنکبوت کا ذکر ہے۔ کبوتر یا درخت کا کوئی ذکر نہیں۔ غار میں داخل ہونے کے بعد تھوڑی دیر میں مکڑی کا جالا تان دینا کوئی بعید از فہم بات نہیں۔ یہ ضرور ہوا ہوگا اور اسی اوھن البیوت نے ان کی عقلوں پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔ ورنہ غار کے اندر انہیں تلاش کرنے سے کیا چیز روک سکتی تھی؟ یہ خدا کی شان ہے کہ اس نے کمزور ترین تارِ عنکبوت سے وہ کام لے لیا جو بڑی سے بڑی میگزین بھی نہیں کر سکتی تھی۔

تلاش کی ناکامی کے بعد یہ تمام لوگ واپس ہو گئے اور آفتابِ نبوت کوکبِ ولایت کے ساتھ تین دن اسی برجِ ثور میں مقیم رہا جہاں جنابِ صدیقؓ کے انتظام کے مطابق کھانا اور دودھ وغیرہ بھی ملتا رہا اور ضروری خبریں بھی پہنچتی رہیں۔ تین شبانہ یوم اس غار میں گزارے اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب لوگ اس راستے کی طرف نہیں آئیں گے دونوں بندگوار چل کھڑے ہوئے۔ حسبِ وعدہ عبداللہ بن اریقط سواریاں لے آیا تھا۔ عامر بن فہیرہ بھی ساتھ تھا۔ یہ چاروں ساحلی راستے سے مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ بھی واضح رہے کہ حضورؐ جس اونٹ پر سوار ہوئے وہ اگرچہ حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ ہی کے لیے خرید رکھا تھا لیکن حضورؐ اس وقت اس پر سوار ہوئے جب حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی خواہش کے مطابق اس کی قیمت لینا گوارا کر لیا۔

تلاشِ مزید

ادھر کفارِ قریش نے تلاشِ مزید کی تدبیر کے لیے یہ اعلان کر دیا کہ: جو شخص محمدؐ یا ابوبکرؓ کو زندہ گرفتار کر لائے یا ان کے سر لے آئے اسے سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ اس اعلان نے تلاش میں مزید سرگرمی پیدا کر دی۔ اسی دوران میں ایک

مدلجی شخص نے سراقہ بن مالک بن جُعشم کو اطلاع دی کہ میں نے کچھ آدمیوں کو ساحلی راستے پر جاتے دیکھا ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ محمدؐ اور ان کے ساتھی ہی ہوں گے۔ سراقہ نے سوچا کہ اگر کسی اور کو اس کی خبر ہو گئی تو ممکن ہے وہی سبقت کر جائے لہٰذا اس نے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کہہ دیا کہ نہیں وہ فلاں فلاں آدمی ہیں جو میرے سامنے ہی ادھر گئے ہیں۔ یہ کہہ کر سراقہ خاموشی سے گھر آیا۔ اپنا برچھا لیکر گھوڑے پر سوار ہوا مگر گھوڑے نے اسے گرا دیا۔ سراقہ نے اپنے تیروں سے فال لی۔ جواب نفی میں آیا مگر سو اونٹوں اور شہرت کے لالچ نے اسے پیچھا کرنے پر مجبور کر دیا۔ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا حضورؐ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت حضورؐ قرآن تلاوت فرما رہے تھے۔ اور کچھ ایسی پُر اطمینان محویت تھی کہ سراقہ کی طرف رُخ بھی نہ کیا۔ مگر رفیقِ غار بے چینی سے بار بار ادھر مُڑ مُڑ کر دیکھ رہا تھا۔ یہاں ایک بار پھر نبوت اور صدیقیت کے حوصلوں کا فرق نمایاں ہو گیا۔ اتنے میں سراقہ کے گھوڑے کے دونوں اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے اور ایک طوفانِ غبار نے اسے اترنے پر مجبور کر دیا۔ اب اس نے پھر دورِ جاہلیت کے مطابق فال لی اور پھر وہی جواب ملا۔ اس وقت سراقہ کو یقین ہو گیا کہ میری کوشش رائگاں جائے گی اور حضورؐ کو ایک دن غلبہ حاصل ہو گا۔ یہ سوچ کر اس نے آواز دی کہ: اہلِ مکہ آپ کو گرفتار یا قتل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے سو اونٹ کا انعام رکھا ہے جس کے لیے میں نے پیچھا کیا تھا۔ مگر اب مجھے امان عطا کیجیے اور میرے پاس جو کچھ زادِ راہ اور دوسری چیزیں ہیں سب لے لیجیے۔" اس کے جواب میں حضورؐ نے اور جناب صدیقؓ نے اتنا کہا کہ: ہم سے تم دور ہی رہو۔ سراقہ نے امان طلب کی اور حضورؐ کے حکم سے عامر بن فہیرہ نے ایک چمڑے یا کپڑے یا ہڈی پر امان نامہ لکھ دیا۔

یہ روایت بخاری کی ہے اور حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے۔ اس پوری روایت

میں اور کوئی بات ایسی نہیں جسے صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل پیدا ہو۔ لیکن مجھے یہ پڑھنے کے بعد آخری حصے میں کھٹک پیدا ہوئی۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بے سروسامانی اور پریشانی میں دوات قلم بھی ساتھ ہو اور وہ بھی کاغذ کے بغیر۔ اس کھٹک کے بعد میں نے مولانا شبلی کی سیرت النبی دیکھی تو خوشی ہوئی ان کے دل میں بھی یہ کھٹک پیدا ہوئی ہے۔ اور فٹ نوٹ میں اس کھٹک کو دور کرنے کے لیے انہوں نے یہ لکھا ہے کہ:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پریشانی کی حالت میں بھی دوات قلم ساتھ رہتا تھا۔"

لیکن افسوس ہے کہ اس تاویل و توجیہ سے کم از کم میری خلش دور نہ ہو سکی۔ بات یوں معلوم ہوتی ہے کہ سراقہ نے امان طلب کی اور حضورؐ نے زبانی امان دے دی۔ اس نے امان نامہ لکھنے کی درخواست کی تو سامانِ کتابت موجود نہ ہونے کی وجہ سے چمڑا یا کوئی چیز بطور علامت مرحمت فرما دی۔ یہ علامت بعد میں "امان نامہ" بن گئی۔ اور اس امان نامے کے لیے "کتابت" کا نام تجویز کر لیا گیا۔

یہ سراقہ غزوۂ طائف کے بعد "جعرانہ" میں حضورؐ سے ملے اور اسلام لے آئے۔ حضورؐ نے انہیں بشارت دی تھی کہ: میں تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کا طلائی کنگن دیکھ رہا ہوں۔ حضورؐ کی یہ خوش خبری سیدنا عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پوری ہوئی جب کہ سراقہ صاحبِ فراش تھے۔ یہ پیش گوئی حضورؐ نے اس وقت فرمائی تھی جب انہیں امان نامہ دیا گیا تھا۔ اہلِ مکہ نے صرف اونٹوں کا وعدہ کیا تھا اس شرط پر کہ حضور یا صدیق کی گرفتاری بھی عمل میں آئے۔ مگر حضورؐ نے کسی شرط کے بغیر امان بھی دی اور کسریٰ کا کنگن بھی (استیعاب)۔

اقدارِ صداقت و صدیقیت

اس سفرِ ہجرت میں ایک اور دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ایک موقعے پر ایک شخص ملا جو جناب ابو بکرؓ کا شناسا تھا مگر حضورؐ کو نہیں پہچانتا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے حضرت ابو بکرؓ سے پوچھا کہ: یہ تمہارے ساتھ دوسرا کون آدمی ہے؟ ذرا سوچیے جناب ابو بکرؓ کی جان اس وقت کیسی ضیق میں پڑ گئی ہوگی۔ اگر غلط بتائیں تو جھوٹ ہوتا ہے جو صدیق کے صدق و راست گفتاری کے خلاف ہے اور اگر سچ بتائیں تو ڈر ہے کہ دشمنوں کو علم ہو جائے جو صداقت و یاری کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ ایسے نازک مواقع پر جب کہ دو قدروں میں کش مکش ہو رہی ہو حواس کا قائم رکھنا دشوار ہوتا ہے اور انسان اس کش مکش سے نکلنے کے لیے سوچ میں پڑ جاتا ہے لیکن جنابِ صدیق فوراً اسے یہ برجستہ جواب دے کر آگے بڑھ گئے کہ: رجل یهدینی السبیل۔ یہ ایک آدمی ہے جو مجھے راستہ دکھاتا ہے۔ آپ کا مقصد تو یہ تھا کہ حضورؐ ہمیں راہِ ہدایت دکھاتے ہیں اور سائل یہ سمجھا کہ ابو بکرؓ نے اس سفر کے لیے کوئی راہنما ساتھ رکھ لیا ہے۔ ایسے کلام کو "توریہ یا ایہام" کہتے ہیں۔ اس کی مثالیں دنیا میں بہت ہیں لیکن یہ مثال برجستگی اور حاضر دماغی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔

سراقہ یہاں سے نہ فقط خود واپس گئے بلکہ راستے میں جو بھی ملا اسے کسی بہانے سے واپس کر دیا۔

اسی سفر میں حضورؐ، ابو بکرؓ، عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ چاروں ایک خیمے سے گزرے جہاں ام معبدؓ بیٹھی تھیں۔ یہاں سب نے ذرا دیر آرام کیا اور حضورؐ کی برکت سے ایک مریل سی بکری کے دودھ سے سب سیراب ہوئے۔ جب یہ

قافلہ آگے بڑھ گیا تو اس کا شوہر ابو معبد پہنچا۔ اور واقعات سن کر اس نے اندازہ لگایا کہ یہی وہی قافلہ ہے جسے قریش گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے امّ معبد سے مزید حالات و اوصاف دریافت کیے۔ ام معبد نے اس وقت جو حضورؐ کا سراپا بیان کیا وہ ایسی نعتِ نبوی ہے جس کا جواب عربی ادب میں ملنا مشکل ہے۔ اس نے کہا:

قالت: رأیت رجلاً ظاهر الوضاءة ابلج الوجه حسن الخلق، لم تعبه ثجلة، ولم تزر به صعلة، وسیمٌ قسیمٌ فی عینیه دعج، وفی اشفاره وطفٌ، وفی صوته صحلٌ، وفی عنقه سطعٌ وفی لحیته کثاثةٌ۔ ازجّ، اقرن۔ ان صمت فعلیه الوقار، وان تکلم سما وعلاه البهاء۔ اجمل الناس وابهاه من بعید واحلاه واحسنه من قریب۔ حلو المنطق لا هذرٌ ولا نزرٌ۔ کانّ نطقه خرزاتُ نظمن......

. . . .

. . . .

دکہ یہ برکت ہے ایک شخص کی جو ابھی ادھر سے گزرا تھا۔ اس نے کہا کہ ذرا اس کا حال تو بتاؤ اس پر وہ بولی: میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کی نظافت نمایاں، جس کا چہرہ روشن، اور جس کی بناوٹ (خُلق) میں حسن تھا نہ موٹاپے کا عیب نہ دُبلاپے کا نقص، خوش رُو حسین، آنکھیں کشادہ اور سیاہ، پلکیں لمبی، آواز میں کھنک، گردن صراحی دار، داڑھی گھنی، بھویں کمان دار اور جُڑی ہوئی، خاموشی میں وقار کا مجسمہ، گفتگو میں صفائی اور دلکشی، حسن کا پیکر اور جمال میں یگانۂ روزگار، دُور سے دیکھو تو حسین ترین، قریب سے دیکھو تو شیریں ترین بھی اور جمیل ترین بھی۔ گفتگو میں مٹھاس، نہ فضول گفتگو کرے اور نہ ضرورت کے وقت خاموش رہے۔ گفتگو اس انداز کی جیسے پروئے ہوئے موتی۔

ربعۃ لا تشنؤہ من طول، ولا تقتحمہ من قصر۔ غصن بین غصنین۔ فھو انضر الثلاثۃ منظرًا و احسنھم قدرًا۔ لہ رفقاء یحفون بہ۔ ان قال انصتوا لقولہ، وان امرتبادروا امرہ؛ محفودٌ۔ محشودٌ۔ لا عابسٌ ولا مفنّدٌ۔ قال ابو معبدٍ ھو واللہ صاحب قریشٍ الذی ذکرلنا من امرہ ما ذکر بمکۃ ولقد ھممت ان اصحبہ و لافعلن ان وجدت الی ذالک سبیلا......

(کبیر بخاری)

ایسا میانہ قد جس میں نہ قابلِ نفرت درازی، نہ حقارت آمیز کوتاہی۔ اگر وہ شاخوں کے درمیان ایک اور شاخ ہو، تو وہ دیکھنے میں ان تینوں شاخوں سے زیادہ تروتازہ دکھائی دے۔ اور قدرو قیمت میں ان سب سے زیادہ بہتر نظر آئے۔ اس کے کچھ جاں نثار تھے جو اسے گھیرے رہتے۔ جب وہ بولتا تو سب خاموش ہو جاتے۔ جب کوئی حکم دیتا تو اس کی تعمیل کے لیے ٹوٹ پڑتے۔ سب کا مخدوم، سب کا مطاع، ترش روئی سے پاک اور قابلِ گرفت باتوں سے مبرّا۔ ابو معبد بولے کہ خدا کی قسم یہ وہی قریشی معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر میں مکے میں سُن چکا ہوں۔ میں ارادہ بھی کر چکا ہوں کہ اس کی صحبت نصیب ہو۔ اگر اس کی سبیل نظر آئی تو میں یہ ضرور کروں گا۔

بریدہ بن خصیب اسلمی کا اقدام

اس سفرِ ہجرت کے دوران بریدہ بن الخصیب اسلمی ملے جو تنہا نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ ستر آدمی اور بھی تھے۔ یہ سب حضورؐ کو گرفتار کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ لیکن ہوا کیا؟ حضورؐ نے ان پر اسلام پیش کیا۔ اور یہ سب کے سب

خود اسلام کی زنجیر میں گرفتار ہو گئے۔ بریدہ نے اپنی سفید پگڑی کھول کر اپنے نیزے کی انی میں اٹکا لی اور امن و سلامتی کا یہ سفید جھنڈا لے کر آگے آگے چلنے لگے:

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امیدِ آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

راستے میں حسنِ اتفاق سے زبیر بن عوام ملے جو شام کے تجارتی قافلے کے ساتھ واپس آ رہے تھے۔ انہوں نے ایک سفید حُلّہ حضورؐ کو اور ایک جناب ابو بکرؓ کو ہدیۃً پیش کیا۔

قبا میں داخلہ

اہلِ یثرب نے جس دن سے یہ سنا تھا کہ حضورؐ مکے سے روانہ ہو چکے ہیں، اس دن سے ان کا معمول سا ہو گیا تھا کہ ہر روز سرِ راہ آ کر بیٹھ جاتے اور حضورؐ کی آمد کا انتظار کرتے۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو واپس چلے جاتے۔

آٹھویں (یا بروایتے بارھویں) ربیع الاول ۱۳ نبوی یا ۱ ہجری روز دوشنبہ (مطابق ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء) کو حضورؐ قبا میں پہنچے جو مدینے سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اہلِ مدینہ حضورؐ کا انتظار دیکھ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ ایک یہودی اپنے مکان یا کسی پہاڑی پر کھڑا تھا۔ اس نے جو چند نورانی شکلوں کو آتے دیکھا تو بھانپ لیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ یہ محسوس کر کے وہ زور سے چلایا کہ: اے عربو! یہ دیکھو تمہارا مقصود چلا آ رہا ہے۔ اس آواز کا سننا تھا کہ ہر طرف سے تکبیروں کی گونج نے

ایتھر میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اور انصار اپنے ہتھیاروں کی سج دھج کے ساتھ باہر نکل پڑے۔

حضورؐ قبا میں ایک انصاری خاندان کے سردار کلثوم ہدم کے مہمان ہوئے اور یہاں کم وبیش دو ہفتے قیام فرمایا۔ انصار جوق در جوق قبا میں آتے اور زیارتِ نبوی کی دولت سے بہرہ مند ہو کر جاتے۔

ایک موقعے پر کچھ لوگ باہر سے آئے۔ انہوں نے اس سے پہلے حضورؐ یا جناب ابوبکرؓ وغیرہ کو نہ دیکھا تھا۔ یہ آپس میں اشاروں سے بات کرنے لگے۔ کوئی حضورؐ کی طرف اشارہ کرتا کہ یہ ہیں رسول اللہؐ۔ اور کچھ حضرت ابوبکرؓ کی طرف توجہ کر کے ادھر اشارہ کرتا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ منظر دیکھا تو سمجھ گئے کہ ان کو شناخت کرنے میں پس وپیش ہو رہا ہے۔ صدیقؓ کی حساس، نکتہ شناس اور زیرک طبیعت کو یہ تشابہ اور التباس گوارا نہ ہو سکا۔ فوراً اٹھے اور دھوپ سے بچانے کے بہانے حضورؐ پر اپنی قبا یا چادر کا سایہ کر دیا تاکہ لوگ شبہے میں نہ رہیں اور اچھی طرح ذرہ و آفتاب کا فرق اور قطرہ و دریا کا امتیاز معلوم کر لیں اور خادم و آقا کو الگ الگ پہچان لیں۔

بہ ظاہر یہی کہا جائے گا کہ شاید دونوں کے جسم پر زبیر بن عوام کے بخشے ہوئے ایک ہی رنگ کے لباس نے التباس پیدا کر دیا تھا اور سن وسال میں بھی زیادہ تفاوت نہ تھا اس لیے لوگوں کو امتیاز کرنے میں دشواری ہوئی ہوگی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ بات صرف اتنی ہی سی نہ تھی۔ ان دونوں کے جمالِ ظاہری میں بھی وہی فرق تھا جو ماہتاب اور ستاروں میں ہوتا ہے۔ لیکن یہاں التباس پیدا ہونے کی وجہ وہ صلہ تھا جو صدیقؓ کی خدمات کے عوض قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ خدا نے ثانی اثنین کہہ کر دونوں کو اتنا قریب کر دیا ہے کہ مشن کے لحاظ

سے دونوں کی حیثیت گویا یکساں ہوگئی ہے۔ ابوبکرؓ رسول نہ تھے مگر فنا فی الرسول ہونے میں تو شبہ ہی نہیں ہو سکتا۔ کسی شخصیت میں فنا ہونے کے بعد اس کے افکار ہی نہیں بلکہ رفتار و گفتار میں اور ہر ہر ادا میں اسی طرح کی یکسانی و ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے ظاہری جمال میں بھی اس کا مثنیٰ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ ثانی اثنین بھی اسی طرح کا مثنیٰ ہو گیا ہو اور لوگوں کو التباس پیدا ہو گیا ہو تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے:

یہ جو صورت ہے تری صورت جاناں ہے یہی
یہی نقشہ ہے، یہی رنگ ہے، ساماں ہے یہی

ع

من و تو نیست میان من و تو
شرک محض ست گمان من و تو

لمحۂ فکریہ

اس چھوٹے سے واقعے کو سیرت نگار یوں ہی مختصراً لکھ کر گزر جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ دو چار لفظوں میں جناب صدیقؓ کی نزاکتِ احساس اور جذبۂ فدویت کا ذکر کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جناب ابوبکرؓ نے اپنے اس طرزِ عمل سے جذبۂ تعلی اور شوقِ ہمسری کو کچل کر رکھ دیا اور ان کی نزاکتِ خیال نے ایک منٹ کے لیے بھی یہ گوارا نہ کیا کہ آقا کی موجودگی میں غلام کی طرف بھی کسی کا خیال جائے اور حقیقت شناسی میں کوئی اشتباہ پیدا ہو۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس چھوٹے سے واقعے سے خود حضورؐ کی زندگی کے ایک بڑے اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضورؐ نے اپنی نشست و برخاست میں، اپنے طرز بود و باند

میں، اپنی معاشی زندگی میں، اپنے لباس و پوشاک میں غرض کسی بات میں بھی اپنے آپ کو افرادِ امت سے نمایاں اور ممتاز رکھنے کی کوشش نہ فرمائی۔ خدا نے اور اس کی بخشی ہوئی فطرتِ سلیمہ نے جو امتیاز حضورؐ کو سارے عالم میں عطا کیا تھا وہ تو اپنی جگہ تھا۔ اسے کون مٹا سکتا تھا۔ لیکن خود حضورؐ نے اپنی طرف سے اپنے لیے ایسا کوئی نمایاں امتیاز قائم رکھنا پسند نہ فرمایا۔ نمائش اور تکلف سے حضورؐ ہمیشہ کوسوں دور رہے۔ مسلمانوں کی جان و مال کے مختارِ ناطق ہونے کے باوجود، مالِ غنیمت میں اپنا حصہ وہی لگایا جو دوسرے اسلامی سپاہیوں کا رکھا۔ اگر تین آدمیوں میں ایک سواری ہوئی تو پیدل چلنے، اور سواری پر چلنے کا خود بھی وہی تناسب رکھا جو دوسرے دو ساتھیوں کے حصے میں آیا۔ اگر تعمیرِ مسجد یا خندق کی کھدائی ہو رہی ہے تو خود بھی مزدور بن کر وہ سارے کام کرتے ہیں جو دوسرے جاں نثار کرتے ہیں۔ کھانا پکانے کی نوبت آتی ہے تو سہل کام دوسروں کے سپرد کرتے ہیں اور خود جنگل سے لکڑیاں لانے کا ذمہ لیتے ہیں۔ حتیٰ کہ... اگر کہیں کسی راستے سے گزر رہے ہیں تو اپنے ساتھی کو آگے کر دیتے اور خود پیچھے چلتے ـــ یہ واقعات اپنے اپنے موقعوں پر آئیں گے جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضورؐ نے اپنے لیے کوئی نمائشی امتیاز پسند نہیں فرمایا۔ ایک سچے لیڈر کی پہچان بھی یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بلند تر رکھنے کی کوشش نہ کرے (بجز نیکیوں کے) اور ایسے ہی لیڈر کے ساتھ اس کے متبعین کو عشق ہو سکتا ہے۔

حضورؐ جب کبھی اپنے جاں نثاروں کے مجمعے میں ہوتے تو نہ کبھی ممتاز قسم کا لباس زیبِ تن فرماتے نہ حضورؐ کے لیے کوئی الگ گدی اور تخت بچھایا جاتا۔ حضورؐ سب لوگوں میں گھُل مل کر عام انسانوں ہی کی طرح بیٹھتے تھے۔ یہ بے امتیازی ہی حضورؐ کا سب سے بڑا انسانی امتیاز تھی۔ اور اسی سادگی، بے تصنعی اور مساویانہ

ہم مجلسی کی وجہ سے باہر سے نئے آنے والوں کو شناخت میں دشواری پیدا ہوئی۔

علی مرتضیٰؓ کی آمد

یہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو مکے میں اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ لوگوں کی امانتیں واپس کر کے آجائیں۔ حضرت علیؓ نے تمام امانتیں ان کے مالکوں کو پہنچا دیں اور تین دن کے بعد خود تنہا روانہ ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب علیؓ پیدل ہی روانہ ہوئے تھے اور قبا میں حضورؐ ان ہی کا انتظار فرمانے کے لیے ٹھہر گئے تھے۔

مسجد قبا کی تعمیر

اس دوران میں ایک بڑا کام یہ ہوا کہ یہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی گئی جسے مسجد قبا کہتے ہیں۔ یہ سب سے پہلی مسجد ہے جو اسلام میں تعمیر ہوئی۔ دیکھنے میں یہ ایک معمولی جھونپڑے سے زیادہ نہ تھی لیکن اس مسجد کی رفعت و بلندی کا کون اندازہ کر سکتا ہے جس کے معمار نہ فقط یہ اولون سابقون مہاجر و انصار تھے بلکہ خود محمد رسول اللہ بھی اس کی تعمیر میں برابر کے شریک تھے۔ یہ سب اللہ کے ایسے مزدور ہیں جن کی مزدوری واجرہ ان اجری الا علی اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جہاں تمام جاں نثاران اسلام پتھر اور مٹی اٹھا رہے تھے وہاں انہی کی طرح حضورؐ بھی یہ سارے کام کر رہے تھے۔ جب حضورؐ کوئی پتھر اٹھاتے اور کوئی جاں نثار آکر عرض کرتا کہ حضورؐ تکلیف نہ فرمائیں مجھے دیدیں تو حضورؐ اس کی دلداری کے لیے وہ پتھر اسے

دیدیتے اور دوسرا ویسا ہی پتھر اٹھا لیتے۔ یہ وہی پہلی مسجد ہے جس کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم احق
ان تقوم فیہ، فیہ رجال یحبون ان یتطھروا
واللہ یحب المتطھرین — ۹:۱۰۸

اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت مسجد قبا کے بارے میں ہے یا مسجد نبوی کے بارے میں (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ احمد بن حنبل نے کئی سندوں سے نیز ترمذی، نسائی اور مسلم کی کئی روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے اس آیت کا مورد مسجد نبوی ہی کو قرار دیا ہے۔ اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ حضرت عمرؓ، عبداللہ بن عمرؓ، زید بن ثابتؓ، سعید بن مسیب بھی اسی کے قائل ہیں اور ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام مالک اور اصحاب مالک تو مسجد نبوی کو مسجد حرام سے بھی افضل بتاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ معمارِ کعبہ سیدنا ابراہیمؑ ہیں اور معمار مسجدِ مدینہ محمد رسول اللہ ہیں۔

لمحۂ فکریہ

راہنما اور لیڈر عموماً یہی کرتے ہیں کہ ایسے مواقع پر دور ہی دور رہا کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ایک بنیادی پتھر رکھ دیا یا ایک پھاوڑا چلا دیا اور الگ ہو گئے۔ کام دوسروں سے لیتے ہیں اور اس کا فائدہ (کریڈٹ) یا اعزاز خود حاصل کر لیتے ہیں اور اپنا امتیاز بہرحال باقی رکھتے ہیں۔ اس طرز عمل سے پیروؤں کی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق باقی رہتا ہے۔ حضورؐ کا سب سے بڑا مشن یہی تھا کہ شاہ و گدا، آقا و غلام، اعلیٰ و

ادنیٰ، اسود و احمر کا فرق و امتیاز مٹا دیا جائے اور جس مرحلے پر بھی موقع ملے اسی رنگ کی انسانی مساوات کا عملی درس دیا جائے۔ کسی کام یا پیشے کو ذلت کی نگاہ سے نہ دیکھا جائے اور لیڈر اپنے متبعین کے ساتھ کسی کام میں شرکت کرنے میں کوئی جھجک یا عار محسوس نہ کرے۔

جذبۂ امتیاز انسانی فطرت میں داخل ہے اس لیے حضورؐ نے اس کے لیے نئی قدریں بخشیں کہ کام چوری سے یا عوام سے الگ تھلگ اور ریزرو رہ کر متکبرانہ امتیاز قائم کرنا کوئی امتیاز نہیں۔ اگر امتیاز ہی قائم کرنا ہے تو گھل مل کر کام کاج میں برابر کے شریک رہو بلکہ حسن کارکردگی، محنت، ایثار، مساوات، دلداری اور دوسری اقدار میں اضافہ کر کے اپنے لیے امتیاز پیدا کرو۔ وہ امتیاز ہی کیا جو شاہانہ کروفر سے پیدا کیا جائے؟ امتیاز وہ ہے جو شانِ فقر سے، تواضع و انکسار سے، خدمت و ایثار سے اور ہمدردی و مساوات سے پیدا کیا جائے۔ اسی میں جذبۂ مسابقت کی بھی تسکین ہو جاتی ہے اور اسی سے خواہشِ امتیاز بھی اعلیٰ قدروں کے روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی جذبۂ مسابقت کی تسکین کے لیے فرمانِ الٰہی نے اس کا رُخ صحیح سمت میں موڑ کر یہ حکم دیا ہے کہ اگر تمہیں مسابقت ہی کرنی ہے تو اس جذبے کا صحیح استعمال یہ ہے کہ "خیر" میں اور تعمیر انسانیت کے کاموں میں مسابقت کرو فاستبقوا الخیرات (خیر کی طرف دوڑ لگاؤ)۔

محنت مزدوری کرنا کوئی عیب ہوتا تو حضورؐ خود اس میں کیوں شرکت فرماتے؟ حضورؐ نے اسے عبادت قرار دیا ہے۔ ایک انصاری صحابی نے حضورؐ سے مصافحہ فرمایا تو ان کی ہتھیلی حضورؐ کو کھردری نظر آئی اور گٹے جیسے نشان نظر آئے۔ حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ یہ نشان کیسے ہیں؟ عرض کیا کہ: یا رسول اللہؐ!

ہیں نعلبندی کا کام کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ یہ نشان اور کھردراپن اسی کی وجہ سے ہے۔" اس کے بعد جانتے ہیں کہ کیا ہوا؟ اللہ اکبر کبیراً حضورؐ نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور فرمایا:

ھذہ ید لا تمسھا النار ایسے ہاتھ کو آگ نہیں چھو سکتی۔

صحابہ میں کتنے بلند پایہ قسم کے لوگ موجود تھے۔ لیکن یہ شرف، جس سے بڑا اور کوئی شرف ممکن نہیں کس کے حصے میں آیا؟ ایک ایسے مزدور کے حصے میں جو محنت کر کے حلال روزی کماتا ہے؟ جو راہنمائے عالمؐ اعزاز و امتیاز کی یہ نئی قدریں عطا کر رہا ہو وہ آج مسجد قبا کی تعمیر میں اپنے جاں نثاروں کے ساتھ کیوں نہ شریک ہوتا۔

اسلام میں پہلا جمعہ

کم و بیش دو ہفتے قبا میں قیام فرمانے کے بعد حضورؐ یثرب کی طرف روانہ ہوئے۔ شمع رسالت کے ساتھ اس کے پروانے بھی تھے۔ جمعے کا دن تھا اور جب حضورؐ بنی سالم کی آبادی میں پہنچے تو وہاں جمعے کی نماز ادا فرمائی۔ یہ اسلام میں پہلی نماز جمعہ تھی اور اس موقعے پر حضورؐ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ بھی تاریخ اسلام کا پہلا خطبۂ جمعہ تھا۔ اختلاف الفاظ و رواۃ کے ساتھ تاریخ نے یہ خطبۂ نبوی اپنے سینے میں محفوظ کر لیا ہے۔ اس میں بڑی اعلیٰ اقدار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ہم بخوف طوالت اسے یہاں چھوڑتے ہیں۔ اس وقت کم و بیش ایک سو صحابہ شریک جمعہ تھے۔

لمحۂ فکریہ

یہاں پھر اس حقیقت کو سامنے لائیے جس کا ہم اوپر کئی جگہ ذکر کر چکے ہیں کہ پیغمبر کا ہر قدم ابتدا ہی سے صحیح سمت میں اٹھتا ہے۔ یہ کوئی ضرور نہیں کہ جب تک کوئی صریح حکم نہ آجائے اس وقت تک پیغمبر کوئی قدم ہی نہ اٹھائے۔ پیغمبر جہاں وحی کا انتظار کرتا ہے وہ انتظار ہی کا صحیح موقع ہوتا ہے ورنہ اس کی ذہنی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ ہر قدم صحیح اٹھے اور بعد میں وحی اس کی تائید و توثیق CONFIRM کرے۔ وحی کی ضرورت عموماً وہاں پڑتی ہے جہاں پیغمبر معاملے کی نزاکت کی وجہ سے خود فیصلہ کرنے کی بجائے انتظار وحی کرے یا اس کی نیک نیتی کے باوجود اس کے اقدام میں غلطی کا احتمال ہو۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو عموماً پیغمبری اقدام درست ہی ہوتا ہے اور وحی اس کی توثیق کر دیتی ہے۔

اسی حقیقت کی مثال ہے یہ نماز جمعہ جو پہلی بار بنی سالم بن عوف کی آبادی میں حضورؐ نے ادا فرمائی۔ یقیناً اس سے پہلے اجتماع جمعہ کے بارے میں کوئی قرآنی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ حضورؐ نے اس کا آغاز کسی حکمِ وحی کے بغیر ہی فرمایا تھا اور قرآن میں اس کا ذکر بہت بعد میں آیا۔ ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ ایسے بہت سے کام حضورؐ نے وحی خفی (یا وحی غیر متلو یا وحی غیر ملفوظ) کے تحت کیے یا اپنی عقل و بصیرت سے۔ جمعے کے خطبہ و نماز کے متعلق کوئی ایسی روایت نظروں سے نہیں گزری جس میں یہ ذکر ہو کہ: مجھے خدا نے یا جبریل نے اقامتِ جمعہ کا امر یا حکم دیا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ حضورؐ کا فیصلہ تھا جو قرآنی توثیق سے پہلے بھی واجب الاتباع تھا اور قرآنی توثیق کے بعد بھی۔ ہم اس سے

اور اس جیسے بہت سے واقعات سے صرف یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پیغمبر کا ہر قدم ابتدا ہی سے صحیح سمت میں اٹھتا ہے۔ نبوت کا مزاج یومِ پیدائش ہی سے الگ نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ ایک تخم ہوتا ہے جو اس کی روح میں ابتدا ہی سے پیوست ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ اس میں برگ و بار آتے رہتے ہیں۔

تاجدارِ مدینہ مدینے میں

نمازِ جمعہ کے بعد حضورؐ مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ اس شہر کا نام پہلے یثرب تھا۔ آج کے بعد سے اس کا نام مدینۃ الرسول ہو گیا جسے اختصار کے لیے "مدینہ" کہتے ہیں۔ لفظ مدینہ کے معنے شہر کے ہیں۔ حضورؐ کا یہ داخلہ عجیب پُرکیف اور روح پرور تھا۔ اس فقیرانہ استقبال کو ہزاروں شاہانہ استقبال ہمیشہ رشک کی نگاہوں سے دیکھتے رہیں گے۔ استقبال کے بہتیرے نظارے دنیا نے دیکھے ہیں اور دیکھتی رہے گی لیکن شیفتگی، عقیدت، عظمت، محبت، فدویت اور مخلصانہ پروانگی کا جو وجد آفرین نظارہ آج نظر آ رہا ہے اسے چشمِ کائنات نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔

حضورؐ ایک اونٹنی پر جلوہ افروز ہیں۔ پروانوں کا ہجوم ساتھ ہے۔ سارے خرد و کلاں اور شیخ و شاب دو رویہ کھڑے مطلوبِ کائنات کے جمال کا نظارہ کر رہے ہیں۔ مخدراتِ مدینہ چھتوں پر کھڑی دولتِ دیدار سمیٹ سمیٹ کر اپنی روح کو مطلع الانوار بنا رہی ہیں۔ آنکھیں فرشِ راہ ہو رہی ہیں:

زیرِ قدمت ہزار جان است

آ پیارے نینن میں پلک تو ہے موند لوں ناں میں دیکھوں اور کو نا تو ہے دیکھن دوں

ہر شخص ناقے کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ حضورؐ اسی کے گھر کو اپنے قیام سے رشکِ فردوس بنائیں۔ حضورؐ نے یہ کشمکش محسوس کر کے ارشاد فرمایا: اس ناقے کو چھوڑ دو۔ یہ قدرت کی طرف سے مامور ہے۔" مطلب یہ ہے کہ خدا اسے جہاں بٹھا دے گا وہیں کے قریب ترین گھر کو اپنی قیام گاہ بنا لوں گا۔ حضورؐ کے اس فیصلے کے بعد ترجیح بلا مرجح کا کوئی ایسا شائبہ نہ رہا جس کے نتیجے میں ایک کی دلداری اور باقی سب کی دل شکنی ہو۔

کبھی پروانوں کی بلند تکبیر و تسبیح کون و مکاں کو گرما دیتی اور کبھی حضورؐ کی جنبشِ لب پوری فضا پر سکون و سکوت طاری کر دیتی۔ اس وقت زبانِ رسالت پر یہ پُرتاثیر جملے ہوتے:

ایھا الناس! افشوا السلام واطعموا الطعام، وصلوا الارحام، وصلوا باللیل والناس نیام، تدخلوا الجنۃ بسلام۔	اے لوگو! اسلام کو پھیلاؤ (بھوکوں کو) کھانا کھلاؤ، صلۂ رحمی کرتے رہو اور راتوں کو جب لوگ سو رہے ہوں نماز (تہجد) ادا کرو (بس اتنی ہی باتوں پر عمل کرنے سے) تم سلامتی کے ساتھ داخلِ بہشت ہو جاؤ گے۔

ذرا ان چھوٹے چھوٹے جملوں پر بھی غور کیجیے۔ کسی جملے میں صرف دو لفظ ہیں۔ کسی میں تین اور کسی میں چار۔ بندوں کا تعلق خدا سے اور خدا کے دوسرے بندوں سے کیا اور کس نوعیت کا ہو، عمل کی دنیا میں اس کا بنیادی پتھر کیا ہے اور اس کے نتیجے میں کس طرح جنّت کی زندگی دنیا و آخرت میں نصیب ہوتی ہے؟ ان ساری معاشی و روحانی اقدار کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

تشریح ارشادات

افشوا السلام سے مراد محض السلام علیکم، وعلیکم السلام کہہ دینا نہیں بلکہ یہ دعاؤں کی شکل میں ایک ایسی عالمگیر آرزوؤں کا تبادلہ ہے جس کا عملی ظہور سارے عالم میں فساد کو دور کر کے ہر طرح کے امن اور سلامتی کا ضامن ہو۔

اطعموا الطعام کا یہ مطلب نہیں کہ مہاجرین کی خوب دعوتیں کرو، یا کبھی کبھی بھوکے سائل کو بھیک کے طور پر کچھ ٹکڑے دیدیا کرو۔ اس کا مقصد ایسا ہموار نظام معاش قائم کرنا ہے جو دنیا سے بھوک اور محتاجی کو ختم کر دے اور سب کے لیے آسودہ حالی کی فضا پیدا کر دے۔

صلوا الارحام سے یہ مقصد نہیں اپنے گھرانے، خاندان یا قبیلے کے قریب وبعید کے ساتھ صلۂ رحمی کا سلوک کر کے مطمئن ہو جاؤ بلکہ اس کا مقصد ایسی وسعت نظر اور ایسی بلند نگہی پیدا کرنا ہے کہ صلۂ رحمی کا یہ دائرہ پھیلتے پھیلتے سارے بنی آدم پر محیط ہو جائے۔ کیونکہ سارے انسان آدم وحوا کی اولاد ہیں اس لیے ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ یہی وسیع القلبی اُن تمام تعصبات کو ختم کر سکتی ہے جو وحدتِ انسانی کے درمیان حائل ہو کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

صلّوا باللیل والناس نیام سے مراد صرف اسی قدر نہیں کہ چند کلمات وحرکات ادا کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے بہت بڑا وظیفہ پورا کر لیا۔ محض "وظیفہ" نہیں۔ یہ وظیفۂ زندگی ہے اور خدا سے اپنا رابطہ قوی کرنے کی ایسی مشق ہے جو پوری زندگی پر پھیل جاتی ہے اور خدا کی مخلوق سے اپنا رابطہ قائم رکھتے وقت حدود اللہ کی نگہداشت پیش نظر ہو جاتی ہے۔

تدخلوا الجنة بسلام صرف اس جنّت کی ضمانت نہیں جو مرنے

کے بعد ہوتی ہے بلکہ یہ پورا پروگرام اسی دنیوی زندگی میں بھی جنتِ ارضی اور بہشت بہ کنار معاشرے کا ضامن ہے۔

گویا یہ چند بلیغ جملے سارے اسلامی مقاصد کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور اسلامی معاشرے کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو چھوٹ گیا ہو۔ اس تعلیم کا آغاز تو بہرحال ایک مختصر سے دائرے ہی میں محسوس شکل اختیار کرے گا لیکن مقصد اسے سارے زمان و مکان کے لیے ہمہ گیر صورت دینا ہے۔

عبداللہ بن سلام کا پہلا تاثر

اس جلوسِ پُر خلوص کا منظر دیکھنے کے لیے بہت سے غیر مسلم بھی آئے ہوئے تھے۔ انہی میں یہودیوں کے پیشوا (حبر) عبداللہ بن سلام بھی تھے جو ایک کھجور کے سائے میں کھڑے یہ پُر کیف نظارہ دیکھ رہے تھے۔ خطبۂ نبوی کے پہلے جملے میں لفظ سلام تھا (افشوا السلام) جو ایک طرف سارے عالم کے لیے سلامتی کا پیغام تھا تو دوسری طرف سلام کے فرزند عبداللہ کے دل میں پیوست ہوا جا رہا تھا۔ گویا عام تخاطب کے پردے میں فرزندِ سلام ہی کو مخاطب کیا جا رہا تھا۔ عبداللہ بن سلام غیر ارادی طور پر متاثر ہو رہے تھے۔ جب مسلمانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو بے اختیارانہ انداز سے عبداللہ بن سلام نے بھی زور سے اللہ اکبر کہا۔ ان کی والدہ یا پھوپھی (خالدہ بنت حارث) ان کے پاس کھڑی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ: تم تو اس طرح نعرہ لگا رہے ہو جیسے موسیٰؑ ہی تو آ گئے ہوں۔" عبداللہ نے کہا: ہاں ہاں بخدا یہ وہی ہے جس کی آمد کی خبر موسیٰ نے دی ہے۔ خدا کی قسم یہ نور جمال کسی جھوٹے کے چہرے پر نہیں ہو سکتا۔"

یہ عبداللہ کچھ دنوں کے بعد اسلام لے آئے جس کی دلچسپ تفصیل آگے آئے گی۔

استقبالی ترانے اور ان کی قدر افزائی

حضورؐ آگے بڑھے تو دیکھا کہ حبشی نوجوان ہتھیار لیے ہوئے فوجی رقص کے انداز سے اچھل کود کر رہے ہیں اور جوش و مستی کے ساتھ سب مل کر یہ ترانہ الاپ رہے ہیں:

محمد نبیؐ عبد صالح

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے نبی اور صالح بندے ہیں

اس سے آگے انصار کی عورتیں یہ استقبالی گیت گا رہی ہیں:

طلع البدر علینا — من ثنیات الوداع

وجب الشکر علینا — ما دعا للّٰہ داع

ایھا المبعوث فینا — جئت بالامر المطاع

۱۔ آج ہمارے ہاں وداع کے ٹیلوں سے چاند اُگا ہے۔

۲۔ جب تک دعا کرنے والا دعا کرتا رہے ہم پر اس نعمت کا شکر الٰہی واجب ہے۔

۳۔ اے وہ جو ہم میں مبعوث ہوا ہے تو واجب الاطاعت دین لے کر آیا ہے۔

اور آگے بڑھے تو دیکھا کہ معصوم لڑکیاں ہاتھوں میں دف لیے یہ ترانۂ استقبال الاپ رہی ہیں:

نحن جوار من بنی النجار

یا حبذا محمد من جار

ہم نجار کی لڑکیاں ہیں۔ خوشا نصیب کہ محمد رسول اللہ ہمارے پڑوسی ہو گئے ہیں۔

حضورؐ نے ان بچیوں سے سوال کیا کہ: کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ بچیوں نے جواب دیا: ہاں یا رسول اللہ۔ حضورؐ نے فرمایا: خدا گواہ ہے کہ میں بھی تم سے محبت رکھتا ہوں۔

لمحۂ فکریہ

حضورؐ نے ایسے کسی جذبے کی حمایت نہیں کی ہے جس میں مایوسی، شکستہ دلی پژمردگی کا شائبہ پایا جاتا ہو۔ حضورؐ نے ان اقدار کو ابھارا اور باقی رکھا ہے جن میں زندہ دلی، شگفتگی اور حسن و جمال کا کوئی پہلو موجود ہو۔ اسی لیے اسلام میں کوئی غم کی تقریب نہیں رکھی گئی ہے۔ اگر تقریب ہے تو وہ عیدین کی ہے۔ حضورؐ کی آمدِ مدینہ سے بڑی اور کون سی عید ہو سکتی تھی؟ اس عید کا اظہار جس جس طرح بھی کیا گیا ہے اسے حضورؐ نے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور اس کی قدر افزائی فرمائی ہے خواہ وہ فوجی اچھل کود کی شکل میں ہو یا اشعار کی شکل میں۔ ترانۂ جوش کی صورت میں ہو یا غنائی شاہکار کی صورت میں۔ مزامیر کے ساتھ ہو یا بلا مزامیر ہو۔ حضورؐ کی نظر نہ ان چیزوں کی ظاہری شکل و صورت پر تھی نہ حضورؐ ان کے فن کی داد دے رہے تھے۔ حضورؐ صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جذبات کی نوعیت کیا ہے اور نیت کیا ہے؟ نیز اظہارِ جذبات کے ان اندازوں میں زندگی کی شگفتگی پیدا ہو رہی ہے یا پژمردگی؟ یہی انداز نوحوں میں بھی ہوتا ہے لیکن اسے حضورؐ نے روک دیا۔ بخلاف اس کے عید یا شادی یا اظہارِ مسرت کے دوسرے مواقع پر گانے بجانے کی کوئی ممانعت نہ فرمائی بلکہ متعدد مواقع پر یا

تائید فرمائی یا تاکید۔ اظہارِ خوشنودی فرمایا، یا کم از کم خاموشی اختیار فرمائی مقصد نہ غنا کی تائید تھی نہ تردید۔ نظر صرف محلِ استعمال پر تھی یا مصرف و نیت پر۔ حضورؐ کا مدینے میں داخل ہونا ایک موقع تھا عید و مسرت کا، اظہارِ محبت و عقیدت کا اور روح کی تازگی اور دل کی شگفتگی کا۔ اس کا جس انداز سے بھی اظہار کیا گیا اس کی حضورؐ نے قدر افزائی فرمائی۔ اگر یہی چیزیں غلط محل پر استعمال ہو رہی ہوتیں یا ان کا مقصد اور ان کے جذبہ و نیت کا رُخ غلط ہوتا تو حضورؐ اسی وقت اسے روک دیتے۔

موسیقیت صرف عربوں ہی میں نہ تھی۔ حسنِ صُورت سے دلچسپی انسانی فطرت میں داخل ہے۔ اور وحشی قوموں تک میں یہ ذوق پایا جاتا ہے۔ ایسی فطری چیز کو اسلام جیسا دینِ فطرت کبھی ممنوع قرار نہیں دے سکتا۔ مگر دوسرے فطری جذبات کی طرح اس کی بھی حدود ضرور قائم کرتا ہے۔ یہ اس وقت میرا موضوع سخن نہیں۔ (تفصیلات کے لیے میری کتاب "اسلام اور موسیقی" دیکھیے)

ابو ایوبؓ انصاری کی قسمت بیدار

حضورؐ کی سواری اسی درویشانہ کروفر کے ساتھ جا رہی تھی اور ہر شخص اس انتظار میں تھا کہ دیکھیں یہ ناقہ کہاں جا کر از خود ٹھہرتا ہے۔ یہ ناقہ چلتے چلتے خود ایک جگہ رُکا اور بیٹھ گیا۔ حضورؐ وہاں اُتر پڑے اور فرمایا: یہی جگہ میرا مدفن بھی ہوگی۔ پھر معلوم ہوا کہ یہاں سے قریب ترین گھر ابو ایوبؓ انصاری کا ہے۔ اس لیے حضورؐ وہیں فروکش ہو گئے۔ یہ مکان دو منزلہ تھا۔ ملنے والوں کی سہولت کے

خیال سے حضورؐ نے نچلی منزل کو پسند فرمایا۔ ابوایوبؓ کے لیے یہ ایک بڑی کشمکش کا موقع تھا۔ ادب کا تقاضا یہ تھا کہ حضورؐ نیچے نہ ہوں اور حضورؐ کی خواہش کا احترام یہ تھا کہ ابوایوبؓ اوپر ہی رہیں۔ یہاں الامر فوق الادب کا اقتضا غالب آیا اور ابوایوب اپنے بال بچوں سمیت اوپر کی منزل میں چلے گئے۔ ٹھیک ہے جڑ نیچے اور شاخیں اوپر ہی ہوتی ہیں۔ لیکن بیہقی کی روایت کے مطابق ابوایوب اس شب کو کنارے کہیں پڑ رہے اور دوسرے دن باصرار حضورؐ کو اوپر کی منزل میں پہنچا دیا۔ واللہ اعلم۔

حقِ میزبانی

دنیا میں نہ کبھی ایسا مہمان ہوا نہ ایسا میزبان۔ ابوایوبؓ دونوں وقت حضورؐ کے لیے کھانا لاتے اور اس وقت تک ان کے ہاں کوئی نہ کھاتا جب تک حضورؐ نہ کھا لیتے۔ جب حضورؐ کھا چکتے تو حضورؐ کا پس خوردہ یہ واپس لے جاتے اور یہ مع اپنی بیوی کے وہی پس خوردہ کھاتے۔ کھانے میں جس جگہ حضورؐ کی انگشتِ مبارک کا نشان ہوتا یہ بھی وہیں حصولِ برکت کے لیے اپنی انگلیاں لگا کر شروع کرتے۔ جو شخص نشانِ انگشت کا اتنا خیال رکھتا ہو وہ نقشِ قدم پر کیوں نہ چلتا ہو گا۔

ایک بار اوپر پانی کا گھڑا ٹوٹ گیا اور قبل اس کے کہ یہ پانی حضورؐ کی طرف نیچے گرے ابوایوبؓ نے فوراً اپنا لحاف وغیرہ ڈال کر سارا پانی جذب کر لیا۔ مہمان نوازی کا یہ انوکھا انداز اور کہاں مل سکتا ہے؟ اگر بیہقی کی روایت صحیح ہے تو یہ واقعہ حضورؐ کے بالائی منزل میں منتقل ہونے سے پہلے کا ہو گا۔ اور ابوایوبؓ سے گھبراہٹ میں گھڑا ٹوٹ گیا ہو گا۔ کیونکہ حضورؐ کے نیچے ہونے کا احساس

ان کے دماغ کو پریشان کر رہا تھا۔

حضورؐ نے یہاں سات ماہ قیام فرمایا اور ازواجِ مطہرات (یعنی حضرت سودہؓ اور حضرت عائشہؓ) کے حجرے بننے کے بعد حضورؐ یہاں سے منتقل ہوئے۔ حضورؐ نے یہیں سے زید بن حارثہ اور ابورافع کو دو اونٹ دے کر کے بھیجا جو حضورؐ کی دو صاحبزادیوں (حضرت فاطمہؓ اور حضرت ام کلثومؓ) اور ام المومنین سودہ بنت زمعہؓ اور اسامہ بن زیدؓ اور ان کی والدہ ام ایمن کو لے آئے۔ ساتھ ہی جناب ابوبکرؓ نے اپنے صاحبزادے عبداللہؓ کو بھیجا تھا جو خاندان صدیقؓ کو (جن میں حضرت عائشہؓ بھی تھیں) جا کر لے آئے۔ حضورؐ کی ایک صاحبزادی رقیہؓ تو حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبشے میں تھیں اور دوسری حضرت زینبؓ تھیں جن کو ان کے شوہر ابوالعاص بن ربیع نے روک لیا تھا۔ یہ ابوالعاص ابھی تک اسلام نہ لائے تھے۔

سنہ ۱ھ

قیامِ ریاست

ہجرت کے بعد اسلام نے ایک نئی کروٹ لی اور مسلمان قوم کی زندگی نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ مدینے میں آنے کے بعد اسلامی ریاست کی بھی بنیاد پڑ گئی۔ حکومت کا قیام یا ریاست کی تعمیر اسلام کا کوئی مقصود نہیں۔ اسلام صرف ایک ایسا مثالی قسم کا صالح معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ جنگ کوئی مقصودِ اسلام نہیں۔

مقصود امن ہے لیکن لبسا اوقات امن کا قیام جنگ ہی پر موقوف ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے۔ مقصود امن اور رفع جنگ ہو تو ابتدا سے رجحان صحیح ہوتا ہے۔ اس وقت جنگ کے بہانے نہیں تلاش کیے جاتے بلکہ اسے ٹالنے کے حیلے تلاش کیے جاتے ہیں۔ گویا جنگ کی نہیں جاتی بلکہ مجبوراً جنگ ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی شکل حکومت کی ہے۔ یہ قائم کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ یہ قائم ہو جاتی ہے۔ مقصود اس کا قیام نہیں بلکہ اسے ختم کرنا ہے اور اس کی بجائے ایک ایسا ہموار معاشرہ قائم کرنا جس میں حکومت کا وجود ہی ختم ہو جائے لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کی ضد و نقیض سے کام لینا پڑتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح امن کا مقصد حاصل کرنے کے لیے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ اصلی قدر جس طرح امن ہے نہ کہ جنگ۔ (والصلح خیر) اسی طرح معاشرے کی حقیقی اقدار حکومت انسانی کا خاتمہ ہے نہ کہ حکومت کا قیام (ﷲ ملك السمٰوٰت والارض) اس مضمون پر تفصیلی بحث "اجتہادی مسائل" میں کی گئی ہے۔

بہر حال مدنی زندگی میں اسٹیٹ یا ریاست کی بنیاد پڑ گئی جو حکومت سے بہت وسیع تر مفہوم رکھتی ہے اور نظامِ حکومت اس کا ایک ادنیٰ سا جز ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سلہ ہی سے اس معاشرتی نظام میں ریاستی انداز پیدا ہو گیا جس میں آگے چل کر نظامِ حکومت کا رنگ بھی مجبوراً آ گیا اگرچہ حکومت مقصود نہ تھی۔

مواخات

ایک مملکت یا ریاست کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دائرے میں رہنے والے افراد کی معاشی زندگی ٹھیک کرے اور اس کی بنیادی مادی ضروریات پوری کرے۔ حضورؐ کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرینؓ کی

معاشی زندگی کا تھا جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر مدینے چلے آئے تھے۔ حضورؐ نے اس گتھی کو نہایت حکیمانہ انداز سے یوں سلجھایا کہ مہاجرین و انصار کو بلا کر انصار سے فرمایا کہ: تم میں سے ہر ایک شخص ایک مہاجر کو لے لے اور اپنے بھائی کی طرح اس کی کفالت کا ذمے دار ہو۔" انصار نے اس تجویز کو بڑی خندہ پیشانی و مسرت کے ساتھ تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضورؐ ایک مہاجر اور ایک انصار کو بلا کر مواخات یعنی بھائی چارہ کراتے گئے۔ اس طرح کم و بیش پچاس مہاجرین کی مواخات انصار سے کرائی گئی۔ جنہیں وہ لے کر خوشی خوشی اپنے گھر رخصت ہوئے۔

مواخات کا عجیب عملی نمونہ

مہاجرین کو ان انصار نے اپنے حقیقی بھائیوں سے زیادہ محبت و عزت کے ساتھ رکھا۔ ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو گھر لے جاتا۔ رہنے کو مکان دیتا یا زمین پیش کر دیتا۔ گھر کے اسباب تک میں برابر کا شریک کر لیتا۔ مگر اکثر مہاجرین ایسے تھے جنہوں نے ضرورت سے زیادہ کوئی عطیہ قبول نہ کیا۔

انصار کی فراخدلانہ محبت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ عبدالرحمٰن بن عوف کی مواخات سعد بن ربیع انصاری سے ہوئی تھی۔ یہ عبدالرحمٰن کو اپنے گھر لے گئے۔ اور کہا کہ: ان تمام مال و اسباب میں آدھا آپ کا ہے وہ لے لیجیے اور سنیے میری دو بیویاں ہیں۔ آپ جس کو پسند کریں اسے میں طلاق دے دوں گا اس سے آپ نکاح کر لیجیے"۔۔۔۔ حضرت عبدالرحمٰن نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ: آپ کے مال و عیال میں اللہ برکت دے۔ مجھے تو بازار کا راستہ بتا دیجیے۔"

انہوں نے تجارتی کاروبار شروع کیا اور اس میں اللہ نے اتنی برکت دی کہ مٹی سے سونا پیدا کرنے لگے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مال کا آٹھواں حصہ چار

بیویوں پر تقسیم کیا گیا تو ہر ایک کو اسّی اسّی ہزار درہم ملے (صاحب اولاد میت کی بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے)۔ علاوہ ازیں ان کے ترکے میں سونا اتنا تھا کہ اسے کلہاڑوں سے کاٹنے والوں کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے تھے۔

مواخاتِ علیؓ کی روایت

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی مواخات کسی سے نہیں کرائی گئی تھی۔ آپ نے گلہ کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ:

انت اخی فی الدنیا والاٰخرۃ — تم تو دونوں جہان میں میرے بھائی ہو۔

جناب علیؓ کے اخوالرسول فی الدنیا والآخرہ ہونے میں شک ہی کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس موقعے پر جب کہ ایک مہاجر اور ایک انصار کے درمیان مواخات ہو رہی ہے یہ روایت کچھ چسپاں معلوم نہیں ہوتی۔ یہ مواخات صرف ایک معاشی مسئلہ تھا تا کہ ہر انصاری ایک بے سر و سامان مہاجر کی کفالت کا ذمے دار ہو جائے ان میں سے کچھ مہاجرین ایسے بھی تھے جن کی کسی انصاری سے مواخات ہی نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ خود حضورؐ کی بھی کسی سے مواخات نہیں ہوئی تھی۔ اگر جناب علیؓ کی بھی کسی انصاری سے مواخات نہ ہوئی ہو تو اس میں کونسا محلِ استعجاب ہے؟ آپ کے کفیل تو خود حضورؐ تھے اس لیے کسی سے مواخات کی ضرورت نہ سمجھی ہو گی۔ لیکن اگر واقعی حضرت علیؓ کو اپنی مواخات نہ ہونے کا کوئی گلہ ہوا ہو گا تو اس مواخات کو انصار میں تلاش کرنا زیادہ بہتر ہے۔ حضرت سہل بن حنیف کے تذکرے میں ابن حجر نے لکھا ہے کہ انہی سے حضرت علیؓ کی مواخات ہوئی تھی۔ اور یہی قرینِ قیاس ہے کیونکہ مہاجر کی مہاجر سے مواخات قابل غور ہو جاتی ہے۔ اور سہل بن حنیف سے حضرت علیؓ کی مواخات کچھ مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔

مسجد نبوی کی تعمیر

جس جگہ حضورؐ کا ناقہ جاکر بیٹھ گیا تھا وہ قطعۂ زمین دو یتیم بچوں کا تھا جن کے نام سہل اور سہیل تھے۔ حضورؐ نے اسی قطعے میں مسجد تعمیر کرنے کا ارادہ فرمایا۔ سہل و سہیل نے یہ قطعۂ زمین اپنی طرف سے پیش کیا مگر حضورؐ نے گوارا نہ کیا اور انہیں اس کی پوری قیمت لینے پر آمادہ کر لیا۔ جناب صدیقؓ نے یہ قیمت ادا کی۔ زمین پر کچھ قبورِ مشرکین بھی تھیں اور چند کھجور کے درخت بھی۔ زمین ہموار کرنے کے بعد تعمیر شروع ہوئی۔

اسلامی تاریخ کی سب سے پہلی مسجد تو قبا میں تعمیر ہوئی تھی جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ یہ تعمیر کچھ اس سے بھی زیادہ روح پرور کیف کے ساتھ ہوئی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسی سے ملے ہوئے ایک گوشے کو مدفنِ رسولؐ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی میں حضورؐ اور صحابہؓ نے سب سے زیادہ نمازیں ادا کیں اور اسی میں بیٹھ کر دنیا اور اقوامِ عالم کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے۔

اس خانۂ خدا کے شرف و عزت کا کیا ٹھکانا ہے جس کے معمار خود حضورؐ اور مہاجرین و انصار ہوں۔ اینٹ پتھر اور مٹی اٹھانے میں حضورؐ سارے جاں نثاروں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ حتیٰ کہ رجز الاپنے میں بھی حضورؐ سب کا ساتھ دے رہے تھے۔ حضورؐ اور صحابہ اس وقت یہ رجز پڑھ رہے تھے:

لاھم ان الخیر خیر الآخرۃ

فاغفر الانصار والمہاجرہ

خدا وندا خیر تو بس آخرت کی ہی خیر ہے لہٰذا تو انصار و مہاجرین کی مغفرت فرما

(کہ انہیں بھی یہ نعمت حاصل ہو)

(مختلف روایتوں میں یہ شعر مختلف الفاظ سے آئے ہیں۔ ایک روایت میں خیر کی بجائے دونوں جگہ عیش یعنی زندگی ہے)۔

اس کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں۔ ستون کھجور کے تنوں کے تھے اور چھت پر کھجور کے پتے ڈالے گئے تھے۔ اس کا رخ پہلے بیت المقدس کی طرف تھا کیونکہ ابھی تک اہلِ اسلام کا قبلہ اُدھر ہی تھا۔

اصحابِ صُفّہ

صحنِ مسجد میں ایک صُفّہ (چبوترا) بھی تھا جس پر اسی طرح کے ستون اور سایہ تھا۔ یہ ان لوگوں کے لیے تھا جو بے گھر تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد کچھ لوگ تو وہ ہوتے تھے جو پہلے ہی سے بے گھر تھے اور کچھ وہ لوگ تھے جو باہر سے تعلیمِ دین کے لیے آتے تھے اور یہاں مدینے میں ان کے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہ تھی اور کوئی معاشی سہارا بھی نہ تھا۔ حضرت ابوہریرہؓ بھی جو احادیث کے سب سے بڑے داعی ہیں انہی اصحابِ صفہ کے ایک فرد ہیں۔ حضورؐ کو ان بے گھر اور بے مایہ اصحابِ صُفہ کا بے حد خیال رہتا ہے۔ جب حضورؐ کے پاس کچھ کھانا وغیرہ آتا تو حضورؐ پہلے انہی کو بھیجتے۔ یہ عجیب درویش صفت لوگ تھے جو اسلام کے معاشی نظام کی رُوح سے محض واقف ہی نہ تھے بلکہ اس پر عامل بھی تھے۔ ان میں جب کوئی شخص محنت مزدوری کر کے کچھ لاتا تو اس میں اپنے ان سب بھائیوں کو شریک کرتا:

نیم نانے گر خورد مردِ خدائے — بذلِ درویشاں کند نیمے دگر

پر ان کا پورا پورا عمل تھا۔ یہ لوگ کاروبار میں انہماک نہ رکھتے تھے۔ قربِ نبوی اور تعلیمِ دین کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ حضورؐ کی اس سے بڑی خوشی کوئی نہ تھی کہ ان میں جو

شخص بھی کچھ کمائے وہ اس میں اپنے سب بھائیوں کو شریک کرے۔ مسند احمد میں ایک روایت حضرت علیؓ سے ہے کہ:

اہل صفہ میں ایک شخص دو دینار یا دو درہم چھوڑ کر مرا تو حضورؐ نے فرمایا کہ: اس قدر اس نے جمع کر رکھا تھا؟ جاؤ تم لوگ جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھ لو (میں نہیں پڑھتا)۔ ریاض السنۃ ص ۵۳۳

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی نظام اور قناعت میں حضورؐ ان لوگوں کو نمونہ اور آئیڈیل بنانا چاہتے تھے اور یہ پسند نہ فرماتے تھے کہ تعلیم دین اور درویشی کو مفت خوری اور جمع مال کا بہانہ بنائے۔ دینی اقدار کے فہم میں جب اختلاط پیدا ہوا تو یہی سمجھا جانے لگا کہ اصحاب صفہ کے توکل کا مطلب ہے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا، محنت مزدوری سے جی چرانا اور دوسروں کی کمائی پر مفت خورانہ گزارا کرنا اور اس عجیب توکل کو دولت جمع کرنے کا بہانہ بنانا۔ اگر کوئی شخص اصحاب صفہ بننا چاہتا ہے تو اسے خدمت دین کے لیے وقف ہونا چاہیے اور محنت مزدوری سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ پھر جو مزدوری حاصل ہو اس میں ان لوگوں کو شریک بھی کر لینا چاہیے جنہیں باوجود کوشش کے مزدوری نہ مل سکی ہو اور اپنے پاس کوئی جمع پونجی نہ رکھنی چاہیے۔

حجرات اہل بیت

اس وقت تک حضورؐ کے نکاح میں یا تو حضرت سودہؓ تھیں یا حضرت عائشہؓ (ان کی ابھی تک رخصتی نہ ہوئی تھی)۔ اس مسجد کے متصل ہی صرف دو حجرے بنائے

گئے۔ باقی حجرات بعد میں بنتے گئے۔ یہ دونوں حجرے بھی کچی اینٹوں کے تھے اور چھتیں کھجور کے پتوں کی۔ ان کمروں کی دیواریں کھجور کی چٹائیوں کی تھیں۔ یہ کاشانہائے نبوتؐ چھ سات ہاتھ چوڑے اور دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھتوں کی اونچائی اتنی تھی کہ کھڑا ہونے والا اپنا ہاتھ اٹھا کر چھو لے۔ دروازوں پر کواڑ کی بجائے کملی پردے آویزاں رہتے۔

اذان

کچھ دنوں تک اس مسجد میں نماز یوں ادا ہوتی رہی کہ لوگ وقت کا اندازہ کر کے آجاتے لیکن اس طرح جماعت کا نظام پورا نہ ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح تمام لوگوں کو جماعت نہ ملتی ہوگی اور لوگ متفرق جماعتوں سے یا انفرادی طور پر نماز ادا کر کے واپس جاتے ہوں گے۔ یہ صورتِ حال حضورؐ کو پسند نہ آئی۔ اجتماعی روح، وحدتِ امت، ڈسپلن، مساواتی یکسانی، طاعتِ امیر، پابندی وقت اور ایک آواز پر یکجا ہونے کی تربیت وغیرہ ان تمام اقدار کا تقاضا نماز باجماعت ہی میں پورا ہوتا ہے اور یہ جب ہی ممکن تھا کہ تمام اہل ایمان ایک اجتماعی رنگ میں ایک وقت پر یکجا ہوں اور اقدار انسانی کو بلند کرنے کے لیے اپنی ساری منتشر قوتوں کو ایک جگہ مرتکز کرنے کی عادت ڈالیں۔ حضورؐ نے اس مقصد کے لیے مشورہ فرمایا تو لوگوں نے بہت سے مشورے دیے۔ مثلاً ناقوس بجانا، آگ روشن کرنا وغیرہ لیکن حضورؐ نے پسند نہ فرمایا۔ آخر خود حضورؐ کو اور بعض دیگر صحابہ مثلاً عبداللہ بن زیدؓ اور عمر بن خطابؓ وغیرہ کو خواب میں اذان کی آواز سنائی دی اور حضورؐ نے

اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنایا۔

اجتماعی عبادت کے لیے اذان سے بہتر اور کوئی بلاوا ممکن نہیں۔ اس میں جو خوبیاں ہیں وہ نہ ناقوس میں آسکتی ہیں نہ گھنٹے میں، نہ آگ روشن کرنے میں ہوسکتی ہیں نہ کسی اور طریقے میں۔

۱۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اذان ہر آبادی و ویرانہ میں، ہر سفر و حضر میں سہل العمل اعلان ہے۔ کوئی چیز ساتھ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ایک ہلکا پھلکا آدمی کسی ساز و سامان کے بغیر ہر جگہ یہ اعلان بڑی خوبی سے کرسکتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ کسی اور طریقۂ اعلان میں اس مشن کی دعوت نہیں اور اذان صرف بلاوا ہی نہیں بلکہ ایک تبلیغی دعوت بھی ہے اور اپنے مشن کا پنجوقتہ اعلان بھی۔ اس کے چند جملوں میں پورا اسلامی نظریۂ زلیست سمٹا ہوا ہے جس کی بار بار یاد دہانی ہوتی ہے۔

۳۔ اہلِ اسلام ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم کے لیے یہی کلمۂ جامعہ ہے۔ دنیا کے لیے اس کے سوا اور کوئی نقطۂ وحدتِ انسانی ممکن نہیں۔ اور مسلمان مختلف ٹکڑیوں میں اس وقت منقسم ہو کر فرقے بندی کا شکار ہوا جب اس نے اذان میں نیا اضافہ کر لیا۔ اذان وہی صحیح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بلالؓ اور دوسرے مؤذن دیتے رہے اور امت میں تفریق اس وقت سے شروع ہوئی جب اس میں نیا اضافہ کیا گیا۔ جو اضافہ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت علیؓ تک کی خلافتِ راشدہ میں نہ کیا گیا بلکہ عرصۂ دراز تک کسی نے اس کی جرأت نہ کی وہ معلوم نہیں کب اور کیوں گوارا کر لیا گیا۔

یہودیوں سے معاہدہ

تاریخ اسلام کا ایک بہت بڑا واقعہ وہ معاہدہ ہے جو حضورؐ نے یہود مدینہ سے اسی ۱ھ میں کیا ہے۔ یہ بڑا اہم واقعہ اس لیے ہے کہ:

۱- ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پڑنے کی نشان دہی اسی معاہدے سے ہوتی ہے ورنہ یوں تو قبائل آپس میں مختلف معاہدے کر ہی لیا کرتے تھے۔ ان قبائل میں سب سے بڑا معاہدہ محالفہ ہوا کرتا تھا۔ یعنی باہم حلیف بن جانا اور اس کی رو سے محالفہ کرنے والے قبائل زندگی کے سرد و گرم میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ مگر حضورؐ نے جو معاہدہ یہودیوں سے کیا اس کے خدوخال وہ نہیں جو دو قبیلوں کے درمیان محالفے کے ہوتے ہیں بلکہ یہ معاہدہ اس نوعیت کا ہے جو دو قوموں کے درمیان ہوتا ہے اور سیاسی بنیاد پر ہوتا ہے بغیر اس کے کہ دینی زندگی کو مجروح کیا جائے۔

۲- یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو بین الاقوامی معاہدوں کی اساس ہے۔ آئندہ کے تمام معاہدے بھی اسی نوعیت کے ہیں۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ اسی معاہدے میں دوسرے قبائل بھی شریک ہو گئے۔

۳- اس معاہدے میں بڑی اعلیٰ اقدار ہیں۔ اس میں عمیق سیاست و حکمت کارفرما ہے لیکن ابلیسی سیاست نہیں بلکہ مسلمان قوم کے لیے مستقبل کے تمام معاہدں میں روشنی کے مینار کا کام دیتی رہی اور دنیا کو پہلی بار درس ملا کہ احترام انسانیت کی بنیاد پر اعلیٰ مقاصد کو بروئے کار لانے میں کس طرح تعاون کیا جاتا ہے اور دوسری قوموں کو مذہب و ضمیر کی کتنی فراخدلانہ آزادی دی جاتی ہے۔

۴۔ فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ اس معاہدے میں یہ حقیقت بھی مستور ہے کہ دین جبر سے نہیں پھیلایا جاتا اور دوسرے انسانوں سے مذہب کی بنیاد پر اتنی نفرت وعصبیت نہ برتنی چاہیے کہ اعلیٰ اقدار میں تعاون نہ ہو سکے۔ مذہب کا مقصد ہی اعلیٰ اقدارِ انسانی کا قیام ہے۔ اور تنگ دلانہ تعصب و تفریق کوئی اعلیٰ قدر نہیں۔ اگر مذہب محض رسم ہے تو بے معنی ہے اور اگر انسانی قدروں کا قیام مقصود ہو تو مذہبی تعصب دور ہو کر باہمی قرب پیدا ہو سکتا ہے جس کا آخری نتیجہ وحدتِ انسانی ہے۔ جب مقصد اعلیٰ ہو تو چھوٹے چھوٹے اختلافات دور ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور اس کے بعد اگر فراخ دلی اور رواداری ہو تو بڑے اختلافات بھی دور ہو جاتے ہیں اور قبولِ حق میں روایاتی تعصب حائل نہیں ہوتا۔

غرض یہ معاہدہ ہر لحاظ سے بڑا اہم اور بنیادی ہے اور اپنے اندر بڑے دوررس اثرات رکھتا ہے۔ اب ذرا ان دفعات کو دیکھیے جو اس کے اندر رکھی گئی تھیں:

دفعاتِ معاہدہ

مختلف روایات میں معاہدے کے مختلف الفاظ ہیں۔ ان سب کو ملا کر ہم نمبروار اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں:

۱۔ یہود (بنی عوف) اور مسلمان ایک ہی امت شمار ہوں گے۔

۲۔ یہود کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔

۳۔ یہود اور مسلمان ایک دوسرے کے دوست رہیں گے اور کسی تیسرے حملہ آور کے مقابلے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

۴۔ دونوں کے درمیان خیر سگالی اور خیر خواہی کے تعلقات ہوں گے مگر صرف نیکی میں نہ کہ بدی میں۔

۵۔ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کے دوست کو دوست اور دوسرے کے دشمن کو دشمن سمجھے گا۔

۶۔ قریش کو کوئی امان نہ دے گا۔

۷۔ مظلوم کی حمایت کی جائے گی۔

۸۔ مدینے میں کشت و خون سب پر حرام ہوگا۔

۹۔ خوں بہا اور فدیے کا قدیم دستور باقی رہے گا۔

۱۰۔ ایک فریق کی صلح جو دشمن سے ہو دوسرے فریق کی صلح متصور ہوگی۔ صرف دینی جنگ اس سے مستثنیٰ ہوگی۔

۱۱۔ ہر اختلافی معاملہ جو اس معاہدے سے متعلق ہو اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کے سامنے پیش ہوگا۔

اس معاہدے میں حضورؐ نے تمام دوسرے قبائل یہود وغیر یہود کو بھی شریک کر لیا۔ اس کی مزید توسیع کے لیے حضورؐ نے باہر کے بھی دورے کیے۔ ودّان پہنچ کر بنی حمزہ کو، رضویٰ جا کر اہل جبل بواط کو اور ذوی العشیرہ میں بنی مدلج کو بھی اس معاہدے میں شریک کر لیا۔

اس معاہدے میں جو خاص فوائد مد نظر تھے وہ یہ تھے:

۱۔ عرب قبائل باہمی خونریزی کے عادی تھے۔ وہ اس معاہدے کی وجہ سے آپس میں کچھ ایسے گتھ گئے کہ معمولی معمولی باتوں پر فساد و خونریزی سے باز رہنے پر مجبور سے ہو گئے کیونکہ اس معاہدے کی رو سے سب ہی گویا ایک دوسرے کے حلیف ہو گئے۔

۲- مدینہ بھی اس معاہدے سے حرم ہو گیا۔ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے۔ قرآن نے تو صرف مکّے کے ایک خاص حصۂ زمین کو حرام قرار دیا ہے۔ مدینے کے حرم ہونے پر کوئی قرآنی نص نہیں۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ایک مسجد بننے کے معنی یہ نہیں کہ وہی عبادت گاہ ہے بلکہ جعلت لی الارض طهورا و مسجدا (میرے لیے ساری زمین ہی مطہر اور سجدہ گاہ بنائی گئی ہے (حدیث) یعنی انسانی اقدار کا جو احترام مسجد میں ہوتا ہے اسے مسجد سے باہر بھی وسیع کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ سارے عبادت گزاروں کے لیے یکساں مشترک ملکیت ہے تو اسی طرح ساری زمین بھی تمام بنی آدم کے لیے ذریعۂ انتفاع ہے۔ بس یہی شکل حرم کی بھی ہے۔ مسجد حرام میں خونریزی ممنوع ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے باہر ضرور خونریزی کی جائے بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ اس مرکز تربیت سے باہر بھی ایسی فضا پیدا کرو کہ خونریزی بند ہو جائے۔ اس مقصد کی طرف حضورؐ نے یہ پہلا قدم بڑھایا کہ حدود مدینہ کو بھی حرم قرار دیا۔ اس میں صرف مسلمانوں ہی کا فائدہ نہ تھا بلکہ مدینے سے تعلق رکھنے والے تمام انسانوں کا بھلا تھا۔

۳- ایک بڑا فائدہ اس معاہدے سے یہ بھی ہوا کہ آئندہ پیش آنے والا ایک بڑا خطرہ کمزور پڑ گیا۔ حضورؐ کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ قریش کی حد سے بڑھی ہوئی عداوت تین سو میل دور آنے کے بعد بھی چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔ لہٰذا اس معاہدے کی رو سے قریش کی ممکن الوقوع سازشوں کا بڑی حد تک سدباب ہو گیا۔

۴- پھر اس معاہدے میں سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ ایک سیاسی معاہدے کی بنیاد اخلاقی قدروں پر رکھی گئی ہے جو اصل مقصود ہے۔ مثلاً دیکھیے:

ایک اعلیٰ مقصد کے لیے مذہبی اختلافات کو برطرف رکھ کر اتحادِ عمل کا ایک

اعلیٰ نمونہ ہے۔ بلکہ یہ دیکھیے کہ نسل، رنگ، وطن، مذہب اور پیشے کے تمام اختلافات کے باوجود سب کو ایک امت قرار دیا گیا۔ اس سے اسلام کے اس مشن کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے جسے ہم وحدت انسانی کہتے ہیں۔

ایک بڑا مشن اس سے یہ پورا ہوا کہ مذہبی تنگ نظری کی بجائے فراخدلی اور رواداری کی بنیاد رکھی گئی ہے اور لا اکراہ فی الدین کی اساس مستحکم کی گئی ہے۔

پھر اس معاہدے کی اساس ان اخلاقی قدروں پر رکھی گئی ہے جن کی افادی اور انسانی حیثیت سے کوئی عقل سلیم منکر نہیں ہو سکتی۔ یعنی مظلوم کی امداد، برو تقویٰ میں تعاون، اثم و عدوان میں عدم تعاون، امن و امان کا قیام اور فساد و خونریزی سے اجتناب وغیرہ۔

متحدہ قومیت

لمحۂ فکریہ

اس مقام پر متحدہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کا مسئلہ خواہ مخواہ زیر بحث آجاتا ہے کیونکہ اس معاہدے کی ایک بڑی اہم دفعہ یہ ہے کہ:

وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین ۔

بنی عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک امت (قوم) شمار ہوں گے

اس دفعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اعلیٰ مقصد کے لیے دو مختلف المذہب قومیں بھی مل کر ایک قوم بن سکتی ہیں۔ چنانچہ اسے ایک زمانے میں بڑے زور شور کے ساتھ اس نظریے کی تائید میں پیش کیا گیا تھا کہ: "قومیں اوطان سے بنتی ہیں مذہب سے نہیں بنتیں۔" اس دعوے کے پہلے حصے میں تو صداقت موجود ہے لیکن دوسرے

حصے میں صداقت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں بلکہ رنگ، نسل، زبان اور پیشے سے بھی بنتی ہیں۔ پاکستانی قوم، گوری قوم، پٹھان قوم، اردو بولنے والی اور درزی قوم وغیرہ کہنا کسی طرح غلط نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اسی طرح مسلمان قوم، ہندو قوم، عیسائی قوم، بدھسٹ قوم وغیرہ کہنا بھی ویسا ہی درست ہے۔ پہلی قسم کی ایک ہی قوم مختلف اوطان میں ہو سکتی ہیں اور دوسری قسم کی مختلف قومیں ایک ہی وطن میں ہو سکتی ہیں۔ اس میں کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں۔

سوال صرف یہ ہے کہ اگر پہلی قسم کی قومیت کا دوسری نوع کی قومیت سے ایسا ٹکراؤ پیدا ہو جائے کہ دوسری نوع کی قومیت خطرے میں پڑ جائے تو ترجیح کسے دی جائے گی؟ ایک مسلمان بہر حال دوسری نوع کی قومیت کو ترجیح دے گا۔ کیونکہ مسلمان کا مشن یہ ہے کہ اس کی آئیڈیالوجیکل اور تصوراتی قومیت کی بنیاد صرف اسلام ہے اور اس کا فرض ہے کہ اگر پہلی قسم کی قومیت سے اس کا ٹکراؤ پیدا ہو تو وہ اس پر ساری دوسری قومیتوں کی بنیادوں کو قربان کر دے خواہ وہ وطنیت ہو یا نسلیت، زبان ہو یا رنگ، پیشہ ہو یا کچھ اور۔ ہجرت اسی کا عملی ثبوت ہے جس کا ہم ہجرت کے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ وطن کو بچانا ہر مسلمان کا بھی فرض ہے۔ لیکن یہ اس لیے نہیں کہ وطن کوئی مقصود یا معبود ہے بلکہ اس نقطۂ نگاہ سے کہ یہاں اس کا دین محفوظ رہے گا۔ اگر دین وطن میں محفوظ نہ رہ سکے تو اس وطنی قومیت پر ایک مسلمان بلا تکلف لات مار کر الگ ہو جائے گا۔

لہٰذا مذکورۂ بالا دفعہ (ان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین) سے ہندوستان کی متحدہ قومیت پر استدلال کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا خصوصاً اس اضافے کے ساتھ کہ "قومیں مذہب سے نہیں بنتیں"۔ اس کے علاوہ کچھ اور اساسی وجوہ بھی ایسی ہیں

جن کی بنا پر یہ دعوےٰ کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" صحیح نہیں ثابت ہوتا۔ مثلاً

(الف) حضورؐ نے یہ امت یا قوم بر بنائے وطنیت نہیں بنائی تھی۔ حضورؐ کے اور مہاجرین کے ہم وطن اور ہم نسل تو مکی تھے اور قریشی تھے جن کو اس قومیت سے قطعی طور پر چھانٹ دیا گیا اور مدینے کے انصار کو اپنی قومیت میں داخل کر لیا گیا جن کو ہم وطنی اور ہم نسلی کا تعلق نہ تھا بلکہ ان انصار کے ساتھ یہود اور دوسرے قبائل کو بھی قومیت میں شامل کر لیا گیا۔ وطنی اور نسلی لحاظ سے مکے کے قریشی بہر حال اقرب تھے۔

(ب) سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ "متحدہ قومیت" ایک ایسے معاہدے کے تحت تسلیم کی گئی جس میں معاہد قبائل اور مسلمانوں کے حقوق وقتی تقاضوں کے مطابق متعین کر لیے گئے تھے۔ "بلینک چیک" نہ ادھر سے پیش کیا گیا تھا نہ ادھر سے۔ پوری اسلامی تاریخ میں معاہدوں کے بغیر کسی قوم سے اتحادِ عمل نہیں کیا گیا۔

(ج) اور یہ معاہدہ بھی ایسا تھا جو کسی حیثیت سے سائلانہ یا محکومانہ انداز کا نہ تھا۔ مساویانہ تھا۔ نہیں بلکہ حاکمانہ و غالبانہ تھا۔

(د) معاہدے کی صرف ایک ابتدائی شق کو لے کر باقی شقوں کو چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک پورے نسخے میں سے سنکھیا کو لے لینا اور باقی اجزائے تریاقی کو پس پشت ڈال دینا۔ اس معاہدے کی آخری شق پر معلوم نہیں کیوں لوگوں کی نظر نہیں گئی۔ وہ شق یہ ہے:

وانہ ما کان بین اھل ھٰذہ الصحیفۃ من حدث او اشتجار یخاف فسادہ فان مردّہ الی اللہ والی محمد رسول اللہ۔

شرکائے معاہدہ میں کوئی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس سے معاہدے

کی برقراری پر خراب اثر پڑنے کا اندیشہ ہو تو اس کے فیصلے کے لیے اللہ اور محمد رسول اللہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

اس دفعہ کے ہوتے ہوئے ایسی تمام متحدہ قومیتوں کا جواز ختم ہو جاتا ہے جس میں غالبانہ بلکہ مغلوبانہ انداز کا بھی سرے سے کوئی معاہدہ ہی نہ ہو اور سارا دار ومدار بلینک چیک پر ہو۔

سنہ ہجری کے کچھ اور واقعات

اس سنہ میں جہاں مذکورۂ بالا اہم واقعات ہوئے وہاں چند اور واقعات بھی ہوئے جو اپنی اولیت کی وجہ سے اہم ہو گئے۔

۱۔ کلثوم بن ہدم نے وفات پائی۔ ان کے ہاں مہاجرین ٹھہرے تھے۔ نیز حضورؐ کے داخلۂ مدینہ کے چھ سات ماہ کے بعد اسعد بن زرارہ نے بھی رحلت کی۔ یہ تینوں موقعوں پر مقام عقبہ پر موجود تھے۔ بارہ نقیبوں میں سے ایک یہ بھی تھے۔

۲۔ عبداللہ بن زبیر پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلی ولادت یہی ہے۔ ان کے کام و دہن نے جس اول چیز کا مزہ چکھا وہ وہ کھجور تھی جو حضورؐ نے چبا کر ان کے منہ میں تحنیک کے لیے ڈالی تھی۔

۳۔ اسی سال سلمان فارسیؓ بھی اسلام لائے۔ اور سلمان منا اھل البیت کے لقب سے فائز ہوئے۔

۴۔ حافظ ابن کثیر نے حضرت عائشہؓ کی رخصتی کو بھی اسی سنہ کے واقعات میں لکھا ہے لیکن یہ بالکل ہی غلط ہے (اس کا ذکر ۲ سنہ کے واقعات میں آئے گا)۔

عبداللہ بن سلام کا اسلام

۵۔ اسی سال یہودیوں کے حبر حضرت عبداللہ بن سلام بھی ایمان لائے۔ داخلۂ مدینہ کے آغاز میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے حضورؐ کو دیکھتے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ "یہ جھوٹے کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔" اور یہ وہی ہے جس کی خبر موسیٰؑ نے دی ہے۔" اب اس جذبۂ صادقہ کا اظہار باقی تھا۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کہا کہ: یارسول اللہ! میری قوم عجیب خود غرض، بہتان طراز واقع ہوئی ہے حضورؐ مجھے ایک کمرے میں چھپا دیں اور یہود کے چند افراد کو بلا کر میرے بارے میں بھی دریافت فرمائیں۔ اس کے بعد ملاحظہ فرمائیں کہ وہ میرے بارے میں کیا کہتے ہیں اور میرے اسلام لانے کی اطلاع پانے کے بعد کیا خیال ظاہر کرتے ہیں؟ حضورؐ نے چند یہودیوں کو بلا کر پہلے اسلام پیش کیا۔ انہوں نے شدت سے مخالفت کی۔ اس کے بعد حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ: یہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسے آدمی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ: سبحان اللہ ان کے کیا کہنے ہیں۔ وہ تو ہمارے آقا ہیں اور آقا زادے ہیں۔ سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے عالم کے صاحبزادے ہیں۔" حضورؐ نے پوچھا کہ: اگر وہ اسلام لے آئیں تو ...؟ انہوں نے فوراً کہا: توبہ کیجیے وہ کیوں آپ پر ایمان لانے لگے؟ حضورؐ نے عبداللہ بن سلام کو آواز دی کہ ذرا باہر تو آؤ۔ عبداللہ بن سلام نے باہر آکر کلمۂ شہادت ادا کیا اور کہا کہ: اے یہود! خدا سے ڈرو اور تم بخدا خوب جانتے ہو کہ حضورؐ اللہ کے رسول ہیں ——— یہ سننا تھا کہ یہود چلا اٹھے کہ: عبداللہ! تم بالکل جھوٹ بکتے ہو۔ تم بدترین انسان ہو۔ اور تمہارا باپ بھی نہایت نالائق تھا۔ غرض انہوں نے جس عبداللہ بن سلام کی ایک منٹ پہلے مداحیاں کر رہے تھے اسی کو ملاحیاں سنانے لگے۔ عبداللہ بن سلام نے

عرض کیا کہ حضورؐ نے ملاحظہ فرمالیا؟ یہ ہے ہماری قوم۔ اور مجھے پہلے معلوم تھا کہ میرے اسلام کا علم ہوتے ہی کیا کچھ کہیں گے۔

۶۔ اسی سال راس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول بھی بہ ظاہر اسلام لایا اس کی کارگزاریوں اور فتنہ پردازیوں کا ذکر آگے مختلف صفحات میں آئے گا۔

۷۔ یہ بھی روایت ہے کہ ظہر، عصر، اور عشار کی نمازیں اب تک تو صرف دو دو رکعتیں تھیں۔ پھر اسی سال چار چار ہوگئیں اور سفر میں وہی دو باقی رہیں۔

سنہ ۲ ہجری

سنہ ۲ ہجری میں بعض بڑے اہم واقعات ہوئے مثلاً:

تحویل قبلہ

روزوں کا حکم۔ نیز پہلی نماز عید اور صدقۂ فطر

حضرت عائشہ رضؓ کی رخصتی

کفر و اسلام کی پہلی ٹکر، غزوۂ بدر

حضرت فاطمہ رضؓ کا نکاح

ہم ان کو الگ الگ لکھیں گے کیونکہ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر سیرت نگاروں نے زیادہ توجہ نہیں دی ہے

تحویلِ قبلہ

حضورؐ کا یہ معمول تھا کہ جن باتوں کے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہوتا ان پر عموماً

خاموش رہ کر وحی کا انتظار فرماتے یا صحائف آسمانی (بائبل) کی پیروی فرماتے۔ یا اپنے ذوقِ سلیم سے کوئی اقدام فرماتے۔ اور عموماً وحی حضورؐ کی تائید کرتی جس کی کئی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں اور کچھ آئندہ بھی آئیں گی۔

شعبان ۲ھ تک مسلمانوں کا قبلۂ نماز بیت المقدس رہا (یعنی مدینے میں بھی سترہ مہینے تک) حضورؐ عموماً یوں نماز ادا فرماتے کہ کعبہ اور بیت المقدس ایک سیدھ میں آجاتے۔ یعنی اہل کتاب کا قبلہ بھی سامنے رہتا اور اپنی فطری خواہش بھی پوری ہو جاتی جو ملت ابراہیمی سے لگاؤ کا فطری نتیجہ تھی۔ تاریخ سے بھی ثابت ہے کہ کعبے سے پہلے دنیا میں کوئی عبادت خانہ جسے "قبلے" کی حیثیت بھی حاصل ہو موجود نہ تھا۔ قرآن نے اسی حقیقت کی طرف یہ فرما کر اشارہ کیا ہے کہ:

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ ... ۳ : ۹۶	سب سے پہلا گھر جو انسانوں کے لیے وضع کیا گیا وہ وہی ہے جو مکے میں ہے (یعنی کعبۃ اللہ)

سچ پوچھیے تو اہل کتاب اور اہل اسلام کے علاوہ تمام اسماعیلی اور غیر اسماعیلی مشرکین کا متفق علیہ اور مرکزی قبلہ وہی ہو سکتا تھا جس کی بنیاد ان سب کے متفق علیہ پیغمبر سیدنا ابراہیم خلیل اللہؑ نے رکھی تھی۔ اور یہی گھر ان سب کے لیے وحدتِ انسانی کے پیغام کا مرکز بن سکتا تھا۔ یوں بھی عام طور پر اس کی مرکزیت اس قدر مسلم تھی کہ ابرہہ کو اس کی مرکزیت ختم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور جب وہ اپنے اس حملے میں بری طرح ناکام ہوا تو اس کی مرکزیت کی دھاک اور بھی زیادہ بیٹھ گئی۔

یہ قبلہ خود کیا چیز ہے؟ یہ درحقیقت قومی ثقافت و تہذیب کا ایک

محسوس تمثیلی مرکز SYMBOLIC CENTRE ہے۔ یہ مرکز توجہ ہے۔ محض چہرے کا رُخ پھیرنے کے لیے مخصوص سمت نہیں۔ ملتِ ابراہیمی کا جو سرچشمہ اس سرزمین سے پھوٹا اور اس نے اہل ایمان کو جو اقدار انسانی بخشیں اسی کا ایک محسوس نشان ہے یہ بیت اللہ۔ ادھر رُخ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار وہی ہیں جس کا سرِ دفتر یہ بیتِ عتیق ہے۔ جس طرح ایک قومی پرچم کپڑے اور ڈنڈے سے زیادہ کچھ نہیں مگر صرف ایک نشانِ قومیت ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام شعائر میں داخل ہے، اور جس طرح قربانی بجز خونریزی و گوشت خوری کے کچھ نہیں بلکہ صرف ایثار و قربانی اور تقوے کا ایک درس ہے (لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم) اسی طرح بیت خلیل بظاہر محض چوب و خشت کا ایک مجموعہ ہے۔ اس کا احترام صرف اس لیے ہے کہ یہ سر دفتر ہے انسانی نظامِ زندگی کا، مرکزی درسگاہ ہے اقدارِ حیات کی تعلیم و اشاعت کی۔ نقطۂ آغاز ہے صحیح ثقافت و تہذیب کا۔ اولین تربیت گاہ ہے حقائق دین کی۔ اس کے تمام شعائر، سارے مناسک بظاہر فقط رسوم ہیں۔ مقصد اور روح کچھ اور ہے۔ اسی طرح اسے قبلۂ نماز بنانے کا مقصد محض ادھر منہ کر لینا نہیں۔ خدا کی ہمہ جہت ذاتِ بحت کعبے کی دیواروں میں مقید نہیں۔ اینما تولوا فثم وجہ اللہ ساری سمتیں خدا ہی کی سمتیں ہیں۔ وللہ المشرق والمغرب محض اس طرف منہ کر لینا طاعت پذیری یا بلند قدریں نہیں۔ اقدار کچھ اور ہیں:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن	بر یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کر لیا کرو۔ بلکہ صاحبِ بر وہ

البر من آمن باللہ والیوم
الاخر والملئکۃ والنبیین ؕ واٰتی
المال علیٰ حبہ ذوی القربیٰ و
الیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل
والسائلین وفی الرقاب ؕ واقام
الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ ج والموفون
بعھدھم اذا عٰھدوا ج والصٰبرین
فی الباساء والضراء وحین الباس ـ

ہے جو اللہ، آخرت، فرشتے، کتاب اور
نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں
قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر،
حاجت مندوں پر اور غلامی سے رہا کرنے
کی راہ میں مال صرف کرے۔ صلوٰۃ قائم
کرے، زکوٰۃ ادا کرے۔ نیز جو عہد کرے
اسے پورا کرے۔ تنگ دستی، بیماری اور
قتال کے موقعوں پر ثابت قدم رہے۔ ایسے

اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون ۲:۱۷۷ ہی لوگ صادق اور یہی اصحاب تقویٰ ہیں۔

آپ نے دیکھا؟ یہ ہیں وہ اقدار جو اصل مقصود ہیں۔ صرف کسی جہت کی طرف منہ موڑ دینا کوئی مقصد نہیں۔ منہ موڑنا تو صرف اس یاد دہانی کے لیے ہے کہ ان تمام اقدار کے چشمے جس مقام سے پھوٹتے ہیں اور جس انداز سے پھوٹتے ہیں ان کا مرکز محسوس شکل میں کعبۃ اللہ ہے۔

بیت اللہ محض رکوع و سجود کی ایک سمت نہیں بلکہ قومی، سیاسی، روحانی معاشی اور سارے معاشرتی و انسانی نظام حیات کا قبلۂ توجہ، وہ دین خداوندی ہے جو خلیل اللہؑ اور حبیب اللہ ﷺ سارے بنی آدم کے لیے لائے ہیں۔ آج روسیوں کا قبلہ ماسکو ہے۔ انگریزوں کا لندن ہے۔ جاپان کا ٹوکیو ہے۔ امریکہ کا واشنگٹن ہے۔ ان سب کی "ہدایات" کا مرکز توجہ ان کے یہی مراکز ہیں جن کے گرد ان کا پورا نظام زندگی گردش کرتا ہے۔ لیکن مسلمان قوم کا قبلہ اب صرف قبلۂ نماز رہ گیا ہے۔ باقی گوشہائے زندگی سے کچھ تعلق نہیں رہ گیا ہے حالانکہ:

حرم جز قبلۂ قلب و نظر نیست — طواف او طواف بام و در نیست
میانِ ما و بیت اللہ رمزیست — کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست

یا پھر مراسمِ حج ادا کرنے کے لیے سفرِ مکہ صرف ایک "یاترا" رہ گیا ہے:

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

بہرکیف حضورؐ کی تمنا یہی تھی کہ بیت المقدس سے زیادہ قدیم اور زیادہ جامع اور مرکزیت کا حامل خانۂ خدا یعنی کعبۃ اللہ قبلہ قرار پائے۔ پیغمبر کی ہر ادا کا رخ صحیح سمت ہی ہوتا ہے اس لیے خدا نے تحویل قبلہ کا حکم دے کر اس آرزو کی عملی توثیق فرما دی۔

اس تحویل کی ایک بڑی مصلحت خدا نے خود بتا دی کہ:

لنعلم من یتبع الرسول ... $\frac{2}{143}$ دیکھیں رسول کا اتباع کون کرتا ہے۔

یہ ایک بڑا امتحان (TEST) تھا جس سے اہل اسلام نہایت آسانی و خوشی کے ساتھ گزر گئے لیکن سفہا کو باتیں بنانے کا موقع ملا جس کا قرآن میں ذکر ہے۔ اس حکم سے کھرے کھوٹے کا امتیاز ہو گیا۔ اور یہود کو یہ تحویل قبلہ سخت ناگوار ہوئی جس سے ان کے بعض منافقین بھی کھل کر سامنے آنے لگے۔

روزوں کا حکم

تحویل قبلہ سے متصل ہی صوم رمضان کا حکم نازل ہوا۔ روزہ تمام قوموں میں مختلف انداز سے موجود ہے۔ اہل اسلام پہلے بھی روزے رکھتے تھے جیسا کہ جعفر طیارؓ کے اس خطبے سے مترشح ہوتا ہے جو آپ نے نجاشی کے دربار میں دیا تھا۔ اس وقت روزے کا فلسفہ پیش نظر نہیں لیکن اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اعلیٰ ترین اقدار

کی تخلیق کرتا ہے۔ اور جس طرح حج یاترا سے مختلف چیز ہے اسی طرح روزہ بھی برت اور محض فاقہ کشی اور ہنگر اسٹرائک سے جداگانہ قسم کی شے ہے۔ تسلیم و رضا یعنی رضا کارانہ جذبۂ اتباع و طاعت کے علاوہ اپنا آپ محاسبہ کرنے کی صلاحیت، اعلیٰ و ادنیٰ میں یک رنگی، صبر اور جفاکشی کی قدریں پیدا کرتا ہے۔ اور دوسرے فاقہ کشوں کی تکلیف کا احساس دلاتا ہے۔ اور اسی سے نعمات الٰہی کا صحیح قدر اور شکر پیدا ہوتا ہے۔ فاقہ کش انسان اپنی زندگی سے عاجز آجاتا ہے اور پیٹ بھرنے کے لیے ارتکاب جرائم تک سے دریغ نہیں کرتا۔ لیکن یہی فاقہ کشی جب روزے میں تبدیل ہو جائے تو اندرونی مسرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور معاصی سے بچنے بلکہ کچھ اور نیکیاں کرنے پر ابھارتا ہے۔ روزے کی ان تمام اقدار کو سمیٹ کر قرآن نے دو لفظوں میں یوں بیان کر دیا ہے کہ:

لعلکم تتقون — امید ہے کہ تم صاحب تقویٰ بن جاؤ گے۔

نماز عید و صدقۂ فطر

اسی رمضان کے بعد پہلی بار حضور نے نماز عید پڑھی اور صدقۂ فطر نکالنے کا بھی حکم دیا۔ اسلام میں کسی غم کو مذہبی تقریب کی حیثیت نہیں دی گئی ہے۔ اگر تقریبیں ہیں تو خوشی ہی کی تقریبیں ہیں۔ لیکن یہ تقریبات بھی محض تہوار نہیں بلکہ زندگی اور اس کی اقدار پیدا کرنے والے اجتماعات ہیں محض "ہجوم مومنین" نہیں بلکہ "شوکت قوم و دین" ہے۔

یہ پہلی عید الفطر قدرتی طور پر فتح بدر کی خوشی کا اظہار بن گئی اور کیا عجب کہ یہ نماز عید در اصل اسلام میں اس پہلی جنگ کی پہلی فتح کی یادگار ہی ہو۔

منافقینِ مدینہ

مدینے میں پہنچ کر اہل اسلام نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ یہاں مسلمان اس پوزیشن میں نہ تھے کہ اہل مکہ کی طرح جو چاہے انہیں اپنی مرضی کے مطابق سزائیں دے یا قید کرے یا نکال باہر کرے۔ یہاں انہیں ایک اجتماعی قومی قوت حاصل ہو گئی تھی۔ یہاں مہاجرین بھی یکجا تھے اور انصار بھی اور ہر مسلمان اپنی جگہ سر بکف شمشیر بدست مجاہد تھا۔ بعض یہودیوں کے اسلام لانے کی وجہ سے عام یہود آتش زیر پا تھے مگر اپنے اندر اتنی قوت نہ پاتے تھے کہ قریش کی طرح وہ اہل اسلام کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا سکیں۔ وہ کوئی کھُلا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ اہل اسلام سے معاہدہ بھی کر چکے تھے جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اس معاہدے میں یہود اس لیے بھی کوئی رخنہ نہ ڈال سکتے تھے کہ اس میں تنہا وہی شریک نہ تھے بلکہ جیسا کہ آپ اوپر معلوم کر چکے ہیں آس پاس کے بہت سے قبائل اس میں شریک ہو گئے تھے۔

ان تمام باتوں کے باوجود مدینے میں ایک بڑے شدید اور انوکھے فتنے نے سر اٹھایا جو اپنے دور رس اثرات میں قریشی فتنوں سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ یہ فتنہ ایسا تھا جو حضورؐ کے دمِ واپسیں تک رہا۔ نہیں بلکہ اس کے بعد بھی رہا اور کھنے دیجیے کہ آج تک قائم ہے۔ مکی زندگی تک اسلام بھی واضح تھا اور کفر بھی اس کے مقابلے میں علانیہ نمایاں اور عیاں تھا۔ لیکن مدینے کے یہود نے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک نیا حربہ ایجاد کیا اور وہ تھا نفاق یا منافقت۔ یعنی باہر سے دوست اندر سے دشمن۔ بہ ظاہر مسلمان اور بباطن کافر۔

قرآن ان کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ ان کا پروگرام مختصراً یہ تھا:

۱۔ مسلمانوں سے کہنا کہ ہم مسلمان ہیں اور کافروں کو یقین دلانا کہ ہم دراصل تمہارے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں کو تو ہم احمق بنا رہے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کا ہمدرد بن کر ان کو اسلام سے بدظن کرنے کے علاوہ مخبری کرنا۔

۳۔ صبح اسلام لا کر شام کو مرتد ہو جانا تاکہ اہل اسلام کے دلوں میں شکوک پیدا ہوں اور ان کی استقامت میں کمزوری آجائے۔

۴۔ جہاں موقعہ ملے اہل اسلام میں تفریق، بدگمانی، تھڑدلی، ہراس اور پینک پھیلانے کے لیے ہر ممکن علانیہ و خفیہ پروپیگنڈا کرنا۔

۵۔ غیر مسلموں سے مسلمانوں کے خلاف خفیہ سازشیں کرنا اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کی دعوت دینا اور خود ان کو امداد دینا۔

۶۔ حقیقت کو اس طرح توڑ مروڑ کر دوسروں کے سامنے پیش کرنا کہ بات کچھ کی کچھ ہو جائے۔

۷۔ بے حقیقت اور ناقابل اعتنا باتوں کو اتنی اہمیت دے کر پھیلانا کہ لوگ اصلی کاموں کی طرف سے ہٹ کر ادھر متوجہ ہو جائیں۔

۸۔ نئی نئی باتیں اور جھگڑے تصنیف کر کے اذہان کو تشویش میں ڈالنا۔

۹۔ حق کے ساتھ باطل کو اس خوبصورتی سے ملا کر پیش کرنا کہ سطحی فہم رکھنے والے مسلمان اس کو فوراً یقین کر لیں۔

۱۰۔ اہل اسلام کا غلبہ دیکھ کر ان کے ساتھ ہو جانا اور کمزوری کے وقت الگ ہو جانا جو مفاد پرستوں (APPORTUNISTS) کا خاصہ ہوتا ہے۔

غرض یہ تھا ان منافقین کا پروگرام جس پر وہ عمل کرتے رہے۔ ان کا ذکر اپنے اپنے مواقع پر آئے گا۔ ان کا مقابلہ مسلمانوں کے لیے بے حد دشوار تھا اس لیے کہ

یہ بہ ظاہر کلمۂ شہادت پڑھ کر اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔ مسلمانوں کی طرح احکام الٰہی بھی بجا لاتے تھے لیکن اندر گھن کی طرح گھس کر جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور منکروں کے مخبر بن کر مسلمان سوسائٹی میں گھس جاتے۔ مسلمان ان کے ظاہری اسلام کی وجہ سے انہیں مسلمان شمار کرنے پر مجبور تھے کیونکہ قانون صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور باطن کو خدا کے سپرد کرتا ہے۔ ان پر اس وقت تک ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا جب تک گرفت کے قابل کوئی فعل سرزد نہ ہو جائے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کا (قرائن قویہ سے معلوم کر لینے کے بعد) حضورؐ نے مواخذہ کیوں نہ فرمایا اور ان کے معاملے میں ڈھیل کیوں دیتے رہے؟ یہ بڑا اہم سوال ہے اور بڑی بڑی اقدار اس سے وابستہ ہیں۔ اس ڈھیل کی وجوہ ہماری سمجھ میں یہ آتی ہیں:

۱۔ حضورؐ تو اپنی اعلیٰ ترین بصیرت سے منافقوں کی صحیح دارو گیر کر لیتے لیکن بعد والوں کے لیے یہ اسوہ کس طرح بنتا؟ اس کا نتیجہ تو یہ ہوتا کہ بعد کے اولی الامر جب کو چاہتے منافق قرار دے کر سخت سے سخت سزا حتیٰ کہ سزائے موت تک دے دیتے حالانکہ یہ عین ممکن ہے کہ وہ دراصل منافق نہ ہوتا یا کوئی شخص اپنے ذاتی انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اس پر منافقت کا الزام لگا دیتا۔ اس صورت میں انسانی خون کی کیا قدر و قیمت رہ جاتی؟

۲۔ جو اہل اسلام فی الواقع مسلمان ہوں ان کے مسلمان ہونے کی کیا ضمانت ہو سکتی تھی جب کہ فیصلے کا انحصار ظاہر پر نہیں بلکہ صرف باطن پر ٹھہرا ہو۔

۳۔ ایک بڑی مصلحت اس ڈھیل میں یہ بھی تھی ان منافقین کو اصلاح حال کا موقع دینا بھی مقصود تھا۔ منافقوں میں جہاں پکے منافق تھے وہاں ایسے بھی تھے جو اپنی منافقت میں پختگی نہ رکھتے تھے یا ان کے اندر کوئی گوشۂ شرافت موجود

تھا۔ ان سے اصلاح حال کی توقع بجا طور پر منقطع نہیں ہوئی تھی۔ ان میں کتنے ایسے تھے جو اسلامی سوسائٹی کی برکات سے آخر متاثر ہوئے۔ یا قدرتی گرفت نے انہیں دوسروں کے لیے نمونۂ عبرت بنا دیا۔

۴۔ اس ڈھیل کی ایک بڑی اخلاقی وسیاسی وجہ یہ تھی انہی منافقین کے بعض قریبی رشتے دار سچے مومن بھی تھے۔ اگر ان منافقین کو قتل کر دیا جاتا تو ان کے مومن رشتے داروں کے دل پر ناخوشگوار اثر پڑتا ایک فطری بات ہوتی۔ یہی عبداللہ بن ابی بن سلول کے صاحبزادے حضرت عبداللہ سچے مومن تھے۔ ایسے سچے مومن کہ حنین کے موقعے پر اپنے منافق باپ کا سر کاٹنے کی حضورؐ سے اجازت مانگی تھی مگر حضورؐ نے اجازت نہ دی۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ جب حضورؐ نے یہ گوارا نہ کیا کہ بیٹا اپنے باپ کا سر قلم کر دے تو یہ کب گوارا فرما سکتے تھے کہ بیٹے کے سامنے خود اپنے حکم سے اس کا سر قلم کرا دیں؟ یہ تو خیر حالتِ امن تھی۔ حضورؐ نے تو حالتِ جنگ میں بھی گوارا نہ فرمایا۔ احد کے میدانِ جنگ میں ابو عامر قریش کے لشکر کی قیادت کر رہا تھا۔ ان کے صاحبزادے حضرت حنظلہ (غسیل ملائکہ) نے اپنے باپ سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت چاہی مگر رحمۃ للعالمینؐ نے اسے پسند نہ فرمایا۔ تفصیل آگے آئے گی۔

بات یہ ہے کہ یوں تو حضورؐ کا سب سے بڑا مشن انسانی خون کا احترام تھا۔ یہ خود ایک بہت بڑی قدر ہے لیکن حالتِ جنگ یا حالتِ امن میں خونریزی ناگزیر ہونے کی حالت میں بھی حضورؐ ایک اور اعلیٰ قدر کی محافظت کو ضروری سمجھتے تھے اور وہ تھا بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر رحم۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

من لم یوقر کبیرنا ولم یرحم صغیرنا فلیس منا۔	جو ہمارے بڑے کا ادب اور ہمارے چھوٹے پر رحم نہ کرے وہ ہم سے باہر ہے۔

اس کے الفاظ قابل غور ہیں۔ حضورؐ دوسروں کے بڑے کو اپنا بڑا اور دوسروں کے چھوٹے کو اپنا چھوٹا فرما رہے ہیں۔ اگر حضورؐ ان منافقین کو سخت سزا یا سزائے موت دیتے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ وہ جنگی مقابلہ نہیں کر رہے ہیں تو ان کے بڑوں اور ان کے چھوٹوں دونوں ہی کے جذبات کو ٹھیس لگ سکتی تھی اور رحمتِ نبوی کو یہ گوارا نہ تھا۔ اس لیے آخر وقت تک درگزر ہی سے کام لیا۔

۵۔ حضورؐ کا فیصلہ اپنے دور کے منافقین کے لیے تو ہر حال صحیح ہوتا لیکن بعد والوں کے لیے یہ حدود قائم کرنا بہت مشکل تھا کہ کس نوع کی منافقانہ کارروائی پر سزا دی جائے اور کس کارروائی سے درگزر کیا جائے۔ بعض سچے اہل ایمان (مثلاً حاطب بن ابی بلتعہ) سے بھی ایسی لغزشیں ہو گئیں جن پر منافقت کا گمان کیا جا سکے۔ بعض اہل ایمان سے نادانستہ بھی ایسی لغزشیں ہو گئیں۔ ایسی صورت میں وہ کون سا واضح خط امتیاز ہے جو ان اہل ایمان کی لغزشوں اور منافقین کی دانستہ کارروائیوں کے درمیان کھینچا جا سکے؟ آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ حضرت عمرؓ ذرا ذرا سی باتوں پر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور حضورؐ سے بعض اہل خطا کی گردن اڑا دینے کی اجازت چاہنے لگتے تھے۔ اگر حضورؐ نے منافقین سے درگزر کا یہ وسیع انداز نہ رکھا ہوتا تو حضرت عمرؓ کا جوش اپنے دور میں اتنا متوازن نہ ہو سکتا تھا۔ اور بعد میں تو یہ ہوتا کہ ہر امیر منافقت کو بہانہ بنا کر جسے چاہتا ختم کر کے اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنا ایک مشغلہ بنا لیتا اور اس صورت میں عفو، عدل، رحم اور احترامِ خون کی تمام قدریں مجروح ہو کر رہ جاتیں۔

غرض یہ تھے وہ اسباب جن کی وجہ سے منافقین کو انگیز کرنا پڑا۔ ان کے بارے میں تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد قابلِ عمل روش یہی ہو سکتی تھی کہ اسلامی سوسائٹی کے افراد ان سے ہوشیار رہیں اور اس وقت تک کوئی ہلکی یا

سخت سزا نہ دیں جب تک وہ سزا ناگزیر نہ ہو۔ اس ناگزیری میں ہر مسلم و کافر و منافق کے درمیان کوئی قانونی فرق نہیں ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ اسلام تو ظاہر و باطن دونوں ہی کی اصلاح چاہتا ہے اور اس کا ہر قانون دونوں ہی پر حاوی ہے لیکن کسی قانون کی گرفت باطن پر نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص منافقت کے ساتھ اسلام قبول کرے تو اگرچہ وہ مومن تو نہ ہوگا لیکن اسے مسلم تو کہنا ہی پڑے گا۔ پس اس کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہیں کہ قانون (شریعت) صرف ظاہر کو دیکھے جیسا کہ تمام دنیا کے قوانین دیکھتے ہیں اور باطن کے متعلق اس کا سلوک یہ ہو کہ حسابہ علی اللہ اس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی تطہیرِ نفاق کی کوشش میں لگی رہے۔

یہود کی عداوت کے اسباب

یہ تو اوپر بیان ہو چکا ہے کہ یہود نے کن مجبوریوں کی وجہ سے کھلے مقابلے کی بجائے منافقت کو اپنی دشمنی نکالنے کا حربہ بنایا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ انصار کی طرح یہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر ایمان کیوں نہ لے آئے اور حق کو قبول کرنے کی بجائے اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی کو اپنا شعار کیوں بنا لیا؟ اور چند سعید روحوں کے سوا یہ سب کے سب آخر وقت تک عداوت پر کیوں قائم رہے؟ اس کے کئی اسباب ہیں اور ان کا جاننا اس لیے ضروری ہے کہ خود ہمارے موجودہ احوال و کوائف سے اس کا گہرا تعلق ہے۔

۱۔ قومِ یہود کی خصوصیات کو قرآن مجید نے بڑی تفصیل سے کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ ان سب کو سمیٹنے کا یہاں موقع نہیں۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ روحانی اقدار کو برطرف کر کے لفظی موشگافیوں کے پیچھے پڑے رہنا، تنگ دلی اور تعصّب،

خاندانی برتری کا غرور، جاہ و اقتدار کی ہوس۔ مال و دولت کی حرص میں فنائیت اور حصولِ زر کے لیے تمام اخلاقی اقدار کو پس پشت ڈال دینا، قانونی انطباق میں اعلیٰ و ادنےٰ کی تفریق وغیرہ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن کے ذکر سے قرآن بھرا پڑا ہے۔ انہوں نے اپنی شرارتوں سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو عاجز کر رکھا تھا۔ سیدنا مسیحؑ کا پیغام ان کے ان ہی افکار و کردار کے خلاف ایک بغاوت تھا۔ آج ہماری قوم میں یہودیوں کی یہی خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ روایت درست ہے جس میں یہ ارشاد نبوی ہے کہ تم لوگ (مسلمان) بھی ان ہی کے نقش قدم پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی اس میں گھس کر رہو گے۔ یہ واقعہ ہے کہ جب پیغامِ وحی سے بے نیازی ہوتی جائے اور انسانوں کو مقامِ نبوّت پر بٹھا دیا جائے تو قوم کی تمام بلندیاں پستیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور قبولِ حق میں شخصیتیں اور ان کے پیدا کردہ غلط تصورات حائل ہو جاتے ہیں۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے اگر کوئی خدائی فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو تو بڑی خوشی سے اسے گلے لگاتی ہے اور اگر اس کی مرضی کے خلاف ہو تو خدا کا نام لیتے ہوئے بھی وہ اسے رد کر دیتی ہے۔

یہودیوں کی جاہ طلبی اور خاندانی فخر و غرور نے حضورؐ کا انکار کرنے پر مجبور کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک چونکہ سارے انبیاء و مرسلین بنی اسرائیل میں آتے رہے ہیں اس لیے نبوت اسی خاندان کی اجارہ داری ہے۔ کسی دوسرے خاندان (بنی اسماعیل) میں نبوت کہاں سے آ سکتی ہے؟ اور لطف یہ ہے کہ یہ یہود خود اسرائیلی پیغمبروں کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔ بلکہ قتل تک سے دریغ نہیں کیا۔ بنی اسماعیل میں ایک پیغمبر آخر الزمان کا پیدا ہو جانا انہیں سخت ناگوار تھا اور یہ اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک سبکی سمجھتے تھے۔ انہیں ایک پیغمبر کا انتظار

ضرور تھا اور آپ بیعت عقبہ کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ ایک آنے والے پیغمبر کا چرچا ان کے اندر ہوتا رہتا تھا اور انصار مدینہ کو بھی اس کے متعلق تھوڑا بہت علم ان ہی یہود کی بدولت ہوا تھا۔ یہ اپنے دشمنوں (اوس و خزرج) کو یہ کہہ کر دھمکی دیتے تھے کہ ذرا اس منتظر پیغمبر کو آلینے دو۔ پھر دیکھنا کہ ہم اس کا ساتھ دے کر کس طرح تم سے انتقام لیتے ہیں۔ انہیں یہ یقین تھا کہ یہ آنے والا بنی اسرائیل ہی میں مبعوث ہوگا لیکن جب مشیئت کی نگاہِ انتخاب بنی اسماعیل پر پڑی تو یہ یہود ناراض ہو گئے۔ ان کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ وہی نبی منتظر ہے اور اس کے تمام اوصاف ایک ایک کر کے اس کے اندر موجود ہیں۔ وہ جس طرح اپنے فرزندوں کو پہچانتے تھے اسی طرح حضورؐ کو بھی پہچانتے تھے (یعرفونہ کما یعرفون ابناءھُم) مگر ہوا یہ کہ فلما جاءھم ما عرفوا کفروا بہ پہچاننے کے باوجود منکر ہو گئے۔

۲۔ خاندانی اقتدار و جاہ کو خطرے میں محسوس کرنے کے علاوہ ان یہود کو "لکشمی پوجا" نے بھی قبولِ حق سے باز رکھا۔ یہ اپنا اقتدار بھی اپنی دولت ہی کی خاطر چاہتے تھے۔ بنیا ذہنیت کا صحیح مظہر تھے۔ حصولِ مال کا ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ اکل بالسحت یعنی الحصال اور ناجائز ذرائع معاش ان کی ممتاز خصوصیت تھی۔ شریعتِ موسوی میں سود خواری کو قطعاً حرام کیا گیا ہے لیکن یہود کی معاشی زندگی ہی سود خواری اور حرام خوری پر قائم تھی۔ مدینے کے انصار تک ان کے محتاج تھے۔ (سودی قرض لیتے اور مدتِ دراز تک ادا نہ کر سکنے کے باعث ذہنی طور پر ان کے غلام رہتے)۔

قبولِ اسلام کے بعد اور خصوصاً حضورؐ کی آمدِ مدینہ کے بعد انصار اور دوسرے نومسلموں کی معاشی حالت سنبھلنے لگی تھی۔ ایک تو اس لیے کہ قبل از اسلام جن فضول یا ناجائز باتوں پر پیسہ برباد کیا کرتے تھے اس سے باز آ گئے۔ وہ اب اپنے ضروری

اخراجات میں بھی تخفیف کرنے لگے تھے اور رقم بچا کر اپنے غریب (مہاجر و غیر مہاجر) بھائیوں کی امداد کرتے تھے۔ پھر رزق حلال کی کوشش سے مہاجرین و انصار دونوں کی معاشی حالت سنبھلنے لگی۔ سود کی حرمت اگرچہ ابھی نازل نہ ہوئی تھی لیکن اس کی کراہت تو مکی زندگی ہی میں مسلّم ہو چکی تھی جیسا کہ دربار نجاشی میں خطبۂ جعفر طیارؓ سے واضح ہے۔ اس رجحان کی وجہ سے مسلمان سودی قرض سے بچتے تھے۔

غرض اہل اسلام کی معاشی حالت سنبھلنے کی وجہ سے اور اسلامی سادہ زندگی کی وجہ سے قرض کا لین دین بہت کم ہو گیا تھا۔ جب اعمال مکروہہ کے علاوہ غیر ضروری اخراجات سے بھی احتراز کیا جائے اور قرض لینے کی بجائے خدا کو قرض دینے کا جذبہ کارفرما ہو تو کوئی کیوں قرض اور وہ بھی سودی قرض لیتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کے کاروبار پر خاصا اثر پڑا کیونکہ ان کا سب سے بڑا ذریعۂ معاش یہی سودی لین دین تھا اور اسی کی بدولت وہ اہل مدینہ پر اور دوسروں پر اپنی آقائی قائم رکھے ہوئے تھے۔

یہ معاشی مار یہود کب برداشت کر سکتے تھے؟ بنیا سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر پیسے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ یہودیوں کو یہ چیز کھائے جا رہی تھی کہ اہل اسلام ان کی اقتصادی غلامی سے آزاد ہو رہے تھے اور خود یہود کا معاشی کاروبار خطرے میں پڑ رہا تھا۔ یہی سب سے بڑی وجہ تھی جو انہیں حضورؐ کا پیغام قبول کرنے سے روک رہی تھی اور وہ اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی پر اتر آئے تھے۔

۲۔ انہیں ایک خطرہ اور بھی تھا اور وہ یہ تھا کہ اگر مسلمان اسی طرح قوت پکڑتے گئے تو بہت ممکن ہے کہ کل کلاں کو یہاں ان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے۔ لہٰذا یہ اس فکر میں تھے کہ کوئی موقع ایسا ہاتھ آئے کہ جس طرح اہل اسلام کو مکّے سے نکلنا پڑا اسی طرح یہاں سے بھی انہیں نکال باہر کیا جائے یا یہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔

۴۔ یہود کی ایک بڑی خفگی کا سبب اور بھی بعد میں پیدا ہو گیا اور وہ یہ تھا پہلے شعبان ۲ھ تک مسلمانوں کا قبلۂ نماز وہی تھا جو اہل کتاب کا تھا لیکن بعد میں بہ وحیِ خداوندی یہ قبلہ بدل گیا اور اب خانۂ خلیل ــــ کعبۃ اللہ ــــ اہلِ اسلام کا قبلہ قرار پا گیا جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

یہ تمام خیالات ان یہودِ مدینہ کے دل و دماغ پر کابوس بن کر مسلط ہو رہے تھے مگر ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو ختم کر کے اپنے انحطاطِ معاش و اقتدار کی تلافی کر سکیں۔ وہ منتظر تھے کسی موقعے کے۔ اور سر دست انہوں نے یہ عبوری دور گزارنے کے لیے منافقانہ اسلام کا ایک آسان حربہ استعمال کرنا شروع کیا تاکہ بہ ظاہر مسلمان ان کی طرف سے مطمئن رہیں اور یہ اس دور ان میں اپنے مفر کی راہیں تلاش کرتے رہیں۔

قریش کی ناراضی

یہ تو مدینے کا حال تھا۔ اُدھر مکے والوں کو بھی اپنے اقتدار اور معاش کا مزید خطرہ ایک دوسرے انداز سے پیدا ہو گیا۔ انہیں ایک تو یہ صدمہ تھا کہ اسلام روز بروز پھیلتا جا رہا ہے اور تمام اہل اسلام مکے سے بچ کر نکل گئے اور انہیں ایک محفوظ ٹھکانا مل گیا۔ اہل مکہ کو اسلام کا اس طرح پھلنا پھولنا کب گوارا ہو سکتا تھا؟ صرف اتنی ہی بات نہ تھی بلکہ اس سے زیادہ دو بڑے خطرے اور بھی ان کے سامنے آ گئے۔ ایک یہ کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے جو شام کی طرف جاتے تھے اس کا سہل اور عام راستہ مدینے ہی کے قریب سے ہو کر جاتا تھا۔ انہیں خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اہل اسلام ہمارا راستہ روک دیں یا ہمارے قافلے کو لوٹ لیں۔ اگر یہ شکل ہوئی تو ہمارا سارا معاشی نظام

تباہ و برباد ہو جائے گا۔ مزید برآں یہ بھی ہوگا کہ باہر سے آنے والے تجارتی قافلوں اور نیز زائرین کو اگر روک دیں تو معاش کا رہا سہا سہارا بھی ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ مسلمان دوسرے دشوار گزار راستوں کی اور سمندر کے کنارے والے راستے کی بھی ناکہ بندی کر دیں۔

اس معاشی خطرے کے علاوہ ایک اور بڑا خطرہ انہیں یہ بھی پیدا ہو گیا کہ اگر اہل اسلام نے مزید قوت پیدا کر لی تو کل ہم پر حملہ کر کے ہماری آزادی، عیاشی، معاش، اقتدار اور مذہب وغیرہ سب کا خاتمہ کر دیں گے۔

انسان جب غیر معقول جذبات کی رو میں بہہ جائے تو اس کی چشمِ بصیرت اندھی ہو جاتی ہے۔ اہل مکہ اپنی عداوت و دشمنی میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ نہ تو انہیں اسلام پر غور کرنے کا موقع ملا اور نہ انہیں مسلمانوں کے بلند کردار کو نگاہِ غور سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ رسولِ خداؐ کے ہوتے ہوئے اہل اسلام سے ایسے گھٹیا کردار کا مظاہرہ نہ ہو سکتا تھا جس کی اہل مکہ توقع کر رہے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا، کہ حضورؐ جو پیغام لائے ہیں وہ ان خطرات مزعومہ کا حامل نہ تھا۔ وہ پیغام لوٹ مار کو روکنے کے لیے تھا نہ کہ اسے ہوا دینے کے لیے۔ وہ دین انسانوں کی اقتصادی، معاشی حالت درست کرنے کے لیے تھا نہ کہ اسے برباد کرنے کے لیے۔ وہ جذبۂ انتقام کو عدل میں تبدیل کرنے کے لیے تھا نہ کہ اسے اور ابھارنے کے لیے۔ حضورؐ ان ہی اعلیٰ اقدار کو اجاگر کرنے کے لیے آئے تھے نہ کہ ان کے مزعومہ خطرات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے۔

بہر حال اہل مکہ اپنے لیے یہ خطرات حقیقت سے کہیں زیادہ محسوس کرنے لگے اور انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اسلام اور اہل اسلام کے استیصال کے لیے

ہر ممکن تدبیر کو عمل میں لانا چاہیے۔ اور اس خطرے کو سر پر آنے سے پہلے ہی دور کر دینا چاہیے۔ اس کے لیے انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منافقوں کے رئیس عبداللہ بن اُبی بن سلول کو ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ:

"تم لوگوں نے ہمارے قبیلے کے ایک شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پاس ٹھہرا لیا (یعنی یہ ہم اہل مکہ پر زیادتی کی ہے) لہذا یا تو ان سبھوں کو اپنے شہر سے نکال دو یا ان سے لڑ کر ان کو ختم کر دو۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے تم کسی ایک کے لیے بھی تیار نہیں تو پھر اس وقت کا انتظار کرو جب ہم اہل مکہ خود تمہارے اوپر حملہ کر دیں گے اور پھر تمہارے نوجوانوں کو قتل کر کے تمہاری عورتوں کو تصرف میں لائیں گے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ خاصے باخبر بھی تھے اور معاملہ فہم بھی۔ خط لکھنے کے لیے انہوں نے جس کا انتخاب کیا ہے اس سے بہتر آدمی قریشی نقطۂ نگاہ سے اور کوئی نہیں مل سکتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی ایک تو منافق بلکہ سردارِ منافقین تھا۔ دوسرے انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج پر یہ اپنا خاصا اثر رکھتا تھا۔ اہل مکہ کا یہی آلۂ کار بن سکتا تھا۔ مکتوب الیہ کا یہ انتخاب بلاشبہ اہل مکہ کی دانائی کا ایک واضح ثبوت ہے۔ پھر خط کا مضمون بھی اتنا مکمل ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔ اسی مضمون کے پیش نظر وہ انصار کو بظاہر ہمدردانہ مشورہ دے سکتا تھا اور اسی سے وہ اپنی مطلب برآری کر سکتا تھا۔

انصار کی تمام شیفتگی حضورؐ کی ذات سے وابستہ ہو گئی تھی۔ یہ صورت حال تمام منافقوں پر گراں تھی۔ اور عبداللہ بن ابی پر تو بے حد شاق تھی۔ قریش کا خط آنے کے بعد ان تمام منافقوں کو بڑی ڈھارس ملی۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ گویا اہل مکہ کا باہر

جتھا ہمارا ہم خیال ہے جو وقت پڑے پر ہماری امداد بھی کرے گا۔ منافقین کو یہ بہانہ ہاتھ آگیا اور انہوں نے معاملے کو گویا اس طرح پیش کیا کہ قریش کی اس دھمکی کے بعد اب ہمارا وجود باقی ہی اس طرح رہ سکتا ہے کہ مدینے کے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے خواہ انہیں مدینے سے باہر نکال کر ہو یا ان سے مدینے کے اندر جنگ کر کے ہو۔

آخر ان منافقوں نے یہ طے کیا کہ مسلمانوں سے جنگ ہی کرنا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر یہ مسلمان نہ مغلوب ہوں گے اور نہ مدینے سے نکلیں گے۔ حضورؐ کو ان کے اس فیصلے کی اطلاع ملی تو خود ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

"دیکھو تم کو قریش نے بڑے مغالطے میں ڈالا ہے۔ اگر تم یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ لڑو گے تو خود تمہارا ہی نقصان ہو گا کیونکہ یہ تمہارے ہی رشتے دار ہیں جو مسلمان ہوئے ہیں۔ اور اگر تم قریش کی باتوں کو ماننے سے انکار کر دو اور تمہیں ان سے لڑنا پڑے تو یہ مقابلہ پھر بھی غیروں سے ہو گا۔"

یہ چند جملے تھے جو سننے والوں کے دلوں میں اُتر گئے اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ ذرا ان جملوں کو پھر پڑھیے اور دیکھیے کہ بلاغت کا کتنا اعلیٰ مرقع ہے۔ بلاغت ایسے اندازِ کلام کو کہتے ہیں جو اقتضائے حال اور موقع محل کے عین مطابق ہو جو دلوں میں اتر جائے۔ ان جملوں میں سیاست کا اعلیٰ نمونہ موجود ہے مگر یہ محمدی سیاست ہے جس کا مقصد قیامِ امن ہے اور جنگ کے امکانات کو کم کرنا۔

قریش کی ایک اور سازش

قریش کو اپنی اس تدبیر میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے دوسرا پینترا بدلا۔

اب انہوں نے یہودِ مدینہ سے خط و کتابت شروع کی۔ یہود پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ قریش کی پشت پناہی سے انہیں شہ ملی۔ اور دونوں ہم خیال ہو گئے۔ اس اتحاد خیال پر قریش کو اتنا اعتماد پیدا ہو گیا کہ مسلمانوں کو یہ پیغام بھیج دیا کہ تم اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ مدینے میں پہنچنے کے بعد امن و اطمینان حاصل ہو گیا۔ یاد رکھو ہم وہیں آکر تمہیں ختم کر دیں گے۔

بدرِ اولیٰ

اس دھمکی کے بعد قریش نے کچھ عملی اقدام بھی کیا۔ ایک قریشی سردار کرز بن جابر فہری مدینے کی ایک بیرونی چراگاہ میں پہنچا اور مسلمانوں کے بہت سے مویشی دن دہاڑے لوٹ کر لے گیا۔ گویا مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ ہم تمہیں تین سو میل کے فاصلے پر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ اسی واقعے کو اہلِ سِیَر بدرِ اولیٰ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

بہ ظاہر تو یہ محض ایک شرارت سی معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک بڑا سیاسی اقدام تھا۔ قریش ایسے بے وقوف نہ تھے جو محض چند مویشی کے لیے تین سو میل کا سفر ضروری سمجھیں۔ کرز بن جابر فہری کا یہ اقدام صرف ایک آزمائشی اقدام TEST تھا۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی قوتِ دفاع اور یہود کے جذبۂ حمایت کا اندازہ کر لیا جائے۔ عموماً اہل سیاست جب کسی پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ایک چھوٹی سی چنگاری پھینک دیتے ہیں۔ اس سے ان کو اندازہ ہو جاتا ہے اس چنگاری کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے؟ کتنا ہیجان پیدا ہوتا ہے؟ عام تاثرات کیا ہوتے ہیں؟ کون حمایت اور کون مخالفت کرتا ہے؟ دشمن کی قوت کتنی ہے اور اس کے حمایتی کتنے؟ اس کے حوصلے کا اور غیرتِ قومی کا کیا حال

ہے اور اس کی تدبیر و سیاست کتنے پانی میں ہے ؟ ان ہی باتوں کا جائزہ یا اندازہ لینے کے لیے یہ چھوٹی سی چنگاری مدینے کی چراگاہ میں ڈالی گئی تھی۔ محض اتفاقی شرارت نہ تھی۔

حضورؐ نے وادیٔ سفوان تک جو بدر کے قریب ہے تعاقب فرمایا مگر کرز بن جابر ہاتھ نہ آیا۔

قتال کی اجازت

اب تک اسلام میں قتال و جنگ کے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہوا تھا۔ اب اس کے متعلق پہلا حکم یوں دیا گیا:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا و ان اللہ علٰے نصرھم لقدیر ہ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ط ولولا دفع اللہ الناس بعضھم لبعض لھدمت صوامع و بیع وصلوات و مساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۲: ۳۹، ۴۰

جن مسلمانوں سے جنگ کی جائے انہیں بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیے گئے ہیں۔ اللہ ان کی مدد پر قدرت رکھتا ہے۔ ان کو محض اس جرم میں کہ یہ اللہ کو اپنا رب تسلیم کرتے ہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا ہے۔ اگر اللہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا اور اس طرح طاقت کا توازن برقرار نہ رکھتا، تو عیسائیوں کے گرجے، یہودیوں کے عبادت خانے، ترسا ہب کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں بکثرت

ذکر الٰہی ہوتا ہے سب کے سب منہدم کردیے
جاتے۔

اسلام اور جنگ

اسلام میں پہلی جنگ غزوۂ بدر ہے اور یہ حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔ یہاں تھوڑی دیر کے لیے رُک جایے اور اسلام میں جنگ کی اصلی حقیقت کی پردہ کشائی کرتے چلیے۔ جنگ بظاہر ایک بے رحمی، ایک بھیانک تصویر اور ایک وحشیانہ فعل نظر آتی ہے اور فی الواقع ہے بھی کچھ ایسا ہی۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اس کے اندر بھی کچھ بلند اقدار ہو سکتی ہیں اور ایک پیغمبر جو دنیا میں آیا ہی اس لیے تھا کہ اعلیٰ اقدار کو قائم کرے کس طرح خونریزی کو روا رکھ سکتا ہے اور اس خدا نے کیونکر جنگ و خونریزی کی اجازت دی جس کی سب سے بڑی صفت رحمان و رحیم ہے۔

ان حقائق کی پردہ کشائی کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ محض ایک حصہ ہے جہاد کا۔ اور "جہاد" ایک ایسا لازمی جزو زندگی ہے جسے زندگی سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ صرف انسانی زندگی ہی نہیں بلکہ ساری کائنات ایک مسلسل جہاد ہے۔ ہر شے شعوری یا غیر شعوری طور پر آگے بڑھنے کے لیے ہر آن مصروف جہاد ہے خواہ تکوینی انداز سے ہو یا اختیاری رنگ سے۔ ہر پودا برگ و بار لانے کے لیے جہاد کرتا ہے اور ہر حیوان اپنی منازل بقا طے کرنے کے لیے جہاد میں مصروف رہتا ہے۔ پھر انسان جہاد سے گریز کرکے کس طرح اپنا کوئی مقصد حاصل کرسکتا ہے؟ اور مسلمان تو جہاد سے الگ رہ کر مسلمان رہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جنگ سراپا جہاد نہیں بلکہ جہاد کا

صرف ایک حصہ ہے۔ جہاد نام ہے کش مکشِ حیات سے حسن و خوبی کے ساتھ گزرنے کا۔ لیکن بدقسمتی سے جہاد اور جنگ کو ایک ہی مترادف چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ بلاشبہ ہر جنگ ایک جہاد ہے لیکن ہر جہاد جنگ نہیں۔ ہر انسان جاندار ہے لیکن ہر جاندار انسان نہیں۔

جہاد کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد جنگ کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جائے گی۔ یہاں چند احکام جنگ ملاحظہ ہوں:

اسلامی آدابِ جنگ

اسلامی قوانینِ جنگ کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے:

۱۔ فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ۱۶:۱۲۶	تم دشمنوں کے ساتھ اتنا ہی کر سکتے ہو جتنا تمہارے ساتھ کیا گیا ہے۔
۲۔ ولئن صبرتم لھو خیر للصّٰبرین۔ ایضاً	اور اگر صبر و درگزر سے کام لو تو تمہارے لیے اور بھی بہتر ہے۔
۳۔ ولا یجرمنکم شناٰن قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰی ۵:۸	کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل سے باہر نہ لے جائے۔ عدل کرنا ہوگا کیونکہ یہی تقوے سے قریب تر ہے۔
ان اللہ لا یحب المعتدین ۵:۸۷	حد سے متجاوز ہونے والوں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔

. . . .

کچھ فرامینِ نبوی بھی سنیے:

(۵) اللہ کا نام لے کر اللہ ہی کی راہ میں اللہ کے نافرمانوں سے جہاد کرو۔

(۶) بدعہدی اور خیانت نہ کرو۔

(۷) لاشوں کو مُثلہ نہ کرو۔

(۸) راہبوں اور گوشہ نشینوں کو نہ چھیڑو۔

(۹) کھجوریا اور کوئی پھلدار درخت نہ کاٹو

(۱۰) عمارت کو نہ گراؤ۔

(۱۱) عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مریضوں اور غیر محارب آدمیوں کو نہ چھیڑا جائے۔

فتح مکہ کے وقت کی ہدایات بھی سن لیجیے:

(۱) حرم میں خونریزی نہ ہو۔

(۲) صرف اسی کا مقابلہ کیا جائے جو سامنے آکر مقابلہ کرے۔

(۳) جو شخص کعبے میں داخل ہو اسے پناہ۔

(۴) جو شخص ابوسفیان کے گھر داخل ہو اسے پناہ۔

(۵) جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اسے پناہ۔

(۶) بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔

(۷) ہتھیار پھینک دینے والے کا تعاقب نہ ہو۔

(۸) زخمی اور اسیر نہ قتل کیے جائیں۔

یہ ہیں مختصر نمونے ان قوانین کے جن کا ہر مجاہد کو جنگ کے موقعے پر پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بین الاقوامی اور عالمگیر جنگوں میں جتنا بھی ان باتوں کا لحاظ خیال رہا کیا ہے وہ آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی جہاد تو انسانیت کے لیے رحمت ہے، اور بربریت و درندگی دراصل ان کی جنگیں ہیں جو اسلامی جہاد کو بربریت قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقت سے ہمارے معترضین بے خبر نہیں لیکن ان کی بربریت چھپ ہی سکتی ہے اس صورت میں کہ وہ اسلامی جہاد کو بربریت و وحشت ثابت کرنے کی

کوشش اور پروپیگنڈا کرتے رہیں۔ غرض ان تمام پروپیگنڈوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ اولاً تو مسلمان اس اہم فریضۂ زندگی سے کنارہ کش ہو جائیں اور ثانیاً خود معترضین کی جنگی زندگیوں پر پردہ پڑا رہے۔

ہمیں ان تصریحات کی ضرورت اس لیے پڑی کہ ایک تو جنگ اور جہاد کا فرق واضح ہو جائے۔ دوسرے جہاد زندگی کا ایک لازمی عنصر ہے اور جنگ بھی اسی جہاد کا ایک حصہ ہے جو ناگزیر حالات میں ضروری ہو جاتی ہے۔ نبوی زندگی روزِ ازل ہی سے ایک جہاد تھی۔ ہجرت تک پوری مکی زندگی بھی جہاد تھی۔ البتہ اس کے ایک حصے ـــ جنگ ـــ کا آغاز مدنی زندگی میں ہوا کیونکہ اب اسلامی مقاصد کا تحفظ اور محافظینِ اسلام کا دفاع اس کے بغیر ممکن نہ تھا۔

اس سلسلے میں ایک ضروری نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جنگ اگرچہ ناگزیر چیز ہے لیکن یہ بجائے خود کوئی مقصد نہیں۔ مقصد امن قائم کرنا اور فتنہ و فساد کو دور کرنا ہے۔ اس کی مثال عملِ جراحی اور راپریشن کی سی ہے۔ اس میں اگرچہ تکلیف ہی ہوتی ہے لیکن مقصد آرام ہی پہنچانا ہے اور یہ ایک ایسا مستقل آرام ہے جو اس عارضی تکلیف کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن اسی مقصد کو یوں واضح کرتا ہے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ:

إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۹:۷۳ — اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اس سے بھی بڑا فتنہ و فساد ہوتا رہے گا۔

جنگ خود ایک چھوٹا فتنہ اور غیر مطلوب شے ہے اس لیے اس سے گریز ضروری ہے لیکن جب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہے تو ایک بڑے فتنے کو دور کرنے کے لیے اس چھوٹے فتنے کو اختیار کرنے سے مفر نہیں ہوتا۔ لیکن اس چھوٹے فتنے کو اختیار کرنے کے لیے بھی جو شرائط رکھی گئی ہیں وہ خود اتنی اعلیٰ اقدار

کی حامل ہیں جن سے برتر قدروں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جہاد کے اور اس کے ایک حصے یعنی جنگ کے مندرجہ بالا حقائق کے بعد اب پھر اصلی مرکزِ گفتگو کی طرف رجوع کیجیے۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ اب تک اسلام میں جنگ کا ——— نہ کہ جہاد کا ——— کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اب پہلی آیت یہ نازل ہوئی:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیرہ الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ ط ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مساجد یذکر فیھا اسم اللہ کثیرا ۲۲: ۴۰	جن مسلمانوں سے جنگ کی جائے انہیں بھی (جوابی جنگ) کی اجازت ہے اس لیے کہ ان پر بہت ظلم ہو چکے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ مظلوم وہ ہیں جو محض اللہ کو اپنا رب ماننے کے جرم میں گھروں سے نکالے گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسانی طاقتوں (کے توازن) کو ایک کو دوسرے سے دبا کر برابر نہ کرتا تو عیسائیوں کے گرجے، یہود کے عبادت خانے، ترسا کے مندر، اور مسلمانوں کی مسجدیں، جن میں بکثرت ذکر الٰہی ہوتا ہے سب کے سب منہدم کر دیے جاتے۔

ذرا اس آیت کے حقائق پر غور کیجیے:

۱۔ اذن جنگ کی اجازت ہے۔

۲۔ بانھم ظلموا کیونکہ ان پر کافی مظالم ہو چکے۔

۳۔ اخرجوا من دیارھم بغیر کسی جائز وجہ کے گھر بار، املاک (اور اقارب) سے جدا کر دیے گئے۔

۴- الا ان یقولوا ربنا اللہ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ اللہ ہی کو اپنا رب تسلیم کیا۔ (اہل مکہ مسلمانوں کا جرم اس کے سوا اور کچھ نہ بتا سکے تھے)۔

۵- ولولا دفع اللہ الناس جنگ تو ایک کے ذریعے دوسرے کی زیادتی کو دور کرنے کے لیے ہے۔ اس لیے جہاں اس کا غلط استعمال ہو سکتا ہے وہاں صحیح محل استعمال بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام صحیح محل ہی پر اس کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اگر صحیح محل پر بھی اس کا استعمال نہ ہو تو ——

۶- لھدمت صوامع الخ تمام قوموں کے عبادت خانے برباد ہو جائیں۔ یعنے جنگ کا مقصد عبادت خانوں کو ڈھانا نہیں بلکہ ان کا بچاؤ ہے۔ زبردستی دین کو مسلط کرنا نہیں بلکہ دینی آزادی دینا ہے۔ تمام عبادت خانوں کے ذکر کے ساتھ مساجد کا ذکر اہل اسلام کو یہ تنبیہ کر رہا ہے کہ اگر تم نے دوسری قوموں کے عبادت خانوں کو برباد کیا تو خود تمہاری مسجدیں بھی محفوظ نہ رہیں گی۔

ان آیات میں جنگ کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس سے کون صاحبِ عقل انکار کر سکتا ہے؟ ان مقاصد کو کس طرح عمل میں لایا گیا اور اس کے کتنے شاندار نتائج پیدا ہوئے اور ہر ہر جنگ کے موقعے پر اعلیٰ اخلاقی قدروں کی کتنی محافظت کی گئی ان تمام باتوں کا ذکر اپنے اپنے مواقع پر آئے گا۔

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لیے کرز بن جابر فہری نے مدینے کی بیرونی چراگاہ پر حملہ کیا اور کچھ مویشی لوٹ کر لے گیا۔ یہ اقدام اہل اسلام کے لیے یقیناً ایک انتباہ (WARNING) کی حیثیت رکھتا تھا جس کے بعد ہی اجازتِ قتال کی یہ آیت نازل ہوئی۔

کرز بن جابر فہری کا یہ حملہ ایک اعلان تھا قریش مکہ کی جنگی تیاریوں کا۔ اس لیے حضورؐ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر آس پاس کے مختلف مقامات پر فوجی نقل و

حرکت فرمائی۔ اس نقل و حرکت کا مقصد کوئی جنگ نہ تھا بلکہ:

۱۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ آس پاس کی مختلف آبادیوں سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ قریش کا جنگ میں ساتھ نہ دیں اس لیے ان پہ یہ اثر ڈالنا تھا کہ وہ اہلِ اسلام کو غافل نہ سمجھ لیں۔ بلکہ خود قریش کو بھی بتانا تھا کہ مسلمان جوابی کارروائیوں کے لیے دم خم رکھتے ہیں۔

۲۔ ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ جن قبائل سے اب تک کوئی معاہدہ نہ ہوا تھا ان سے معاہدہ ہو جائے۔ اور اگر معاہدہ ہو چکا ہو تو اس کی تجدید و توثیق ہو جائے۔ اور وہ کسی دھوکے میں آ کر قریش کا ساتھ نہ دیں۔

۳۔ ایک اور مقصد یہ تھا کہ جہاں دشمنوں کی کچھ سازشی کارروائیوں کا علم ہوا وہاں حالات کا جائزہ لینے کے لیے کوئی فوجی دستہ پہنچ گیا۔

۴۔ اور سب سے بڑا مقصد جو کسی آن بھی حضور کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا تھا یہ تھا کہ شاید کوئی بندۂ خدا دعوتِ اسلام پر لبیک کہنے والا مل جائے۔

یہ تمام مقاصدِ نقل و حرکت سیاسی، فوجی اور دینی نقطۂ نگاہ سے اتنے اہم ہیں کہ ان کو پیشِ نظر رکھے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس سے حضور کے بین الاقوامی زاویۂ نظر، بیدار مغزی، جزرسی اور چوکسی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔

حضور نے ماہ صفر میں ودّان یا ابواء کا سفر فرمایا۔ یہ پہلا فوجی دستہ تھا جو حضور کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس میں سیدنا حمزہؓ بھی علم لیے ہوئے تھے۔ یہ سفید جھنڈا تھا اور اسلام میں پہلا جھنڈا تیار کیا گیا تھا۔ پھر ماہ ربیع الاول میں ایک دستہ بواط کی طرف بھیجا۔ پھر ماہ ربیع الثانی میں مقام عشیرہ (یا عسیرہ) کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر ایک دستہ سیف البحر کی طرف روانہ فرمایا۔ نیز ایک دستہ ثنیۃ المرار

کی طرف اور دوسرا جمادی الثانیہ میں نخلہ کی طرف روانہ کیا۔

چند قابلِ غور باتیں

آگے چلنے سے پہلے یہاں چند حقائق کی پردہ کشائی ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اب مدنی زندگی میں باقاعدہ ریاست وحکومت کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے:

۱۔ یہاں جو معاہدے ہوئے وہ محض قبائلی قسم کے نہ تھے بلکہ بین الاقوامی انداز کے تھے۔

۲۔ پھر خطرات کے پیشِ نظر تجدیدِ معاہدہ بھی ہو رہی ہے۔

۳۔ جہاں جہاں بھی قریش کی آمد یا تیاریوں یا سازشوں کا پتہ چلتا ہے وہاں ایک دستہ روانہ کیا جاتا ہے۔ اور پھر یہ دستہ محض تبلیغی انداز کا نہیں بلکہ فوجی رنگ کا ہے۔

۴۔ جب حضورؐ باہر کسی دستے کے ساتھ جاتے ہیں تو ایک نہ ایک کو مدینے میں اپنا جانشین بنا کر جاتے ہیں۔ چنانچہ بواط جاتے ہوئے مدینے کا عامل سائب بن عثمان بن مظعون کو (بروایت ابن ہشام) یا سعد بن معاذ کو (بروایت واقدی) بنا جاتے ہیں۔ عشیرہ (یا عسیرہ) کی طرف رخ کرتے ہوئے ابو سلمہ بن عبد الاسد کو مدینے کا عامل بناتے ہیں۔ جب کرز بن جابر فہری کے تعاقب میں وادیِ سفوان تک تشریف لے گئے تو زید بن حارثہ کو مدینے کا عامل مقرر فرمایا۔ وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ ہر دستے کے ساتھ ایک رایت (جھنڈا) بھی ہوتا ہے۔

غرض سارے انداز ریاست کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن کسی مرحلے پر بھی

رئیسانہ شان وشوکت کا اظہار نہیں ہوتا۔

ان دستوں کو بعض جگہ قریشی جھگھٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کسی جگہ کوئی جنگ نہیں لڑنی پڑی۔ صرف ایک موقع ایسا ہے جس میں پہلا قتال واقع ہوا۔ اس کا مختصر واقعہ یوں ہے:

حضورؐ نے عبداللہؓ بن جحش بن رئاب اسدی کو سات آٹھ مہاجرین کا امیر بناکر بھیجا تاکہ قریشی نقل وحرکت کی خبر لائیں۔ یہ اسلام میں پہلے شخص ہیں جن کو حضورؐ نے امیر بنایا۔ ورنہ اس سے پہلے کسی کو امیر نہیں بنایا گیا تھا۔ امارت ہوتی ہی ہے نظامِ ریاست قائم ہونے کے بعد۔ اس سے پہلے بہت لوگوں کو حضورؐ نے قاری، رئیس، مبلغ، معلم، نقیب وغیرہ تو بنا کر خود بھیجے ہیں لیکن "امیر" کا لقب کبھی کسی کو نہیں دیا گیا۔ خدا جانے یہ کب سے رواج ہو گیا کہ بے طاقت انجمنوں کے صدر کو امیر کہا جانے لگا۔ ہر کیف حضرت عبداللہؓ بن جحش مقام نخلہ میں قیام پذیر ہوئے۔ یہاں ایک قریشی قافلے کا سامنا ہوا۔ صحابہ نے باہم مشورہ کیا اور نتیجے میں حملہ کر دیا۔ واقد بن عبداللہ تمیمی کے تیر سے عَمرو بن حضرمی قتل ہو گیا۔ دو شخصوں (عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان) کو اسیر کر لیا۔ عبداللہؓ بن جحش جب مالِ غنیمت اور دونوں قیدیوں کو لے کر حضورؐ کی خدمت میں آئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ: میں نے تمہیں ماہِ حرام میں قتال کرنے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔" یہ اتفاق تھا کہ اس واقعے کے دن رجب کی آخری رات تھی جس کے بعد شعبان شروع ہو جاتا ہے۔ رجب ماہ حرام ہے اور شعبان ماہ حلال۔ حضورؐ کے اس ارشاد سے عبداللہؓ بن جحش اور ان کے ساتھیوں کو شدید ندامت اور کوفت ہوئی اور خود مسلمانوں نے بھی ان کو بہت طعنے دیے۔ اور قریش نے بھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ عبداللہؓ بن جحش نے یہ اقدام اس لیے کیا تھا

کہ ان کے خیال میں ماہِ حرام رجب کا مہینہ ختم ہو چکا تھا لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے بعد قریش نے اپنے دونوں اسیروں کی رہائی کے لیے فدیہ روانہ کیا۔ حضورؐ نے عمرو بن حضرمی کا تو خون بہا ادا فرمایا (اس کی تفصیل آگے آئے گی) اور دونوں اسیروں کو فدیہ لے کر رہا کرنے کی بجائے یہ فرمایا کہ ہمارے دو آدمی —— سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان —— جو مکّے گئے ہوئے ہیں واپس آجائیں تو اپنے دونوں قیدیوں (عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان) کو واپس لے جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعد میں حکم بن کیسان ایمان لے آئے اور حضورؐ ہی کے ساتھ رہے تا آنکہ بیرِ معونہ میں شہید ہوئے اور عثمان بن عبداللہ بحالتِ کفر مرا۔

کہا جاتا ہے کہ یہی واقعہ غزوۂ بدر کی بنیاد بن گیا تھا۔

لمحۂ فکریہ

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اہلِ اسلام اور اہلِ کفر کے درمیان یہ پہلی جھڑپ تھی اور عمرو بن حضرمی پہلا مقتول ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا اور عثمان بن عبداللہ و حکم بن کیسان وہ پہلے اسیر ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ چند حمار پہلا مالِ غنیمت ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔ اور یہی واقعہ غزوۂ بدر کی بنیاد بنا۔ اب قدرۃً آغازِ جنگ کا الزام مسلمانوں ہی پر آتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بمصداق البادی اظلم (ابتدا کرنے والا زیادہ ظالم ہے) مسلمان ہی قصوروار ٹھہرتے ہیں۔

دوسرا الزام یہ آتا ہے کہ مسلمانوں نے ماہِ حرام کی حرمت کیوں نہ قائم رکھی جب کہ پورا عرب اس کا احترام کر رہا تھا؟

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ:

۱۔ آغازِ جنگ کا الزام دراصل کفارِ قریش پر عائد ہوتا ہے جنہوں نے کرز بن جابر فہری کو بھیجا اور اس نے مدینے کی بیرونی چراگاہ پر حملہ کیا اور مویشی بھگا کر لے گیا۔ اگر مسلمانوں کو موقع ملتا تو یہیں ایک جھڑپ ہو جاتی اور وہ اسے مار دیتے یا اسیر کر لیتے۔ غزوۂ بدر کا اصلی محرک یہی ہوا تھا نہ کہ ابن حضرمی کا قتل۔ یہی وجہ ہے کہ کرز بن جابر کے اس واقعے کا نام بدر اولیٰ (پہلا غزوۂ بدر) ہے۔

۲۔ حضورؐ نے عبداللہ بن جحش کے اس اقدام کو خود بھی ناپسند کرتے ہوئے فرمایا کہ: میں نے تمہیں ماہِ حرام میں کسی قتال کی اجازت نہیں دی تھی۔ کسی امتی کی ذاتی غلطی سے حضورؐ پر یا اسلامی اصول پر کوئی حرف نہیں آسکتا حضرت خالد بن ولید نے بھی ایک شخص کو محض اس گمان پر قتل کر دیا تھا کہ یہ شخص خوف سے منافقانہ اسلام لایا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس کا اسلام درست نہیں؟ پھر بار بار ہاتھ اٹھا کر فرمایا کہ خداوندا خالد نے جو کچھ بھی کیا ہے میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ ایسی غلطیاں اور بھی بعض لوگوں سے ہوئیں لیکن حضورؐ نے اسے کبھی پسند نہیں فرمایا۔

۳۔ پھر یہ کتنی بڑی بات ہے کہ حسبِ دستور حضورؐ نے اس مقتول (عمرو بن حضرمی) کا خون بہا دینا منظور فرمایا۔ اگر حضورؐ اسے آغازِ جنگ قرار دیتے یا اسے پسند فرماتے تو خون بہا دینے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا؟ خون بہا تو حالتِ امن میں ادا کیا جاتا ہے نہ کہ حالتِ جنگ میں۔

۴۔ پھر ایک حقیقت اور بھی فراموش نہ کرنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اہلِ مکہ کے سیزدہ سالہ شدید مظالم کے مقابلے میں اس معمولی سی غلطی کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے؟ وہاں تو کئی قتل بھی ہوئے۔ یاسر اور ان کی بیوی سمیہؓ بڑے دردناک

طریقے سے شہید کیے گئے، جن کا کوئی خون بہا بھی ادا نہ کیا گیا۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، جو دوسرے سوال کے جواب میں آگے مذکور ہوئی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب جو ایک لحاظ سے پہلے سوال کا بھی جواب ہے یہ ہے کہ رجب یا کسی دوسرے ماہِ حرام میں قتال کرنا عام رواج کے مطابق ممنوع تھا لیکن اس کی ممانعت اسلام میں اس واقعے کے بعد ہوئی۔ اہل اسلام نے اس رواج کا ہمیشہ احترام کیا۔ آج یہ پہلی غلطی ہوئی جس پر حضورؐ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اس کے باوجود اگر اس رواجی قدر سے بے اعتنائی کا مقابلہ ان انسانی اقدار کی پامالی سے کیا جائے جو کفار قریش اب تک کرتے رہے تو یہ غلطی بہت ہی معمولی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن یوں بیان فرماتا ہے:

یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ ط قل قتال فیہ کبیر وصدٌّ عن سبیل اللہ وکفر بہ والمسجد الحرام و اخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ ط والفتنۃ اکبر من القتل... ۲ : ۲۱۷

لوگ آپ سے ماہ حرام میں جنگ کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ ماہ حرام میں جنگ بڑا جرم ہے لیکن خدا کے انکار کے ساتھ دوسروں کو راہِ خدا سے اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے بسنے والوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا خدا کے نزدیک اس سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور ان کو مسلسل آزمائشوں میں مبتلا رکھنا تو کسی کو قتل کر دینے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

ان حقائق کو دیکھنے کے بعد کون یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ قریش کا اپنے تمام جرائم کو فراموش کر کے مسلمانوں کی ایک لغزش پر اعتراض کرنا حق بجانب

ہو سکتا ہے؟ اور لغزش بھی ایسی جس کو حضورؐ نے خود پسند نہیں فرمایا اور اس کی تلافی بھی فرمادی۔

قافلۂ ابوسفیان

واقعۂ نخلہ یعنی قتل عمرو بن حضرمی کے دو ماہ کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان (صخر بن حرب) کی سرکردگی میں شام سے مکّے روانہ ہوا۔ قافلے میں تیس یا چالیس آدمی تھے اور ایک ہزار اونٹ زرومال اور اسباب تجارت سے لدے ہوئے تھے۔ یہ سارا مال قریش کے مختلف افراد کا تھا۔ شام سے مکّے جانے والے کو مدینے کے پاس ہی سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ اس لیے ابوسفیان کو قدرتاً یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں مدینے کے اہلِ اسلام اس مختصر سے قافلے پر حملہ کر کے جان ومال کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس لیے ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو غفاری کو ایک تیز رفتار اونٹنی پر مکّے بھیج دیا۔ اس نے مکّے پہنچ کر زوردار دہائی دی کہ: "اے قریشیو! المدد، المدد۔ تمہارا مال واسباب ابوسفیان کے قافلے کے ساتھ آرہا ہے۔ اور محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ درمیان میں حائل ہونے والے ہیں۔"

ادھر حضورؐ کو بھی اس قافلۂ تجارت کی اطلاع ملی اور صحابہ میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اکثروں نے خواہش ظاہر کی کہ یہ موقع اچھا ہے۔ افراد قافلہ کم ہیں اور مال واسباب بے شمار ہیں۔ ایک جھڑپ میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔

لمحۂ فکریہ

ابن اسحاق عبداللہ بن عباس کی زبانی لکھتے ہیں کہ جب حضورؐ کو اس قافلۂ

تجارت کی اطلاع ملی تو حضورؐ نے فرمایا:

هٰذہ عیر قریش فیها امو الهم فاخرجوا الیها لعل الله ینفلکموها

دیکھو یہ قریش کا قافلہ مال سے لدا جا رہا ہے۔ تم ادھر جاؤ، شاید اللہ تمہیں یہ مالِ غنیمت دلوا دے۔

گویا نعوذ باللہ خود حضورؐ کی خواہش تھی کہ یہ قافلہ بغیر کسی اعلانِ جنگ کے لوٹ لیا جائے اور اس طرح پچھلے مظالم کا انتقام لیا جائے۔ بعض صحابہ کے دل میں اگر یہ انتقامی جذبہ پیدا ہوا ہو تو کوئی تعجب نہیں لیکن اس ارادے کی نشاندہی خود قرآن بھی کرتا ہے۔ ہم اگر اسی قرآنی روشنی میں دیکھیں تو حضورؐ کی طرف اس پست ارادے اور گھٹیا خواہش کا انتساب سخت غیر موزوں اور غلط معلوم ہوتا ہے۔ ایسی ادنیٰ خواہش اس رسولؐ کے دل میں کب پیدا ہو سکتی ہے جس کی بعثت کا مقصد ہی اعلیٰ اقدار کا قیام اور مکارمِ اخلاق کی تخلیق ہو؟ اور جس کے اعلیٰ اخلاق کی شہادت انك لعلی خلق عظیم کا خداوندی ارشاد دے رہا ہو۔ حضورؐ تو ایسے پست جذبات کو ختم کرنے آئے تھے نہ کہ انہیں باقی رکھنے کے لیے۔

بلاشبہ بعض صحابہ کے دل میں اس خیال کا آنا ایک بشری تقاضا تھا کیونکہ

۱۔ تیرہ سال تک ان ہی کفارِ قریش کے ہاتھوں مسلمان شدید ایذائیں جھیلتے رہے۔ حتےٰ کہ گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔

۲۔ کفارِ مکہ نے مدینے کے یہود سے مراسلت کر کے مسلمانوں کے خلاف ان کو ابھارا تھا۔

۳۔ کرز بن جابر فہری نے دن دہاڑے مدینے کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا اور بہت سے مویشی چرا لے گیا تھا۔ گویا یہ بتایا گیا تھا کہ مکے سے تین سو میل کے فاصلے

پر بھی مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔

۴۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس قافلے کی واپسی کے بعد قریش مدینے پر حملہ کریں گے۔

۵۔ قافلے میں صرف چالیس آدمی ہیں جن کو ایک ہی حملے میں صاف کیا جا سکتا ہے۔ اور ابوسفیان جو تمام مخالفوں کا ہیرو ہے، اسی قافلہ میں ہے۔ قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا ہے۔ یہی ابوسفیان اور اس کے ساتھی اسی مال و اسباب کے سہارے کر کس کے چند دنوں بعد ہمارے خلاف آئیں گے۔ اس لیے اگر اس کو یہیں ختم کر دیا جائے تو نہ فقط مال و اسباب ہی ہاتھ آئے گا بلکہ جذبۂ انتقام بھی سرد ہو گا۔ اور قریش کے حوصلے بھی پست ہو جائیں گے۔

غرض عام مسلمانوں کے دل میں اس قافلے کو لوٹنے کا اگر کوئی بجا جذبہ پیدا ہوا ہو تو اس پر کوئی تعجب نہیں لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ خود حضورؐ بھی یہی جذبہ رکھتے تھے۔ یہ قافلہ رمضان میں آ رہا تھا اور اس سے پہلے کرز بن جابر فہری کے چھاپے کے بعد حضورؐ نے مختلف دستے مختلف جگہ روانہ فرما دیے تھے۔ مثلاً ماہ صفر میں ودّان اور ابواء تک۔ ربیع الاوّل میں بواط کی طرف ربیع الثانی میں عسیرہ دیا عشیرہ یا ذی العشیرہ، سیف البحر اور ثنیۃ المرار کی طرف اور جمادی الاخریٰ میں نخلہ کی طرف فوجی دستے روانہ فرمائے مگر ان میں سے کوئی دستہ بھی مشورے کے بعد نہیں روانہ کیا گیا بلکہ حضورؐ نے مارچ کا حکم دیا، اور دستے روانہ ہو گئے۔ پھر سوچیے کہ صرف چالیس آدمیوں کے قافلۂ تجارت کو لوٹنا مقصود ہوتا تو حضورؐ کو مشورے کی کیا ضرورت تھی؟ مسلمان پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے اور خواہش مند تھے۔ ذرا سا اشارہ کافی تھا مگر حضورؐ حکم دینے کی بجائے مشورہ کرنے بیٹھتے ہیں۔ اور صرف مشورہ ہی نہیں فرماتے بلکہ مشورے کے

بعد طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو قافلۂ ابو سفیان کی خبر لانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ غور کیجیے کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ ایک سیرت نگار نے بھی اس پر غور نہیں کیا۔

اگر واقعی حضورؐ کی یہ مرضی ہوتی کہ مکے سے شام جانے والے تجارتی قافلوں کو روک کر لوٹ لیا جائے تو ہجرت کے بعد قریش کا ایک قافلہ بھی نہ بچ سکتا تھا اس لیے کہ مکے اور شام والی سڑک مدینے سے کچھ دور نہ تھی۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ (سنہ ۶ ھ) کے بعد جب ابو بصیر عتبہ بن اسید مکے سے بھاگ کر مدینے آ گئے تو حضورؐ نے معاہدہ حدیبیہ کے مطابق ان کو واپس کر دیا۔ اور یہ سمندر کے کنارے ذو المرہ کے پاس مقام عیص میں جا کر مقیم ہو گئے اور مکے کے دوسرے مسلمان قیدی بھی رفتہ رفتہ بھاگ بھاگ کر ان کے پاس پہنچتے گئے۔ اور ان سب نے قریش کے تجارتی قافلوں کا ایسا ناک میں دم کر دیا کہ قریش مکہ نے معاہدۂ حدیبیہ کی اس دفعہ کو ختم کرنے کی درخواست کی جس کی رو سے بھاگے ہوئے مسلمانوں کو مدینے سے واپس کرنا ضروری تھا (تفصیلی ذکر آگے آئے گا)۔ اگر مسلمان چاہتے تو اس سے پہلے ہی قریش کے تجارتی قافلوں کا ناطقہ بند کر دیتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی حضورؐ نے کبھی اجازت نہ دی۔ حضورؐ نہ تو بے مقصد جذبۂ انتقام کی پرورش چاہتے تھے اور نہ لوٹ مار جیسے پست مقصد سے اعلیٰ اسلامی اقدار کو مجروح کرانا پسند فرماتے تھے۔ اس وقت حضورؐ کے سامنے دو چیزیں تھیں۔

ایک طرف مسلمانوں کی مارشل اسپرٹ تھی جسے آگے چل کر اعلیٰ اقدار کی محافظت کے لیے وقف ہونا تھا۔ اس اسپرٹ کو دبا کر ختم کرنا کسی صاحبِ عقل کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس دباؤ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو کر کوئی نامناسب ردِ عمل پیدا ہوتا۔

دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر ان مسلمانوں کو مارچ کا حکم دیدیا جائے تو یہ کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہوگا۔ محض جذبۂ انتقام ہوگا نیز اسلامی اقدارِ جنگ کے بھی خلاف ہوگا۔ یعنی دشمن حملہ آور نہیں ہوتا۔ مٹھی بھر بے طاقت جماعت ہے اور وہ بھی قافلۂ تجارت کی شکل میں۔ یہ کوئی شجاعت نہیں کہ کسی کو کمزور پاکر دبا دیا جائے اور وہ بھی کسی اعلیٰ مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض لوٹ مار کے لیے۔

غرض فوجی جذبے (مارشل اسپرٹ) کو دباکر جذبات کو مجروح کرنا، یا مارچ کا حکم یا اجازت دینا دونوں نامناسب تھے۔ اس لیے حضورؐ نے ایک ایسی راہ اختیار فرمائی کہ یہ حملہ بھی نہ ہو اور مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں۔ یعنی مارشل اسپرٹ کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھا جائے۔ اور اس قافلۂ تجارت سے مڈبھیڑ ہونے کا موقعہ ٹال دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنی عدیم النظیر بصیرت سے یہی کچھ کیا۔ وہ اس طرح کہ کچھ وقت مشورے میں صرف کیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جذبات حملے کے حق میں ہیں تو کچھ مزید وقت اس لیے لے لیا کہ مزید حالات معلوم کر لیے جائیں۔ پھر دو شخصوں (طلحہ بن عبید اور سعید بن زید) کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ اس جنگ کو ٹالنے کی یہ بڑی اعلیٰ درجے کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ چنانچہ اسی مشورے اور تگ و دو میں ابوسفیان کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ دریا کے کنارے کا راستہ اختیار کر کے صاف بچ نکلا۔ یہی مقصد تھا جسے حضورؐ نے ایسی خوبصورتی سے پورا فرمایا کہ مسلمانوں کو ایک پست مقصد یعنی تسکین انتقام اور غیر شجاعانہ جنگ اور لوٹ مار سے بھی بچالیا۔ اور قوتِ قتال کو ایک دوسرے اہم موقعہ —— بدر —— کے لیے محفوظ بھی کر لیا۔

ہمیں قرآن پاک سے بھی کچھ اسی قسم کا اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ (۸-۷) (الخ)	اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے لیے مقدر ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور ہی جماعت ہمارے لیے ہو۔ حالانکہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو ثابت کرکے ان کی جڑیں کاٹ دے ..... الخ

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر مسلمانوں کو قابو حاصل ہوگا۔ ایک طاقتور گروہ تھا اور دوسرا کمزور ـــــ اس کی تفسیر اب تک یہی کی جاتی ہے کہ ایک معرکۂ بدر تھا۔ اور دوسرا یہ تجارتی قافلہ۔ اور اس تفسیر کے علاوہ کوئی دوسری تفسیر ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی فطری خواہش یہی تھی کہ کمزور گروہ (قافلۂ تجارت) ہی ان کے قبضے میں آجائے کیونکہ مقابلہ بھی آسان تھا اور مالِ غنیمت کی فراوانی بھی تھی۔ لیکن اللہ کی ـــــ اور اللہ کے رسولؐ کی بھی ـــــ خواہش یہ تھی کہ قافلۂ تجارت کی بجائے اس گروہ کا مقابلہ ہو (یعنی محاربین بدر کا) جس کے بعد باطل و کفر کا زور ٹوٹ جائے۔ یہ کہنا کہ رسول اللہؐ کی بھی وہی خواہش تھی جو عام مسلمانوں کی تھی۔ یا خود رسول اللہؐ ہی نے مسلمانوں کو قافلۂ تجارت لوٹنے پر ابھارا تھا ہمارے خیال میں روح قرآنی سیرتِ رسولؐ اور مقاصد اسلامیہ کے مطابق نہیں ہے۔

بہرکیف اِدھر حضورؐ نے دو آدمیوں طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید کو اس تجارتی قافلے کی خبر لانے کو بھیجا اور اُدھر ابو سفیان نے مکے جانے کے لیے معروف

راستے کو ترک کر کے سمندر کے کنارے کنارے جانے والا راستہ اختیار کیا اور پورا قافلہ صحیح سلامت مکے پہنچ گیا۔ جب قافلہ مکے پہنچا تو معلوم ہوا کہ ضمضم بن عمرو غفاری کی فریاد پر قریشی کمک روانہ ہو چکی ہے۔ بعد میں ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق ابوسفیان نے اس کمک کو پیغام بھیجا کہ جس قافلۂ تجارت کی حمایت و حفاظت کے لیے تم جا رہے تھے وہ صحیح و سلامت واپس آگیا ہے۔ اس لیے اب خواہ مخواہ جنگ کے لیے نکلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن ابوجہل بن ہشام نے کہا کہ بدر کے سالانہ میلے کی شرکت تو ضرور کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنی جمعیت اور شان و شوکت سے سارے عرب کو مرعوب کر دیں۔ مگر بنی عدی اور بنی زہرہ کے تمام افراد ابوسفیان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے واپس آ گئے۔

ادھر حضورؐ کو بھی قریش کی روانگی کی اطلاع ملی لہٰذا ۱۲ رمضان ۲ھ کو حضورؐ تین سو تیرہ آدمیوں کو لے کر روانہ ہو گئے۔ ان میں ساٹھ یا ستر سے کچھ زیادہ مہاجرین تھے اور باقی انصار۔ روانگی کے وقت عبداللہ بن ام مکتوم کو امام نماز مقرر فرمایا۔ بعد میں مقام روحا سے ابولبابہ کو مدینے کا عامل بنا کر واپس بھیج دیا۔ اور مدینے کے بالائی حصے کا نگراں عاصم بن عدی کو متعین فرمایا۔ اس وقت ایک سفید جھنڈا مصعب بن عمیر کے ہاتھ میں تھا۔ ایک سیاہ جھنڈا جس کا نام عقاب تھا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں اور دوسرا سیاہ جھنڈا سعد بن معاذ یا حباب بن منذر کے ہاتھ میں تھا۔ گھوڑے صرف دو تھے اور زرہیں آٹھ۔ اور ہر تین آدمیوں کے درمیان ایک اونٹ کی سواری تھی جس پر باری باری دو آدمی سوار ہوتے تھے۔ حضورؐ کے ساتھیوں میں علیؓ اور ابولبابہ تھے۔ ان دونوں نے خواہش ظاہر کی کہ صرف حضورؐ سوار ہوں اور ہم دونوں پیدل چلیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا:

ما انتما باقوی منی — تم دونوں مجھ سے زیادہ قوی نہیں اور

ولا انا باغنیٰ عن الاجر منکما۔ یعنی تم دونوں سے اجر الٰہی کا کم محتاج نہیں۔ (رواہ احمد عن ابن مسعود)

اللہ اللہ کیا بندگانہ انکسار، مساواتِ حقوق، مسکین نوازی، اور فقیرانہ زندگی کی اس سے بہتر بھی کوئی مثال مل سکتی ہے؟ عام طور پر سرداران قوم جس انداز سے نکلتے ہیں وہ کوئی پوشیدہ چیز نہیں۔ لیکن سرور کونینؐ جن انسانی واخلاقی اقدار کو قائم کرنے آئے تھے اس کا ہر ہر قدم پر مظاہرہ ہو رہا تھا۔

مقام روحاء سے جب ابو لبابہ عامل مدینہ بنا کر واپس کیے گئے تو مرثد ابن ابی مرثد نے ان کی جگہ لے لی۔

جب حضورؐ مقام ذفران پر پہنچے تو حضورؐ کو اطلاع ملی کہ فی الواقع قریش اپنے تجارتی قافلے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں اور اب کچھ زیادہ دور نہیں۔ ابوجہل نے اگرچہ محض بدر کے میلے میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہاں سے فارغ ہو کر وہ مدینے پر حملہ نہ کر دے گا؟ مکے سے دو سو بیس میل چل کر جو لشکر بدر میں پہنچا ہو اور مدینہ صرف ساٹھ میل رہ گیا ہو وہاں عقل و سیاست کا ایک ہی تقاضا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے مزید اقدام کو روک دیا جائے ایسا کرنا عین مدافعت ہی کا تقاضا ہے۔ مدافعت کے یہ معنی نہیں کہ جب مسلح دشمن گھر میں گھس آئے اور تلوار چلانی شروع کر دے تب تم مدافعت کے لیے اٹھو۔

خطرہ اب سر پر آچکا تھا اس لیے لشکر قریش کی خبر سنتے ہی حضورؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے گویا مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہوئے پوری امداد کا وعدہ کیا۔ مگر حضورؐ کو انصار کے جواب کا انتظار تھا جو اس وقت مہاجرین سے سہ چند زیادہ تھے۔ حضورؐ کا یہ انتظار محسوس کر کے مقداد بن عمرو (یا مقداد بن اسود) بولے کہ: یا رسول اللہؐ! ہم وہ بنی اسرائیل نہیں جنھوں

نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا کہ: اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون (تم اور تمہارا خدا جا کر جنگ کرو۔ ہم یہیں سے بیٹھے تماشا دیکھیں گے)۔ بخدا اگر حضورؐ ہمیں برک غماد تک بھی لے جائیں تو ہم وہاں بھی جانے کو حاضر ہیں ـــــ سعد بن معاذؓ نے کہا کہ ہم حضورؐ کے ہاتھ پہ سمع و طاعت کی بیعت کر چکے ہیں اور حضورؐ کی دعوت پر ایمان لا چکے ہیں۔ خدا کی قسم ہمیں اگر سمندر میں بھی کودنا پڑا تو ہم میں سے کوئی پیٹھ نہ دکھائے گا۔

حضورؐ یہ جواب سن کر خوش ہوئے اور جیش اسلامی روانہ ہو کر ایک مقام پہ فروکش ہوا۔ آج ماہ رمضان کی سترھویں تاریخ تھی اور جمعے کا دن تھا۔ یہ میدانِ بدر تھا جہاں بدر نبوت اپنے تین سو تیرہ ستاروں کے ساتھ خیمہ زن ہوا۔ یہاں مختلف ذرائع سے معلوم ہو گیا تھا کہ لشکر قریش دوسری جانب یہیں پڑاؤ ڈال چکا ہے۔ ابن اسحٰق کی روایت کے مطابق اس قریشی لشکر میں تقریباً ایک ہزار نبرد آزما تھے جن میں چھ سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑے تھے۔ نو دس اونٹ روزانہ ذبح کیے جاتے تھے۔

حضورؐ نے اس میدان میں ایک جگہ منتخب فرمائی تو ایک صحابی حباب بن منذر بن جموح نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا یہ جگہ حضورؐ نے خدا کے حکم سے پسند فرمائی ہے جس میں کوئی رد و بدل نہ ہو سکے یا جنگی تدبیروں کے متعلق حضورؐ کی اپنی رائے ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: یہ اپنی صوابدید ہے جنگی تدبیر کے مطابق ـــــ حباب نے عرض کیا کہ فلاں جگہ جو پانی سے قریب بھی ہے زیادہ موزوں ہے۔ وہاں کے نشیب میں ایک حوض بنا کر ہم نالی کے ذریعے سارا پانی کھینچ سکتے ہیں۔ حضورؐ نے حباب کی رائے کو مان لیا اور انہیں کی بتائی ہوئی رائے پر عمل فرماتے ہوئے جگہ بدل لی۔

لمحۂ فکریہ

یہ روایت ابن اسحٰق کی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے اور غلط ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تو اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں جو بڑے اہم ہیں:

۱۔ حضورؐ ہر بات وحی سے ہی نہیں فرمایا کرتے تھے اس لیے حضورؐ کے ہر قول و فعل کو جو احادیث میں موجود ہے غیر متبدل وحی قرار دینا یقیناً درست نہیں۔

۲۔ حضورؐ کی ہر رائے کا فنی طور پر صحیح ہونا ضروری نہیں۔ لہٰذا

۳۔ حضورؐ کی رائے سے اختلاف کرنا کوئی معصیت نہیں بلکہ حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (ان سے مشورہ کر لیا کیجیے) اور ظاہر ہے کہ مشورے میں حضورؐ کی رائے سے اتفاق اور اختلاف دونوں ہو سکتے ہیں اور ایسا بارہا ہوا ہے اور متعدد مواقع پر حضورؐ نے اپنی رائے پر دوسروں کی رائے کو ترجیح عطا فرمائی ہے۔ حضورؐ انسانوں کی حریتِ ضمیر کی جو نعمت بخشنا چاہتے تھے اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ حضورؐ جیسی شخصیت کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کا دروازہ بند نہ رہے۔

۴۔ وحی خداوندی کے آگے سب حتیٰ کہ خود حضورؐ بھی بے اختیار ہیں اسی لیے حباب بن منذر نے عرض کیا تھا کہ کیا یہ جگہ بحکم خداوندی پسند فرمائی ہے جس میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتی؟ حضورؐ کی تو بعثت ہی اس لیے ہوئی تھی کہ خود بھی وحی کی پابندی فرمائیں اور دوسروں کو بھی پابند بنائیں۔ دوسروں سے سے تو کسی وقت وحی سے بے اعتنائی کی غلطی ہونا ممکن ہے لیکن حضورؐ کے متعلق اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

۵۔ صحابہ عام طور پر سمجھ لیا کرتے تھے کہ حضورؐ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ وحی

سے فرما رہے ہیں یا وہ ذاتی رائے ہے۔ لیکن جب اس میں شبہہ ہوتا تو حباب بن منذر کی طرح دریافت کر لیتے تھے۔ وہ اپنی رائے اسی وقت دیتے تھے جب یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ حضورؐ کی اپنی رائے ہے۔ لیکن اگر حضورؐ بحیثیت رسول کے وحی سے کوئی بات فرماتے یا بحیثیت امیر امت حکم و امر (نہ کہ رائے)، فرماتے تو کسی کو مجالِ دم زدن نہ ہوتی کیونکہ یہ صریح کفر ہوتا۔

۶۔ اہلِ فکر کے لیے یہاں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے کہ اگر پڑاؤ کی جگہ پسند فرمانے کے متعلق کوئی قرآنی حکم نازل ہوا ہوتا تو بفحوائے بلّغ ما انزل الیک حضورؐ اسی وقت سب کو بتا دیتے اور حباب بن منذر اس سے بے خبر نہ ہو سکتے تھے اور نہ وہ حضورؐ سے دریافت کرتے کہ کیا یہ جگہ حکمِ خداوندی سے پسند فرمائی گئی ہے؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی قرآنی حکم تو یقیناً نازل نہیں ہوا تھا۔ پھر حبابؓ کا دریافت کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ کسی ایسی وحی کے بھی قائل تھے جو قرآنی وحی سے الگ نوعیت رکھتی تھی۔ عہدِ صحابہ میں تو اسے بآسانی معلوم کیا جا سکتا تھا لیکن اب جو ذخیرۂ روایات ہمارے سامنے موجود ہے اس میں بجز حضورؐ کی بعض پیشگوئیوں یا احادیث قدسیہ وغیرہ کے (وہ بھی اگر معیارِ صحت پر پوری اتریں) اور کسی حدیث کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حضورؐ کی غیر قرآنی وحی ہے چہ جائیکہ اسے مثلہ معہٗ قرار دیا جائے۔

(ان تمام مباحث کی تفصیل آپ کو "مقامِ سنت" میں ملے گی جو ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے شائع ہو چکی ہے)

ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ سعد بن معاذ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! ہم سب حضورؐ کے لیے ایک عریش (سائبان) نہ بنا دیں جس میں حضورؐ تشریف رکھیں؟ اس سے ہماری غرض یہ ہے کہ حضورؐ کے سامنے ہی ہم روانہ ہو کر دشمن کا مقابلہ

کریں گے۔ اگر اللہ نے فتح دی تو فبہا۔ اور اگر خدانخواستہ معاملہ کچھ اور ہوا تو حضورؐ کے لیے مدینے واپس تشریف لے جانا اس لیے ضروری ہوگا کہ وہاں کے مسلمانوں کو حضورؐ کی ذات ہم سے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اگر انہیں یہ علم ہوتا کہ حضورؐ کو جنگ پیش آئے گی تو وہ یقیناً حضورؐ کے ساتھ ہی چل پڑتے۔ سعد بن معاذ کے الفاظ یوں ہیں:

وَلَوْ ظَنُّوْا اَنَّكَ تَلْقٰى حَرْبًا مَّا تَخَلَّفُوْا عَنْكَ

(اگر انہیں یہ گمان ہوتا کہ حضورؐ کو جنگ پیش آئے گی تو وہ مدینے میں نہ رہتے بلکہ حضورؐ کے ساتھ ہی آجاتے)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی روانگی بدر جنگ کی غرض سے نہ تھی ورنہ سب کو اس کا علم ہو جاتا۔ یہ روانگی اسی قسم کی فوجی نقل و حرکت تھی جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ میدانِ بدر میں آنے کے بعد یہ صورتِ حال پیدا ہوگئی کہ اگر دشمنوں کو یہیں روک نہ دیا جاتا تو مدینے پر چڑھائی کا قوی اندیشہ تھا۔

قدرت کی طرف سے ایک امداد و انعام یہ ہوا کہ پانی برس گیا جس سے گرد بیٹھ کر زمین خوشگوار ہوگئی اور مسلمانوں کے حوض بھی پانی سے بھر گئے۔ قرآن مجید میں اس کا خاص طور پر یوں ذکر ہے کہ:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ

اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالانکہ تم بے سر و سامان تھے سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکرگذار رہو۔ جب کہ آپ مسلمانوں سے فرمارہے تھے کہ کیا تم کو یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد

منزلین ہ بلیٰ ان تصبروا وتتقوا ویأتوکم من فورھم ھٰذا یمددکم ربکم بخمسۃ الاف من الملٰئکۃ مسومین ہ وما جعلہ اللّٰہ الا بشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہٖ وما النصر الا من عند اللّٰہ العزیز الحکیم ہ لیقطع طرفا من الذین کفروا او یکبتھم فینقلبوا خائبین ہ لیس لک من الامر شیء او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظٰلمون۔

۳: ۱۲۳ تا ۱۲۸

کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ جو اتارے جاویں گے۔ ہاں کیوں نہیں اگر مستقل رہو گے اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آپہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوں گے اور اللہ تعالےٰ نے یہ امداد محض اس لیے کی کہ تمہارے لیے بشارت ہو تاکہ تمہارے دلوں کو قرار ہو جاوے اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں، حکیم ہیں۔ تاکہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا ان کو ذلیل و خوار کر دے پھر وہ ناکام لوٹ جاویں۔ آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالےٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائیں یا ان کو کوئی سزا دیدیں کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کر رہے ہیں۔

ادھر قریش نے عمیر بن وہب کو لشکر اسلامی کا اندازہ کرنے بھیجا۔ عمیر نے آکر بتایا کہ: مسلمان کم وبیش تین سو ہیں جن میں سے کوئی بھی کم از کم ایک دشمن کو مارے بغیر خود نہیں مرے گا۔ اس طرح اگر ہمارے تین سو آدمی مارے گئے تو ہماری زندگیاں بے مزہ ہو جائیں گی۔ یہ سن کر حکیم بن حزام سیدھا عتبہ بن ربیعہ کے پاس مشورے کے لیے گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ محض ایک شخص عمرو بن الحضرمی

کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کوئی بڑی خونریزی مناسب نہیں۔ بہتر ہے کہ اس کا خون بہا ادا کر دیا جائے اور سب لوگ یہاں سے واپس چلے جائیں۔ (اگر اہلِ اسلام خون بہا نہ دیں تو) یہ خون بہا اور دوسرے مالی نقصانات کی طرح میں (عتبہ) ادا کر دوں گا۔ کیونکہ میں ابن حضرمی کا حلیف ہوں۔ ابوجہل نے طنزاً کہا کہ عتبہ کا فرزند (   ) چونکہ مسلمانوں کے لشکر میں ہے اس لیے یہ جنگ سے کتراتا ہے۔ اس کے بعد ابوجہل نے عامر بن حضرمی کو اکسایا اور اس نے اپنے مقتول بھائی عمرو بن الحضرمی کی دہائی دینی شروع کی۔ اس دہائی پر عرب کے دستور کے مطابق سب سر بکف ہو کر میدان میں آ گئے اور عتبہ کو بھی تیار ہونا پڑا۔

ادھر حضورؐ نے خود لشکر اسلامی کی صف بندی فرمائی۔ حضورؐ ایک چھڑی کے اشارے سے صف بندی فرما رہے تھے۔ اتفاق سے سواد بن غزیہ (بنی عدی بن نجار کے حلیف) صف سے ذرا آگے ہو گئے۔ حضورؐ نے ان کے پیٹ میں چھڑی کی نوک لگا کر پیچھے کیا۔ اس پر سواد بولے کہ مجھے آپؐ نے تکلیف پہنچائی۔ آپؐ کو اگر خدا نے حق اور عدل لے کر بھیجا ہے تو مجھے بدلہ لینے کی اجازت دیجیے۔" اس وقت سواد کے جسم پر کوئی کرتا نہ تھا اس لیے حضورؐ نے فوراً اپنا شکم مبارک کھول کر سواد سے فرمایا کہ لو اپنا بدلہ لے لو۔" اللہ اللہ آج سے پہلے آسمان کی آنکھوں نے نہ سواد بن غزیہ جیسا "گستاخ" امتی دیکھا تھا اور نہ محمدؐ جیسا عادل انسان۔ صحابہ نے بھی یہ عجیب و غریب منظر کبھی نہ دیکھا ہو گا کہ سید الانبیاء اپنے ایک ادنیٰ امتی کے سامنے اپنی مطہر و مقدس ذات کو بدلہ لینے کے لیے پیش کر رہا ہے۔ جان نثاروں کی آنکھوں میں کس طرح خون اتر رہا ہو گا اس کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ بہت ممکن تھا کہ کسی صحابی

کی تلوار حرکت میں آجاتی اور میدان بدر میں پہلی لاش اسود ہی کی خاک و خون میں غلطاں نظر آتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سارے واقعات چٹ پٹ ہی ہو گئے اور صحابہ کے عالم تحیّر نے کسی اقدام کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے بھی چشم کائنات نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ ادھر حضورؐ نے اپنے نورانی شکم سے کرتا ہٹایا اور ادھر اسود دوڑ کر حضورؐ سے لپٹ گیا اور شکم مبارک کو بار بار بوسے دینے لگا۔ پھر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جنگ سر پر ہے اس لیے میری تمنا تھی کہ زندگی کی آخری سعادت اس طرح حاصل کروں کہ حضورؐ کے بدن سے میرا بدن مَس ہو جائے۔" حضورؐ نے اس کے بعد سواد کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ اے سواد! تو کتنا خوش بخت ہے اور کتنی مبارک ہیں تیری یہ حیلہ سازیاں۔

صف بندی کے بعد حضورؐ اپنے عریش میں واپس تشریف لے آئے۔ حفاظت کے لیے صرف سیدنا ابوبکرؓ تلوار لیے کھڑے رہے۔ اس دن (۱۶ر رمضان سنہ ۲ھ) شب کے وقت حضورؐ نے اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں شروع کیں۔ یہ ایک دعا تھی جو زبانِ رسالت سے کمالِ عاجزی اور کمالِ ناز کے ساتھ نکل رہی تھی۔ دعا کے یہ چند الفاظ ہی تھے جو ساری کائناتی قوتوں کو اپنی طرف سمیٹ رہے تھے۔ الفاظ یہ تھے:

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعدھا فی الارض۔ اللھم انجز لی ما وعدتنی۔ اللھم نصرک	بارالٰہا! اگر تو نے اس جماعت مومنین کو ہلاک کر دیا تو اس کے بعد اس زمین پر تیری بندگی کبھی نہ ہوگی۔ خداوندا جو وعدہ تو نے مجھ سے کیا ہے اسے پورا فرما۔ الٰہی تیری مدد درکار ہے۔

دعا کے وقت حضورؐ پر گریہ وزاری اور بے خودی کا عالم طاری تھا۔ بار بار دوش مبارک سے چادر سرک جاتی اور حضرت ابوبکرؓ اسے اٹھا کر پھر دوش پر رکھ دیتے۔ حضورؐ کا اضطراب اور گریہ و تضرع جناب ابوبکرؓ سے دیکھا نہ جاتا تھا اس لیے بار بار عرض کرتے کہ "یا رسول اللہؐ! اب بس کیجیے۔ اپنے آپ کو اتنا ہلکان نہ کیجیے۔ اللہ تعالیٰ اپنا وعدۂ مدد ضرور پورا کر کے رہے گا۔" آخر خدائی وعدہ صریح لفظوں میں یوں نازل ہوا:

سیھزم الجمع ویولون الدبر ۵۴:۴۵ یہ دشمن شکست کھا کر بھاگیں گے

حق و باطل کا پہلا معرکہ

آج ۱۷ رمضان ۲ھ کی صبح ہے اور حق و باطل کا پہلا معرکہ میدانِ بدر میں شروع ہو رہا ہے۔ حضورؐ نے عین اس موقعے پر بھی انسانی اقدار کو ملحوظ رکھا اور حکم دیا کہ آغاز مسلمانوں کی طرف سے نہ ہو۔ صفیں دونوں طرف آراستہ ہو گئیں تو سب سے پہلے اسود بن عبدالاسد مخزومی یہ قسم کھا کر نکلا کہ:
"میں مسلمانوں کے حوض میں سے پانی پیوں گا یا اسے ڈھا دوں گا ورنہ پھر جان دیدوں گا۔" جب یہ آگے حوض کی طرف بڑھا تو سیدنا حمزہؓ نے اس کی طرف لپک کر اس کے پاؤں پر زخم لگایا۔ وہ پیٹھ کے بل گرا مگر فوراً اٹھ کر تیزی سے حوض کی طرف گھسٹتا ہوا لپکا مگر حضرت حمزہؓ نے عین حوض کے کنارے ہی پر اس کا کام تمام کر دیا۔

اس کے بعد عتبہ بن ربیعہ اپنے دونوں بھائیوں — شیبہ اور ولید —

کو لے کر میدان میں نکلا اور دعوتِ مبارزت دی۔ ان کے مقابلے کے لیے تین انصاری ــــ معاذ بن حارث اور عوف بن حارث اور عبداللہ بن رواحہ ــــ نکلے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مقابلے میں آنے والے انصار ہیں تو انہوں نے متکبرانہ انداز سے کہا کہ: "تم ہمارے جوڑ کے نہیں ہو۔ ہماری قوم (قریش) کے آدمیوں کو بھیجو۔" اس پر حضورؐ نے عُبَیدہؓ بن حارث، حمزہؓ بن عبدالمطلب اور علیؓ بن ابی طالب کو بھیجا۔ تھوڑے سے مقابلے کے بعد حمزہؓ نے عتبہ کو اور علیؓ نے ولید کو ڈھیر کر دیا۔ عبیدہؓ کو شیبہ نے زخمی کر دیا مگر حمزہؓ یا علیؓ نے لپک کر ایک ہی وار میں شیبہ کو ختم کر دیا۔ عبیدہؓ اپنے زخم سے جانبر نہ ہو سکے۔ غزوۂ بدر کے کئی دنوں کے بعد آپ نے وفات پائی۔ آخری وقت میں آپ نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ: "میں درجۂ شہادت سے محروم تو نہیں رہا؟ حضورؐ نے فرمایا کہ تم شہید ہو۔"[1]

پھر عبیدہ بن سعید بن عاص دشمنوں کی صف سے نکلا۔ یہ لوہے میں غرق تھا۔ مقابلے کے لیے زبیر بن عوام آگے بڑھے مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس پر کس طرف سے وار کیا جائے کیونکہ کوئی جگہ آہن پوشی سے خالی نہ تھی۔ حضرت زبیر کو اس کے خود میں سے آنکھیں نظر آئیں اور یہی جگہ لوہے سے خالی نظر آئی۔ آپ نے

---

(۱) جو قتال فی سبیل اللہ میں مارا جائے اسے قتیل یا مقتول فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ اور شہید اسے کہتے ہیں جس کا عمل اس حقیقت کی شہادت دے کہ اس کی زندگی اور موت سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔ لہٰذا شہید صرف وہی نہیں جو راہِ خدا میں مارا جائے۔ زندہ بھی شہید ہے بشرطیکہ اس کی زندگی خدا کے لیے ہو۔ قرآن نے لفظ شہید کو ان معنوں میں نہیں لیا ہے جن میں ہم لیتے ہیں۔ مقتول فی سبیل اللہ کے ساتھ شہادت کو مخصوص کر دینا بعد کی اصطلاح ہے۔ اسی لیے حضورؐ نے عبیدہؓ کو شہید فرمایا۔ یا ممکن ہے خود راوی کا اپنا لفظ ہو۔

ایسی ہوشیاری اور چابک دستی سے برچھی ماری کہ آنکھ کو چھیدتی ہوئی اندر گھس گئی اور عبیدہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ برچھی کو باہر نکالنے کے لیے آپ کو اس کے سر پر پاؤں رکھ کر زور سے کھینچنا پڑا۔ یہ برچھی حضورؐ نے زبیرؓ سے مانگ لی تھی جو یکے بعد دیگرے خلفائے راشدین کے پاس بھی رہی اور پھر عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس واپس آ گئی۔

عبیدہ بن سعید کے مارے جانے کے بعد گھمسان قسم کے حملے شروع ہو گئے اس لیے اس کی صحیح ترتیب نہیں بیان کی جا سکتی تاہم جستہ جستہ واقعات محفوظ ہیں۔

یہاں ایک چیز پیش نظر رکھنی چاہیے کہ دشمنوں کی صف میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کئی وجوہ سے جنگ کرنا نہیں چاہتے تھے اور وہ محض اوپر کے دل سے مجبوراً شریک ہو گئے تھے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے تھے جو دل سے حضورؐ کی صداقت کے قائل تھے لیکن اظہار کا موقع نہ پا رہے تھے۔ بعض وہ تھے جو اپنی قومی ہاشمی عصبیت کی وجہ سے حضورؐ کا مقابلہ نہ کرنا چاہتے تھے مثلاً عباس، عقیل، نوفل وغیرہ۔ اور چند ایسے بھی تھے جو کفر کے باوجود شرافتِ نفس کا جوہر اپنے اندر رکھتے تھے۔ انہیں میں ابوالبختری بن ہشام بھی تھا۔ یہ وہی شریف انسان تھا جس نے شعب ابی طالب کا ظالمانہ محاصرہ و مقاطعہ ختم کرنے میں ابوجہل کی کوئی پروا نہ کی اور ایک مسلح جماعت کے ساتھ جا کر سارے بنی ہاشم کو اس گھاٹی سے باہر لے آیا۔ حضورؐ نے ایسے تمام افراد کی نشاندہی فرما دی تھی جو محض اوپر کے دل سے شریک جنگ تھے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا کہ ان میں سے جو ملے اسے قتل نہ کرنا کیونکہ یہ جبراً لائے گئے ہیں۔

مگر ہوا یہ کہ مجذر بن زیاد انصاری سے دورانِ جنگ میں ابوالبختری کی

ملاقات ہوئی تو مجذرؓ نے کہا کہ حضورؐ نے تیرے قتل سے منع کیا ہے (اس لیے تجھے زندہ گرفتار کروں گا ورنہ مقابلے سے ہٹ جا) ۔ ابوالبختری نے کہا کہ اگر مجھے چھوڑتے ہو تو میرے ساتھی (جنادہ بن ملیحہ اللیثی) کو بھی چھوڑ دو۔ مجذرؓ نے کہا کہ حضورؐ نے صرف تیرے ہی بارے میں قتل سے باز رہنے کا حکم دیا ہے نہ کہ تیرے ساتھی کے بارے میں۔ ابوالبختری نے کہا کہ پھر میں بھی لڑ کر مروں گا کیونکہ میں قریش کی عورتوں کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری اپنے ساتھی کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ گیا۔

اس کے بعد دونوں میں جنگ ہوئی اور ابوالبختری مارا گیا۔ پھر مجذرؓ نے آ کر حضورؐ سے سارا قصہ بیان کیا۔

ایک دوسرا واقعہ اُمیہ بن خلف کے قتل کا ہے۔ اس سے عبدالرحمٰن بن عوف کا کبھی معاہدہ ہوا تھا کہ وہ مکے میں ان کی اور یہ مدینے میں اس کی حفاظت کریں گے بدر کے معرکے میں امیہ بھی آیا ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ میں ان عہود کی کہیں پابندی نہیں کی جاتی خصوصاً اس صورت میں کہ معاہدہ قومی نہ ہو بلکہ محض انفرادی ہو لیکن حضور اکرمؐ کی بعثت کا مقصد اعلیٰ انسانی اقدار کو قائم کرنا تھا۔ اس لیے عبدالرحمٰنؓ خاموشی کے ساتھ اسے لے کر ایک پہاڑی پر چڑھ گئے تاکہ اس کی حفاظت کا عہد پورا کریں۔ اس کا ایک فرزند بھی اس کے ساتھ تھا۔ کہیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے دیکھ لیا۔ اور انصار کو آواز دی اور چند انصاری اس کے پیچھے لپکے۔ عبدالرحمٰن نے بہتیری کوشش کی مگر انصار نے ایک نہ سنی۔ پہلے اس کے فرزند کو قتل کیا۔ اس کے بعد امیہ کی طرف بڑھے تو عبدالرحمٰن اسے لٹا کر اس پر اوندھے گر گئے تاکہ کسی طرح ان کی جان بچا کر اپنا عہد پورا کریں۔ مگر انصار نے ان کے نیچے سے تلواریں داخل کر کے اسے قتل کر دیا۔ اس کش مکش میں خود عبدالرحمٰن کا ایک پاؤں بھی زخمی ہو گیا۔ اُمیہ

مدینے میں نہ تھا جو عبدالرحمٰن پر اس کی حفاظت لازم ہوتی۔ نیز یہ معاہدہ صرف عبدالرحمٰن سے تھا انصار سے نہ تھا۔ اس کے باوجود عبدالرحمٰن نے آخر وقت تک اس کی جان بچانے کی کوشش کی۔ یہ ہیں وہ اخلاقی قدریں جن کی محافظت جنگ کے میدان میں بھی کی گئی۔ بلالؓ اسی امیہ بن خلف کے غلام تھے اور آزاد ہونے کے وقت تک اس نے بلالؓ پر ظلم و ستم کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اسی لیے بلالؓ نے انصار کو اس کا پتہ نشان بتا دیا۔ اگر بلالؓ ایسا نہ کرتے تو حضرت عبدالرحمٰن اس بدترین دشمنِ اسلام کی جان بچا کر اپنا عہد پورا کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اسی معرکۂ بدر میں ابوجہل بھی مارا گیا۔ دو نوجوان ——— معاذ اور معوذ[1] ——— اس معرکے میں شریک تھے۔ ان کے والد کا نام حارث اور ماں کا نام عفراء ہے۔ ان دونوں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے ابوجہل کا پتہ پوچھا اور کہا کہ یہ بدبخت حضورؐ کی شان میں گستاخی کرتا ہے اس لیے آج یا یہ نہیں ہوگا یا ہم نہیں ہوں گے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے جب اشارے سے بتایا کہ "وہ ہے ابوجہل" تو یہ دونوں باز کی طرح جھپٹے اور تھوڑی دیر میں ابوجہل خاک پر تھا۔ عکرمہ بن ابی جہل نے عقب سے حملہ کیا اور ایک وار میں معاذ کا بایاں بازو کٹ کر ایک تسمے کے سہارے لٹک گیا مگر معاذ اسی حالت میں لڑتے رہے۔ پھر ان کو محسوس ہوا کہ یہ بازو قتال فی سبیل اللہ میں کچھ کام نہیں کر رہا بلکہ کچھ رکاوٹ سا بن رہا ہے۔ لہٰذا اسے اپنے پاؤں سے دبا کر الگ کر دیا۔

ان بڑے بڑے قریشی سورماؤں کے مارے جانے سے لشکرِ قریش میں

---

(۱) بعض روایتوں میں ان کی جگہ معاذ بن عمرو بن جموح کا نام ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔

تھڑولی اور مایوسی پیدا ہوگئی اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مسلمانوں نے یہ آثار دیکھے تو ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ پھر انھوں نے دشمنوں کو اسیر بھی کرنا شروع کیا۔

اسی دوران میں حضورؐ کے حکم سے عبد اللہ بن مسعود ابو جہل کی لاش کی تلاش میں نکلے۔ دیکھا کہ ایک جگہ پڑا سسک رہا ہے۔ ابن مسعود نے تلوار کو اس کے سر پر رکھ کر اس کا سر کاٹنا چاہا تو وہ بولا: اوچرواہے یہ کیا حرکت ہے؟ آپؓ نے کہا آج تجھ جیسے دشمن خدا کو خدا نے رسوا کیا ہے۔ اس کے بعد جب سر کاٹنے لگے تو اس نے کہا کہ میری گردن نیچے سے کاٹو تاکہ اس کے بعد بھی سر ذرا بلند رہے)۔ جب ابن مسعود نے اس کا سر لاکر حضورؐ کے قدموں میں ڈالا تو حضورؐ نے فرمایا: یہ تھا اس امت کا فرعون۔

اس جنگ میں چھ مہاجر اور آٹھ انصار شہید ہوئے۔ دشمنوں میں تقریباً ستر مارے گئے اور اتنے ہی اسیر ہوئے۔ ان مقتولین میں گیارہ وہ تھے جو دارلندوہ میں حضورؐ کو قتل کرنے کی سازش میں شریک تھے۔ یہ چودہ تھے جن میں سے گیارہ بدر میں مارے گئے اور باقی بالآخر اسلام لے آئے۔

جنگی قیدیوں میں حضورؐ کے چچا عباس بن عبد المطلب بھی تھے حضورؐ کے عمزاد بھائی عقیل بن ابی طالب بھی تھے۔ حضورؐ کے داماد ابو العاص بھی تھے۔ نوفل بھی تھے اور جادو بیان خطیب قریش سہیل بن عمرو بھی تھے۔ جب قیدیوں کا معاملہ مشورے کے لیے سامنے آیا تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا کہ: ان سبھوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا جائے۔ عام صحابہ کی بھی یہی رائے تھی اس لیے کہ یہ سارے قیدی گویا اپنے ہی بھائی بند تھے۔ نیز مسلمانوں کی کچھ معاشی ضرورتیں زر فدیہ سے پوری ہوسکتی تھیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ رائے دی کہ: یہ سب کفر کے لیڈر ہیں اس لیے ان کی گردنیں اڑادی جائیں۔ حضورؐ نے عام رجحان کے مطابق یہ فیصلہ فرمایا کہ ان

سے فدیہ لے کر انہیں رہا کر دیا جائے۔

ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو زر فدیہ ادا کر سکتے تھے اور چند ایسے بھی تھے جو ابھی اس کا موقع نہ رکھتے تھے۔ ان کے لیے جو فدیہ مقرر کیا گیا وہ ایسی چیز ہے جو رہتی دنیا تک ہر تشنۂ علم کے لیے شمع ہدایت بنی رہے گی۔ رسول امیؐ نے فیصلہ فرمایا کہ ایسے غیر مستطیع قیدی کے لیے فدیہ یہ ہے کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

اس روایت سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

(الف) یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ عرب خصوصاً اہل مکہ بالکل جاہل اور ان پڑھ تھے وہ صحیح نہیں۔ پڑھنے لکھنے کا بہت عام رواج تھا ورنہ ان قیدیوں میں سے کوئی بھی تو کہتا کہ میں بچوں کو نوشت و خواند نہیں سکھا تا کیونکہ میں خود ان پڑھ ہوں۔

(ب) اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تعلیم کا مسئلہ حضورؐ کی نگاہوں میں کتنی اہمیت رکھتا تھا۔

(ج) اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسیروں یا قیدیوں سے فدیہ لیتے وقت ان کی مختلف حیثیتوں اور متفاوت صلاحیتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ آگے معلوم ہوگا کہ جن لوگوں سے زر فدیہ لیا گیا وہ خود اپنی مقدار میں مختلف تھا۔ کسی پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالا گیا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔

قیدیوں کے ساتھ آج بھی مہذب ممالک میں منتقمانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن حضورؐ جو اعلیٰ اقدار قائم فرمانا چاہتے تھے اور مواقع جنگ پر بھی ان اقدار کو برقرار رکھنا چاہتے تھے ان کے اظہار کا آج یہ پہلا موقع ہے جب کہ

قیدیوں پر نہ فقط یہ کہ استطاعت سے باہر بوجھ نہیں ڈالا جاتا اور کوئی منتقمانہ کارروائی نہیں کی جاتی بلکہ ان قیدیوں کا بیان ہے کہ "یہ مسلمان خود سوکھی کھجوروں پر گزارا کر لیتے تھے اور ہمیں پکی ہوئی روٹیاں کھلاتے تھے۔ ہمیں ندامت ہوتی اور ہم انہیں روٹیاں واپس کرنا چاہتے تو وہ انکار کر دیتے۔

لمحۂ فکریہ

ذرا سوچیے کہ اہلِ اسلام تیرہ سال تک مکے میں انتہائی مظلومیت کی زندگی بسر کرتے رہے اور آخر کار گھر بار اور املاک سے محروم کر کے نکال دیے گئے۔ مدینے پہنچنے کے بعد بھی انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا۔ اس کے بعد کفر و اسلام کا پہلا مقابلہ ہوا جس میں کفر کو شکست فاش ہوئی۔ جو بھاگ گئے یا مارے گئے ان کا یہاں کوئی سوال ہی نہیں۔ لیکن جو قیدی ہاتھ آئے تھے ان سے انتقام لینے کا آج سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا؟ اگر انتقامی کارروائیاں کی جاتیں تو یہ عام تقاضائے بشریت ہوتا۔ لیکن انتقام تو الگ رہا یہاں تو خود خشک کھجوریں کھا رہے ہیں اور قیدیوں کو پکی پکائی روٹیاں کھلا رہے ہیں۔ ان کا مقصد نہ حصول اقتدار تھا نہ اقتدار کے نشے میں کوئی منتقمانہ کارروائی کرنی۔ ان کو جو تعلیم دی گئی اور جسے پھیلانا ان کا مقصد تھا وہ انسانی اقدار کے قیام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انہی اقدار میں قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا بھی تھا۔

صرف کھانے کا خیال نہیں رکھا گیا بلکہ جن لوگوں کو کپڑوں کی ضرورت تھی انہیں حضورؐ نے کپڑے بھی دیے۔ عباس بن عبدالمطلب ذرا دراز قامت تھے ان کے جسم پر کوئی کرتا ٹھیک نہ آیا تو راس المنافقین عبداللہ ابن اُبی بن سلول سے کرتا لے کر انہیں دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس منافق کے مرنے کے

بعد حضورؐ نے جو اپنا قمیص مبارک اتار کر اسے کفنانے کے لیے دیا وہ درحقیقت اس کے اسی احسان کا بدلہ تھا۔

جب ذی استطاعت قیدیوں سے زرِ فدیہ وصول کیا جانے لگا تو قیدیوں کے رشتے داروں نے مطلوبہ رقمیں بھجوائیں یا جن کے پاس رقم موجود تھی انھوں نے خود ہی ادا کر دی۔

آپ اوپر یہ پڑھ چکے ہیں کہ حضورؐ کی صاحبزادی سیدہ زینبؓ کو ان کے شوہر ابوالعاص نے مکے میں روک لیا تھا اور حضورؐ کے پاس مدینے میں نہ جانے دیا۔ اب جو ابوالعاص قید ہوئے اور ان سے زرِ فدیہ طلب کیا گیا تو ان کے پاس وہ موجود نہ تھا۔ لہٰذا ان کا زرِ فدیہ حضرت زینبؓ نے مکے سے بھجوایا۔ اس رقمِ فدیہ میں حضرت زینبؓ نے ایک قیمتی ہار بھی بھیجا تھا۔ یہ وہ ہار تھا جو سیدہ خدیجہؓ کے ترکے میں حضرت زینبؓ کو ملا تھا۔ حضورؐ کی نظر جب اس ہار پر پڑی تو وہ رفیقۂ حیات یاد آ گئی جو اس سقفِ آسمانی کے نیچے سب سے پہلے ایمان لائی تھی اور جس نے حضورؐ کی رفاقت میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ آہ دنیا میں کب کہیں یہ موقع آیا ہو گا کہ بیٹی اپنے شوہر کو رہا کرانے کے لیے اپنی ماں کا ترکہ اپنے باپ کے پاس بھیج رہی ہے۔ یہ منظر کتنا دلسوز ہو گا اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ حضورؐ کی نظر ہار پر پڑی تو سراپا اخلاص خدیجہؓ یاد آ گئیں اور چشمانِ مبارک آبدیدہ ہو گئیں۔

ذرا اس کشمکش کا اندازہ کیجیے کہ ایک طرف رفیقۂ حیات کی یاد اور بیٹی کی محبت جذباتِ بشری کو ابھار رہی ہے کہ ساری کائنات بیٹی کے حوالے کر دو اور دوسری طرف تقاضائے عدل، مقتضائے جمہوریت، احترامِ قانون اور ایک اعلیٰ نصب العین کی راہ میں قربانیاں دینے والے جاں نثاروں کا

لازمی لحاظ مجبور کر رہا ہے کہ جو برتاؤ غیروں کے ساتھ ہو وہی اپنوں کے ساتھ بھی ہو اور قرابتی دلداری پر رفقا کی دلداری کو ترجیح دو ــــ اگر حضورؐ اشارۃً بھی اپنی طرف سے حکم دیدیتے کہ یہ ہار اور سارا زرِ فدیہ واپس کر دیا جائے اور ابوالعاص کو یوں ہی رہا کر دیا جائے تو کون بدبخت تھا جو حضورؐ کے اس حکم سے انکار کر دیتا؟ مگر حضورؐ نے اپنے بشری جذبات پر قومی عدل کو اور ذاتی حکم پر اقدارِ جمہوریت کو ترجیح دی اور صحابہ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو یہ ہار ــــ ماں کا ترکہ ــــ بیٹی کو واپس کر دیا جائے۔ سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا، ہارِ زینبؓ کو واپس کر دیا گیا اور ابوالعاص رہا ہو کر چلے گئے اور حضرت زینبؓ کو مدینے جانے کی اجازت دیدی۔

سچ پوچھیے تو یہ عنایت بھی محض بیٹی کی خاطر نہ تھی۔ اس میں ایک بڑی مصلحت اور تھی جسے صرف پیغمبر کی عقابی نظریں ہی دیکھ سکتی تھیں۔ بدر کے چند سال بعد یہی ابوالعاص شام سے ایک قافلۂ تجارت لے کر واپس آ رہے تھے کہ مسلمانوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مسلمانوں نے ان کے تمام مال و اسباب لے کر آپس میں بانٹ لیے۔ حضورؐ کو علم ہوا تو یہ انتقامی کارروائی پسند نہ آئی کیونکہ بظاہر یہ فی سبیل اللہ کسی اعلیٰ نصب العین کی راہ میں نہ تھی، اس لیے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو ابوالعاص کا مال ان کو واپس کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ مال تنہا ابوالعاص کا نہ ہو گا بہت سے افراد اس میں شریک ہوں گے اور ان سب کے مال و اسباب کے ذمے دار ابوالعاص ہی ہوں گے۔ بہرکیف حضورؐ کے حکم کے آگے سب نے سرِ تسلیم جھکا دیا اور ایک ایک تنکا لا کر ابوالعاص کو واپس کر دیا۔ ابوالعاص مکے آئے تو تمام لوگوں کو ان کا مال و اسباب واپس کر کے اپنا حساب کتاب بالکل بے باق کر دیا اور مکے سے روانہ ہو کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تاکہ کوئی یہ نہ

کہہ سکے کہ ابوالعاص ہزار کی رقم لے کر فرار ہو گئے۔ مدینے پہنچ کر وہ اسلام لے آئے۔ یہ تھا وہ کردار نبوی جس کے صدقے میں ابوالعاص کو اسلام کی دولت نصیب ہوئی۔ محض ایک داماد کی جانب دارانہ ہمدردی کا معاملہ نہ تھا۔ ادھر اہل اسلام کو یہ اعلیٰ تعلیم دی کہ کسی کو کمزور پاکر لوٹ لینا اور اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنا کوئی جہاد فی سبیل اللہ نہیں اور ادھر اپنی بلند کرداری سے ابوالعاص کو اس طرح متاثر کیا کہ ہار واپس کیا تو زینبؓ کو مدینے جانے کی اجازت مل گئی اور مال تجارت واپس کیا تو وہ دولتِ اسلام سے مالا مال ہو گئے۔ حضورؐ کی یہ عنایت صرف ابوالعاص ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھی جسے نعوذ باللہ داماد کی پاسداری سے تعبیر کیا جائے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ ایسے بہتیرے مواقع آئے ہیں جہاں اپنوں اور بیگانوں سبھوں کے ساتھ حضورؐ نے ایسی ہی دریا دلی فرمائی ہے اور اس کا مقصد تالیفِ قلب کے سوا کچھ نہ تھا۔

سب سے بڑی اور قابلِ توجہ بات تو یہ ہے کہ حضورؐ نے سارے مسلمانوں کی جان و مال کے واحد متصرف ہونے کے باوجود یہ نہ کیا کہ محض اپنا حکم چلایا ہو اور دوسرے یاروانصار کی دل شکنی کی پروا نہ کی ہو۔ سرکارِ دوعالم کی یہی وہ دلداریاں ہیں جنہوں نے فداکاروں کو اور زیادہ فداکار بنا دیا۔

بدر کے قیدیوں میں خطیب قریش سہیل بن عمرو بھی تھے (جو آگے چل کر ۶ھ میں بموقع صلح حدیبیہ سفیر قریش بن کر آئے) یہ اپنے زورِ خطابت سے قبائل میں آگ لگا دیتے تھے اور حضورؐ کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ سہیل کے سامنے کے دانت تڑوا دیے جائیں تاکہ ان کی طلاقتِ لسانی ختم ہو جائے۔ مگر نگاہِ نبوت جس طرح ابوالعاص کے مستقبل کو دیکھ رہی تھی اسی طرح سہیل کے آنے والے دن کو بھی

ملاحظہ کر رہی تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: نہیں ان کے دانت یوں ہی رہنے دو شاید اللہ تعالیٰ آئندہ ان سے کوئی اچھا کام لے لے۔ چنانچہ وفات نبوی کے بعد جس مضمون کا خطبہ حضرت صدیق اکبرؓ نے مدینے میں دے کر لوگوں کے ہوش و حواس بجا کر لئے بالکل اسی مضمون کا خطبہ سہیل بن عمرو نے مکّے میں دیا اور ارتداد کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو یہ کہہ کر روک دیا کہ: "مکّے والو! تم نے اسلام لانے میں بڑی تاخیر سے کام لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ارتداد میں تقدیم کی غلطی کر بیٹھو"۔

انہیں قیدیوں میں عباس، عقیل اور نوفل بھی تھے۔ حضورؐ نے عباس سے خود ان کا اور ان کے دونوں برادر زادوں ——— عقیل اور نوفل ——— کا فدیہ طلب فرمایا۔ عباس نے کہا کہ میرے پاس رقم فدیہ کہاں ہے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں قریش سے بھیک مانگتا پھروں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ: "چچا جان! وہ سونا کیا ہوا جو تم نے اپنی بیوی (ام الفضل) کے پاس چپکے سے رکھوایا تھا اور کہا تھا کہ لڑائی سے اگر میں واپس نہ آسکوں تو یہ سونا تمہارے اور بچوں (عبد اللہ، عبید اللہ، قاسم اور فضل وغیرہ) کے کام آئے گا۔" حضورؐ کا ارشاد سوال کی صورت میں بالکل واقعے کے مطابق تھا اور اس واقعے کی خبر بجز عباس اور ان کی بیوی کے کسی کو نہ تھی۔ آج حضورؐ کی زبان سے یہ غیبی اطلاع عباس کو متاثر کیے بغیر نہ رہ سکی، اور وہ بے ساختہ کلمۂ شہادت پڑھ اٹھے۔ اس سے پہلے بھی عباس حضورؐ کے پاسداروں ہی میں تھے لیکن اس کی بنیاد صرف حمیتِ جاہلیہ تھی۔ مگر آج یہ ایمانی بنیاد میں تبدیل ہو گئی۔

ان قیدیوں میں عقبہ، نضر اور طعمہ کے سوا کوئی قتل نہیں کیا گیا۔

حق و باطل کا یہ پہلا معرکہ تھا جس میں حق کو فتح مبین اور باطل کو شکست فاش ہوئی۔ اس قومی و اجتماعی مسرت کے ساتھ حضورؐ کو ایک صدمہ بھی اٹھانا پڑا۔

حضورؐ بدر سے واپس تشریف لائے تو حضورؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہؓ زوجۂ عثمان غنیؓ نے رحلت فرمائی۔ مدینے سے روانگی کے وقت یہ بیمار تھیں اور انہیں کی تیمارداری کے لیے حضرت عثمانؓ غزوۂ بدر کی شرکت نہ فرما سکے۔ حضرت رقیہؓ ہجرتِ حبشہ میں بھی حضرت عثمانؓ کی شریک تھیں اور ہجرتِ مدینہ میں بھی۔ ان کا شمار مومنین اولین میں تھا۔ اس لیے حضورؐ کو خونی اور دینی دونوں طرح کے صدمے ہوئے لیکن اس صدمے کو حضورؐ نے کوئی ذاتی صدمے سے متجاوز نہ ہونے دیا۔ اسے قومی صدمہ نہ بننے دیا اور فتح بدر کی قومی خوشی کو اس صدمے پر غالب رکھا۔ یوں بھی اسلام وقفِ غم و ماتم ہونے کا حامی نہیں اسی لیے اس نے جو دینی تقریبات رکھی ہیں وہ خوشی (عید) کی ہیں۔ غم کے کسی بڑے سے بڑے حادثے کو بھی تقریبِ غم کی حیثیت نہیں دی۔

قرآن اور غزوۂ بدر

چونکہ غزوۂ بدر حق و باطل کا پہلا معرکہ تھا اور حق نے شاندار فتح حاصل کی تھی اس لیے قرآن نے اس کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان تمام آیات کی اگر وضاحت کی جائے تو الگ ایک بڑی ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ لیکن ہمیں چونکہ ان آیات کی تفسیر لکھنی مقصود نہیں اس لیے ہم صرف چند ضروری نکات کا ذکر کریں گے۔

۱۔ ایک آیت کی شانِ نزول میں غلطی:

سیرت نگاروں کے علاوہ اہل تفسیر بھی لکھتے ہیں قیدیانِ بدر کے بارے میں حضرت عمرؓ نے سب کو قتل کرنے کی رائے دی تھی اور باقی لوگوں نے فدیہ لیکر چھوڑ دینے کی رائے دی تھی اور یہی فیصلہ حضورؐ نے دیا — یہاں تک تو بات درست ہے اور اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ یہ

آیت عتاب نازل ہوئی جس میں بتایا گیا کہ عمرؓ ہی کی رائے درست تھی اور فدیہ لینے کی رائے غلط تھی۔ وہ آیت عتاب یہ ہے:

ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض ط تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرۃ ط واللہ عزیز حکیم ۞ لولا کتب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم ۞ (القرآن)	کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں کہ اس کی منفعت کے لیے قیدی رہ جائیں تا آنکہ وہ زمین پر غالب نہ ہو جائے۔ تم لوگ دنیا کا مال چاہتے ہو حالانکہ اللہ آخرت (انجام) چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے اگر اللہ کی طرف سے مشیئت سبقت نہ کر چکی ہوتی تو جو تم کرنے لگے تھے اس کی بڑی سزا میں تم گرفتار ہو جاتے۔

ہمارے مفسرین و اہل سیر سے یہاں چند فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ پہلے وہ سن لیجیے:

۱۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ یثخن فی الارض میں اثخان کے معنی انہوں نے خونریزی کے لے لیے اور نتیجہ یہ نکالا کہ قیدیانِ بدر کو قتل کر دینا چاہیے تھا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ کی رائے صحیح تھی۔ تعجب ہے کہ سیرۃ النبی کے مؤلف نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بغیر اچھی طرح خونریزی کرنے کے" ..... اور دوسری جگہ ہے "تا آنکہ خوب زمین میں لڑ نہ لے" ..... حالانکہ اثخان کے معنی نہ لڑنے کے ہیں نہ قتل کرنے کے۔ اس کے معنی ہیں کسی کو کمزور کر دینا اور اس پر غالب آجانا۔ اس کی تائید خود قرآن سے ہوتی ہے جہاں سورۂ محمدؐ میں فرمایا گیا ہے:

حتی اذا اثخنتموھم فشدوا	یہاں تک کہ جب تم ان پر غالب آجاؤ تو

الوثاق ..... انہیں قید کر لو

ذرا سوچنے کی بات ہے اگر اثخان کے معنی قتل کرنے کے لیے جائیں تو یہ حکم کتنا بے جوڑ ہو جائے گا کہ "جب انہیں قتل کر چکو تو انہیں قید کر لو" غرض اس آیت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ جب تک دشمن کا زور اچھی طرح نہ توڑ دو اس وقت تک قیدیوں کو حصولِ زر کا ذریعہ نہ بناؤ کیونکہ تمہارا مقصد حصولِ زر نہیں بلکہ غلبۂ دین ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسری غلطی یہ ہوئی ہے کہ اہل سیر و تفسیر نے اس آیت کو قیدیانِ بدر پر چسپاں کر دیا ہے اور اس کی تائید میں روایتیں بھی بن گئی ہیں۔ حالانکہ اس کا تعلق قیدیانِ بدر سے نہیں بلکہ ابوسفیانی قافلۂ تجارت سے ہے جس کا تفصیلی ذکر اوپر آ چکا ہے اور جسے قرآن نے احدی الطائفتین اور غیر ذات الشوکۃ کہا ہے جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں بعض مسلمانوں کی یہ خواہش تھی کہ ابوسفیانی قافلۂ تجارت میں ایک تو چالیس آدمی ہیں اور دوسرے مال و اسباب بے اندازہ ہے۔ اگر سو مسلمان بھی نکل کھڑے ہوں تو ان کو گھیر کر مال و اسباب آسانی سے لوٹ لیں گے اور باقیوں کو قیدی بنا لیں گے۔ پھر انہیں قیدیوں کے ذریعے بے شمار زرِ فدیہ بھی ہاتھ آ جائے گا۔ ان مسلمانوں کی تجویز دنیا (عرض الدنیا) کے لحاظ سے تو بڑی پُرکشش اور درست تھی لیکن اسلام کے بلند ترین نصب العین اور اخلاقی قدروں کو دیکھتے ہوئے یہ اقدام بڑا ہی پست تھا۔ ایک تو مال و دولت کا لالچ اور انتقامی جذبے کی تسکین عالی ظرفی کے خلاف تھی اور دوسرے کسی کو کمزور پا کر دھر دبانا اقدارِ شجاعت کے مطابق نہ تھا۔ تیسرے اس میں غلبۂ اسلام اور ہزیمتِ کفر کا وہ اعلیٰ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو بعد میں فتح بدر

سے حاصل ہوا۔ چوتھے حملہ کرنے میں پہل کرنا خود اسلامی قوانین جنگ کے خلاف تھا۔ ایسے اقدامات سے نبوت کی اعلیٰ قدریں مجروح ہو سکتی تھیں۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

زمین پر غلبہ حاصل کیے بغیر محض قیدیوں کو حصولِ زر کا ذریعہ بنانا ایک ایسا اقدام ہے جو کسی نبی کو زیب نہیں دیتا۔ یہ تو دنیا طلبی ہے حالانکہ خدا تمہارے لیے آخرت اور حسن انجام کو پسند فرماتا ہے۔ یہ تو حسن اتفاق تھا کہ جو مقدر تھا وہی ہوا اور تمہیں اس شامی قافلے پر چھاپا مارنے کا موقع ہی نہ ملا ورنہ قدرتی تائید شامل حال ہو کر تمہیں اس اقدام سے نہ بچاتی تو جو تم کرنے لگے تھے اس میں بڑی سخت گرفت سے دوچار ہونا پڑتا۔

یہ ہے اس کا تفسیری ترجمہ۔ اس کا سرا سر تعلق قافلۂ ابوسفیان پر چھاپا مارنے سے ہے نہ کہ قیدیانِ بدر سے۔

۳۔ ایک تیسری غلطی اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں یہ ہوئی ہے کہ لمسکم فیما اخذ تم عذاب عظیم میں فیما اخذ تم کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ ... تم نے قیدیانِ بدر سے جو فدیہ لیا ہے (اس کی بڑی گرفت ہوتی اگر نوشتۂ تقدیر پہلے سے لکھا نہ جا چکا ہوتا)۔ اخذ تم کے معنی "تم نے زرِ فدیہ لیا" نہیں ہے اور نہ یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کے عوض عذابِ عظیم آتا۔ جنگ کے بعد قیدیوں کا ہونا اور ان سے زرِ فدیہ لے کر رہا کرنا ایک رسم قدیم تھی اور اسلام نے اسے باقی رکھا ہے۔ اگر کوئی بڑا گناہ ہوتا تو اسے ختم کر دیا جاتا اور اس کی تلافی یوں کی جاتی کہ ... سب کے فدیے واپس کر دیے جاتے، اور مفسرین کی تفسیر کے مطابق سارے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا۔ یہ کون سی مشکل بات تھی؟ لیکن ہوا یہ کہ زرِ فدیہ حلال طیب رہا اور قیدی رہا کر دیے گئے اور

بہت سے قیدی عرصۂ دراز تک قبضے میں رہے۔ پھر یہ دعویٰ کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ یہ آیت قیدیانِ بدر کے متعلق ہے اور ان سے فدیہ لینا اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کا بدلہ عذاب عظیم ہی تھا۔

دراصل یہ مغالطہ لفظ اخذتم سے پیدا ہوا ہے جس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ "تم نے جو زرِ فدیہ حاصل کیا ہے"۔ حالانکہ اخذتم کے یہاں یہ معنی نہیں۔ اخذ، طفق، جعل، انشأ وغیرہ "ماضی ابتدائی"[1] بنانے کے لیے آتا ہے۔ اخذ یصنع کرنے لگا۔ طفق یبکی رونے لگا۔ جعل یضحک ہنسنے لگا۔ انشأ یقول کہنے لگا۔ یہاں اخذتم سے مراد ہے اخذتم تعملون یا تفعلون یعنی جو تم کرنے لگے تھے۔ جو تم عن قریب کرنے والے تھے۔ مطلب یہ ہے جو کام (قافلۂ ابوسفیان کو لوٹنے کا) کرنے لگے تھے وہ تمہارے مقاصدِ عالیہ اور سیرتِ اسلامیہ کے اس قدر خلاف تھا کہ اس سے تم میں اور دوسرے عرب کے جاہلی لٹیروں میں کوئی فرق نہ رہتا اور اس سے تمہارے اعلیٰ نصب العین کے دعاوی خاک میں مل جاتے کیونکہ اس سے کوئی دینی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ کوئی تبلیغ حق نہ ہوتی، کوئی شجاعت کا مظاہرہ نہ ہوتا، کوئی اعلیٰ اقدار نہ قائم ہوتیں۔ صرف ہوسِ

---

(۱) میں نے ہمیشہ اپنے شاگردوں کو ماضی کی سات قسمیں پڑھائی ہیں۔ ماضی مطلق: فعل (اس نے کیا)۔ ماضی قریب: قد فعل (اس نے کیا ہے)۔ ماضی بعید: کان فعل (اس نے کیا تھا)۔ ماضی ناتمام یا استمراری: کان یفعل (وہ کرتا تھا یا کر رہا تھا)۔ ماضی تمنائی: لیتما یفعل (کاش وہ کرتا)۔ ماضی احتمالی یا شکی: لعلما فعل (شاید اس نے کیا ہوگا)۔ ماضی ابتدائی: اخذ یفعل یا جعل یفعل وغیرہ (وہ کرنے لگا)۔ فارسی میں "کردن گرفت"۔

انتقام کی تسکین ہوتی۔ آغاز حملہ نہ کرنے کی اخلاقی قدر مجروح ہوتی۔ ہوس زر اور لوٹ مار کا جاہلانہ اظہار ہوتا اور سب سے بڑھ کر اس کفر کا زور نہ ٹوٹتا بلکہ اہل کفر کو یہ طعنہ دینے کا موقع ملتا کہ دین کا ڈھونگ محض کمزوروں کو لوٹنے کے لیے رچایا گیا ہے۔ نیز اس حرکت سے بجا طور پر اہل کفر کا جوش انتقام بھڑک اٹھتا اور تاریخ ان کے جوابی حملے کو حق بجانب ٹھہراتی۔ پس ایسی شدید غلطی کے عوض عذاب عظیم کا نازل ہونا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن زر فدیہ لینے کو عذاب عظیم کا موجب سمجھنا — وہ بھی اس کے جواز کو باقی رکھتے ہوئے — بڑی مشکل سے سمجھ میں آسکتا ہے۔

۴۔ ایک چوتھی غلطی لولا کتب من اللہ سبق کی تفسیر میں ہوئی۔ سیرت نگار اور تفسیر نگار "تقدیر" کے گورکھ دھندوں میں تو پھنسا گئے لیکن انہوں نے کسی لگتی ہوئی بات کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ مولانا سید سلیمان ندوی سیرت النبی ص ۳۴۲ میں اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

> "اگر خدا کی تقدیر پہلے نہ ہو چکی ہوتی تو تم نے جو قیدیوں سے لیا ہے اس پر دردناک عذاب پہنچتا۔"

ذرا غور کر کے بتائیے کوئی بات سمجھ میں آئی؟ آخر وہ کیا "نوشتۂ تقدیر" تھا جس کی وجہ سے یہ عذاب عظیم ٹل گیا اور پھر یہ عذاب عظیم کس جرم کے عوض میں تھا؟

یہاں فرضی تقدیر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ نوشتۂ الٰہی ہے جو یوں ہے:

واذ یعدکم اللہ احدی	وہ وقت یاد کرو جب خدا تم سے دو
الطائفتین انھا لکم	گروہوں (ابوسفیانی قافلۂ تجارت اور
وتودون ان غیر ذات الشوکۃ	بدری لشکر قریش) میں سے ایک کا وعدہ
تکون لکم و یرید اللہ ان	فرما رہا تھا کہ وہ تمہارے لیے ہوگا، تم

یحق الحق بکلمتہ ویقطع دابر الکافرین ۸:۷ . . . . | تو بے خوخشہ گروہ کو اپنے لیے پسند کر رہے تھے مگر اللہ یہ چاہتا تھا کہ (بدر کے لشکر قریش کو ہزیمت دلوا کر) اپنے "کلمات" سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر رکھ دے . . . . .

یہ ہے وہ نوشتۂ الٰہی جسے "نوشتۂ تقدیر" کا گورکھ دھندا بنا دیا گیا ہے۔ بات صاف ہے کہ بعض مسلمان قافلے پر حملہ کرنا چاہتے تھے اور خدا نیز اس کا رسولؐ بھی دوسرے موقعے (بدر) پر کفر کی جڑیں کاٹ ڈالنا چاہتا تھا۔ خدا اور اس کے رسولؐ کا یہی فیصلہ تھا۔ یہی نوشتۂ الٰہی ہے جو وقوع پذیر ہوا اور . . . . . اگر ایسا نہ ہوتا اور اس کی بجائے قافلۂ ابوسفیان کو لوٹا جاتا تو ساری اقدار اسلامی ختم ہو جاتیں اور ظاہر ہے کہ اس کے عوض عذاب عظیم نازل ہوتا کیونکہ اس سے پندرہ سال کی مسلسل نبوی جدوجہد بے نتیجہ ہو جاتی۔ جو جو مصیبتیں جھیل کر حضورؐ نے ایک امت قائم فرمائی تھی اور جن جن اقدار عالیہ کی اقامت کے لیے ان کو تیار کیا تھا وہ سب اس ذرا سی غلطی سے خاک میں مل جاتیں اور اس کا نتیجہ عذاب عظیم کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

غرض آیت زیر بحث —— ما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ کا کوئی تعلق قیدیان بدر سے نہیں۔ اس واقعے کو خواہ مخواہ سیدنا عمرؓ کے فضائل میں بیان کیا جاتا ہے۔ آپ کے فضائل تو ان گنت ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ ایک خلافِ واقعہ فضیلت کو بھی آپ کی ذاتِ گرامی سے چپکا دیا جائے۔ اس واقعے میں جو فضیلت سیدنا عمرؓ کی ہے وہ دوسری روایت میں موجود ہے اور اس میں سیدنا ابوبکرؓ بھی شریک ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ جب حضرت

ابوبکرؓ نے فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کرنے کی رائے دی اور حضرت عمرؓ نے ان سب کو قتل کرنے کی رائے دی تو حضورؐ نے فرمایا کہ:

اے ابوبکرؓ! تمہاری مثال (رحم و کرم میں) ابراہیمؑ و مسیحؑ جیسی ہے۔ ابراہیم نے فرمایا تھا کہ ... ومن عصانی فانک غفور رحیم (اگر کوئی میری نافرمانی کرتا ہے تو تو غفور و رحیم ہے) اور مسیح نے فرمایا تھا ... وان تغفر لهم فانك انت العزيز الحكيم (اگر تو ان کی مغفرت فرما دے تو تو عزیز و حکیم ہے)۔ اور اے عمرؓ! تمہاری مثال نوح اور موسیٰ جیسی ہے۔ نوح نے کہا تھا رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا (اے خدا ان نافرمانوں کو زمین پر زندہ نہ چھوڑ) اور موسیٰ نے کہا تھا ربنا اطمس علی اموالهم (اے ہمارے رب تو ان کے اموال کو بھی مٹا کر رکھ دے)۔ رواہ الترمذی واحمد

۲۔ نزولِ ملائکہ

غزوۂ بدر کے سلسلے میں نزولِ ملائکہ کا بھی بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے ارشاد ہے:

اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکة مردفین[1] ۹ : ۸

وہ وقت یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے کہا کہ تمہاری سن لی کہ لگا تار ہزار[2] فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا

---

(۱) یہاں سے آگے جو تخاطب ہے سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب فاضربوا الخ۔ وہ مسلمانوں سے ہے (۲) دوسری جگہ تین ہزار اور پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعے مدد کا بھی ذکر ہے یہاں سب کا ذکر مقصود نہیں۔

....، اِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۔ ... ۸ : ۱۲	.... وہ وقت یاد کرو جب تیرا رب ملائکہ کی طرف یہ وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پس اہل ایمان کو ثابت قدم رکھو۔

ان آیات میں فرشتوں کے نزول اور ان کے سپرد کردہ فریضے کا ذکر ہے ہزار فرشتوں کے نزول کی کیفیت ہمارا دماغ نہیں سمجھ سکتا۔ بس ہم زیادہ سے زیادہ اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیشہ انسانی مقاصد کی کامیابی اور ناکامی میں بہت سی غیر مرئی قوتیں کام کرتی رہتی ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہمت یا بزدلی بھی جنگ میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ ٹھیک ہے لیکن یہ غیر مرئی کیفیات کہاں سے اور کس طرح پیدا ہوتی ہیں؟ ایک قلیل التعداد، کم اسلحہ گروہ میں جرأت و ہمت اور کثیر التعداد فراواں اسلحہ لشکر میں بزدلی وکمزوری کہاں سے آجایا کرتی ہے؟ ان مختلف قلبی کیفیات کی تخلیق تو خدا کی طرف سے ہوتی ہے لیکن ان کے لیے اس نے ذریعہ یا ایجنسی AGENCY جن غیر مرئی قوتوں کو بنایا ہے وہی فرشتے ہیں۔ انسانی دماغ کے لیے ملکی حقیقت کو اس سے زیادہ سمجھ سکنا مشکل ہے۔ ایسی تائیداتِ غیبی کی توجیہات کو مادی نقطۂ نظر سے کس طرح سمجھایا جا سکتا ہے؟

۳۔ غلبۂ خواب اور بارانِ رحمت

نیند آجانا اور پھر دور دراز مسافت طے کرنے والے مسافروں کو نیند آجانا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا خاص طور پر ذکر کیا جائے لیکن قرآن نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میدانِ جنگ سامنے ہو اور دشمن کے

لشکر، اسلحہ اور رسد بہت چند ہوں اور ایک اعلیٰ ترین مشن کی فنا و بقا کا سوال درپیش ہو تو نیند کا آجانا یقیناً ایک غایت درجے کے سکون و اطمینان اور اعتماد و بے خوفی کی دلیل ہے اور یہ ایسا انعام الٰہی ہے جس کا ذکر خاص طور پر قرآن میں یوں کیا گیا ہے:

اذ یغشیکم النعاس امنۃ و	وہ وقت یاد کرو جب خدا تم پر تمہارے
ینزل علیکم ۸ : ۱۱ الخ	چین کے لیے اپنی طرف سے اونگھ طاری
	کر رہا تھا اور ․․․․․

یہ واضح رہے کہ یہاں خواب غفلت یا گہری نیند کا ذکر نہیں بلکہ صرف نعاس کا ذکر ہے جس کے معنی اونگھ یا جھپکی کے ہیں اور یہ نیند کا بالکل ابتدائی زینہ ہوتا ہے۔ اس قلیل مگر گہری جھپکی نے اہل اسلام کے اندر ایک کایا پلٹ کر دی کہ جاگے تو بالکل تازہ دم (FRESH) تھے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن نے ایک اور انعام کا بھی ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے باران رحمت کا نزول۔ اس کا ذکر یوں ہے:

وینزل علیکم من السماء	اور وہ تم پر بلندی سے پانی برسا رہا تھا
ماءً لیطھرکم بہ ویذھب	تاکہ تمہیں اس کے ذریعے پاکیزہ بنا دے
عنکم رجز الشیطان ولیربط	اور تم سے شیطانی پلیدی کو دور کر دے
علیٰ قلوبکم و یثبت بہ	اور تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور
الاقدام۔ ۸ : ۱۱	تمہارے قدم جما دے۔

پانی کا سب سے بڑا مقصد پیاس بجھانا ہوتا ہے لیکن یہ چونکہ محض حیوانی ضرورت ہے اس لیے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کا ذکر مناسب نہ سمجھا اور دوسرے اعلیٰ مقاصد کا ذکر کر دیا ہے۔ پہلی چیز ہے طہارت جس کی ہر مومن

کو ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری چیز ہے شیطانی پلیدی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا مفہوم غسل جنابت ہو یا وہ مایوسانہ جذبات ہوں جو ایسے بے آب و گیاہ سرزمین میں پیدا ہو سکتے ہیں خصوصاً اس وقت جب کہ کنوئیں پر دشمن کا غلبہ ہو۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں نے اس سے مراد پیاس بھی لی ہے کیونکہ "شیطان الفلاۃ" (صحرا کا شیطان) شدت کی پیاس کو بھی کہتے ہیں۔ تیسری شے ہے دلوں کی ڈھارس بندھنا اور پانی کا ایک بہت بڑا سہارا ہاتھ آجانے سے ڈھارس بندھ جانا آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ چوتھی چیز ہے قدم جمنا یہ ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے ہوا۔ جس طرف مسلمان تھے (جسے قرآن نے العدوۃ الدنیا کہا ہے) ادھر کی زمین گرد و غبار جمنے سے ایسی ہموار ہو گئی جس پہ قدم دھنسنے نہ پائیں اور باطنی حیثیت سے ان تمام تائیدات غیبی نے ان کے قدم جما دیے۔

۴۔ حقیقت کے خلاف تعداد کا نظر آنا

قرآن نے ایک اور عجیب چیز بتائی ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کی نگاہ میں کمتر نظر آ رہے تھے۔ ارشاد ہے:

اذ یریکهم الله فی منامک قلیلا ولو اراکهم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر .... اذ یریکموهم اذ التقیتم	وہ وقت یاد کرو جب اے رسول تمہیں خدا خواب میں ان کو تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا اور اگر وہ زیادہ کر کے دکھاتا تو تم ڈھیلے پڑ جاتے اور (مقابلہ دشمن) کے معاملے میں باہم جھگڑا کرنے لگتے.. .... وہ وقت بھی یاد کرو جب تمہاری

فی اعینکم قلیلا ویقللکم فی اعینھم۔ ۸ : ۴۳ و ۴۴ | مڈبھیڑ ہوئی تو اللہ ان دشمنوں کو تمہاری نگاہوں میں گھٹا کر اور تمہیں ان کی نگاہوں میں کم کر کے دکھا رہا تھا . . . . .

گویا مسلمانوں کو اہل کفر اپنی اصلیت سے کم تر دکھائی دے رہے تھے یعنی تین گنے کی بجائے صرف دو گنے۔ اسی کو دوسری جگہ یوں کہا گیا ہے کہ یرونھم مثلیھم رأی العین ـــــ اور اسی طرح کفار کو اہل اسلام کم تر نظر آ رہے تھے۔ اور اس کی غرض یہ تھی کہ ہونے والی بات ہو کر رہے (لیقضی اللہ امرا کان مفعولا ۔ اس کا نتیجہ قدرۃً یہ ہوا کہ اہل کفر بھی بے جگری سے لڑے اور اہل اسلام بھی۔ اگر دونوں ایک دوسرے کو اصلیت سے زیادہ نظر آتے تو دونوں ایک دوسرے سے خائف ہو جاتے اور ممکن تھا کہ جنگ نہ ہوتی اور غلبۂ اسلام کو کفر کا زور توڑنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن چونکہ ہر ایک فریق کو دوسرے نے کمتر محسوس کیا اس لیے آسانی سے نگلا جانے والا لقمۂ تر سمجھ کر خم ٹھونکتا ہوا میدان میں نکل آیا اور جس زور کی ٹکر ہوئی اسی زور کا صدمہ بھی کفر کو برداشت کرنا پڑا۔

یہ کمتر نظر آنے کا معاملہ بہ ظاہر تو تعداد سے متعلق دکھائی دیتا ہے لیکن اگر اسے قوت کی کمی سے تعبیر کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مسلمان تو یوں بھی تعداد میں کم تھے، دوسرے بے سرو سامان تھے، تیسرے وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان آج تک کسی موقعے پر ہم سے مقابلہ نہ کر سکے یہاں تک ہم نے ان کو مکے سے نکال باہر کیا۔ وہ اسے صبر و استقامت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمزوری سمجھ رہے تھے۔ یہ تمام اسباب مسلمانوں کو ہیچ تر سمجھنے کے لیے کافی تھے۔ اہل کفر تعداد میں تو دوگنے دکھائی ہی دے رہے تھے اور یہ واقعیت

کے خلاف بھی نہ تھا وہ زیادہ تھے لیکن اہل کفر کو ہیچ تر سمجھنے کے اسباب یہ تھے کہ ان کے پاس قوت ایمان نہ تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محمدؐ جیسا سہارا ان کے پاس نہ تھا جو خدا کو بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور فتح ونصرت کی بشارتیں بھی۔ یہ غیر معمولی قوت بجائے خود اتنی زیادہ حوصلہ افزا تھی کہ اگر دشمن دس گنے بھی ہوتے تو انہیں "تھوڑے" دکھائی دیتے۔

غرض قلیل یا قلت کا لفظ محض کمیت کے لیے نہیں ہوتا بلکہ کیفیت کے لیے بھی اسی طرح مستعمل ہے۔ اس لیے اسے "نظر بندی" جیسا کرشمہ ماننا ضروری نہیں بلکہ ایک ایسا اسوہ ونمونہ ہے جو ہر دور میں اہل صبر وتقوےٰ کے ساتھ وابستہ رہے گا۔

عمیر بن وہب کا اسلام

رات کی تاریک تنہائی میں مقام حجر کے پاس صفوان بن امیہ اور عمیر بن وہب باتیں کرتے ہیں۔ مقتولان بدر کی یاد میں سوگواری کا اظہار کر رہے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ صفوان کا باپ امیہ بدر میں مارا گیا تھا اور عمیر بن وہب کے فرزند وہب بن عمیر بدر کے قیدیوں میں تھے) اتنے میں عمیر نے کہا کہ: "بخدا اب تو زندگی بے کیف سی ہو گئی ہے۔ اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بال بچوں کی ذمہ داری نہ ہوتی تو میں مدینے جا کر محمدؐ کا قصہ ہی پاک کر دیتا۔ صفوان نے کہا کہ تمہارا قرض اور کفالت عیال میرے ذمے رہی۔ عمیر نے گھر آ کر ایک خنجر زہر میں بجھایا اور مدینے کی طرف چل پڑا۔ اونٹ سے اترا تو حضرت عمرؓ کو کچھ شک گزرا، اور آپ کی رائے سے بہت سے صحابہ حضورؐ کے گرد حلقہ باندھ کر حفاظت کے لیے بیٹھ گئے۔ عمیر آ کر حضورؐ کے سامنے بیٹھ گیا۔ اور یہ گفتگو یوں شروع ہوئی:

عمیر: انعم صباحا یا محمد (صبح بخیر)۔

حضورؐ: قد ابدلنا اللہ خیرًا منہا (اللہ نے اس سے بھی بہتر صبح بخشی ہے۔ اچھا تم یہاں کس سلسلے میں آئے ہو؟)

عمیر: جئت افدی اسارا کم۔ (قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے رہا کرانے کے لیے۔)

حضورؐ: فما السیف (یہ تلوار کیسی ہے؟)

عمیر: اما انا فقد حملنا ھا یوم بدر فلم یفلحن ولم ینجحن (ہم نے تو بدر کے دن بھی یہ تلواریں سنبھالی تھیں لیکن یہ نہ کام آئیں نہ کارگر ثابت ہوئیں۔)

حضورؐ: فما شئی قلت لصفوان وانتما بالحجر لولا عیالی ودینی لکنت انا الذی قتلت محمدا بنفسی ... (اچھا جب تم اور صفوان حجر کے پاس اکٹھے تھے تو تم نے صفوان سے کیا کہا تھا؟ یہی نا کہ اگر میرے بال بچے نہ ہوتے اور اور مجھ پر قرض نہ ہوتا تو میں اپنے ہاتھ سے جا کر محمدؐ کو قتل کر دیتا؟)

عمیر: ھاہ کیف قلت (ذرا پھر فرمایئے کیا باتیں ہم دونوں میں ہوئیں؟)

حضورؐ نے پھر اس سازش کی تفصیل کو دہرایا۔ اس کے بعد وہب نے کہا:

کنت تخبرنا خبر اھل الارض فنکذبک فاراک تخبر خبر اھل السماء اشھد ان لا الہ الا اللہ وانک رسول اللہ (حضورؐ زمین والوں کی باتیں بتاتے تھے تو ہم جھٹلاتے تھے لیکن اب تو میں یہ دیکھتا ہوں کہ حضورؐ آسمان والوں کی باتیں بھی بتلانے لگے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور آپؐ اس کے رسول ہیں۔)

اس کے بعد وہب کی درخواست پر حضورؐ نے اپنی دستار مبارک عطا

فرمادی جسے وہ لے کر مکے لوٹ آئے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ: جب عمیر مدینے میں آیا ہے تو اس وقت وہ میری نگاہوں میں خنزیر سے بھی زیادہ بدتر تھا لیکن جب وہ واپس گیا ہے تو وہ مجھے اپنی اولاد سے زیادہ پیارا تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے ان کے فرزند وہیب بن عمیر کو بغیر فدیے کے رہا کر دیا۔ اور یہ دونوں مکے آگئے۔ اس کے بعد عمیر نے مکے میں تبلیغ اسلام شروع کر دی اور بہت سے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کا نام عمیر بن وہب بتایا ہے اور طبری کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن طبرانی نے کبیر میں ان کا نام (بروایت حضرت انس) وہب بن عمیر بتایا ہے۔ نیز انہوں نے واقعۂ بدر کے بعد ان کے اسلام قبول کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن طبرانی کے الفاظ صاف ہیں کہ: کان وھب بن عمیر شھد احدا کافرا۔ یعنی وہب بن عمیر بحالت کفر اُحد کے دشمن کیمپ میں تھے اور ۔ ۔ ۔ شدید زخمی ہونے کے بعد اچھے ہو گئے تھے۔ لہٰذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ غزوۂ احد کے بعد یہ ایمان لائے ہیں نہ کہ بدر کے بعد۔ واللہ اعلم۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پیغمبر کو اللہ تعالےٰ بہت سے غیوب پر مطلع کر دیتا ہے اور جب حجابات اٹھتے ہیں تو ایسی بہت سی محیّر العقول باتیں باذن الٰہی بتا دیتا ہے۔ یہ چیزیں مادہ پرستوں کی سمجھ میں مشکل ہی سے آتی ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ یہ حضرات TELEPATHY کو ایک عملی فن کی حیثیت سے تو مان لیتے ہیں اور نبوت کی اس قوت کو تسلیم کرنے میں انہیں تامل ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایسے واقعات کو اس قدر بلند مقام دے کر بیان کیا جاتا ہے کہ گویا حضورؐ کے لیے یہ بڑا شرف ہے حالانکہ:

درِ دلِ ہر کس کہ دانش امروست ‏ ‏ ‏ رو بے دا آواز پیمبر معجزہ ست

اس قسم کی قوتیں تو حضورؐ کے ادنے سے ادنے کفش برداروں میں بتواتر ثابت ہیں اور حضورؐ کے لیے تو یہ کوئی اہم چیز ہی نہیں۔

غزوۂ سویق

معرکۂ بدر نے قریش کی کمر توڑ دی۔ ابو جہل کے مارے جانے کے بعد قریش کی قیادت ابو سفیان بن حرب کے ہاتھ آگئی اور انہوں نے اپنی قیادت کی لاج رکھنے اور آتشِ انتقام کے شعلوں کو سرد کرنے کی غرض سے یہ قسم کھائی کہ جب تک بدر کا بدلہ نہ چکالوں گا اس وقت تک نہ غسل جنابت کروں گا اور نہ سر میں تیل ڈالوں گا۔ عرب کی گرمی میں یہ قسم زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے ابو سفیان نے اپنی قسم پوری کرنے کے لیے یہ کیا کہ دو سو شتر سواروں کو لیکر مدینے کی طرف چل پڑے۔ پہلے حُیَیّ بن اخطب کے پاس گئے مگر اس نے دروازہ ہی نہ کھولا۔ پھر سلام بن مشکم کے پاس گئے یہ یہود بنی نضیر کا سردار تھا۔ اس نے بڑی آؤ بھگت کی۔ صبح ابو سفیان نے مدینے سے تین میل کے فاصلے پر عُریض پر حملہ کر دیا اور سعد بن عمرو انصاری کو قتل کر دیا۔ نیز چند مکانات کو آگ لگا دی۔ ابو سفیان نے اپنے خیال میں قسم پوری کر لی۔ حضورؐ کو خبر ملی تو ایک جماعت صحابہ کے ساتھ ابو سفیان کا تعاقب کیا مگر یہ پورا گروہ بھاگا اور اپنا بوجھ کم کرنے کے لیے یا پیچھا کرنے والوں کی رفتارِ تعاقب کو سست کرنے کے لیے یہ گروہ مختلف مقامات پر ستو کی تھیلیاں گراتا گیا۔ ستو کو عربی میں سویق کہتے ہیں۔ اس لیے اس غزوے کا نام غزوۂ سویق ہے اور اسی کو غزوۂ قرقرۃ الکدر بھی کہتے ہیں۔

تزویج فاطمہؓ

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال یعنی ۲ھ میں رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے اور رمضان ہی کی سترھویں کو غزوۂ بدر پیش آیا تھا۔ اس کے بعد ہی جب مسلمان بدر سے فاتحانہ واپس ہوئے تو اس سال پہلی بار عیدالفطر کی نماز باجماعت ادا فرمائی۔ یہ دراصل فتح بدر کی خوشی تھی جو آج تک بطور یادگار قائم ہے۔ اسی سال حضورؐ نے صدقۂ فطر کو بھی لازم قرار دیا۔

اور اسی سال ذی الحجہ کے اواخر یا نئے سال کے آغاز یعنی اوائل محرم میں سیدہ فاطمہ زہراؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہوا۔ سیدنا علیؓ نے خود اپنے آپ کو دامادی کے لیے پیش فرمایا۔ حضورؐ نے خود ہی جناب فاطمہؓ سے اذن لیا اور خود ہی نکاح پڑھایا۔ حضرت علیؓ نے اپنی زرہ (حضرت عثمانؓ کے ہاتھ) فروخت کر کے کوئی سوا سو روپے کی رقم زرِ مہر میں پہلے ہی ادا کر دی۔

جہیز کی غلط فہمی

حضورؐ نے کچھ چیزیں حضرت فاطمہؓ کو اس موقعے پر دی تھیں۔ مثلاً ایک بان کی چارپائی، ایک چمڑے کا گدا جس میں کھجور کی چھال بھری تھی، ایک بڑا اور ایک چھوٹا مشکیزہ، ایک چکی، دو مٹی کے گھڑے، فیل دنداں کے کنگن، ایک چاندی کا ہار جو حضرت خدیجہؓ کے ترکے میں ملا تھا اور اس دن کے لیے محفوظ رکھا تھا۔۔۔۔ اکثر لوگ غلط فہمی سے اسے جہیز سمجھتے ہیں حالانکہ جہیز کوئی اسلامی چیز نہیں۔ نہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہے نہ حدیث میں اسے ضروری قرار دیا

گیا اور نہ کسی فقہ میں اسے جزوِ شادی بتایا گیا ہے۔ جہیز صرف ہندوؤں کی رسم ہے اور وہ بھی اس لیے کہ وہاں بیٹیوں کا ترکے میں کوئی حصہ نہیں ہوتا اس لیے وہ ایک ہی بار بہت کچھ جہیز کے نام سے دے کر گویا حق میراث بھی ادا کر دیتے ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں نے ان سے یہ رسم لے لی اور اس کا نام جہیز رکھ دیا۔ یہاں تک تو خیر کوئی مضائقہ نہ تھا لیکن غضب یہ کیا کہ اسے "سنت رسول" بھی قرار دیدیا اور ثبوت میں وہ چیزیں پیش کر دیتے ہیں جو حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو دی تھیں۔ ذرا سی لغزش سے آگے چل کر کتنا غلط مسئلہ بن کر سامنے آجاتا ہے اور اس غلطی پر تہ بہ تہ پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

ذرا سوچئے اگر جہیز کوئی سنت ہوتا تو یہ سنت محض حضرت فاطمہ ہی کے ساتھ ادا کی جاتی؟ کیا حضورؐ کی اور صاحبزادیاں نہ تھیں؟ اسے بھی جانے دیجیے۔ حضورؐ کی خود متعدد ازواج موجود تھیں۔ لیکن آپ نے کہیں سنا کہ حضورؐ نے رقیہؓ، ام کلثومؓ اور زینبؓ کو بھی کوئی جہیز دیا ہو؟ کسی جگہ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ فلاں ام المومنین جب رخصت ہو کر حضورؐ کے پاس آئیں تو اپنے ساتھ فلاں فلاں چیزیں جہیز میں لائی تھیں؟ دوسرے بے شمار صحابہ کی اور خود سیدنا علیؓ کی شادیاں ہوئیں۔ کہیں آپ نے یہ پڑھا ہے کہ وہ اپنے ساتھ جہیز لائی تھیں؟ پھر آخر یہ کیا منطق ہے کہ جس حقیقت کا کہیں سراغ نہ ملے اسے نکاح فاطمہؓ کے سر تھوپ دیا جائے اور پھر اسے سنتِ نبوی بھی قرار دیا جائے؟ یہ عجیب سنت نبوی ہے کہ اس کی ایک سے زیادہ — اور وہ بھی غلط — کوئی نظیر ہی نہیں ملتی۔

حقیقت یہ ہے کہ رسم جہیز کو سنت رسول سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

یہ اگر کوئی سنت ہے تو سنتِ ہنود ہے اور اب تو وہ بھی اس رسم کو ختم کر رہے ہیں اور بیٹیوں کو ترکہ دلوا رہے ہیں۔ مگر اہلِ اسلام اس ہندوانہ رسم پر قائم ہیں اور غضب یہ کہ اسے سنتِ رسول سمجھے بیٹھے ہیں۔

بات صرف اتنی ہے کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کو اس کے کپڑے اتروا کر گھر سے باہر رخصت نہیں کرتا۔ اس کی پدری شفقت اسے اپنی حیثیت کے مطابق ایک اچھی شکل میں رخصت کرنے پر مجبور کرتی ہے لیکن یہ داد و دہش صرف رخصت ہوتے وقت ہی تک محدود نہیں رہتی۔ وہ ساری عمر اپنی استطاعت کے مطابق اس کی اعانت کرتا رہتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک بڑی نیکی ہے لیکن ساری عمر کی یہ داد و دہش کوئی "جہیز" نہیں ہوتی۔

جناب فاطمہؓ کا قصہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے سرپرست حضورؐ ہی تھے اور دونوں کی مناکحت کا اہتمام حضورؐ ہی کو کرنا تھا اس وقت حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ مکان نہ تھا۔ چونکہ یہاں ایک نیا گھر بسانا اور بنانا تھا اس لیے حضورؐ نے اتنا کچھ بھی کیا۔ اگر حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ گھر ہوتا تو جس طرح اپنی دوسری بیٹیوں کے لیے حضورؐ نے الگ گھر بنانے کا کوئی اہتمام نہ فرمایا اسی طرح حضرت فاطمہؓ کے لیے بھی کوئی خاص اہتمام نہ فرماتے۔ حضرت عثمانؓ کا الگ گھر موجود تھا اس لیے حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ کو بیاہتے وقت حضورؐ نے کوئی اہتمام نہ فرمایا۔ حضرت ابوالعاصؓ کا گھر بھی الگ موجود تھا اس لیے حضرت زینبؓ کو بیاہنے کے لیے بھی حضورؐ کو کوئی خاص اہتمام نہ فرمانا پڑا۔ لیکن حضرت علیؓ کے پاس کوئی الگ گھر نہ تھا حضرت حارثہ بن نعمان انصاری نے اپنا ایک گھر خالی کر کے اس نئے پاکیزہ جوڑے کے لیے حضورؐ کو پیش کر دیا۔ اسی نئے گھر کے لیے حضورؐ کو گھرداری کے

کچھ سامان مہیا کرنے پڑے۔ لوگوں نے خدا جانے کیوں اسے "جہیز" فرض کر لیا اور اپنے اوپر ایک ایسی مصیبت مول لے لی کہ محض جہیز کے تصور سے بیٹی جیسی نعمت الٰہی کو ایک وبال سمجھنے لگے۔ گویا اگر جہیز نہ ہو تو بیٹی کی شادی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ جہیز کی بلا ایسی نازل ہوئی کہ گویا یہ شادی بیاہ کا محض ایک لازمی جزو ہی نہیں ٹھہرا بلکہ ایک ضروری سنت رسول بھی بن گیا۔ گویا اب النکاح سنتی الخ کا مفہوم ہو گیا کہ "نکاح جو بغیر جہیز کے ہو ہی نہیں ہو سکتا میری سنت ہے۔ دیکھ لیا آپ نے؟ غلط فہمی کہاں سے چلی اور کہاں جا کر ختم ہوئی؟

پھر ایک عجیب چیز اور بھی پیش نظر رکھیے کہ حضورؐ نے جو کچھ بھی دیا اس میں کچھ تو وہ تھا جو جناب خدیجہؓ کے ترکے سے حضرت فاطمہؓ کو ملنا ہی تھا، اور کچھ حصہ وہ تھا جو حضورؐ نے اپنی طرف سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے دیئے ہوئے زرہ مہر سے منگوا کر حضرت فاطمہؓ کو دیا۔ اگر فی الواقع جہیز دینا کوئی سنت ہے تو اس کے صرف ایک ہی حصے کو کیوں اختیار کیا جاتا ہے؟ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پہلے داماد سے زرہ مہر لے کر اس سے سامان منگوا لیں؟

جہیز کی غلط فہمی کی وجہ

بہت عرصہ ہوا ایک بار ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ایک بڑے وسیع النظر استاذ مولانا شاہ حلیم عطا سلونی سے جہیز فاطمہؓ پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ: بیہقی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ:

جھز رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ فاطمۃ فی خمیل۔۔۔۔ الخ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے "جہیز" دیا۔ اور یہی جھز لفظ

دوسری روایتوں میں چاندی کے ہار کے متعلق بھی ہے۔ اس لیے جہیز کے وجود سے انکار کیسے ممکن ہے؟ میں نے عرض کیا کہ "سورۂ یوسف میں ہے:

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ ۔۔۔ الخ

تو کیا آپ اس کا ترجمہ یوں کریں گے کہ "جب یوسف نے اپنے بھائیوں کو جہیز دیا"۔ تجہیز کے معنی ہیں سامان مہیا کرنا نہ کہ جہیز دینا۔ روایت میں جو جَھَّزَ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ حضورؐ نے فاطمہؓ کو یہ یہ سامان دیے۔ نہ یہ کہ یہ یہ سامان "جہیز" میں دیے۔ سامان خواہ آپ کسی مسافر کے لیے کریں یا کسی دلہن کے لیے یا کسی میّت کے لیے جھّز کا لفظ سب کے لیے آتا ہے۔ اصطلاح "جہیز" کا مفہوم اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حضورؐ نے جناب فاطمہؓ کو کچھ بھی نہیں دیا۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا حضورؐ نے "جہیز" دیا؟ اور اس "دینے" سے جہیز دینے کو سنت نبوی قرار دیا جا سکتا ہے؟"

مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اس تجہیز کو اصطلاحی جہیز ہی لکھا ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں۔

اس رسم ہنود کو سنت نبوی سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا اور اس میں اتنا غلو پیدا ہو گیا کہ اس کی پابندی میں گھُل گھُل کر مرنا رہ گیا اور جس فرض کا قرآن، حدیث اور فقہ میں ہر جگہ ذکر ہے وہ محض رسم بن کر رہ گیا۔ وہ فرض ہے "مہر" یا صداق و صدقات یا اجر یا فریضہ، جسے محض ایک رسم یا مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور جو چیز شرع سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اسے لازمۂ ازدواج بنا دیا گیا۔ اور لازمہ بھی ایسا کہ گویا یہ سنت مؤکدہ سے کم نہیں۔

عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی۔ عمر عائشہؓ کی بحث

اسی سال غزوۂ بدر رمضان ۲ھ کے بعد ہی کے شوال ۲ھ میں حضرت

عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ نکاح شوال سنہ ۱۰ نبوی میں حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ شوال سنہ ۱۰ نبوت سے شوال سنہ ۲ھ تک پورے پانچ سال ہوتے ہیں۔ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال اور بوقتِ رخصتی نو سال تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر رخصتی کے وقت نو سال کی عمر تھی تو پانچ سال پہلے ان کی عمر صرف چار سال کی ہوتی ہے اور اس عمر میں نکاح ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ اور اگر چھ سال کی عمر میں نکاح ہوا ہو تو پانچ سال کے بعد رخصتی کے وقت عمر گیارہ سال کی ہوگی۔ بہرنوع بخاری کی روایت میں یا تو چھ غلط ہے یا نو۔ دونوں کا صحیح ہونا ممکن نہیں۔

لیکن ہمارے خیال میں دونوں ہی غلط ہیں اس لیے اس روایت سے صغر سنی کی شادی پر استدلال بھی درست نہیں۔ قرآن نے شادی کی عمر بلوغ کو قرار دیا ہے ... حتیٰ اذا بلغوا النکاح اور یہ بلوغ بھی محض لفظی بلوغ نہیں بلکہ رشد یعنی برے بھلے کی خاصی تمیز بھی ضروری ہے۔ یہ آیت مدنی ہے لیکن جیسا کہ ہم کئی بار اس حقیقت کو دہرا چکے ہیں مزاجِ نبوت کا رخ ابتدا ہی سے صحیح جانب ہوتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو آئندہ حکم ملنے والا ہو۔ اتنی کم سنی میں نکاح اور رخصتی نبوی افتادِ مزاج کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ ذرا سوچیے کہ جو شخص اپنی عمر کے پچیسویں سال میں چالیس سال کی خدیجہؓ سے اور پچاسویں سال میں پچاس ہی سال کی سودہؓ سے نکاح کرے اس کی طبیعت دفعۃً یہ گوارا کر سکتی ہے کہ چار یا چھ سال کی لڑکی سے نکاح پر آمادہ ہو جائے؟

بہرحال ہمارے نزدیک بخاری کی مذکورہ بالا روایت کی صحت محلِ نظر ہے۔ اس کی چند دلیلیں ملاحظہ ہوں:

۱- ایک عقلی دلیل تو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ چھ اور نو میں ایک تو یقیناً غلط ہے کیونکہ دونوں میں پانچ سال کا فرق ضروری ہے جو یہاں نہیں ہے۔

۲- حضرت اسمارؓ بنت ابی بکرؓ کی وفات ایک سو سال کی عمر میں ۷۳ھ میں ہوئی (ترجمہ الکمال فی اسمار الرجال ص ۴۷۲)۔ لہذا یہ بوقت ہجرت ۲۷ سال کی ہوئیں۔ اور الکمال کی روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ حضرت اسمار سے دس سال چھوٹی تھیں۔ لہذا آپ کی عمر بوقت ہجرت ۱۷ سال (بوقت نکاح ۱۴ سال) اور بوقت رخصتی ۱۹ سال ہوئی۔

۳- حضورؐ جب ۳۵ سال کے تھے تو حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئیں۔ اسی سال قریش نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی جس میں حجر اسود کے نصب کا فیصلہ حضورؐ پر چھوڑ دیا گیا۔ (طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۱۱ و ۱۷)۔ اور حضرت عائشہؓ حضرت فاطمہؓ سے پانچ سال چھوٹی تھیں (ترجمہ اسد الغابہ ج ۴ ص ۳۷۷)۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۵ نبوت میں حضرت عائشہؓ پیدا ہوئیں اور بوقت نکاح ان کی عمر ۱۰ سال (بوقت ہجرت ۱۲ سال)، اور بوقت رخصتی ۱۵ سال ہوئی۔

۴- ایک اور روایت بخاری ہی کی ہے جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تزوجنی وانا بنت سبع۔ سات سال کی عمر میں حضورؐ نے مجھ سے نکاح فرمایا۔ اس لحاظ سے بوقت ہجرت آپ کی عمر ۱۰ سال اور بوقت رخصتی ۱۲ سال ہوتی ہے۔

یہ تمام دلائل یہ ثابت کرنے کو بالکل کافی ہیں کہ بوقت رخصتی حضرت عائشہؓ کی عمر یا تو ۱۲ سال کی تھی یا ۱۵ سال کی یا ۱۹ سال کی لیکن ۹ سال ہرگز نہ تھی۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ غلط چیز ایک مسلمہ حقیقت بن کر کس طرح تواتر کا درجہ حاصل کر گئی؟ تو بات یہ ہے کہ ایک اسی پر کیا موقوف ہے بیسیوں

باتیں ہیں جو مشہور ہیں لیکن ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ صورت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح کسرات کو حذف کر دینا عربوں کا ایک عام رواج تھا (مثلاً ۲۷ کو ۲۰ کہہ دینا) اسی طرح عشرات (دہائیوں) کو بھی وہ حذف کر دیتے ہوں گے ست عشرہ کو ست کہہ دیا۔ تسع عشرہ کو تسع بتا دیا۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے ہم ۱۸۵۷ء کو صرف ۵۷ء اور ۱۹۵۸ء کو فقط ۵۸ء کہہ دیتے ہیں۔

اوپر کے بیان سے اتنا تو ثابت ہو جاتا ہے کہ چار یا چھ سال کی عمر میں نکاح اور ۹ سال کی عمر میں رخصتی یقیناً غلط ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر نکاح یا رخصتی کی صحیح عمر کیا ہے؟ ہمارے خیال میں پہلی روایت زیادہ قرین قیاس ہے یعنی ۱۴ سال میں نکاح ۱۷ سال میں ہجرت اور ۱۹ سال میں رخصتی۔

چلیے اگر آپ اسے نہیں مانتے تو ۱۶ سال مان لیجیے۔ یہ بھی پسند نہیں تو ۱۲ ہی سال تسلیم کر لیجیے لیکن ۹ سال مان کر اس سے تو صغر سنی کی شادی پر استدلال نہ فرمایئے۔

غزوۂ بنی قینقاع

(شوال سنہ ۲ھ)

مدینے اور اس کے اطراف میں یہود کے تین باوقار قبیلے آباد تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ، اور بنی قینقاع۔ یہ آخر الذکر قبیلہ بڑا جاہ اور تھا۔ لیکن یہ

نفسیاتی اصول ہے کہ جب اخلاقی رجحانات میں پستی آنے لگے تو شجاعت تہوّر سے بدل جاتی ہے۔ شجاعت کا خاصّہ ہے عفو، درگذر، تحمل، بردباری، اور رواداری یعنی کمزوروں کے ساتھ عفو اور رواداری ہوتی ہے اور اگر قوی کا مقابلہ ہو تو قدم پیچھے نہیں ہٹتے۔ یہ تو ہوئی شجاعت جس کے پیچھے کئی دوسری اعلیٰ اقدار بھی ہوتی ہیں لیکن تہوّر کے خواص اس سے مختلف ہیں۔ اس میں خودغرضی اور مفاد پرستی کا جذبہ ہوتا ہے اور بہادری کا اظہار کمزوروں پر ہوتا ہے۔ اگر قوی کا مقابلہ ہو تو ساری بہادری مسکینی و تملق میں تبدیل ہو جاتی ہے شجاعت کا جوہر حمایت حق پر ابھارتا ہے یا مقابلۂ باطل پر۔ لیکن تہوّر ہر اس جگہ حرکت میں آتا ہے جہاں ہوائے نفس مجبور کرے۔ بنی قینقاع کی بہادری کا بھی یہی حال تھا کہ ان میں مظاہرہ تو شجاعت کا ہوتا تھا لیکن عمل تہوّر پر تھا۔ جس میں اخلاقی پابندیاں ضروری نہیں ہوتیں۔

یہودیوں کو اب تک اہل اسلام نے کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ لیکن کئی وجوہ سے ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جذبات میں روز افزوں تلاطم برپا ہو رہا تھا۔ مثلاً:

۱۔ اہل اسلام کا اثر جس نسبت سے بڑھتا جا رہا تھا اسی نسبت سے ان کا اثر گھٹتا جا رہا تھا۔

۲۔ بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں ایک نبی کا آنا انہیں شروع سے ہی ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

۳۔ بیت المقدس کی بجائے بیت خلیل کا قبلۂ اسلام بن جانا ان کی ناراضی میں دوچند اضافے کا باعث ہو گیا۔

۴۔ اور سب سے بڑی یہ بات ہوئی کہ انصار کے اندر نہ فقط اتحاد

پیدا ہو گیا بلکہ ان کے اخلاق بے حد بلند ہو گئے اور اس کا اثر ان کی معاشی زندگی پر یہ پڑا کہ یہودیوں کی مقروضیت اور معاشی غلامی سے وہ آزاد ہو گئے۔

۵۔ فتح بدر سے ان کی یہ آس بھی گویا ٹوٹ گئی کہ قریش کی سازش سے وہ اہل اسلام پر غالب آ سکیں گے۔

غرض ایسے بہت سے اسباب پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے یہود خار کھا رہے تھے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان میں کسی سے حسد و عناد پیدا ہو جائے تو وہ اپنی تعمیر کی بجائے دوسرے کی تخریب میں لگ جاتا ہے اور ہر وقت اسی تاک میں لگا رہتا ہے کہ کون سا موقع آئے جو ہم اس سے اپنی دشمنی نکالیں۔ ظاہر ہے کہ جب حسد و بغض اور غیظ و غضب پیدا ہو جائے تو دماغی توازن میں بھی فرق پڑ جاتا ہے اور بہت سی باتوں کا اندازہ بھی غلط کرنے لگتا ہے۔ یہود بنی قینقاع سے یہی غلطی ہو گئی جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

ایک دن ان کے بعض بدکرداروں نے ایک انصاری خاتون کو سر راہ چھیڑا جس پر اس نے شور مچایا۔ آواز سن کر ایک انصاری وہاں پہنچے، اور چھیڑنے والے کو روکا۔ اس سے تو تو میں میں ہوئی، اور انہوں نے اس یہودی کو قتل کر دیا۔ اس پر اس کے دوسرے مددگار یہودیوں نے مل کر ان انصاری کو مار ڈالا۔ اس سے قدرتی طور پر مسلمانوں اور یہودیوں دونوں میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ اور اس اشتعال کو دور کرنے کی غرض سے حضورؐ خود وہاں تشریف لے گئے۔ حضورؐ نے یہودیوں کو خوف خدا کی تلقین کی اور فرمایا کہ: کہیں تم لوگوں پر بھی اسی طرح غضب الٰہی نہ نازل ہو جس طرح مشرکین بدر پر نازل ہو چکا ہے۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ مکے والے فن جنگ سے ناواقف تھے اس لیے شکست کھا گئے۔ اگر تم لوگوں کی ہم سے جنگ ہوئی تو تمہیں جنگ

کا مزہ آجائے گا۔ معاملہ طول پکڑتا گیا مگر پھر بھی حالات پر آسانی سے قابو پایا جا سکتا تھا لیکن غضب یہ ہوا کہ یہود بنی قینقاع نے معاہدہ توڑنے کا اعلان کر دیا۔ معاہدہ توڑنے کا مطلب اعلانِ جنگ تھا۔ ان میں حالات حضورؐ کو ان پر فوج کشی کرنی پڑی۔ اس وقت دنیا کو علم ہو گیا کہ یہ بنی قینقاع اہلِ شجاعت نہ تھے بلکہ اہلِ تہور تھے۔ مقابلے کی جرأت نہ کر سکے الٹا قلعہ بند ہو گئے۔ دو ہفتے محاصرہ رہا آخر عبداللہ بن ابی بن سلول رئیس المنافقین نے یہودیوں سے صلح کی بات چیت کرنے کے لیے بیچ میں ڈالا اور فیصلۂ جلاوطنی کو منظور کر لیا۔ سات سو یہود بنی قینقاع اپنے تمام مال و اسباب سمیت جلا وطن ہو کر شام کے علاقہ "اذرعات" میں آباد ہو گئے۔

بظاہر یہ جلاوطنی ایک ظلم دکھائی دیتی ہے اور بادی النظر میں رحمۃ للعالمینؐ کی رحمتِ عامہ کے منافی بھی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حضورؐ بڑے سے بڑے جرم کو معاف فرما دیتے تھے لیکن "غدر" (عہد شکنی) کو برداشت نہ فرماتے تھے۔ حضورؐ کی بعثت کا مقصد ہی تھا اعلیٰ اقدار کا قیام۔ اور وفائے عہد ایک ایسی اعلیٰ قدر ہے جس کے بغیر دوسری تمام اقدار بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر کسی فرد یا قوم سے کوئی معاملہ کیا جائے اور وہ ایک بار عہد شکنی کرے تو آئندہ اس کے عہد کا کیا اعتبار قائم رہ سکتا ہے؟ عہد شکنی کے بعد اس پر کسی وقت بھی اطمینان نہیں کیا جا سکتا اور جب یہ صورت حال ہو کہ باہمی اعتماد اٹھ جائے تو نظامِ امن قائم رہنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس بے اعتمادی کی حالت میں نہ تجارتی تعلقات قائم رہ سکتے ہیں نہ صنعتی۔ نہ سیاسی خوشگواری رہ سکتی ہے نہ بین الاقوامی امن و امان۔ اس سے پہلے دنیا میں اس طرح کی غداریاں، سیاسی فریب کاریاں

اور عہد شکنیاں ہوتی رہی ہیں اور معاہدوں کو زیادہ سے زیادہ ایک ایسا مکڑی کا جالا تصور کیا جاتا رہا جو کمزور کو پھانس لیتا ہے اور مضبوط کی ایک جنبش سے ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن حضورؐ سیاست کی اس خود غرضانہ بازیگریوں کی بھی تطہیر چاہتے تھے اس لیے سیاسی عہود کو انسانی اقدار سے متجاوز ہوتے نہ دیکھ سکتے تھے۔ حضورؐ معاہدوں کی جس شدت کے ساتھ پابندی چاہتے تھے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ:

۱۔ حذیفہ اور ابوحسیل جب مکے سے ہجرت کرنے لگتے ہیں تو قریش انہیں روک لیتے ہیں اور اس وعدے پر انہیں چھوڑتے ہیں کہ مدینے جاؤ مگر محمدؐ کے ساتھ ہمارے مقابلے میں جنگ کے لیے نہ آنا۔ غزوۂ بدر پیش آتا ہے تو ان دونوں کے اندر بھی شرکتِ قتال کا جذبہ پیدا ہوتا ہے لیکن وہ عہد بھی سامنے آجاتا ہے جو قریش سے کر چکے ہیں۔ یہ دونوں اپنی صورتِ حال حضورؐ کے سامنے پیش کرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے کہ: انصرفا نفی لھم بعھدھم و نستعین اللہ علیھم۔

یعنی تم دونوں واپس جاؤ۔ ہم بہر حال وفائے عہد کریں گے اور دشمنوں کے مقابلے میں اللہ سے مدد چاہیں گے۔

۲۔ صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ لکھی جاتی ہے کہ مکے سے جو مسلمان قیدی مدینے پہنچے گا اسے واپس کرنا ہوگا لیکن قریش مدینے سے آیا ہوا کوئی آدمی واپس نہ کریں گے۔ اسی دوران میں ابوجندلؓ کسی طرح بھاگ کر یہاں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے نشانِ ضرب دکھا دکھا کر فریاد کرتے ہیں۔ ابھی عہد نامے پر دستخط بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن قریش کے مطالبے پر حضورؐ ان کو واپس کر دیتے ہیں۔

۳۔ ابوبصیرؓ (عتبہ بن اسید) کچھ دنوں کے بعد اسی طرح بھاگ کر مدینے پہنچے۔ قریش کے دو آدمی انہیں واپس کرنے کا مطالبہ لے کر گئے اور حضورؐ نے ان

کو بھی ابو جندلؓ کی طرح پہلے سے زیادہ پُر خطر ماحول میں واپس کر دیا۔ راستے میں بمقام ذوالحلیفہ انہوں نے ان دو میں سے ایک کو مار دیا اور دوسرا بھاگ کر مدینے پہنچا اور ساتھ ہی ابو بصیرؓ بھی پہنچ گئے۔ حضورؐ نے انہیں پھر واپس کر دیا۔ یہ مکے تو نہ گئے بلکہ عیص میں اپنا اڈا جما لیا۔ لیکن بہر حال حضورؐ نے مدینے میں ان کا رہنا پسند نہ کیا۔

ایسے ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ اپنے جاں نثاروں کا موت کے دہانے میں بھیج دینا تو گوارا کر لیا لیکن وفائے عہد اور دوسری اخلاقی اقدار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ خود ہی سوچیے کہ وفائے عہد کی خاطر جب حضورؐ بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے سے بھی دریغ نہ فرماتے تھے تو جن یہود بنی قینقاع نے عہد شکنی کا اعلان کر دیا ان پر ایک ساعت کے لیے بھی حضورؐ اعتماد فرما سکتے تھے؟ کیا ایسی قوم انسانی اقدار کے لیے ناسور کا حکم نہ رکھتی تھی؟ اس ناسور کا علاج ہی ایسا آپریشن تھا جو ناسور زدہ عضو کو کاٹ کر کیا جائے تاکہ آئندہ اس کی کسی کو جرأت نہ ہو۔ لیکن حضورؐ کا یہ تقاضائے رحمت تھا کہ ایک ہلکی سی سزا دی یعنی جلاوطنی کی سزا۔ تاکہ وہ معاشرہ جس کو حضورؐ خالص اخلاقی اقدار کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے ان کے متعدی اثرات سے پاک ہو جائے۔ یہ ایک ایسا عمل جراحی تھا جس کے بغیر انسانیت کا پورا دھڑ ہی مسموم ہو جاتا۔

کعب بن اشرف کے قتل کی روایت

بخاری اور ابن اسحاق کی روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ کعب بن اشرف کے متعلق خود حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ اسے کون قتل کرے گا؟ محمد بن مسلمہ نے کہا مَیں قتل کر دوں گا لیکن کچھ جھوٹ سچ باتیں بنانے کی بھی اجازت دی جائے۔ حضورؐ

نے اس کی بھی اجازت دے دی۔ محمد بن مسلمہ کے ساتھ سلکان بن سلامہ بن وقش، عباد بن بشر بن وقش، حارث بن اوس بن معاذ اور ابوعبس بن جبر روانہ ہوئے اور حضورؐ نے بقیع غرقد تک ان کی مشایعت بھی فرمائی۔ اول الذکر تینوں بنی عبدالاشہل سے تعلق رکھتے تھے اور سلکان جس کی کنیت ابونائلہ ہے کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ کعب بن اشرف خاندان طے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی ننھیال یہودی قبیلہ بنی نضیر میں تھی۔ یہ بڑا حسین اور اعلیٰ درجے کا شاعر تھا، اور صاحب کاروبار بھی کرتا تھا۔ دولت مند اور حسین شاعر ہونے کی وجہ سے بنی نضیر کی قیادت اس کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ یہ حضورؐ کا سخت دشمن تھا۔ اپنی شاعری سے لوگوں کو حضورؐ کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا اور حضورؐ کی بلکہ عام مسلمانوں کی بھی ہجو کیا کرتا تھا۔ محمد بن مسلمہ اور اس کے ساتھیوں نے شب کے وقت اس کے گھر پر جاکر آواز دی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ اس آواز میں تو سے خون آرہی ہے۔ بہرکیف وہ باہر آیا اور اس کے بالوں کی خوشبو سونگھنے کے بہانے اسے دبوچ لیا اور اسے مار کر حضورؐ کی خدمت میں اس کا سر لے آئے۔"

انسانی خون کا جو احترام حضورؐ نے سکھایا ہے اور عین حالت جنگ میں بھی جن انسانی و اخلاقی اقدار کی محافظت کی تعلیم فرمائی اسے دیکھتے ہوئے یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کسی جنگ کا الٹی میٹم دیئے بغیر اقدام قتل پر رضامند ہونا، اور نہ فقط رضامند ہونا بلکہ خود اس کی ترغیب دینا ــــ حضورؐ کی سیرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ اور جب یہ چیز سامنے آتی ہے کہ حضورؐ نے کسی بہادری سے نہیں بلکہ دھوکے سے جھوٹی سچی باتیں بنا کر بھی قتل کرنے کی اجازت دی تو روایت کے غلط ہونے پر آخری مہر بھی لگ جاتی ہے۔ حضورؐ اس قسم کوئی بات نہ پسند فرما سکتے تھے جو اخلاق سے گری ہوئی ہو اور جو اگر خود مسلمانوں کے ساتھ کی جائے تو اسے پسند

نہ فرمائیں۔

اگر اسلام دشمنی اور ہجو رسالت سے بچنے کے لیے اسلامی اقتدار کو مجروح کرنا جائز ہوتا تو اب تک خدا جانے کتنے قتل ہو چکے ہوتے۔ ذرا سوچیے کیا فتح مکہ تک ابو سفیان سے بھی زیادہ کوئی اسلام دشمن تھا؟ اور ایک ابو سفیان پر کیا موقوف ہے؟ کون سا قریشی، کون سا یہودی اور کون سا غیر مسلم حضورؐ کا، اسلام اور عام مسلمانوں کا جانی دشمن نہ تھا اور کس نے اپنی زبان کو ہجو حق سے آلودہ نہیں کیا تھا؟ لیکن کیا حضورؐ نے کسی کو اس طرح بغیر جنگ کے، دھوکے سے قتل کرانے کی کوئی سازش کی؟ اس قسم کے دو واقعے منقول ہیں جن میں دوسرے (ابو رافع کے قتل) کا ذکر آگے آئے گا۔ لیکن جس شکل میں یہ دونوں روایتیں پیش کی گئی ہیں وہ یا تو سرے سے غلط ہیں یا پھر اس کا صحیح پس منظر راوی نہیں پیش کر سکا ہے۔ ہمارا اصول یہ نہیں کہ سو فی صد روایات سے حضورؐ کی سیرت تیار کی جائے بلکہ قرآنی تعلیمات اور خود دوسری صحیح روایات سے حضورؐ کی سیرت کا جو نقشہ سامنے آتا ہے وہ بجائے خود روایات کی صحت وسقم کا اعلیٰ معیار ہے۔ اس سے متناقض ہونے والی کوئی روایات قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

آپ آگے چل کر پڑھیں گے کہ حضورؐ نے ابو براء کلابی کی درخواست پر ستر مبلغین کو نجد کی طرف بھیجا جو بیر معونہ پر دھوکے سے قتل کر دیے گئے اس دغا سے حضورؐ کو اتنا صدمہ پہنچا کہ ان دغا بازوں کے حق میں حضورؐ ایک مہینے تک نماز صبح میں بددعا فرماتے رہے۔ ذرا سوچیے جس دغا سے حضورؐ کو اتنی نفرت تھی اس دغا بازی کی تعلیم و ترغیب حضورؐ اپنی امت کو دے سکتے تھے؟

ایک اور واقعے پر غور کیجیے جو ابو داؤد اور نسائی میں سعد سے مروی

ہے۔ فتح مکہ کے بعد عبداللہ بن ابی سرح کو واجب القتل قرار دیا گیا تھا۔ یہ حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے۔ اس لیے آپ ہی کے پاس روپوش ہو گئے۔ جب بیعت عام ہونے لگی تو حضرت عثمانؓ انہیں ساتھ لے کر آئے اور بیعت اسلام لینے کی تین بار درخواست کی۔ ہر بار حضورؐ نے سر اٹھا کر ابن ابی سرح کو دیکھا اور چوتھی بار بیعت اسلام لے لی۔ پھر صحابہ سے فرمایا کہ: تم دیکھ رہے تھے کہ میں اس کی بیعت نہیں لے رہا ہوں تو تم میں سے اتنی سمجھ والا کوئی نہ تھا جو اٹھ کر اسے قتل کر دیتا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ: ہمیں حضورؐ کے دل کی بات کا کیا علم تھا۔ حضورؐ نے آنکھ سے ہی اشارہ فرما دیا ہوتا۔ حضورؐ نے جواب دیا:

لا ینبغی لنبیؐ ان تکون لہ خائنۃ الاعین۔ — کسی پیغمبر کو اس قسم کی اشارہ بازی زیب نہیں دیتی۔

ذرا ملاحظہ فرمایئے

۱۔ ابن ابی سرح اپنی بعض انتہائی نازیبا حرکات کی وجہ سے واجب القتل قرار پا چکا ہے۔

۲۔ سامنے بے بس کھڑا ہے۔

۳۔ ایک ادنیٰ سے اشارے میں گردن اڑ سکتی ہے۔

۴۔ تین بار کی خاموشی سے بھی حضورؐ موقع دیتے ہیں کہ اب بھی کوئی قتل کر دے۔

۵۔ اگر حضورؐ چاہتے تو بڑی آسانی سے اس کی بیعت کو دوسرے وقت پر ٹال دیتے اور اس درمیان میں کسی کو اشارہ کر دیتے کہ اسے قتل کر دو۔

۶۔ صحابہ یہ عرض بھی کرتے ہیں کہ کاش حضورؐ نے ذرا آنکھ سے اشارہ

فرمادیا ہوتا۔

ان تمام باتوں کے باوجود حضورؐ نبوی کیرکٹر کا اظہار اس انداز سے فرماتے ہیں کہ: "پیغمبر کے لیے اس قسم کی چشمی اشارے بازیاں روا نہیں۔" اب آپ خود ہی سوچیے کہ ایک قبضے میں آئے ہوئے واجب القتل مجرم کو بھی قتل کرنے کے لیے حضورؐ کوئی فریب کارانہ انداز اختیار فرمانا کردارِ پیغمبری کے لیے نامناسب سمجھتے ہیں۔ ایک واجب القتل کا قتل سے بچ جانا تو گوارا فرما لیتے ہیں لیکن ایسی کوئی دورخی پالیسی اختیار کرنا پسند نہیں فرماتے جس میں دنیادارانہ ڈپلومیسی یا دغا و فریب کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہو اور کردارِ نبوت کے صاف ستھرے دامن پر کوئی ہلکا سا داغ آسکے۔

اس بلند کردار کے ساتھ ذرا کعب بن اشرف کے قتل کا وہ واقعہ رکھیے اور روایت پرستی کے جذبے سے الگ ہو کر دیکھیے۔ کیا دونوں میں کوئی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ میرا دل تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتا کہ حضورؐ کا یہ اندرونی منشا ہو اور محمد بن سلمہ نے اسے تاڑ کر از خود ہی یہ اقدام کیا ہو۔ چہ جائیکہ حضورؐ خود اس اقدام پر آمادہ کریں اور بقیع غرقد تک مشایعت بھی فرمائیں۔ اور پھر اس کے لیے جھوٹی سچی باتیں بنانے کی بھی اجازت مرحمت فرمائیں۔ میرا دل تو یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی نے یہ اقدام حبِ رسولؐ کے جوش میں خود کیا ہو اور حضورؐ نے کسی خوشنودی کا اظہار کیا ہو۔

اگر یہ روایت صحیح ہے تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ راوی سے اس کا صحیح پس منظر اوجھل رہا ہے اور حقیقتِ حال مستور ہو کر واقعات غلط رنگ میں پیش ہو گئے ہیں۔

غزوۂ اُحد

معرکۂ بدر کی اسلامی فتح نے کفار قریش کی آتشِ انتقام کو بے انتہا بھڑکا دیا تھا۔ اسی آگ کا ایک شعلہ تھا جو ابوسفیان نے عُریض کی چراگاہ میں پھینک کر اپنی قسم پوری کر لی تھی۔ معرکۂ بدر کے بعد سارے قریش کی کمان ابوسفیان کے ہاتھ میں آگئی تھی اس لیے تمام قبائل قریش نے انتقام لینے کی درخواست انہیں سے کی اور ابوسفیان نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ ان سب کو نظر آرہا تھا کہ اگر جلد سے جلد انتقامِ بدر نہ لیا گیا تو نہ صرف یہ کہ اہلِ اسلام کا اقتدار بڑھتا چلا جائے گا بلکہ قریش کا رہا سہا وقار بھی خاک میں مل جائے گا۔ اس تصور کے تحت انہوں نے ایک نئی جنگ کی بڑے زور شور سے تیاری شروع کر دی۔ اس تیاری کا اندازہ اس سے کیجیے کہ:

۱۔ شام سے آیا ہوا کل منافعہ جو قافلۂ ابوسفیان کے ساتھ آیا تھا اور (جو کسی مڈبھیڑ کے بغیر ہی مکے پہنچ گیا تھا اور جس کی وجہ سے معرکۂ بدر پیش آیا تھا) اس جنگی تیاری میں جھونک دیا گیا۔ اس کی مقدار پچاس ہزار مثقال سونا اور ایک ہزار اونٹ تھے۔

۲۔ اس کے علاوہ بھی لوگوں نے الگ سے چندے دیے تھے۔

۳۔ آتش بیان خطبا اور جادو اثر شعرا ہر طرف بکھیر دیے گئے تاکہ ہر طرف جوشِ انتقام کو بھڑکاتے رہیں اور درمے سخنے قدمے ہر طرح کا تعاون حاصل کیا جائے۔ جو لوگ عربی ذہنیت سے واقف ہیں وہ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بجائے خود وہاں کے لیے کتنا بڑا حربہ تھا۔ ان میں ابوعزہ، عمرو جمحی اور مسافع

وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر خطبا و شعراء ہیں۔ خطابت اور پرجوش شاعری آج
بھی کچھ کم تاثیر کی حامل نہیں لیکن اس دور میں تو گویا حکومت ہی زبان آوری
کی تھی۔ ایک شعر سے جس قبیلے کو چاہا ذلیل کر دیا اور جسے چاہا آسمان پر چڑھا دیا
جب چاہا جوش کو ابھار دیا اور جب چاہا بڑے سے بڑا فتنہ پیدا کر دیا۔
یہ بھی عجیب بات ہے کہ عمرو جمحی بدر میں قید ہوا تھا اور حضور نے اسے
بلا فدیہ رہا کر دیا تھا لیکن یہ اب مخالفت پہ آمادہ ہو گیا۔

۴۔ اس سے بھی زیادہ موثر حربہ یہ تھا کہ بڑے بااثر اور اونچے گھرانے
کی خواتین بھی میدان جنگ میں ساتھ لے لی گئیں۔ ان میں اکثر وہ عورتیں
تھیں جن کے رشتے دار بدر میں مارے گئے تھے اور ان کے دل میں انتقام کی
آگ بھڑک رہی تھی۔ ان کے سپرد یہ خدمت تھی کہ عین میدان جنگ میں باہر
نکل کر مردوں کو جوش اور اس سے زیادہ غیرت دلائیں۔ یہ بجائے خود ہی شاعرات
تھیں اور ان کا ایک ایک لفظ مُردوں میں نئی روح پھونک کر کٹ مرنے پر
ابھارنے کے لیے بہت کافی تھا۔ پھر ان کا وجود اس لیے بھی بڑا موثر تھا کہ
ہر نبرد آزما یہ سمجھتا تھا کہ اگر ہم نے پیٹھ دکھائی تو ہماری یہ معزز خواتین دشمنوں
کے قبضے میں چلی جائیں گی اس لیے یہ تقاضائے غیرتمندی ہے کہ ان کے ناموس
کی خاطر جان کی بازی لگا دی جائے۔

ان عورتوں میں خود ابوسفیان کی بیوی ہند بھی ہیں جن کا باپ عتبہ بدر
میں مارا گیا تھا۔ عکرمہ کی بیوی ام حکیم بھی ہیں جن کا خسر ابوجہل بھی بدر میں قتل
ہوا تھا۔ خالد کی بہن فاطمہ بھی ہیں جو خود اس جنگ احد میں موجود ہیں اور جن کی
شجاعت کفر و اسلام دونوں میں مسلّم تھی۔ رئیسِ طائف مسعود ثقفی کی بیٹی ہرزہ
بھی ہے۔ عمرو بن العاص کی بیوی ریطہ بھی ہے۔ اور عجیب تماشا یہ ہے کہ

حضرت مصعب بن عمیر تو لشکرِ اسلام میں ہیں اور ان کی ماں خناس لشکرِ کفار میں۔

۵۔ پانچ ہزار کا لشکر تیار ہوا جس میں تین ہزار شتر سوار، اور دو سَو اسپ سوار اور سات سو زرہ پوش تھے اور ہر شخص آتشِ انتقام سے ہمہ تن شعلۂ جوّالہ بنا ہوا ہے۔

ان تمام تیاریوں کے ساتھ لشکرِ قریش مدینے کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضرت عباسؓ بن عبد المطلب اگرچہ فیصلۂ بدر کے بعد ہی ایمان لا چکے تھے لیکن ہنوز مکّے میں مقیم تھے۔ انھوں نے قریش کی تمام سازشوں اور تیاریوں کا حال لکھ کر ایک تیز رفتار قاصد کو حضورؐ کے پاس بھیج دیا۔

حضورؐ نے یہ اطلاع پاکر (شوال ۳ھ میں) دو آدمیوں — انس اور مونس — کو لشکرِ قریش کی نقل و حرکت کی خبر لانے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے حضورؐ کو یہ اطلاع دی کہ لشکرِ قریش مدینے کے قریب آچکا ہے بلکہ عریض کی چراگاہ کو صاف کر چکا ہے۔ حضورؐ نے پھر حباب بن منذر کو لشکر کی صحیح تعداد کا اندازہ کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے واپس آکر صحیح تعداد کا تخمینہ بتایا۔ اس دن ساری رات حضرت سعد بن عبادہ اور سعد بن معاذ نے مسجدِ نبوی کا پہرہ دے کر قرانِ سعدین پیش کیا اور دوسرے مسلمانوں نے دوسرے خطرے کے محاذوں پر پہرے دیے۔ قریش کی طرف سے حملے کا اندیشہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس لیے صبح حضورؐ نے صحابہ سے مشورہ لیا۔ حضورؐ کی خواہش تھی کہ مدینے کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے۔ اکثر مہاجرین و انصار نے بھی اسی رائے کی حمایت کی مگر بعض جوشیلے نوجوانوں نے رائے دی کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ راس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کے حق میں تھا۔ جب پُرجوش طبقے نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے پر زیادہ اصرار کیا تو حضورؐ گھر کے اندر

تشریف لے گئے اور مسلح ہو کر باہر تشریف لائے۔ اب جوشیلے طبقے کو خیال آیا کہ باہر نکل کر مقابلہ کرنا خود حضورؐ کی مرضی کے مطابق نہیں لیکن حضورؐ صرف ہم لوگوں کے اصرار سے مسلح ہو کر تشریف لے آئے ہیں۔ یہ سوچ کر ان سب نے اپنی رائے واپس لینی چاہی اور حضورؐ کی مرضی کے مطابق اندر رہ کر مقابلہ کرنے پر آمادگی ظاہر کی لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ ہتھیار باندھ کر کھولنا ایک نبی کو زیب نہیں دیتا۔

یہ جمعے کا دن تھا۔ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ایک ہزار کا جیش مدینے سے باہر روانہ ہو گیا۔ عبداللہ بن اُبی نے عین وقت پر دغا دی اور بہانہ یہ پیش کیا کہ جب ہماری رائے ہی نہیں مانی گئی تو ہم شہر سے باہر نکل کر لڑائی کرنے میں کیوں ساتھ دیں؟ یہ منافق تین سو کی جمعیت لے کر واپس آگیا اور سر فروش مسلمان صرف سات سو رہ گئے۔ یعنی لشکرِ قریش میں جتنے صرف زرہ پوش تھے اتنے یہاں سارے مسلمان رہ گئے۔ گویا بدر میں تو ایک اور تین کی نسبت تھی لیکن آج اہل کفر کی تعداد مسلمانوں سے سات گنی سے بھی زیادہ تھی۔

جذبۂ فدویت کی انوکھی مثال

مدینے سے باہر آ کر حضورؐ نے جیشِ اسلامی کا جائزہ لیا۔ حضورؐ کمسن بچوں کو چھانٹنے لگے تا کہ انہیں واپس کر دیں۔ اتنے میں ایک کم سن بچے پر نظر پڑی۔ یہ تھے رافع بن خدیج جو اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے بل کھڑے ہو کر یہ مظاہرہ کر رہے تھے کہ میں بھی بڑوں میں شامل ہوں اور اتنا کم سن نہیں ہوں کہ میدان غزا سے واپس کر دیا جاؤں۔ رافع کی تدبیر کامیاب رہی اور وہ لشکر میں شامل کر لیے گئے۔ اس کے بعد ایک دوسرے صاحبزادے کی باری آئی۔ یہ تھے سمرہ بن جندب۔ انہیں یہ تدبیر نہ سوجھی اس لیے حضورؐ نے انہیں الگ کر دیا۔ الگ کرنا تھا کہ یہ مچل گئے اور

عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں رافع سے زیادہ شہ زور ہوں۔ کشتی کرا کے دیکھ لیا جائے۔ چنانچہ کشتی ہوئی اور واقعی سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور اس طرح اپنا استحقاق پیدا کر کے یہ بھی مجاہدین میں لے لیے گئے۔

یہاں بے ساختہ بنی اسرائیل کا یہ طرزِ عمل یاد آتا ہے جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کو صاف جواب دیدیا تھا کہ "(عمالقہ کے مقابلے میں) آپ اور آپ کا خدا جائے۔ ہم تو یہیں سے بیٹھے تماشا دیکھیں گے۔" اس کے مقابلے میں امتِ محمدیہ کے ان کمسن بچوں کو دیکھیے کہ کس کس حیلے بہانے سے میدانِ جنگ میں جانے کے لیے بے تاب ہیں۔

صف آرائی

حضورؐ اپنے ساتھ سرفروشوں کو لیے ہوئے مدینے سے تقریباً چار کوس کے فاصلے پر میدانِ احد میں پہنچے۔ کوہ احد کو اپنی پشت کی طرف رکھ کر صف آرائی شروع کی۔ مصعب بن عمیر کو علم عنایت کیا۔ زبیر بن عوام کو رسالے کا افسر مقرر کیا۔ بے زرہ پوش فوج کی کمان حمزہؓ کے سپرد کی۔ پشت کی طرف جو گھاٹی تھی اس کی ناکے بندی کے لیے پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کیا جس کے افسر عبداللہ بن جبیر تھے۔ ساتھ ہی اس دستے کو یہ ہدایت فرمائی کہ جنگ کا خواہ کوئی نقشہ بھی ہو مگر تم لوگ اس ناکے سے نہ ہٹنا۔

قریش کی صف بندی

قریش کو بدر میں مسلمانوں کی جنگی صلاحیتوں کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے اب کے بڑی دانائی و ہوشیاری کے ساتھ اپنی صفیں مرتب کیں۔

میمنے پر خالد بن ولید کمان سنبھالے ہوئے ہیں جن کی بہن فاطمہ مردوں کو جوش دلانے کے لیے میدانِ جنگ میں موجود ہیں۔ اور جن کو چھوڑ کر بھاگنے کا خیال بھی خالد کے لیے ناقابلِ برداشت تازیانہ ہے۔ میسرے کے کمانڈار عکرمہ ہیں جن کا باپ ابوجہل بدر میں ذلّت کے ساتھ مارا جا چکا ہے اور جن کے جذبۂ انتقام سے عکرمہ کا خون کھول رہا ہے۔ پھر عکرمہ کی غیرت کو ابھارنے کے لیے ان کی بیوی امّ حکیم رجز خواں ہے۔ سواروں کی افسری ابن صفوان کے سپرد ہے جس کا باپ امیہ بدر میں قتل ہو چکا ہے اور جس نے جوشِ انتقام میں عمیر بن وہب کو حضورؐ کے قتل کے لیے مدینے میں بھیجا تھا طلحہ کے ہاتھ میں علم ہے، اور تیر اندازوں کی کمان عبداللہ بن ربیعہ کے ہاتھ میں ہے۔ دو سو گھوڑے اس لیے الگ رکھ لیے گئے تھے کہ بوقت ضرورت فوراً میدان میں لائے جا سکیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سردار قریش ابوسفیان ہیں اور ان کی بیوی ہند بنت عتبہ رجز خواں عورتوں کی قیادت کر رہی ہیں۔ اور ان کا وجود سارے قریش کی حمیت وغیرت کو کوہ آتش فشاں بنا رہا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہند کا باپ عتبہ بدر میں حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا ہے اور اس کے انتقام میں وہ وحشی سے وعدہ کر چکی ہیں کہ اگر تو حمزہؓ کو قتل کر دے تو میں تجھے جُبیر کی غلامی سے آزاد کرا دوں گی۔

آغازِ جنگ

اس سازوسامان کے ساتھ قریش نے طبلِ جنگ بجایا اور سب سے پہلے عورتیں آگے بڑھیں۔ آگے آگے ہند تھیں اور ان کے پیچھے پیچھے چودہ عورتیں۔ یہ سب کی سب جس انداز سے آگے بڑھی ہیں وہ مردانِ قریش کی غیرت و

حمیت کے لیے سب سے بڑا چیلنج تھا۔ کہیں مقتولین بدر کا مذبہ تھا اور کہیں نبرد آزماؤں کو جوشِ انتقام میں آپے سے باہر کر دینے والے رجز تھے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔ عورتیں یہ گا رہی تھیں:

نحن بنات طارق	ہم دخترانِ ستارۂ آسمانی ہیں
نمشی علی النمارق	ہم قالینوں پر چلتے ہیں۔
ان تقبلوا نعانق	اگر تم بہادری سے آگے بڑھے تو ہم تمہیں
ان تدبروا نفارق	گلے سے لگا لیں گے۔ اور اگر پیٹھ دکھائی تو
فراق غیر وامق	قطع تعلق کر لیں گے۔
	جیسے بے الفت الگ ہو جاتا ہے۔

ان جادو اثر الفاظ میں کیا آگ بھری ہوئی ہے اس کا آج ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ جاہلیت عرب کے ادب اور ان کے جذباتِ غیرت و انتقام ان کے ولولۂ و جوش، ان کی شجاعت و بے جگری سے جو مؤرخ واقف ہے وہی اس رجز کی تاثیر کو کچھ سمجھ سکتا ہے۔

اوپر آپ غزوۂ بدر کے بیان میں پڑھ چکے ہیں کہ حضرت مجذر نے ابوالبختری سے کہا تھا کہ حضورؐ نے تیرے قتل سے منع کیا ہے اس لیے تجھے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابوالبختری نے کہا کہ میرے رفیق کو بھی جو اس وقت میرے ساتھ ہے چھوڑ دو۔ مجذرؓ نے کہا کہ اس دشمنِ دین کو ضرور قتل کروں گا۔ اس پر ابوالبختری نے جو جواب دیا ہے وہ عرب جاہلیت کی غیرت و حمیت کی پوری تصویر ہے۔ ابوالبختری نے کہا کہ: "میں خاتونانِ عرب کا یہ طعنہ نہیں سن سکتا کہ ابوالبختری نے اپنی جان بچانے کی خاطر اپنے رفیق کا ساتھ چھوڑ دیا۔" یہ کہہ کر اس نے رجز خوانی کرتے ہوئے مجذر پر حملہ کر دیا اور مارا گیا۔

اس واقعے سے آپ اندازہ کر لیجیے کہ میدانِ احد میں اونچے گھرانوں کی عورتوں کی یہ طنز آمیز اور غیرت افزا رجز خوانی کیا اثر رکھتی ہوگی۔

اس کے بعد ابو عامر ڈیڑھ سو آدمیوں کو اپنی جلو میں لیے ہوئے میدان میں آیا۔ یہ اصل میں مدینے ہی کا رہنے والا تھا اور ترکِ وطن کر کے مکّے میں آباد ہو گیا تھا قبل از طلوعِ اسلام یہ بڑا زاہد و پارسا سمجھا جاتا تھا۔ انصار پر بھی اس وقت اس کا اثر تھا۔ یہ پہلے اس لیے میدان میں آیا تھا کہ اپنی دیرینہ پارسائی کی یاد سے انصار کو متاثر کر کے مسلمانوں سے الگ کر لینا چاہتا تھا۔ مگر ان پر کسی کی رسمی پارسائی کیا اثر ڈال سکتی تھی جب کہ ایک پارس کی صحبت میں خود ان کی پارسائی زرِ خالص بن چکی تھی۔ ہر انصاری کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا:

کہ در انداز دور بینیم رہ و رسم پارسائی

اس کے بعد لشکرِ قریش کا علمبردار طلحہ نکل کر طنز آمیز اور حقارت آمیز لہجے میں مسلمانوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ: ہے کوئی تم میں جو مجھے مار کر دوزخ میں پہنچا دے یا خود میرے ہاتھ سے مر کر جنت میں پہنچ جائے؟ اس آواز پر خدا کا شیر (علیؓ)، بپھرتا ہوا آگے بڑھا اور اس کے طنز کا جواب ایک ہی ضربتِ حیدری سے دیا جس کے بعد طلحہ کا طنز حقیقت بن گیا اور وہ مقتولانِ احد کا عنوانِ فہرست بن گیا۔

طلحہ کے گرتے ہی اس کے بھائی عثمان نے لپک کر علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور رجز پڑھتا ہوا آگے بڑھا۔ عورتیں عثمان کے پیچھے رجز خوانی کر رہی تھیں۔ اتنے میں جناب حمزہؓ شہباز کی طرح اپنے شکار پر جھپٹے اور ایک ہی وار میں عثمان شانے سے کمر تک دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔

اس کے بعد لشکرِ قریش نے عام یلغار سے اس کا جواب دیا جسے حمزہؓ، علیؓ، طلحہؓ، ابو دجانہؓ، نضر بن انسؓ نے اسی شدت سے حملے کو روک دیا اور دونوں

بازوؤں کو دباتے چلے گئے۔ اس موقعے پر حضورؐ نے اپنی تلوار بلند کر کے پوچھا: یہ تلوار کون لیتا ہے؟ بہت سے ہاتھ اس کی طرف لپکے۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: اس کا حق کون ادا کرے گا؟ اس سوال کے بعد سارے ہاتھ واپس ہو گئے۔ مگر ایک خوش قسمت تھا جس نے دریافت کر کے اس حق کو معلوم کر لیا اور لپک کر وہ تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق حضورؐ نے اس تلوار کا حق یہ بیان فرمایا کہ اس سے دشمن کو مارتے مارتے اسے ٹیڑھا کر دو۔ یہ تھے سیدنا ابو دجانہؓ سماک بن خرشہ۔ کون جان سکتا ہے کہ جسے رسول اللہؐ اپنے دستِ مبارک سے اپنی مقدس تلوار دیں اور اس اعتماد کے ساتھ دیں کہ اس کا حق ادا کیا جائے گا اس کی قسمت کا ستارہ کتنی بلندی پر پہنچ گیا ہو گا اور اس کی روحانی و نفسی کیفیات عظمت و سعادت کی کن کن رفعتوں سے ہم کنار ہو رہی ہوں گی۔ بس ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ جناب ابو دجانہؓ نے یہ تلوار ہاتھ میں لی تو نازو تبختر کے ساتھ اکڑ اکڑ کر چلنے لگے۔ حضورؐ کی نگاہ ابو دجانہؓ کی ظاہری صورت پر بھی تھی اور اس کی معنویت پر بھی۔ اس لیے فرمایا: خدا کو اس طرح اکڑ کر چلنا پسند نہیں۔ مگر ابو دجانہؓ کا اکڑنا اس وقت خدا کو پسند آ رہا ہے۔"

یہ انداز اپنے اندر دو پہلو رکھتا تھا۔ ایک اپنی خوش بختی پر ناز تھا اور دوسرے اہلِ کفر کے مقابلے میں اکڑ تھی۔

ابو دجانہؓ نے فی الواقع اس بابرکت تلوار کا کچھ حق بھی ادا کیا۔ ایسا حق جو شاید کسی دوسرے کے ذہن میں بھی نہ آتا۔ یہ اس تلوار کو ہاتھ میں لے کر یہ محسوس کر رہے ہوں گے کہ کائنات کی ساری فاتحانہ قوتیں اور بہادرانہ ولولہ و جوش سمٹ کر ان کے قبضے میں آ گئے ہیں اس لیے پوری بے جگری کے ساتھ لڑتے اور صفوں کو الٹتے جا رہے تھے کہ سامنے ایک عورت آ گئی۔ کون؟ ساری عداوتوں

کے ہیرو اور سردارِ قریش ابوسفیان کی بیوی ہند، جو اپنی اور اپنی رفیقاؤں کی رجز خوانی سے قریش میں آگ لگا رہی ہے۔ ہند کے سامنے آنے کے بعد اسے قتل کر دینے کا اس سے بہتر اور برمحل کون سا موقع مل سکتا تھا؟ ابو دجانہؓ بجلی کی طرح لپکے اور ہند پر وار کر ہی دیا۔ ابھی تلوار ہند کے سر کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ابو دجانہؓ نے دفعتہً یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ کھینچ لیا کہ: "رسول اللہؐ کی تلوار کسی عورت پر چلانا اس تلوار کے احترام کے خلاف ہے۔

لمحۂ فکریہ

ہر سیرت نگار ابو دجانہؓ کے اس واقعے کو بس اسی قدر لکھ کر گزر جاتا ہے لیکن ہماری نگاہوں میں یہ واقعہ غزوۂ احد کا ایک ایسا شاہکار ہے جس میں بڑی اعلیٰ اقدار سموئی ہوئی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ عین حالتِ جنگ میں بھی جناب ابو دجانہؓ نے ان جنگی اقدار کا لحاظ رکھا جس کی تعلیم حضورؐ نے دی تھی۔ ان میں ایک قدر یہ بھی تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نہ قتل کیا جائے۔

۲۔ جناب ابو دجانہؓ کو اپنے جذبات پر کتنا قابو تھا کہ گرمیِ قتال کے جوش و شدت میں بھی اپنے دماغی توازن کو اس طرح برقرار رکھا جب کہ عام طور پر لوگ اس بدحواسی میں اندھے ہو جاتے ہیں۔

۳۔ لاٹھی یا تلوار کی ضرب جب چل چکے تو چوٹ لگائے بغیر درمیان میں رُک نہیں سکتی۔ لیکن سیدنا ابو دجانہؓ کی چابکدستی کا یہ کمال بڑا قابلِ غور ہے کہ تلوار کا بھرپور ہاتھ چل چکنے کے بعد بھی سر کے پاس پہنچ کر واپس ہو جاتا ہے۔ راقم الحروف ضرب و حرب (لاٹھی، گدکے، بنوٹ وغیرہ) سے کسی قدر واقف ہے اور وہ جب

ابودجانہ کی اس "قادر ضربی" پر غور کرتا ہے تو عقل حیران ہو جاتی ہے۔

۴۔ جناب ابودجانہؓ کے دل میں سیف نبوی کے احترام کا یہ حال ہے کہ اس کو ایک کافرہ اور دشمن عورت کے خون سے رنگین کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خود صاحبِ سیف صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپؐ کے فرامین کا کس درجے کا احترام ہوگا۔

۵۔ یہ نکتہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ تلوار رحمۃ للعالمینؐ کی تھی، اور فی الواقع کسی عورت کے خون سے اس کا رنگین ہونا اس کے احترام کے خلاف تھا تاہم ابودجانہؓ کے ہاتھ سے یہ تلوار ایک عورت کا سر اڑانے کے لیے حرکت میں آچکی تھی۔ اس لیے یہ چلی بھی تو رحمت بن کر چلی۔ ہند کی گردن تو نہ کٹی مگر کفر کی گردن گویا اسی وقت اڑ گئی۔ یہی ہند فتح مکہ کے بعد ایمان لاتی ہے اور یہی احد میں رجز خوانی کر کر کے اہل کفر کو ابھارنے والی کل جنگ یرموک میں اس شان سے آتی ہے کہ اپنی رجز خوانیوں سے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش و ولولہ پیدا کر رہی ہے۔ ابودجانہ کے ہاتھ میں رسول اللہ کی تلوار تھی اس لیے جب ہند پر چلی بھی تو رحمت بن کر چلی۔

شہادتِ حمزہؓ

بدر میں جبیر بن مطعم کا چچا طعیمہ بن عدی اور ہند کا باپ عتبہ دونوں حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے۔ اس سے جذبۂ انتقام دونوں میں موجود تھا۔ ہند کے توجہ دلانے سے جبیر نے اپنے ایک حبشی غلام —— وحشی نامی —— سے کہا کہ اگر تو میرے چچا کے عوض محمدؐ کے چچا حمزہؓ کو قتل کر دے تو میں تجھے آزاد کر دوں گا۔ احد کے موقعے پر یہ "وحشی" ایک درخت یا پتھر کی اوٹ میں چھپ گیا اور حضرت حمزہؓ کی تاک میں لگا رہا۔ حمزہؓ صفوں کو الٹتے ہوئے غبار آلود اونٹ کی طرح دوڑ

رہے تھے اور کوئی ان کے مقابلے پر آکر ٹک نہ سکتا تھا۔ اتنے میں سباع بن عبدالعزیٰ غشانی کو قتل کر کے وحشی کے پاس سے گزرے اور اس نے نشانہ تاک کر حربہ (ایک چھوٹا نیزہ جسے پھینک کر مارنے میں حبشیوں کو کمال حاصل تھا) پھینکا اور حضرت حمزہؓ کی ناف یا سینے میں لگ کر آر پار ہوگیا۔ حمزہؓ وحشی کی طرف اس حالت میں بھی لپکے مگر لڑکھڑا کر گر گئے اور پھر نہ اٹھ سکے۔

یہاں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے ادھر ایک عورت ہے اور حضرت ابو دجانہؓ اس پر تلوار چلانا سیف نبوی کے احترام کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس شرافت و انسانیت کا جواب یہ دیا جاتا ہے جب حضرت حمزہؓ شہید ہو جاتے ہیں تو دشمن ان کے کان ناک وغیرہ کاٹ کر ہار بناتے ہیں۔ لاش کا مثلہ کرتے ہیں۔ اور وہی عورت (ہند) ان کا جگر نکال کر چبا تی ہے۔ اور نگلنے کی کوشش میں ناکام ہو کر تھوک دیتی ہے۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ جنگی اقدار کا لحاظ کن لوگوں نے رکھا اور یہ کس کی تعلیم کا اثر تھا؟

حنظلہ کی شہادت

یہ منظر بھی دنیا میں کم دیکھا گیا ہو گا کہ ادھر قریشی لشکر کی قیادت ابو عامر کر رہا ہے اور ادھر اسی کے نوجوان فرزند حضرت حنظلہؓ ایک عجیب انداز سے سر فروشی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ یہ نوجوان تھے۔ ابھی ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہ اپنی لذت گیریوں میں محو تھے کہ قتال کے لیے منادی سنی اور فوراً اٹھ کر روانہ ہو گئے۔ غسل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ سوچا کہ اس پکار پر لبیک کہنے میں کہیں تاخیر نہ ہو جائے۔ ویسے ہی بے نہائے روانہ ہو گئے۔ میدانِ جنگ میں آئے تو حضورؐ سے اپنے باپ ابو عامر پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن رحمۃ للعالمینؐ نے اسے گوارا نہ کیا۔ آخر یہ ابوسفیان

پر حملہ آور ہوئے لیکن راستے ہی میں شداد بن اسود نے ان پر وار کر دیا جس سے یہ جانبر نہ ہو سکے۔

ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "حنظلہؓ کو ملائکہ غسل دے رہے ہیں۔" چونکہ منادیِ جہاد کے بعد ان کو غسل جنابت کا موقع نہ مل سکا اور اسی حالت میں شہید ہو گئے اس لیے یہ شرف انہیں حاصل ہوا۔ راہ مولیٰ میں جو بھی ہو اس کی کچھ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ایک بات عام حالات میں معمولی بلکہ مکروہ ہوتی ہے اور دوسرے موقعے پر بڑی قیمتی اور قابل قدر ہوتی ہے۔ خون ناپاک ہے لیکن قتیل فی سبیل اللہ کا خون پاک ہے اور انہیں ان ہی خون کے دھبّوں کے ساتھ دفن کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جنابت ایک ناپاکی ہے لیکن راہِ خدا میں یہ حالت بھی بڑی قابلِ قدر ہے۔ انہی مواقع کے لیے مولانا رومی نے کہا ہے:

خوں شہیداں را ز آب اولیٰ تر است　　　　این خطا از صد صواب اولیٰ تر است

در حقِ او شہد و در حقِ تو سم　　　　در حقِ او مدح و در حقِ تو ذم

فاش غلطی

یہ صحیح ہے کہ اس جنگ کے آغاز ہی میں مسلمانوں کی قیمتی جانیں کام آئیں تاہم جاں نثار بہادروں کے بے پناہ حملوں نے قریش کے چھکے چھڑا دیے اور انہوں نے میدان جنگ سے بھاگنا شروع کر دیا۔ مسلمان یہ سمجھے کہ اب جنگ کا نقشہ ہمارے حق میں پلٹ چکا ہے اور دشمن بھاگ رہے ہیں، یہ دیکھ کر انہوں نے مالِ غنیمت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ تیر اندازوں نے جب یہ دیکھا تو ان کو بھی یہ گمان ہوا کہ اب اس درے کی حفاظت کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہ سوچ کر وہ بھی مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔ ان کے افسر حضرت عبداللہ بن جبیر ان کو سمجھاتے رہے،

رہ کہتے رہے مگر کسی نے ایک نہ سنی اور کم و بیش دس کے سوا سب اس اہم ناکے کو چھوڑ کر چل دیے۔

اس فاش غلطی کا جو نتیجہ نکلا وہ بہت ہولناک تھا۔ قریش کے سپہ سالار اس وقت خالد بن ولید تھے۔ انہوں نے اس ناکے کو خالی دیکھا تو ایک دستہ لیکر ادھر چل پڑے۔ چند تیر اندازوں نے پوری بے جگری سے مقابلہ کیا۔ لیکن سب کے سب درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اب کوئی روک نہ باقی رہی تھی اس لیے خالد نے بھی پورے زور شور سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ غنیمت سمیٹنے والوں کو اب ہوش آیا لیکن انہیں محسوس ہوا کہ وہ خود دشمنوں کے نرغے میں آ گئے ہیں۔

یہ مسلمانوں پر انتہائی نازک وقت تھا۔ ہر طرف افراتفری اور سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی حتیٰ کہ بعض مواقع پر وہ اپنوں اور بیگانوں کی بھی تمیز نہ کر سکے۔ حضرت حذیفہ کے والد یمان خود مسلمانوں ہی کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔ بہت سے جانبازوں کے قدم اکھڑ گئے۔

حضرت مصعب بن عمیر حضورؐ سے کچھ ظاہری مشابہت رکھتے تھے۔ یہ لڑتے لڑتے مارے گئے تو افواہ پھیل گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ اس جھوٹی افواہ سے مسلمانوں کے رہے سہے حواس بھی مختل ہو گئے اور سخت ابتری پھیل گئی ——— کچھ لوگ بدستور لڑ رہے تھے تو کچھ میدان سے واپس آ رہے تھے۔ بعض کنارے بیٹھ کر فکرِ انجام میں غرق ہو رہے تھے اور بعض حضورؐ کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔

انس بن نضر کی شہادت

انس بن نضر لڑتے ہوئے آ رہے تھے کہ ان کی نظر حضرت عمرؓ پر پڑی جو

ہتھیار پھینک کر حیرانی کے عالم میں کھڑے تھے۔ انسؓ نے پوچھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ جناب عمرؓ نے جواب دیا کہ جب رسول اللہؐ ہی نہ رہے تو اب لڑ کر کیا کریں گے؟ انس نے کہا کہ یوں کیوں نہیں کہتے کہ جب رسول اللہؐ ہی نہ رہے تو ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟ جس نصب العین کے لیے حضورؐ نے جان دی اسی پر تم بھی اپنی جان دے دو۔ انس یہ کہہ کر لشکر اعدا پر ٹوٹ پڑے اور داد شجاعت دیتے ہوئے مقام شہادت پر فائز ہو گئے۔ ان کے جسم پر اسیؔ زخم لگے تھے۔ لاش پہچانی نہ جاتی تھی۔ ان کی بہن نے انگلی دیکھ کر انہیں پہچانا۔

مرکزِ کائناتؐ پر یورش

لشکر اعدا نے حضورؐ پر بھی حملہ کیا۔ اس وقت حضورؐ تنہا تھے اور ایک چادر سے منہ لپیٹے ہوئے تھے۔ دشمنوں نے حضورؐ کو تنہا پا کر حملہ کیا تو حضورؐ نے مٹھی میں کنکریاں اٹھا کر دشمنوں کی طرف پھینکیں۔ یہ خدا بہتر جانتا ہے کہ ان کنکریوں میں کیا زور تھا۔ بہرحال دشمن پیچھے ہٹ گئے۔ غالباً سب سے پہلے سعد بن ابی وقاص نے حضورؐ کو پہچان کر آواز دی اور ہر طرف سے لوگ حضورؐ کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑے۔ اس افراتفری میں کون یقین کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ پہلے حضورؐ کے پاس کون پہنچا۔ جو لوگ حضورؐ کے گرد جمع ہو گئے وہ یہ ہیں:

ابوبکر، عمر، علی، عبدالرحمان بن عوف، سعد بن ابی وقاص، طلحہ، زبیر، ابوعبیدہ، ابودجانہ، حباب بن منذر، عاصم بن ثابت، حارث بن صمہ، سہل بن حُنیف، سعد بن معاذ، اسید بن حضیر، اور سعد بن عبادہ وغیرہم۔

اس گھمسان کے رن میں صحابہ نے جاں نثاری کے جو نمونے دکھائے وہ مختصراً یوں ہیں:

سعد بن ابی وقاصؓ کا درجہ

سعد بن ابی وقاص کا ترکش تیر چلاتے چلاتے خالی ہو گیا تو حضورؐ نے اپنا ترکش انڈیل دیا اور فرمایا۔ ارم یا سعد فداك ابی و امی اے سعد تیر چلائے جا تجھ پر میرے ماں باپ قربان ہوں ـــــــ اللہ اللہ! حضورؐ کے اس ایک جملے میں سعدؓ کی کتنی سعادتیں اور فضیلتیں سمٹی ہوئی ہیں۔ فضائل و مناقب کا ایک اتھاہ سمندر ایک کوزے میں بند ہے۔ دنیا کا کون خوش بخت ہے جس کا کوئی عمل اسے اس بلند مرتبے پر پہنچا سکے۔

ابو طلحہؓ کی شجاعت

ابو طلحہ اور سہل بن حنیف کے آگے بھی حضورؐ ہر گزرنے والے سے تیر ڈلواتے جاتے تھے۔ اس دن دو یا تین کمانیں ابو طلحہ کے ہاتھ سے ٹوٹیں۔

ابو دجانہؓ کی جاں نثاری

ابو دجانہؓ حضورؐ کو اس طرح گھیرے کھڑے تھے کہ دشمنوں کے جتنے تیر حضورؐ کی طرف آتے وہ اپنی پشت یا کمر پر لیتے۔

عمارہؓ کا نصیبہ

عمارہ بن یزید بن سکن (یا زیاد بن سکن) کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ حضورؐ نے اس یورش میں اعلان فرمایا کہ آج کون جاں نثاری کا ثبوت دیتا ہے؟ یہ سن کر زیاد بن سکن (یا عمارہ بن زیاد) پانچ اور انصاریوں کو لے کر بڑھے اور ایک ایک نے اپنی جان

کی قربانی دی۔ عمارہ (یا زیاد) میدان میں ایک بے حرکت لاش کی طرح پڑے تھے۔ حضورؐ نے انہیں لانے کا حکم دیا۔ لاش قریب آئی تو اس کی چند سانسیں باقی تھیں۔ حضورؐ کو دیکھتے ہی یہ بے حس و حرکت مقتول پھڑکا اور تڑپ کر اپنا رخسارہ حضورؐ کے قدموں پہ رکھ دیا اور شہادت کی آخری ہچکی لے کر ختم ہو گیا:

سر بوقت ذبح اپنا ان کے زیر پائے ہے یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

طلحہؓ کی جاں نثاری

حضرت طلحہ ہر اس تیر کو جو حضورؐ کی طرف آتا اپنے ہاتھ پر روک لیتے آخر ان کا ایک ہاتھ شل ہو کر رہ گیا۔

نُسیبہ خاتون کی بہادری

ایک خاتون نُسیبہ بنت کعب مازنیہ مشکیزہ بھر بھر کر پیاسوں کو پانی پلانے کی خدمت انجام دے رہی تھی۔ حضورؐ پر جب یورش ہوئی تو اس نے مشکیزہ رکھ دیا اور تلوار سوت کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی چستی اور چابک دستی کا یہ عالم تھا کہ حضورؐ خود فرماتے ہیں کہ: میں دائیں بائیں جس طرف بھی نظر کرتا تھا نُسیبہ کو کسی نہ کسی پر تلوار سے حملہ کرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ اس بہادر خاتون نے بارہ زخم کھائے لیکن کمزوری نہ دکھائی۔

ہند کی قربانیاں

ہند نامی ایک خاتون تھیں۔ یہ انصاریہ بنی دینار سے تھیں (بعض روایتوں میں ان کا نام ام ایمن اور بعض میں عاصمہ بتایا گیا ہے)۔ ان کے شوہر، بھائی اور فرزند جنگ میں کام آئے۔ ہر ایک کی خبر شہادت سن کر صبر کیا لیکن جب حضورؐ کی بابت غلط

افواہِ شہادت پھیلی تو بے اختیار گھر سے باہر نکل پڑیں۔ لوگوں نے میدان جنگ میں ان کو ان کے مقتول عزیزوں کی لاشیں دکھائیں مگر انہوں نے کسی کی طرف توجہ نہ کی اور یہی کہتی گئیں حضورؐ کی خبر سناؤ۔ جب حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو خوشی سے ہنس پڑیں اور بولیں:۔ كل مصيبة بعدك جلل يا رسول الله یارسول اللہ اب مجھے کسی کا کوئی غم نہیں رہا۔

سعد بن الربیع کا پیغام

سعد بن الربیع اسی معرکۂ احد میں کام آئے۔ ان کو تلاش کرنے کے لیے حضورؐ نے خود ایک آدمی بھیجا۔ جب یہ سعد کے پاس آیا تو اس وقت حضرت سعد دم توڑ رہے تھے انہوں نے اپنے آخری وقت میں ایک پیغام دیا کہ: رسول اللہؐ کو میرا سلام پہنچا دو اور مسلمانوں کو یہ پیغام دے دو کہ آخری وقت تک بھی اگر دشمن حضورؐ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو تم اللہ کی بارگاہ میں اپنا کوئی عذر نہ پیش کر سکو گے۔

عمیر بن حمام کا شوقِ شہادت

جناب عمیر بن حمام میدان کے کنارے کھجوریں کھا رہے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کو دیکھ کر عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر میں راہِ خدا میں لڑتا ہوا مارا جاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: جنّت۔ عمیر نے اپنی مٹھی میں ساری کھجوریں ایک ہی بار منہ میں رکھ لیں اور چبانے لگے۔ مگر ابھی پوری طرح چبانے بھی نہ پائے تھے کہ ساری کھجوریں اُگل دیں اور کہا کہ جنّت لینے کے لیے اتنی تاخیر بھی (کہ چبا کر نگل جائیں) مناسب نہیں۔ کھجوریں اُگل کر میدان میں گھس گئے اور جلد ہی جانبازی دکھاتے ہوئے راہِ خدا میں قتل ہو گئے۔

عورتوں کی خدمات

کچھ عورتیں دوسری قسم کے جہاد میں مصروف تھیں۔ اور وہ تھا پیاسوں کو پانی پلانا اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا۔ حضرت عائشہؓ، فاطمہ زہراؓ، ام سلیط اور ام سلیم وغیرہ یہ خدمت انجام دے رہی تھیں۔

حضورؐ کو اذیتیں

حضورؐ پر ایک پتھر اتنی زور سے لگا کہ حضورؐ پہلو کے بل گر پڑے۔ عتبہ بن ابی وقاص کے پتھر سے حضورؐ کے نیچے کا دانت ٹوٹ گیا۔ ابن قمیہ نے حضورؐ کے وجنہ (گال کا بالائی حصہ) کو زخمی کر دیا۔ وجنے میں خود کی دو کڑیاں بھی گڑ گئیں اور ہجوم کی زد سے حضورؐ ایک گڑھے میں گر گئے اور حضورؐ کے گھٹنے چھل گئے۔ ابو عبیدہؓ، ابو بکرؓ اور عقبہ بن وہبؓ نے اپنے دانتوں سے پکڑ کر کھینچا تو یہ کڑیاں نکل سکیں۔ ابو عبیدہؓ کے دو دانت اسی کوشش میں ٹوٹ گئے۔ حضورؐ نے گڑھے سے باہر آنا چاہا تو حضرت طلحہ نے آپؐ کو اپنے کاندھے پر اٹھا لیا اور حضورؐ کو گڑھے سے باہر لے آئے۔ حضرت طلحہ کے ایک پاؤں میں لنگ تھا لیکن اس موقعے پر انھوں نے اپنے پاؤں پر پورا زور ڈال کر حضورؐ کو اٹھا لیا اور اس دن سے ان کے پاؤں کا لنگ بھی دور ہو گیا۔

غلط افواہ

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر حضورؐ سے بڑی شباہت رکھتے تھے۔ وہ جب شہید ہوئے تو یہ افواہ اڑ گئی کہ حضورؐ شہید ہو گئے۔ یہی وہ وقت تھا جب اہلِ اسلام میں انتہائی سراسیمگی پھیل گئی۔ حسنِ اتفاق سے کعب بن مالکؓ

انصاری نے مغفر (خود) کے اندر سے حضورؐ کی آنکھوں کو دیکھ کر پہچان لیا اور آواز دی کہ حضورؐ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اس آواز نے پست حوصلوں میں تازہ روح پھونک دی اور سب کے سب تازہ دم ہو کر پلٹ پڑے۔

حضرت علیؓ سپر میں پانی لا رہے تھے اور حضرت فاطمہؓ حضورؐ کے زخموں کو دھو رہی تھیں۔ خون بند نہ ہوا تو چٹائی کو جلا کر زخموں پر لگایا۔

حضورؐ پہاڑی پر

اب جب کہ مسلمان نئی روح کے ساتھ پلٹے تو لشکر قریش مقابلے کی تاب نہ لا سکا اور وہ بکھرنے لگا۔ اس وقت حضورؐ چند صحابہ کو لے کر پہاڑی پر چڑھ گئے۔ خالد اور ابوسفیان نے یہاں بھی کئی بار حملے کیے لیکن حضرت عمرؓ کے بے پناہ حملوں نے ہر بار انہیں پسپا کر دیا۔

جنگ کی عجیب قدریں

اس وقت حضورؐ کے زخموں سے خون جاری تھا بعض صحابہ نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ان ظالموں کے لیے بد دعا فرمایئے۔ اس درخواست کے جواب میں زبانِ رسالت کو جنبش ہوئی اور یہ الفاظ نکلے کہ ربِّ اھدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْن (خداوندا میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ علم و فہم نہیں رکھتے)

اللہ اکبر! اقدارِ انسانی کی کتنی وسیع دنیا اس ایک جملے میں سمٹی ہوئی ہے۔ ذرا سوچیے۔ جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ تلواریں انسانی خون سے رنگین ہو رہی ہیں۔ جو عداوت و دشمنی کفارِ قریش کو اہلِ اسلام سے تھی، بالکل وہی دشمنی اہلِ اسلام کو بھی کفارِ قریش سے ہونی چاہیے۔ اسی باہمی دشمنی کی وجہ سے دونوں گروہ ایک دوسرے

کے خلاف صف آرا ہو رہے تھے۔ بہ ظاہر جنگی سرگرمیاں اور نبرد آزمائیاں جیسی اِدھر ہو رہی تھیں بالکل ویسی ہی اُدھر بھی تھیں۔ دُور سے اس جنگ کو دیکھنے والا صرف یہی سمجھے گا کہ نتیجۂ جنگ میں محض ایک گروہ یا قوم کی فتح اور دوسرے کی شکست ہو گی۔ اگر وہ بے تعلق ہو گا تو اس کے لیے دونوں میں سے کسی ایک کی فتح اور دوسرے کی شکست تقریباً یکساں اثر رکھے گی۔ لیکن اگر وہ انسانی اقدار کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے تو صرف حضورؐ کے یہ کلمات (رب اھدِ قومی الخ) دونوں متحارب گروہوں کی جنگ کی نوعیت اور مقصد کے فرق کو واضح کر دیں گے۔

دعا کیا ہے؟ ایک تمنائے ورول اور دلی آرزو ہے۔ اگر اہل کفر سے دریافت کیا جاتا تو ان کی تمنا اور آرزو یہی ہوتی کہ یہ لڑنے والے مسلمان برباد و ہلاک ہوں اور ذلت و نامرادی سے دوچار ہوں۔ بلکہ اگر کسی مسلمان سے بھی اس کی تمنا دریافت کی جاتی تو اس کی آرزو یہی ہوتی کہ کفار ہلاک ہوں اور اسی وجہ سے بعض مسلمانوں نے حضورؐ سے بددعا کی پہلی بار درخواست کی۔ لیکن جس رسول کا مقصدِ حیات ہی اقدارِ اخلاقی کا قیام تھا وہ انہیں مقصدِ جنگ کو واشگاف الفاظ میں اپنے ان مبارک کلماتِ دعا کے بین السطور سے بیان کرتا ہے کہ ہمارا مقصد کسی انسان کی بربادی نہیں بلکہ اس کی خیر خواہی ہے۔ جنگ تو صرف محافظینِ اقدار کے تحفظ کے لیے کی جا رہی ہے ورنہ مقصد ایسے اعلیٰ اقدار کا قیام ہے جو انسانی زندگی کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنا دیں۔ دشمنی کسی انسان سے نہیں بلکہ شر سے ہے۔ انسانی خدمت انسان کی بربادی نہیں بلکہ اس شر کی بربادی ہے، جو انسان کو گھیرے ہوئے ہے۔ ایک اچھے طبیب کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ مرض دور ہو نہ کہ مریض ختم ہو جائے۔ مریض سے ہمدردی ہونی چاہیے نہ کہ نفرت و عداوت۔ مریض کا کوئی عضو صرف اس وقت کاٹا جاتا ہے جب اس کے اچھے ہونے کی کوئی

سبیل نہ باقی رہے اور اس کی وجہ سے دوسرے اعضا کے بھی خراب ہو جانے کا یقینی اندیشہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح اخلاقی و روحانی مریض کے ساتھ کمال درجے کی ہمدردی ہی تقاضائے انسانیت ہے۔ ہمدردی کا مقتضا یہ ہے کہ آخری سانس تک اس کی صحت کی کوشش کی جائے اور اس کی بربادی اس وقت تک نہ چاہی جائے جب تک اس کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نہ ہو اور اس کا وجود دوسروں کے لیے یقینی خطرہ نہ بن چکا ہو۔ یہی ہے اخلاقی اقدار کی وہ اعلیٰ تعلیم جو حضورؐ کے ان دعائیہ کلمات میں موجود ہے اور آپ آگے چل کر دیکھیں گے کہ ازلی بدقسمتوں کے سوا وہ تمام لوگ جو آج دشمنوں کی صف میں کھڑے تھے آخر کار اسلام لے آئے، اور اقدارِ انسانی کے خادم ثابت ہوئے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ بعض صحابہ ان دشمنوں کی ہلاکت کی تمنا اور درخواست کر رہے ہیں لیکن حضورؐ ان دشمنوں کی طرف سے بارگاہِ الٰہی میں الٹی وکالت فرما رہے ہیں۔ گویا یہ فرما رہے ہیں کہ یہ نادان ہیں اس لیے اسلام اور اہلِ اسلام کی دشمنی کر رہے ہیں۔ ان کا مرض نادانی و جہل ہے۔ لہٰذا انہیں برباد نہ کر بلکہ ان کا وہ مرض دور کر دے جس کی وجہ سے یہ حق سے برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے اندر جب علمِ صحیح پیدا ہو گا تو یہ خود ہی اپنی نادانی سے باز آ جائیں گے —— ذرا اچھی طرح غور کیجیے۔ کیا انسانیت کی محبت کی اس سے بڑی کوئی نظیر مل سکتی ہے؟

زبان کی جنگ

جب جنگ شروع ہوتی ہے تو ہر چیز کی جنگ ہوتی ہے۔ دل و دماغ کی جنگ ہاتھ پاؤں کی جنگ، ہتھیاروں کی جنگ، مال کی جنگ، قلم کی جنگ اور زبان کی جنگ؛ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ کفار قریش نے جنگ کی آگ کو زیادہ سے زیادہ مشتعل کرنے

کے لیے اپنے جادو بیان خطبا اور آتش زباں شعرا کو ہر طرف دوڑا دیا تھا عین میدانِ جنگ میں بھی ہند بہت سی عورتوں کے ساتھ رجز پڑھتی ہوئی مارچ کر رہی تھیں۔ آج کل منشورات، جرائد اور ریڈیو یہی کام کرتے ہیں۔ اسے بھی ایک ہتھیار ہی سمجھنا چاہیے۔ حربے صرف فولاد ہی کے نہیں ہوتے۔ یہ سب بھی اسلحہ ہیں اور جب دشمن ان سے غلط پروپیگنڈے کا کام لے تو انہیں ذرائع سے کام لینا ہم پر بھی واجب ہو جاتا ہے۔ اگر ہم ان جھگڑوں میں پڑے رہے کہ اخبار بینی یا ریڈیو جائز ہے یا ناجائز تو دشمن اپنا کام کر جائے گا اور ہم فتوے بازیوں میں تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔

زبان کی جنگ اور دشمن کا اس چیز میں بھی مقابلہ کرنے کی مثال ہمیں غزوۂ احد میں ملتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنگ کے نتیجے میں دونوں فریق تھک چکے تھے اور جنگ گویا ختم ہو چکی تھی۔ ابو سفیان کو یہ گمان تھا کہ مسلمان ہمت ہار چکے ہیں اور ان کے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ قریش اپنی طرف واپس جا رہے تھے اور مسلمان اپنی طرف سمٹ کر پہاڑی پر یا ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ ابو سفیان نے مسلمانوں کے دم خم کا اندازہ کرنے کے لیے حضورؐ کا نام لے کر پکارا اور للکارا۔ حضورؐ نے صحابہ سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ اس کے بعد ابو سفیان نے ابو بکرؓ کا نام لے کر آواز دی۔ مسلمان پھر خاموش رہے۔ پھر اس نے حضرت عمرؓ کا نام لے کر آواز دی، مسلمان پھر بھی چپ رہے۔ ابو سفیان نے کہا کہ: معلوم ہوتا ہے یہ سب ختم ہو گئے ہیں اسی لیے کسی طرف سے جواب نہیں آتا" حضرت عمرؓ میں یارائے ضبط نہ رہا اور زور سے چلا کر بولے: او دشمنِ خدا! ہم سب زندہ ہیں۔" پھر ابو سفیان نے کہا: اعل ھبل (ہبل دیوتا کا نام اونچا رہے)۔ صحابہ نے جواب دیا: اللہ اعز واجل (اللہ سب سے بلند و بالا ہے)۔ پھر اس نے کہا: لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم (ہمارے پاس عزیٰ

ہے اور تم اس سے محروم ہو (عزّیٰ دیوی کا نام بھی ہے اور عزت کے معنی میں بھی ہے)۔ صحابہ نے جواب دیا: اللہ مولنا ولا مولیٰ لکم (ہمارا مولیٰ اللہ ہے جس سے تم محروم ہو)۔ ابوسفیان کے ہر جملے کا جواب خود حضورؐ بتاتے جاتے تھے اور صحابہ اسے بلند آواز سے کہتے تھے۔

اس سوال و جواب کا مقابلہ اپنے دور کے متحارب پروپیگنڈے سے کیجیے تو آسمان زمین کا فرق نظر آئے گا۔ آج ایک جھوٹ کے جواب میں دس جھوٹ نشر کرنا پروپیگنڈے کے فن کا کمال سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں دیکھیے۔ ابوسفیان کے جواب میں جو کچھ بھی کہا گیا اس میں صداقت بھی ہے اور شرافت بھی۔ گویا زبان کی جنگ میں بھی اعلیٰ اقدار ملحوظ ہیں۔

ایک ٹریجیڈی

مدینے کے قریب کے بعض قلعوں میں مسلمان عورتیں محفوظ کر دی گئی تھیں جن کی نگرانی کے لیے حضرت ثابت اور حضرت یمان متعین تھے۔ جنگ کے حالات سن کر یہ دونوں بے تابانہ میدانِ جنگ کی طرف دوڑے۔ ثابت کو تو راستے ہی میں مشرکوں نے مار دیا اور یمان کو مسلمانوں نے نہ پہچانا اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ حضرت حذیفہ چلاتے رہے کہ ارے یہ میرے مسلمان باپ ہیں۔ مگر سراسیمگی اور افراتفری میں کسی نے توجہ نہ کی اور یہ مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے مارے گئے۔ مرتے وقت یمان نے کہا کہ خدا تمہاری اس غلطی کو معاف فرمائے۔ حضورؐ نے یمان کا خوں بہا ادا فرمانا چاہا لیکن حذیفہ نے اسے پسند نہ کیا اور خوں بہا معاف کر دیا۔

تعاقب کی مصلحت

جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن حضورؐ کو یہ خطرہ ہوا کہ لشکر قریش اہل اسلام کو مغلوب

سمجھ کر پھر دوبارہ کہیں حملہ نہ کر دے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر حضورؐ نے ایک جمعیت کو قریش کے تعاقب میں بھیجا جو مدینے سے آٹھ میل پر حمراء الاسد تک گئی لیکن کسی دشمن کو نہ پاکر واپس آگئی۔ فوجی نقطۂ نگاہ اور سیاسی زاویۂ نظر دونوں لحاظ سے یہ تعاقب بڑا اہم تھا۔ اس سے دشمنوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اہلِ اسلام ابھی پست حوصلہ نہیں ہوئے ہیں۔ اگر یہ نہ کیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ قریش پھر پلٹ کر حملہ کر دیتے۔

دفنِ شہداء

اس جنگ میں ستّر اہلِ اسلام کام آئے تھے۔ اختتامِ جنگ کے بعد لاشوں کو دفن کرنے کا کام باقی تھا۔ مسلمان ایک تو تھک کر چُور ہو چکے تھے دوسرے کفن کی بڑی کمی تھی۔ اس لیے ہر شہید کے لیے الگ قبر نہ کھودی گئی۔ بلکہ ایک ایک کفن میں دو دو تین تین لاشوں کو لپیٹ کر ایک ہی قبر میں دفن کیا گیا۔ نمازِ جنازہ بھی ہر ایک کی الگ الگ نہ پڑھی گئی بلکہ کئی کئی جنازے ایک ساتھ رکھے جاتے اور ہر نماز کے وقت سیدنا حمزہ رضؓ کے جنازے کو شریک کر لیا جاتا۔

قُزمان کی نمازِ جنازہ

ابن اسحاق کی ایک روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ قُزمان نامی ایک شخص کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ جہنمی ہے۔ اُحد کے موقعے پر اس نے بڑی بہادری سے جنگ کی اور سات آٹھ مشرکوں کو قتل کیا۔ پھر یہ زخمی ہوا تو اس نے بتایا کہ:

واللہ ان قاتلت الا عن احساب قومی ولولا ذلک ما قاتلت۔

بخدا میں نے تو محض قومی ناموس کے لیے جنگ کی ہے اگر یہ پیشِ نظر نہ ہوتا تو میں جنگ بھی نہ کرتا (یعنی اعلائے حق اس کا مقصود نہ تھا بلکہ صرف اپنا قومی وقار مدِنظر تھا اور

اس جذبے سے کفارِ قریش بھی خالی نہ تھے)۔

اس کے بعد اس کو زخم کی تکلیف زیادہ ہوئی تو ایک تیر جھونک کر خودکشی کر لی تاکہ جلدی جان نکل جائے۔

ظاہر ہے کہ جب اعلائے کلمۃ اللہ مقصود ہی نہ ہو اور جنگ کا مقصد محض قومی وملکی ہو تو اس مقصد سے تو دنیا کا ہر ملک اور ہر غیر مسلم قوم ایسی جنگ کر لیتی ہے۔ مسلم اور کافر کی جنگ میں خطِ امتیاز کھینچنے والی چیز صرف "نیت" ہے۔ دونوں کی جنگ بظاہر یکساں ہوتی ہے لیکن ایک کی نیت اعلائے کلمۃ اللہ ہوتی ہے اور دوسرے کی صرف قومی یا ملکی وقار کا قیام۔ اول الذکر خودکشی نہیں کر سکتا اور ثانی الذکر اسے کوئی جرم نہیں سمجھتا۔ خیال ونظریہ جیسا ہوتا ہے ویسا ہی عمل بھی ظاہر ہوتا ہے۔ قزمان کے ساتھ یہی ہوا۔ اور حضورؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے انکار فرما دیا۔ صرف اسلیے نہیں کہ اس نے خودکشی کی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ وہ قومی جنگ لڑ رہا تھا۔

واپسی

جب حضورؐ میدانِ جنگ سے مدینے واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ تمام گھرانے جن کے افراد اس جنگ میں کام آئے تھے ماتم کدے بنے ہوئے ہیں۔ حضورؐ نے یہ دیکھ کر فرمایا۔ لکن حمزۃ لا بواکی لہ (مگر افسوس حمزہؓ پر کوئی رونے والا نہیں)۔ انصار نے حضورؐ کی زبان سے یہ جملہ سنا تو اپنے گھر کی عورتوں کو حکم دیا کہ اپنا ماتم چھوڑو۔ رسول اللہؐ کے گھر جا کر حمزہؓ کا ماتم کرو۔ پھر کچھ دنوں تک یہ دستور رہا کہ اہلِ مدینہ جب بھی کسی کا غم کرتے تو پہلے غمِ حمزہؓ ادا کیا جاتا۔ عرب کی یہ رسمِ ماتم ایک جاہلی رسم تھی جو صدیوں سے ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور اسے کسی موقعے ہی سے ختم کیا جا سکتا تھا۔ چند دنوں کے بعد حضورؐ نے اس رسمِ ماتم کو حکماً بند کر دیا۔

واقعاتِ متفرقہ

اسی سال ۱۵ رمضان کو جناب حسنؓ پیدا ہوئے۔ اسی سال حفصہؓ بنتِ عمرؓ کو ام المومنین بننے کا اور حضرت عثمانؓ کو ام کلثومؓ بنتِ رسول اللہ صلعم کا شوہر بننے کا شرف حاصل ہوا (اس کی تفصیل اوپر واقعاتِ بدر ۲ھ میں گزر چکی ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ قانونِ وراثت بھی اسی سال نازل ہوا اور مشرکہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت بھی اسی سال نازل ہوئی۔

۴ھ

چند معمولی جھڑپیں

اس میں شک نہیں کہ جنگِ بدر نے کفر کی کمر توڑ دی تھی لیکن اہلِ کفر بھی معمولی حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں میدانِ احد میں اور زیادہ تیاری کے ساتھ آئے اور اب کے گویا برابر کی چوٹ تھی جس نے دشمنوں کے حوصلے بلند کر دیے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مختلف اطراف سے راکھ کے ڈھیر سے کئی چنگاریاں اُبھریں۔ قریش نے آس پاس کے قبائل کو حملے پر ابھارنا شروع کیا۔

سریۂ ابو سلمہ

فید کے کوہستانی علاقے میں ایک مقام ہے قطن۔ یہاں ایک قبیلہ آباد تھا جس

کے دو فرد طُلیحہ اور مسلمہ دو فرزندانِ خویلد اسنے جوش دلاکر مسلمانوں پر حملے کی تیاری کردی۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اپنے رضاعی بھائی ابو سلمہؓ کو ڈیڑھ سو مہاجرین وانصار کے ساتھ ادھر روانہ فرمایا۔ کوئی مقابلہ نہ ہوا بلکہ جیشِ اسلامی کی خبر ملتے ہی سب کے سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ محرم ۴ھ کا واقعہ ہے۔ اس موقعے پر کچھ قیدی اور شتر وغنم بھی ہاتھ آئے۔ ابو سلمہؓ کے ایک کاری زخم احد میں لگا تھا جو اچھا ہو گیا۔ قطن سے واپسی کے بعد زخم کا منہ پھر کھل گیا اور ۲۷ جمادی الاولیٰ کو آپؓ کی وفات ہو گئی۔ اور بعد عدت شوال میں ان کی بیوی ام سلمہؓ کو ام المومنین ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

سریۂ ابن انیس

اسی مہینے میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ قبیلۂ لحیان کا سردار سفیان بن خالد بھی مدینے پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ حضورؐ نے ایک مختصر سی جماعت عبداللہ بن انیس کی سرکردگی میں روانہ فرمائی۔ عام مقابلے کی بجائے عبداللہ نے بڑی ہوشیاری سے صرف سفیان کو قتل کر کے دشمنوں کی جماعت کو بے سر کر دیا اور یہ فتنہ وہیں ختم ہو گیا۔

لمحۂ فکریہ

بہ ظاہر یہ معمولی سی جھڑپیں تھیں لیکن فوجی وسیاسی حیثیت سے بڑی اہم تھیں اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ محض ایک روحانی امام نہ تھے بلکہ ملکی وسیاسی حیثیت سے ہر آن چوکس رہتے تھے کیونکہ ذرا سی غفلت بھی بعض اوقات دشمن کو یہ موقع دے سکتی تھی کہ اہل اسلام کو مغلوب کر کے اس پورے مشن کو ختم کر دیا جائے جس کے لیے یہ امت برپا ہوئی ہے۔ یہاں ہمیں سنتِ نبوی میں ایک خاص جنگی قدر

یہ ملتی ہے کہ دفاع کے صرف یہی معنی نہیں کہ جب دشمن گھر کے اندر گھس آئے اور تلوار کی دھار گردن پر رکھ دے جب دفاع کے لیے اٹھو۔ یہ بھی عین دفاع ہی ہے کہ دشمن کا ہاتھ اٹھتے ہی اسے قلم کر دیا جائے (اسلام اور جنگ کے عنوان سے ہم اس کی تشریح اوپر کر چکے ہیں)۔

نیا اندازِ وغا

واقعۂ بیر معونہ اور عامر کا فریب

کفر و انکار جب کمینہ پن پر اتر آئے تو تقاضائے شجاعت اور کردار کی ستھرائی ختم ہو جاتی ہے اور غیر شریفانہ حرکتیں جنم لینے لگتی ہیں۔ اہلِ اسلام کو ختم کرنے کے لیے بعض لوگوں نے نئی تدبیریں پیدا کیں جن میں دو واقعے بڑے اہم ہیں۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ اگلے مہینے ماہ صفر میں بنی کلاب کا سردار ابو براء کلابی خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ چند مبلغوں کو ہمارے ساتھ کر دیا جائے تاکہ وہ ہمارے قبیلے میں چل کر اسلام کی اشاعت کریں۔ حضورؐ نے نجدیوں کی طرف سے خطرے کا اظہار فرمایا مگر ابو براء نے مبلغین کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ حضورؐ نے منذر بن عمرو ساعدی انصاری کی سرکردگی میں ستر معلمین کو بھیج دیا۔ ان کو اس وقت کی اصطلاح میں قراء کہا جاتا تھا۔ ان میں اکثر وہ اصحاب صفہ تھے جو علمِ دین حاصل کرنے کے لیے وقف تھے اور ان کی معاشی زندگی یہ تھی کہ کچھ لوگ ادھر اُدھر سے لکڑیاں لا کر فروخت کرتے اور اس میں خود بھی کھاتے اور اپنے بھائیوں کو بھی کھلاتے ——

قافلۂ مبلغین بیر معونہ پہنچ کر مقیم ہوا حرامؓ بن ملحان کو حضورؐ کا نامۂ مبارک دے کر

رئیس قبیلۂ کلاب عامر بن طفیل عامری کے پاس بھیجا ۔ عامر نے حرامؓ کو وہیں قتل کرادیا۔ اور اردگرد کے قبیلوں ـــــ عُصَیّہ، رِعل، ذکوان ـــــ کے پاس آدمی دوڑا دیے ۔ یہ سب مل کر ایک لشکر تیار ہوگیا اور عامر اپنی قیادت میں ان سب کو لیکر چلا ۔ اِدھر یہ مبلّغین حرامؓ کا تادیر انتظار کرنے کے بعد خود چل پڑے ۔ راستے میں عامر اپنے جمِ غفیر کے ساتھ ملا اور ان سب مبلّغین کو گھیرے میں لے لیا اور ان سب نہتّوں کو قتل کردیا ۔ صرف دو آدمی بچ نکلے ۔ ایک تھے کعب بن زیدؓ جو زخمی ہوکر گر گئے تھے اور دشمنوں نے انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا ۔ دوسرے عمروؓ بن امیہ تھے ۔ ان کو عامر نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ : "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منّت مانی تھی لہٰذا میں تم کو چھوڑتا ہوں ۔"

یہ عمروؓ بن امیہ واپس آنے لگے تو دو عامریوں کو بطورِ انتقام قتل کردیا ۔ ان کو حضورؐ امان دے چکے تھے لیکن عمروؓ بن امیہ کو اس کی خبر نہ تھی ۔ حضورؐ کو جب ان تمام واقعات کی اطلاع ملی تو دو صدمے ہوئے ۔ ایک یہ کہ عمروؓ بن امیہ نے ان دو عامریوں کو کیوں قتل کیا جن کو حضورؐ امان دے چکے تھے ۔ حضورؐ نے دستور کے مطابق اس کی یوں تلافی فرمائی کہ ان دونوں مقتولوں کا خوں بہا ادا کرنے کا اعلان فرما دیا ۔ دوسرا صدمہ ان ۶۸ مبلّغین کے قتل کیے جانے کا تھا ۔ یہ قتل چونکہ دھوکے سے کیا گیا تھا اس لیے حضورؐ کو بڑا صدمہ ہوا اور ایک ماہ تک نمازِ صبح میں ان دغابازوں کے لیے بددعا فرماتے رہے ۔

لمحۂ فکریہ

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب ابوبراء کلابی نے حضورؐ سے مبلّغین بھیجنے کی درخواست کی تو حضورؐ کو بجا طور پر دغا کا اندیشہ پیدا ہوا تھا کیونکہ حضورؐ ایک ایک

قبیلے بلکہ ایک ایک فرد کی فطرت سے واقف تھے۔ لیکن یہاں دو قدروں میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ ایک طرف جذبۂ تبلیغ واشاعت تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ ایک شخص درخواست کر رہا ہے اور مبلّغین کی حفاظت کا ذمہ لے رہا ہے اور دوسری جانب اندیشۂ فریب ہے جس کا کوئی واضح ثبوت موجود نہیں۔ حضورؐ کو قرآن میں حریص علیکم فرمایا گیا ہے یعنی یہ رسولؐ تمہاری بھلائی کا ہوکا رکھتا ہے۔ بس یہی تبلیغ انسانیت کا ہوکا تھا جو اندیشۂ دغا پر غالب آگیا اور حضورؐ نے مبلّغین بھیج دیے۔ حضورؐ اپنے مزاج کے اعتبار سے رجائی اور پُر امید تھے اس لیے غالب توقع یہی ہو سکتی تھی کہ شاید یہ لوگ دین صحیح کو قبول کر لیں۔ یہی رجائیت تھی جو خود حضورؐ کو بڑے بڑے خطرناک مواقع پر لے گئی۔ اور اس کی بہت مثالیں گزر چکی ہیں، اور سفرِ طائف اس کی واضح مثال ہے۔ دھوکا قنوطیت اور سوئے ظن میں بھی ہو سکتا ہے اور رجائیت وحسنِ ظن میں بھی۔ اس میں کچھ کام کی چیزوں سے محرومی ہوتی ہے اور اس میں کچھ کام کی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اقدارِ انسانی کی محافظت اسی میں ہے کہ ان دونوں نقصانوں میں وہ نقصان برداشت کیا جائے جو رجائیت اور حسنِ ظن سے ہو۔ کم از کم ایک بڑے قبیلے کی دغا کا پوری طرح علم ہو گیا اور اہلِ اسلام اور اہلِ کفر کی قدروں کا فرق نمایاں ہو گیا۔

یہاں بڑا غور طلب نکتہ یہ ہے کہ حضورؐ ان دغابازوں کے لیے ایک ماہ تک بددعا فرماتے رہے۔ بددعا حضورؐ کے عام مزاج کے مطابق نہ تھا۔ حضورؐ کے اعلیٰ اخلاق کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ طائف میں انتہائی مظلومیت کے باوجود ظالموں کے لیے بددعا نہ فرمائی۔ احد میں سخت اذیتیں جھیلنے کے باوجود دعائے خیر ہی فرمائی۔ منافق عبداللہ ابن ابی بن سلول تک کے لیے دعائے خیر سے باز نہ آئے۔ لیکن غدر (دغابازی) کرنے والوں کے لیے ایک ماہ تک بددعا فرماتے رہے۔

اس سے بہ اندازہ بہ آسانی کیا جا سکتا ہے کہ حضورؐ کو فریب جیسی انسانیت کُش حرکت سے کس قدر نفرت تھی۔ حضورؐ تو ایک ایسا نظامِ معاشرہ قائم کرنے آئے تھے جس سے انسانی اقدار اجاگر ہوں۔ زبان کا پاس ہو، سفیروں کا احترام ہو، دھوکا اور فریب قطعی نہ ہو، باہمی اعتماد ہو جو باہمی تعاون کی بھی جان ہے۔ جہاں بلائے ہوئے مہمانوں کے ساتھ یہ کمینہ پن ہو وہاں تو ایک لمحے کے لیے بھی امن و امان، باہمی اعتماد و تعاون، اور خوش معاشگی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ انھیں اعلےٰ اقدار کو حضورؐ قائم فرمانا چاہتے تھے اور یہ ظالم انہی کی جڑ پہ کلہاڑا چلا رہے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی یہ خفگی اور یہ بددعا بالکل حق بجانب تھی۔ اگر حکومتیں یا قبیلے آپس میں فریب و دغا سے کام لیا کریں تو امن و امان اور دوسری انسانی قدریں باقی ہی نہیں رہ سکتیں۔

کیا اس دغا کے جواب میں اہلِ اسلام کی طرف سے بھی ایسا کوئی فریب دیا گیا؟ نہیں بلکہ انہی غدر و فریب کرنے والوں کے دو افراد (جنھیں امان دی جا چکی تھی) جب ایک مسلمان (عمرو بن امیہ) کے ہاتھ سے ناوابستگیٔ امان کی وجہ سے قتل کر دیے گئے تو حضورؐ نے ان کا خوں بہا ادا کرنے کا وعدہ فرما لیا۔ وہ کافروں کا برتاؤ تھا اور اس کے جواب میں یہ حضورؐ کا سلوک تھا۔ دھوکا کرنے والوں کے جواب میں اس سے چھوٹا دھوکا کیا اس کے برابر بلکہ اس سے بڑا دھوکا بھی دنیا میں جائز تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں بے وفائی کا جواب وفا سے، اور کمینہ پن کا جواب شرافت سے دیا جا رہا ہے۔ یہی ہیں وہ اقدار جن کی روشن مثالوں کے مجموعے کا نام سیرتِ مصطفیٰ ہے۔

بدعہدی کی عجیب مثال —— واقعۂ رجیع

واقعۂ بیرِ معونہ ہی کی طرح کا ایک واقعہ انہی دنوں میں اور بھی پیش آیا اور یہ

بھی بڑا اہم واقعہ ہے۔ قبیلۂ عضل اور قبیلۂ قارہ کے چند آدمی حضورؐ کے پاس آئے اور ایک نئے انداز سے مبلغین بھیجنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے قبیلوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ ان کی دینی تعلیم کے لیے چند آدمیوں کی ضرورت ہے۔ حضورؐ پر جذبۂ تبلیغ تو غالب تھا ہی۔ اس لیے حضرت عاصم بن ثابت کی سرکردگی میں دس مبلغوں کی ایک جماعت بھیج دی۔ مکے اور عسفان کے درمیان ایک مقام ہے رجیع۔ یہاں یہ قافلۂ مبلّغین ٹھہرا۔ ان بدعہدوں نے بنو لحیان کو ان مبلّغین کے قتل پر اکسایا۔ دو سو آدمی جن میں ایک سو تیر انداز تھے چڑھ دوڑے۔ مبلّغین نے انہیں آتے دیکھا تو غداری اور بدنیتی واضح ہو گئی۔ یہ دسوں آدمی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ تیر اندازوں نے کہا کہ تم نیچے اُتر آؤ تو ہم تمہیں پناہ دیدیں گے۔ حضرت عاصم ان کی غداری دیکھ چکے تھے اس لیے صاف جواب دے دیا کہ ہمیں تم کافروں کی پناہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے دعا کی کہ: خداوندا! ہماری اس بے کسی کی خبر اپنے رسولؐ تک پہنچا دے اور میری لاش کو ان کافروں کے قبضے میں نہ آنے دے۔" پھر آپؓ نے اپنے ساتھیوں کو لڑنے کا حکم دیا۔ اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ آٹھ آدمیوں نے لڑکر جان دیدی جن میں ایک عاصم بھی تھے۔ عاصم کی دعا کے دونوں جزء بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوئے۔ عین اسی وقت حضورؐ نے مدینے میں فرمایا کہ: عاصم اپنے ساتھیوں سمیت ظالموں کی دغا میں گھر گئے۔ دعا کا دوسرا جزیوں پورا ہوا کہ جب ظالموں نے بے حرمتی کی نیت سے عاصم کی لاش کی طرف رخ کیا تو اس کثرت سے شہد کی مکھیوں نے یورش کی کہ لاش پر چھا گئیں اور دشمنوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ شب کو سیلاب لاش کو بہالے گیا۔

اس مختصر سے قافلۂ مبلّغین میں سے فقط دو شخص زندہ بچے جو گرفتار ہو گئے

ایک تھے خُبیب بن عدی، اور دوسرے زید بن دثنہ۔ سفیان ہذلی ان دونوں کو لگئے لے جاکر دو ہذلی قیدیوں کے عوض قریش کے ہاتھ بیچ آیا۔ خبیب نے حارث بن عامر کو جنگ احد میں مارا تھا۔ اس لیے اس کے اخیافی بھائی حُجیر بن ابی اہاب نے قریش سے خرید کر عقبہ بن حارث کو دے دیا تاکہ وہ اپنے باپ کے عوض خبیب کو قتل کرے۔ اور زید کو صفوان بن امیہ نے خرید لیا کیونکہ امیہ بدر میں مارا گیا تھا اس لیے صفوان نے زید کو اپنے باپ کے عوض قتل کر کے کلیجا ٹھنڈا کرنے کو خرید لیا۔ ان دونوں (خبیب اور زید) کی داستانِ قتل کی تفصیل بھی سُن لیجیے:

عقبہ نے خبیب کو کئی دن بھوکا پیاسا گھر میں بند رکھا۔ اس دوران میں ایک دن حجیر بن ابی اہاب کی کنیز (ماویہ) سے خبیب نے استرہ مانگا۔ اس نے اپنے کمسن بچے کے ہاتھ بھجوا دیا۔ اب خبیب کے ہاتھ میں استرہ ہے اور قاتلین کے گھرانے کا ایک بچہ اس کے پاس ہے۔ ماں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ خبیب نے اسے بھانپ لیا اور کہا: تجھے یہ خطرہ ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ نہیں ان شاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ اللہ اکبر۔ اس چھوٹے سے واقعے پر اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کا اس سے بہتر کیا موقع مل سکتا تھا۔ مرتا کیا نہیں کرتا۔ خبیب بڑی آسانی سے اس بچے کو قتل کر کے اپنے انتقام کی پیاس بجھا سکتے تھے۔ لیکن یہی تو وہ انسانی اقدار ہیں جن کی تعلیم انہوں نے حضورؐ سے حاصل کی تھی۔ مگر ہاں خبیب کی اس شرافت کا جواب جس کمینگی سے دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ آپ رضؓ کو حدودِ حرم سے باہر کوہ تنعیم کے پاس لے جایا گیا۔ قتل سے پہلے انہوں نے دو رکعت نماز ادا کرنے کی اجازت چاہی۔ یہ نماز جناب خبیب نے ذرا جلدی ختم کر لی۔ پھر فرمایا: یہ آخری نماز فرادا دیر تک پڑھتے رہنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن جلد اس لیے ختم

کر دی گئی کہیں تم یہ گمان نہ کرو کہ موت کے ڈر سے دیر لگا رہا ہوں۔" اس کے بعد انہوں نے دس شعر للکار کر پڑھے جن میں سے دو یہ ہیں:

ولست اُبالی حین اُقتل مسلماً	جب میں مسلمان ہونے کے جرم میں قتل کیا جا رہا
علی ای شق کان للّٰہ مصرعی	ہوں تو اس کی پروا نہیں کہ کس پہلو قتل ہو رہا ہوں
وذالک فی ذات الالٰہ وان یشأ	یہ قتل ذاتِ باری کی راہ میں ہے اگر وہ چاہے گا تو
یبارک علی اوصال شلو ممزع	جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پر برکت نازل فرمائے گا۔

اس کے بعد خبیب کو سولی پر لٹکایا گیا اور نیزے مار مار کر شہید کر دیا گیا۔ پہلی دو رکعت تو نمازِ زہد تھی اور سولی پر نمازِ عشق ادا ہوئی:

نمازِ زاہداں محراب و منبر — نمازِ عاشقاں بر دار دیدم

اشعار کے بعد جناب خبیب نے یوں دعا کی:

اللھم بلغنا رسالۃ	خداوندا! ہم نے تیرے رسول کا پیغام تو پہنچا
رسولک فبلغہ ما	دیا اب میرے ساتھ جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کی
یصنع بی۔	خبر رسول تک پہنچا دے۔

اس کے بعد زید بن دثنہ کو جب قتل کرنے کے لیے لے جایا گیا تو بہت سے قریشی سردار تماشا دیکھنے کے لیے آئے:

بجرمِ عشقِ تو ام می کشند غوغائیست — تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

اس وقت ابوسفیان بن حرب بھی موجود تھے۔ بولے: سچ بتاؤ کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اس وقت تمہاری جگہ محمدؐ ہوتے اور تم آرام سے اپنے گھر ہوتے؟ زید نے کڑک کر جواب دیا: بخدا میں اپنی جان بچانے کے عوض حضورؐ کے جسم میں ایک کانٹا چبھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد نسطاس نے زید کو قتل کر دیا۔

غزوۂ بنی نضیر

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ عمرو بن امیہ نے بنی عامر کے جن دو شخصوں کو قتل کر دیا تھا ان کا خون بہا ادا کرنے کا ذمہ حضورؐ نے لیا تھا۔ یہ بھی آپ معاہدۂ یہود کے سلسلے میں پڑھ چکے ہیں کہ یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ خون بہا کا قدیم طریقہ قائم رہے گا۔ اس کی رو سے خون بہا کا ایک حصہ ادا کرنا بنو نضیر کے لیے بھی ضروری تھا۔ حضورؐ اس مطالبے کے لیے بنو نضیر کے پاس چند صحابہ کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے۔ بنو نضیر نے خون بہا کا حصۂ رسدی ادا کرنے کا وعدہ تو کر لیا لیکن ساتھ ہی چپکے سے حضورؐ کے قتل کی سازش بھی کر لی۔ حضورؐ ایک دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے۔ عمرو بن جحاش بالا خانے پر چڑھا تاکہ اوپر سے ایک بھاری پتھر گرا کر حضورؐ کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ حضورؐ نے اس خطرے کو بھانپ لیا اور مدینے واپس ہو گئے۔ بنو نضیر نے حضورؐ کو پھر آنے کی دعوت دی۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ تم لوگوں پر اعتماد نہیں رہا۔ ہاں اگر معاہدے کی تجدید کرو تو آنے کو تیار ہوں۔ انہوں نے تجدید معاہدہ سے انکار کر دیا۔ یہود کے دوسرے قبیلے بنو قریظہ نے معاہدے کی تجدید کر لی لیکن بنو نضیر نے اس لیے انکار کر دیا کہ انہیں اپنے مستحکم قلعوں پر گھمنڈ تھا۔ دوسرے انہیں یہ بھی اعتماد تھا کہ مدینے کے منافقین اور مکے کے قریش ان کی اعانت کریں گے۔ بنو نضیر کی غلطی یہ تھی کہ وہ خون بہا کا حصۂ رسدی ادا کرنے میں لیت ولعل کر رہے تھے۔ وہ خون بہا کی رقم بھیج دیتے تو کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ باہمی بے اعتمادی پیدا ہی اس لیے ہوئی کہ انہوں نے معاہدے کی اس دفعہ پر عمل نہ کیا جس کی رو سے خون بہا میں شرکت ضروری تھی۔ اس شرکت

میں پس و پیش کی وجہ سے ان کی نیت کا مشتبہ ہونا قدرتی بات تھی۔ پھر اگر فی الواقع ان کی نیت صاف ہوتی تو بنو قریظہ کی طرح تجدید معاہدہ میں پس و پیش نہ ہوتا۔ ان تمام باتوں کے باوجود حضورؐ چونکہ مصالحانہ زندگی کو پسند فرماتے تھے اس لیے ان کی دعوت پر وہاں جانے کو تیار ہو گئے۔ چند صحابہ کو ساتھ لے کر روانہ ہوئے ہی تھے کہ ایک دوسری اطلاع ملی اور وہ یہ تھی کہ بنو نضیر تو تلواریں لیے تیار ہیں اور یہ دعوت محض ایک فریب ہے۔ اب چند باتیں جمع ہو گئیں:

(۱) بنو نضیر نے خوں بہا میں شرکت کا وعدہ تو کر لیا مگر ادا نہ کیا۔

(۲) حضورؐ کے قتل کی سازش کی اور ایک آدمی کو پتھر گرانے کے لیے اوپر چڑھا دیا۔

(۳) معاہدے کی تجدید سے انکار کر دیا حالانکہ دوسرے یہودی قبیلے بنو قریظہ نے تجدید معاہدہ کر کے ایک اچھی مثال پیش کر دی ہے۔

(۴) دوبارہ پھر قتل کی سازش کر کے حضورؐ کو تشریف لانے کی دعوت دی۔

(۵) یہ تمام باتیں ان کے فتورِ نیت کو ظاہر کر رہی ہیں اور یہ قوی امکان ہے کہ کسی وقت وہ مدینے پر چڑھائی کر دیں اور اس حملے میں منافقینِ مدینہ، مشرکینِ مکہ اور خود بنو قریظہ بھی ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔

ان تمام حالات میں حفاظتِ خود اختیاری اور سیاسی پیش بندی کا لازمی تقاضا تھا کہ اس خطرے کو سر پر آنے سے پہلے ہی دور کر دیا جائے۔ حضورؐ نے اسی کے پیشِ نظر ایک جماعتِ صحابہ کو لے کر بنو نضیر کا محاصرہ کر لیا۔ یہ ربیع الاول ۴ھ کا واقعہ ہے۔ چھ دن وہ اپنے قلعوں میں محصور رہے اور آخر مجبور ہو کر اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ جس قدر مال و اسباب وہ اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں لے جائیں اور یہ علاقہ خالی کر دیں۔ حضورؐ نے اس محاصرے کے دوران کھجور کے کچھ درخت کٹوائے بھی اور جلوائے بھی۔ علاوہ ازیں جب بنو نضیر جلا وطن ہونے لگے تو اپنے قلعوں کو مکن

حد تک توڑ پھوڑ کر برباد بھی کر گئے تا کہ اچھی حالت میں ان پر مسلمانوں کا قبضہ نہ ہو سکے بہرحال یہ ٹوٹے پھوٹے قلعے اور ان کے علاوہ پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں۔ ان میں سے سلّام ابن ابی الحُقیق، کنانہ ابن ربیع بن ابی الحقیق اور حُیی بن اخطب خیبر کی طرف چلے گئے جہاں ان کی سرداری قائم ہو گئی اور باقی شام کی طرف روانہ ہو گئے۔

یہاں آگے چلنے سے پہلے ایک نظر اُن آیاتِ قرآنی پر بھی ڈال لینی چاہیے جن میں اس واقعے کا ذکر ہے اور جن میں بعض اہم نکات بھی ہیں۔ ہم ان آیات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے نمبر بھی درج کر رہے ہیں:

ھو الذی اخرج الذین کفروا من	وہی اللہ تو ہے جس نے کفار اہل کتاب (بنونضیر)
اھل الکتٰب من دیارھم	کو ان کے گھروں سے پہلی مرتبہ نکال باہر کیا۔
لاول الحشر۔ ما ظننتم ان	تمہارے خیال میں تو وہ نکل ہی نہ سکتے تھے
یخرجوا وظنوا انھم مانعتھم	اور خود وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ان کے قلعے
حصونھم من اللہ فاتٰھم اللہ	انہیں بچا لیں گے۔ مگر اللہ (کا عذاب) تو
من حیث لم یحتسبوا وقذف	ان تک ایسے رستے سے پہنچا جس کا انہیں
فی قلوبھم الرعب یخربون	گمان بھی نہ تھا اور اللہ نے ان کے دلوں میں
بیوتھم بایدیھم وایدی	ایسا رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود
المومنین ق فاعتبروا یاولی	اپنے ہاتھوں سے یا مسلمانوں کے ہاتھوں برباد
الابصار۔ ولولا ان کتب اللہ	کراتے رہے۔ آنکھ والو اس سے عبرت
علیھم الجلاء لعذبھم فی الدنیا	حاصل کرو۔ اگر اللہ ان کی جلاوطنی کو مقدر
ولھم فی الاٰخرۃ عذاب النار ۝	نہ کر چکا ہوتا تو دوسرے طریقے سے انہیں
ذالک بانھم شاقوا اللہ ورسولہٗ	اس دنیا میں سزا دیتا اور آخرت میں تو ان

ومن يشاق الله فان الله شديد
العقاب ۝ ما قطعتم من لينة
او تركتموها قائمة على اصولها
فباذن الله وليخزي الفٰسقين ۝
وما افاء الله على رسوله منهم
فما اوجفتم عليه من خيل
ولا ركاب ولكن الله يسلط
رسله على من يشاء ط والله على
كل شيء قدير ۝ ما افاء الله
على رسوله من اهل القرىٰ
فلله وللرسول ولذي القربىٰ
واليتمىٰ والمسٰكين وابن
السبيل كي لا يكون دولة بين
الاغنياء منكم وما اٰتٰكم الرسول
فخذوه وما نهٰكم عنه فانتهوا ج
واتقوا الله ط ان الله شديد
العقاب ۝ للفقراء المهٰجرين
الذين اخرجوا من ديارهم
واموالهم يبتغون فضلا من
الله ورضوانا وينصرون الله
ورسوله ط اولٰئك هم الصٰدقون

کے لیے آگ کی سزا ہے ہی۔ یہ سب کچھ اس
لیے ہوا کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول
کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرتا ہے
وہ سمجھ لے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے
تم نے جو کھجور کے درخت کاٹے یا انہیں اپنی
جڑوں پر باقی رکھا یہ سب کچھ اللہ ہی کے حکم
سے ہوا اور اس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ وہ
فاسقوں کو رسوا کرے۔ اللہ نے ان سے جو
کچھ اپنے رسول کو دلوایا اس پر تم نے گھوڑے
یا اونٹ تو نہیں دوڑائے تھے بلکہ اللہ اپنے
رسولوں کو جس پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے
اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اللہ نے اپنے
رسول کو ان گاؤں والوں سے جو کچھ دلوایا
وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور
قرابت مند، یتیموں، مسکینوں اور مسافر
کے لیے ہے تاکہ یہ (مال فے) تمہارے دولتمندوں
ہی کے درمیان گردش کرتا نہ رہ جائے۔ جو کچھ
رسول تمہیں دے دے تو اور جس سے روک دے
رک جاؤ۔ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ بڑا
سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ مال فے ان
مہاجر ناداروں کے لیے ہے جن کو ان کے

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُو الدَّارَ
وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ
يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ
وَلَا يَجِدُونَ فِي
صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا
أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ
أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ
خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُوقَ
شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝
وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ
بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا
الَّذِينَ سَبَقُونَا
بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ
فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ
آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ
رَحِيمٌ ۝

(الحشر)

گھر دل اور املاک سے الگ کر دیا گیا جو اللہ
کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں اور
اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں یہی
تو اہل صدق ہیں۔ اور (یہ مال فے) ان کے
لیے بھی ہے جو اپنا گھر رکھتے ہیں اور (آمد مہاجرین
سے) پہلے ہی ایمان لا چکے ہیں۔ ان کی طرف
جو ہجرت کر کے آئے وہ اس سے محبت
کرتے ہیں اور (مہاجرین کو) جو کچھ بھی دیا
جائے اس کی اپنے دلوں میں ضرورت
محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ انہیں اس وقت
بھی اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں جب کہ ان پر
تنگی غالب ہو اور جو اپنی دل کی طمع اور بخالت
سے محفوظ رہے تو ایسے ہی لوگ تو فلاح یافتہ
ہیں (یہ مال فے) ان لوگوں کے لیے بھی ہے
جو ان کے بعد آئیں گے جن کی دعا یہ ہو گی کہ
اے ہمارے رب بخشش فرما ہماری، اور
ہمارے ان بھائیوں کی جو ایمان لانے میں
ہم پر سبقت لے گئے اور ہمارے دلوں میں
اہل ایمان کی طرف سے کوئی کھوٹ نہ رہنے
دے۔ اے ہمارے رب تو رؤف رحیم ہے

(۱) پہلی آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اگر یہ اب بھی ٹھیک نہ ہوئے تو دوبارہ یہی

سزا دی جائے گی۔ چنانچہ یہ پیش گوئی سیدنا عمرؓ کے زمانے میں پوری ہوئی اور انہیں اطراف خیبر سے پھر شام کی طرف جلاوطن کیا گیا۔

(۲) ویسے تو حضورؐ نے بموقعہ جنگ درختوں کو کاٹنے سے عمومی ممانعت فرمائی ہے لیکن اگر جنگی ضرورت ہی اس طرح کی پیش آجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بعض اوقات اس لیے بھی درخت کٹوائے جاتے ہیں کہ یہ دشمن کی کمین گاہ ہو سکتی ہے اور اس لیے بھی کہ ادھر سے دشمن خاموشی کے ساتھ نکل کر بھاگ سکتا ہے۔ اسی طرح کی دوسری ضرورتیں بھی ہو سکتی ہیں اور ایسے مواقع پر درختوں کو کٹوا دینا تقاضائے مصلحت ہوتا ہے۔ اسی کو فباذن اللہ کہا گیا ہے۔

(۳) یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب رسولؐ نے بھی کوئی گھوڑا یا اونٹ نہیں دوڑایا، یا یوں کہیے کہ جتنا کچھ رسولؐ نے کیا اتنا ہی کچھ شرکائے قتال (بلکہ محاصرین) نے بھی کیا تو خود حضورؐ کے فیصلے کے مطابق اس مالِ فے میں یا تو سب کی شرکت ہونی چاہیے یا پھر کسی کی نہ ہو۔ لہٰذا حضورؐ کے لیے مخصوص ہونے کی کوئی وجہ نہیں ــــــ اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ دشمنوں سے جو مال حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ غنیمت اور فے۔ اگر جنگ سے حاصل ہو تو غنیمت ہے اور اس کو امیرِ جیش یوں تقسیم کرتا ہے کہ ایک خمس مرکز میں بھیج دیتا ہے اور چار خمس خود شرکائے جنگ میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور اگر بغیر جنگ کے حاصل ہو تو وہ سب کا سب مملکت کا ہوتا ہے اور صدرِ مملکت اسے اپنی صوابدید سے مصرف میں لاتا ہے۔ یہ مصرف کیا ہیں ان کا اگلی ہی آیات میں ذکر ہے۔

(۴) اللہ کا حصہ ہونے کا مطلب صرف فی سبیل اللہ ہے اور رسولؐ سے مراد ذاتِ رسولؐ نہیں بلکہ صدرِ مملکت ہے۔ رسول کے بعد جو بھی اس مشن کو چلانے کے لیے متعین ہوگا وہی اس مخصوص حصے کا حقدار ہوگا۔ ایک عہدیدار کی جو تنخواہ

ہوتی ہے ـــــ خواہ معین رقم ہو یا کسی گاؤں کی آمدنی ہو ـــــ وہ اس کے بعد آنے والے عہدیدار کو ملتی ہے۔ بطور وراثت اس کے پسماندوں کو نہیں ملتی۔ پھر اس مصرف کے علاوہ جو مصارف بتائے گئے ہیں اس کے حقدار قرابتمند، یتامیٰ، مساکین، ابن سبیل، مہاجرین، انصار اور ان کے بعد آنے والے نادار لوگ ہیں ـــــ اس تقسیم میں یہ شرط بالکل نہیں کہ جو جنگ میں شریک ہوا ہو وہی حصہ پائے اور جو شریک نہ ہوا ہو وہ نہ پائے بلکہ یہ صدر مملکت کی صوابدید پر منحصر ہے اور وہی اسے لوگوں کی حاجتوں اور ضرورتوں کے مطابق تقسیم کرے گا۔

غزوۂ ذات الرقاع

جمادی الاولیٰ میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ اطراف نجد میں بنو غطفان مدینے پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور بنو محارب اور بنو ثعلبہ بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ یہ اطلاع پاتے ہی حضورؐ نے مدینے کا والی ابوذرؓ کو بنایا اور چار سو صحابہ کے ساتھ اس نخلستان میں پہنچے جہاں ان کے اکٹھا ہونے کی خبر ملی تھی۔ لیکن اہل اسلام کی آمد سن کر یہ سب وہاں سے فرار ہو گئے اور کوئی جنگ نہیں پیش آئی۔ یہ گویا صرف فوجی نقل وحرکت تھی لیکن اہم اس لیے ہے کہ اس جگہ پہلی بار صلوٰۃ الخوف پڑھی گئی کیونکہ کسی کمین گاہ سے دفعتہً دشمنوں کے ٹوٹ پڑنے کا خطرہ تھا۔ لیکن بیہقی اور احمد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صلوٰۃ الخوف غزوۂ بنی لحیان کے موقعے پر بمقام عسفان پڑھی گئی۔

غزوۂ بدرِ ثانیہ

غزوۂ احد کے بعد ابوسفیان نے چلتے وقت دھمکی دی تھی کہ آئندہ سال مقامِ بدر پر پھر معرکہ ہوگا۔ حضورؐ کو اس کا خیال لگا رہتا تھا یہاں تک کہ خبر ملی کہ قافلۂ ابوسفیان مکّے سے چل پڑا ہے۔ ادھر سے مسلمانوں کی جماعت بھی نکل کھڑی ہوئی۔ حضورؐ نے عبداللہؓ بن عبداللہ بن ابی کو حاکمِ مدینہ مقرر کیا۔ یہ شعبان سنہ ۴ھ کا واقعہ ہے۔ اس سے پہلے بدر میں . . . . مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور کفار ایک ہزار۔ اب کے اسی مقام پر مسلمان ڈیڑھ ہزار تھے۔ مگر ابوسفیان پر کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ خرابیِ موسم کا عذر کرکے کوئی مقابلہ کیے بغیر ہی واپس چلا گیا۔ اس جگہ مسلمانوں نے چند دن انتظار کیا اور پھر واپس آ گئے۔ اس نقل و حرکت کا نام بدرِ ثانیہ بھی ہے اور بدرِ موعدہ (دھمکی) بھی۔

واقعاتِ متفرقہ

اسی سال شعبان میں جناب حسین بن علیؓ کی ولادت ہوئی۔ ام المومنین زینب بنت خزیمہ کا نکاح اور وفات دونوں اسی سال ہوئے۔ ام سلمہؓ کو ام المومنین ہونے کا شرف اسی سال حاصل ہوا جن کا ذکر سریۂ ابوسلمہ میں آ چکا ہے۔ غالباً حرمتِ خمر کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا ہے۔

۵ھ غزوہ دومۃ الجندل

دومۃ الجندل بحر احمر اور خلیج فارس کے درمیان حدود شام میں واقع ہے۔ یہ ڈاکوؤں کا مرکز تھا اور ان کی تعداد بھی بہت تھی۔ ربیع الاول ۵ھ میں حضورؐ کو اطلاع ملی کہ ان کی جمعیت بڑھتی جاتی ہے اور مدینے پر یہ لوگ حملہ کرنے والے ہیں۔ حضورؐ نے سباع بن عُرفطہ کو والیِ مدینہ بنایا اور ایک ہزار صحابہ کو ساتھ لے کر نکلے مگر اطلاع ملتے ہی دشمن بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی معرکہ نہیں پیش آیا۔ ان کا قلعہ اور کچھ مویشی ہاتھ آئے۔ ایک شخص بھی گرفتار ہوا جو مدینے آ کر مسلمان ہو گیا۔

غزوہ مریسیع

مدینے سے نو منزل پر ایک چشمہ تھا جس کا نام مُریسیع ہے۔ یہاں قبیلۂ خزاعہ آباد تھا جو قریش کا حلیف تھا۔ اسی قبیلے کی ایک شاخ بنو مصطلق کہلاتی تھی جس کا سردار حارث بن ابی ضرار تھا۔ اطلاع ملی کہ یہ مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ حضورؐ نے زید بن خصیب کو صورتِ حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا۔ جب حارث کی جنگی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو حضورؐ نے بھی صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲۰ شعبان ۵ھ کو جیش اسلامی روانہ ہوا۔ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر حارث اپنی جمعیت لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر دوسرے باشندگان

مریسیع۔ نے صف آرائی کر کے مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کیے۔ مسلمانوں نے یکبارگی حملہ کیا اور دشمن کے دس آدمی مارے گئے اور چھ سو قیدی ہاتھ آئے۔ دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں بھی قبضے میں آئیں۔

یہ واقعہ تو بظاہر معمولی سا ہے لیکن ایک خاص واقعے کی وجہ سے اسے بڑی اہمیت حاصل ہے اور وہ ہے سردار بنی مصطلق حارث بن ابی ضرار کی دختر حضرت جویریہؓ کا ام المومنین ہونا اور سارے قیدیوں کا آزاد ہو جانا۔

ام المومنین جویریہؓ بنت حارث کا نکاح

حضرت جویریہؓ کے نکاح کے بارے میں کئی مختلف روایتیں ہیں۔ ان سب کو ملا کر ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ بنو مصطلق کے قیدی مختلف مسلمانوں کے حصے میں آئے۔ ان میں سردار بنی مصطلق حارث بن ابی ضرار کی بیٹی جویریہؓ بھی تھیں۔ یہ ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں۔ انہوں نے رہائی کی درخواست کی لیکن ثابت نے زرفدیہ طلب کیا۔ جویریہؓ کے پاس وہاں زرفدیہ کہاں تھا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو خود زرفدیہ ادا فرمانے کا وعدہ کر لیا۔ اسی دوران میں حارث زرفدیہ لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اپنی بیٹی کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ خود جویریہؓ سے دریافت کر لو۔ جناب جویریہؓ حضورؐ اور تمام صحابہ کے تقوے اور خلق و کرم سے اس درجے متاثر ہو چکی تھیں کہ اپنے باپ کے سوال کے جواب میں کہا کہ: مجھے حضورؐ کی خدمت میں رہنا زیادہ پسند ہے۔" چنانچہ حضورؐ نے ان کا زرفدیہ خود ادا فرمایا اور رہا ہو جانے کے بعد ان سے نکاح فرما لیا۔ ابن ہشام کی ایک روایت

سے معلوم ہوتا ہے کہ حارث اسی وقت ایمان لے آئے تھے اور ان کے بعد جویریہؓ بھی اسلام لے آئیں (البدایہ والنہایہ ص ۲۴۰، ج ۴)۔

لمحہ فکریہ

حضرت جویریہؓ کا از خود حضورؐ کی زوجیت میں آنے پر راضی ہونا بہت قرینِ قیاس ہے۔ ایک طرف وہ اپنے باپ کو دیکھ چکی تھیں کہ اپنی جمعیت سمیت بھاگ نکلا اور بیٹی کو گرفتاری کے لیے چھوڑ گیا۔ دوسری طرف وہ مسلمانوں کے اعلیٰ کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں کہ ان میں سے ہر فرد تقویٰ، اخلاق، خدا پرستی کا زندہ پیکر ہے اور یہ سب کچھ ایک ذاتِ بابرکات کا فیضِ صحبت ہے۔ پھر انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان سب کے مربّی کا خلق یہ ہے کہ اپنے پاس سے زرِ فدیہ ادا کرنے پر آمادہ ہے اور انتقام و ہوسناکی سے بالاتر ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر حضرت جویریہؓ کے دل میں روشنی پیدا ہو گئی ہو تو اس پر تعجب کیا ہے؟ آخر ام حبیبہؓ بھی تو ایک عورت ہی تھیں جن کا باپ (ابو سفیان) فتح مکہ تک ہر مخالفتِ رسولؐ کا ہیرو بنا رہا لیکن وہ اللہ کی بندی نہ فقط ایمان ہی پر جمی رہی بلکہ حبشہ پہنچ کر مہاجرت کی زندگی بھی گزاری۔ حضرت جویریہؓ میں اگر یہی جذبۂ ایمانی پیدا ہو گیا تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں۔ پھر ممکن ہے کہ آپؓ کے دل میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ میرے حرمِ رسول بننے کے بعد میری برادری کے قیدیوں کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک ہونے لگے۔

اس وقت حضورؐ کے سامنے بھی دو چیزیں تھیں۔ ایک یہ ہے کہ جویریہؓ کو آزاد کر کے ان کے باپ کے ساتھ بھیج دیں۔ لیکن اس سے فقط اتنا ہی بہتر نتیجہ نکل سکتا تھا کہ ایک سردار زادی آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائے۔ لیکن دوسری طرف

جو چیز نظر آرہی تھی اور جو ظہور میں آبھی گئی یہ تھی کہ حضورؐ نے ان سے نکاح فرمالیا اور اس کے نتیجے میں:

(۱) صحابہؓ نے کہا کہ جس خاندان میں حضورؐ نے شادی فرمائی اس سے اپنا صہری (سسرالی) تعلق پیدا کر لیا اس خاندان کے کسی فرد کو ہم قیدی غلام بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ یہ سارے قیدی بغیر زر فدیہ ادا کیے ایک لمحے میں آزاد ہو گئے۔

(۲) بنو مصطلق پیشے ڈاکو تھے۔ اب اس سسرالی قرابت کی وجہ سے اہل اسلام سے قریب تر ہو گئے۔ تعلقات خوشگوار ہو گئے اور دور دور رہنے کی وجہ سے انہیں اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ سب دُور ہوتی گئیں اور جلد ہی وہ دن بھی آگیا کہ یہ سب کے سب اسلام لا کر مہذب، تائب متمدن اور معلمِ اخلاق بن گئے۔

(۳) خود سیدہ جویریہؓ شرف و مجد کے اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں ان کا وہم و قیاس بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ام المومنین ہوئیں اور ان ازواج مطہرات کی صف میں کھڑی ہوئیں جن کے ذکر سے کلام الٰہی رطب اللسان ہے۔ ان سے چند روایات بھی کتب احادیث میں ہیں۔

غرض ایک طرف صرف یہ تھا کہ جویریہؓ کو زر فدیہ لے کر باپ کے ساتھ بھیج دیا جائے اور دوسری طرف یہ مذکورہ بالا حقائق ہیں جو قیاس نہیں بلکہ مشہود حقیقتیں ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے کہ انسانی اقدار کی محافظت کس چیز کا مطالبہ کر رہی تھی؟ یہی تو ہیں وہ قدریں جن کی اقامت کے لیے حضورؐ مبعوث ہوئے تھے۔

ایک ناخوشگوار واقعہ ——— باپ اور بیٹے کے ایمان کا فرق

اسی غزوۂ بنی مصطلق کے موقعے پر ایک ناخوشگوار سا واقعہ یوں پیش آیا کہ

ایک دن چشمۂ مریسیع سے پانی لیتے ہوئے ایک انصاری اور ایک مہاجر میں کچھ تکرار ہوگئی۔ تھا تو محض ذاتی معاملہ مگر ایک نے یا معشر الانصار کہہ کر پکارا، اور دوسرے نے یا معشر المہاجرین کہہ کر آواز دی۔ یوں کہیے کہ ذرا دیر کے لیے قدیم عرب جاہلیت نے اپنا سر نکالا۔ معاملہ کچھ قومی سا بن گیا۔ دونوں طرف کے کچھ جوشیلے جذبات رکھنے والوں کی تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں۔ فوراً چند سمجھ دار لوگوں نے بیچ بچاؤ کر کے قصے کو رفع دفع کر دیا۔ معمولی سا واقعہ تھا جو ختم ہوگیا مگر راس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول نے اس خاکستر کی چنگاری کو ہوا دینی شروع کی۔ اس نے انصار سے کہا کہ: تم ہی نے یہ مصیبت مول لی ہے اور مہاجرین تمہارے سر چڑھ گئے ہیں۔ اب بھی اگر تم ان کی اعانت سے دستکش ہو جاؤ تو اس بلا سے نجات مل سکتی ہے۔" زید بن ارقمؓ نے یہ گفتگو سن لی اور حضورؐ کے سامنے جا کر اسے دوہرا دیا۔ سیدنا عمرؓ غصے سے کانپنے لگے اور عبداللہ بن ابی کا سر قلم کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ: لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا جذبۂ ایمانی تو بجا تھا لیکن دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ خود اس منافق کے صاحبزادے اپنے باپ کے ہم نام حضرت عبداللہ کو علم ہوا کہ حضورؐ میرے باپ سے ناراض ہیں اور بعض صحابہ اس کے قتل کی رائے دیتے ہیں تو خود خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اگر حضورؐ کی مرضی ہو تو میں خود اپنے باپ کا سر لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔" حضورؐ نے فرمایا کہ: میں اسے قتل کرانا نہیں چاہتا بلکہ عفو و درگزر اور رحم و کرم کا ارادہ رکھتا ہوں۔

لمحۂ فکریہ

عبداللہ بن ابی بن سلول کے منافق ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اس سے

پہلے بھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ جب مسلمان میدان احد کی طرف جا رہے تھے تو یہی عبداللہ تھا جو تین سو آدمیوں کو بھکا کر واپس لے گیا۔ آج کے تمدنی دور میں اگر کوئی سیاسی آدمی ایسا کرے تو اسی وقت اس کا کورٹ مارشل ہو جائے۔ ایسا شخص یقیناً سزائے قتل کا مستحق ہوتا ہے۔ اب یہاں چشمہ مریسیع پر اس نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو خطرناک شگاف ڈالنے کی کوشش کی وہ بھی کھلا ہوا سبوتاژ تھا جس کی سزا قتل ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس قتل سے روکنے والی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ عمر فاروقؓ جیسے صحابہ ہی نہیں بلکہ خود اس منافق کے کامل الایمان فرزند بھی صرف اس کے منتظر ہیں کہ ذرا حضورؐ کا اشارہ ہو جائے تو منافق باپ کا سر قلم کرنے کی سعادت انہی کے حصے میں آئے۔ مگر حضورؐ پر دو اعلیٰ قدریں آخر تک غالب رہیں۔ ایک تھا رحمت عامہ کا تقاضا اور دوسرے رجائیت یعنی یہ توقع کہ اگر آج نہیں تو کل شاید اسے ہدایت حاصل ہو جائے۔ یہی رجائی جذبہ سفرِ طائف میں غالب تھا اور یہی جذبہ میدانِ احد میں بھی کارفرما رہا۔ اور یہی اس منافق کے حق میں آخر تک قائم تھا۔ جب یہ مر گیا تو حضورؐ نے اسے کفنانے کے لیے اپنا کرتہ مرحمت فرمایا۔ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ سیدنا عمرؓ نے روکا اور یہ آیت پڑھی کہ:

ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم	ستر بار آپ ان منافقین کے لیے دعائے مغفرت کریں جب بھی خدا ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا۔
۹ : ۸۰	

رحمت عالمؐ نے فرمایا کہ میں بہتّر بار دعا کر لوں گا۔ آخر یہ آیت اتری کہ:

ولا تصل على احد منهم مات ابدا ولا تقم	ان منافقوں میں سے کسی مرنے والے کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور اس کی قبر پر دعائے

علیٰ قبرہٖ - ۹ : ۸۴ مغفرت کے لیے کھڑے بھی نہ ہو۔

چھوٹے جرم یا شبہے پر بڑی سزائیں تو ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں کیونکہ ہم یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں لیکن بڑے جرم پر چھوٹی سزا مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے اور بڑے بڑے جرموں کے عوض درگزر، رحمت بلکہ انعام تو ہماری سمجھ سے اور بھی بالاتر ہے۔ ہمارے ذہنوں میں اس کا تصور بھی نہیں آسکتا، لیکن وسیع ظرف صرف اسی کا ہو سکتا ہے جس کی سیرت آپ کے پیش نظر ہے۔

ام المومنین عائشہؓ اور افکِ مبین

قرعہ اندازی اور استخارہ

غزوۂ بنی مصطلق کا ایک اہم واقعہ وہ ہے جسے قرآنی اصطلاح میں اِفکِ مبین یا بہتان عظیم کہتے ہیں۔ حضورؐ کا معمول تھا کہ جب سفر میں جاتے اور اپنی اہل بیت یعنی بیویوں میں سے کسی کو ساتھ لے جانا ہوتا تو قرعہ اندازی فرماتے تاکہ ترجیح بلا مرجح لازم نہ آئے۔ اگر حضورؐ کسی کو اپنی پسند سے انتخاب فرماتے تو اس کا حضورؐ کو پورا پورا حق حاصل تھا لیکن اس صورت میں یہ امکان تھا کہ دوسری اہل بیت کے آئینۂ دل پر غبار سا آجاتا اور یہ ترکایت اگر شدت اختیار کرتی تو ان کو مقامِ کفر تک بھی پہنچا سکتی تھی۔ حضورؐ یہ بالکل پسند نہ فرماتے تھے کہ ازواجِ مطہرات کی کوئی دل شکنی ہو اور دل شکنی انہیں ایمانی حیثیت سے کسی خطرناک مقام تک لے جائے۔ قرعہ اندازی کی یہی وجہ تھی۔ قرعہ اندازی صرف وہیں ہوتی ہے جہاں ایک نوع کے مختلف افراد میں تساوی ہو اور وجہ ترجیح نظر نہ آتی ہو۔ اگر عقلی یا نقلی وجۂ ترجیح موجود ہو تو قرعہ اندازی کی ضرورت نہیں۔

قرعہ اندازی کے مواقع زندگی میں بہت کم پیش آتے ہیں۔ اگر وجہ ترجیح موجود ہوتے ہوئے خواہ مخواہ قرعہ اندازی ایک عام مشغلہ بن جائے تو اس کی سرحدیں قمار سے بھی مل جاتی ہیں۔ اس کی شکل نبیذ کی سی ہے جو اس وقت تک جائز ہے جب تک اس میں نشہ نہ پیدا ہو۔ لیکن اگر اس کے سرور میں اضافہ کرتے چلے جائیں تو آخر اس کی سرحدیں نشے سے جا ملیں گی۔ اتباع سنت میں مقدار کے صحیح توازن و تناسب کو برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ کھانا سنت ہے لیکن مسلسل کھاتے چلے جانا کوئی سنت نہیں۔ یہی حال قرعہ اندازی اور استخارے کا ہے۔ بقدر مناسب ہی یہ روا ہے اور ہر قدم پر اس کا استعمال انسان کو وہمی بنا دے سکتا ہے۔

بہرکیف اس موقعے پر قرعے میں سیدہ عائشہؓ کا نام نکلا اور غزوۂ بنی مصطلق میں وہی حضورؐ کے ساتھ گئیں۔ واپسی میں ایک جگہ قافلہ رکا۔ جناب صدیقہؓ قضائے حاجت کے لیے ایک طرف تشریف لے گئیں۔ اپنی محمل کے پاس واپس آئیں تو دیکھا ہار غائب ہے۔ یہ ہار وہ اپنی بہن اسماءؓ سے مستعار لے کر آئی تھیں۔ عام عورتوں کی طرح حضرت عائشہؓ کو زیور سے دلچسپی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ لیکن ان کو بڑی فکر یہ تھی کہ وہ ہار خود ان کا نہ تھا، حضرت اسماءؓ کا تھا۔ وہ ادھر ہار ڈھونڈنے نکلیں، اور ادھر قافلہ چل دیا۔ بات یہ ہوئی کہ حضرت عائشہؓ تھیں دُبلی پتلی۔ محمل اٹھانے والے کو پتہ بھی نہ چلا کہ اس میں عائشہؓ موجود ہیں یا نہیں۔ جب عائشہؓ واپس آئیں تو قافلہ نکل چکا تھا۔ وہ وہیں چادر اوڑھ کر اس خیال سے لیٹ گئیں کہ آخر لوگ مجھے ڈھونڈنے تو آئیں گے ہی۔ قافلے کے پیچھے پیچھے صفوان بن معطل آ رہے تھے۔ عرب کا عام دستور تھا کہ قافلے یا فوجی دستے کے پیچھے ایک یا چند آدمی آتے ہیں جن کا کام یہ ہوتا ہے کہ گری پڑی چیزیں اٹھاتے

ہوئے آئیں۔ ان کو سائق کہتے ہیں۔ جناب صفوان نے حضرت عائشہؓ کو دیکھا پہچانا اور صورت حال معلوم کر کے اپنے اونٹ پر بٹھا لیا اور خود مہار تھامے تیزی سے چل پڑے اور قافلے سے جا ملے۔ بس: اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ منافقوں نے جن میں عبداللہ بن ابی پیش پیش تھا ایک ہنگامہ برپا کر دیا اور اتنا زیادہ پروپیگنڈا کیا کہ بعض مسلمانوں کو بھی دال میں کالا نظر آنے لگا اور جناب عائشہؓ کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے بلکہ جناب عائشہؓ پر تہمت لگانے میں وہ بھی شریک ہو گئے۔ انہی مسلمانوں میں مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت، اور حمنہ بنت جحش ہیں۔

حضورؐ راستے بھر خاموش رہے۔ مدینے پہنچ کر مشورہ کیا۔ ایک جماعت صحابہ نے جن میں نمایاں شخصیت اسامہ بن زید کی ہے صاف کہہ دیا کہ: سبحٰنکَ ھٰذا بہتانٌ عظیم (اے اللہ ہم تیری پاکیزگی کا اقرار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بڑا بہتان ہے)۔ حضرت علیؓ نے کہا: یوں تو حضورؐ کے لیے عورتوں کی کمی نہیں لیکن بُریرہؓ سے دریافت فرمایئے۔ بریرہؓ نے کہا: یارسول اللہ میں نے عائشہؓ میں کوئی عیب بجز اس کے نہیں دیکھا کہ وہ گندھا ہوا آٹا چھوڑ کر سو جاتی ہیں اور بکری آکر اسے کھا جاتی ہے۔

اس موقعے پر سب سے بڑے جگرے کا ثبوت عائشہؓ کے پدر بزرگوارؓ نے دیا۔ کئی ہفتوں تک یہ معاملہ درپیش رہا۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ مخالف و موافق رائیں دی جاتی رہیں لیکن سیدنا ابوبکرؓ نے اشارۃً بھی کبھی کوئی ایسا لفظ نہ نکالا جس سے اپنی بیٹی کی حمایت یا سفارش کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ سارا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا تھا اور یہ تسلیم و رضا کی ایسی منزل ہے جو پیغمبر صفت انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے۔

کئی ہفتے تک تو حضرت عائشہؓ کو کوئی خبر نہ تھی کہ باہر کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کیونکہ وہ خود بیمار پڑی تھیں لیکن جب اس واقعے کا علم ہوا تو اور نڈھال ہو کر رہ گئیں۔ دل و دماغ منتشر ہو گئے، آنسوؤں کی لڑی جاری ہو گئی۔ اسی حال میں آپؓ نے فرمایا کہ: اگر میں اس بہتان کی تصدیق کروں تو میں عنداللہ جھوٹی ہوں گی اور اگر تردید کروں تو تم لوگ نہ مانو گے۔ اس لیے یعقوبؑ کی طرح صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتی ہوں کہ: فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ۔

عائشہؓ کی یہ فریاد بڑی مؤثر و ستاب ثابت ہوئی اور بہت جلد وحی کا دروازہ اپنی بھرپور وسعتوں کے ساتھ کھل گیا۔ سورۂ نور کے دو رکوع عائشہؓ کی برأت و بےگناہی ثابت کرنے کیلیے نازل ہو گئے۔ ماں نے کہا: بیٹی اٹھ کر رسول اللہ کا شکریہ ادا کر۔ بیٹی بولی: اس خدا کا شکر کیوں نہ ادا کروں جس نے میری بے گناہی کی آیات نازل فرمائیں۔" یہ ناز بھرا فقرہ اور یہ توحید میں ڈوبا ہوا جملہ عائشہؓ کے سوا اور کون کہہ سکتا تھا؟

اس کے بعد تہمت لگانے والوں کو حسب ہدایت قرآنی اسّی اسّی درے لگائے گئے۔

جنگِ احزاب یا غزوۂ خندق

یہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ بنونضیر مدینے سے جلاوطن ہونے کے بعد خیبر کی طرف چلے گئے اور ان کے سرداروں ——— ابو رافع، سلام بن ابی الحقیق

حُیَیّ بن اخطب اور کنانہ بن ربیع ـــــــ کی وہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی اور ان تینوں نے وہاں سردارانہ پوزیشن حاصل کر لی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف ان کا جوشِ انتقام روزافزوں تھا۔ لہٰذا انہوں نے ایک آخری اور فیصلہ کن مقابلے کے لیے عجیب سازش شروع کی۔ یہ تینوں سردارانِ بنی نضیر مکے جاکر قریش سے ملے اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایک فیصلہ کن جنگ میں وہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ اس کے بعد یہ تینوں قبیلۂ غطفان سے ملے اور انہیں بھی ملا لیا، اور ان سے یہ وعدہ کر لیا کہ خیبر کے محاصل کا آدھا حصہ وہ غطفانیوں کو دیا کریں گے۔ غطفان کے حلیف تھے بنی اسد۔ یہ بھی شریک کر لیے گئے۔ قریش کے قرابتمند تھے بنی سلیم۔ یہ بھی ساتھ ہو گئے۔ یہود کے حلیف تھے بنی سعد۔ یہ بھی خم ٹھونک کر آ گئے۔ غرض آس پاس کے تمام قبائل اپنی شاخوں سمیت اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر یکجا ہو گئے۔ ان کی تعداد بائیس یا چوبیس ہزار تھی (بعض روایتوں میں دس ہزار بھی ہے) احزاب جمع ہے حزب کی، جس کے معنی ہیں گروہ۔ اسے غزوۂ احزاب اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں عرب کے تقریباً سارے قبائل گروہ در گروہ مدینے پر حملہ کرنے کے لیے آئے تھے۔ اس کے افسر الکل ابوسفیان تھے۔ غطفانی لشکر کے افسر عیینہ بن حصن فزاری تھے اور بنو اسد کے کمان دار طلحہ۔

حضورؐ کو ان کی آمد کی خبر ملی تو صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ مقابلے کا ایک نیا طریقہ پہلی بار آزمایا گیا۔ اس کی رائے جناب سلمان فارسی نے دی تھی جو پسند کی گئی۔ انہوں نے بتایا کہ عجم میں مقابلے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ شہر کے چاروں طرف خندق کھودی جاتی ہے اور اس طرح محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جاتا ہے

حضورؐ نے اس رائے کے مطابق خندق کھودنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ خندق مدینہ کے تین جانب کھودی گئی۔ وہ سمت جو شام کی طرف ہے چھوڑ دی گئی کیونکہ اس رخ مکانات بھی تھے اور نخلستان بھی۔ لہٰذا اس طرف خود ہی شہر پناہ بنی ہوئی تھی۔ اسی خندق کی کھدائی کی مناسبت سے اسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔ خندق کی کھدائی محض ایک نیا واقعہ ہی نہ تھا بلکہ اس کھدائی میں جو ایمانی قدریں تھیں اور اخلاص کا جو درجہ پردۂ منظر تھا وہ دنیا میں اس سے پہلے نہیں دیکھا گیا۔

خندق کی کھدائی کا عجیب منظر

۸ ذوالقعدہ ۵ھ کو خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ یہ تین ہزار مزدور تھے جو صرف رضائے الٰہی کی خاطر اپنے دست و بازو کو حرکت دے رہے تھے۔ ان کو کوئی مزدوری رقم کی شکل میں نہ مل رہی تھی۔ بلکہ فاقوں پر فاقے ہو رہے تھے۔ آسمان کی آنکھوں نے اس سے بہتر مزدوروں کا گروہ نہیں دیکھا یہ سب لوگ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

نحن الذین بایعوا محمدا	ہم وہ ہیں جو اپنے آپ کو جہاد کے لیے محمدؐ
علی الجهاد ما بقینا ابدا	کے ہاتھ ہمیشہ کے لیے فروخت کر چکے ہیں۔

خدا کا رسولؐ ان مقدس رجز خوانوں کے جواب میں یوں کہتا:

اللّٰھم لا عیش الا عیش الاٰخرہ	الٰہی زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے،
فاغفر الانصار والمهاجرہ	پس انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرما کہ انہیں عیش آخرت حاصل ہو،

اور کبھی یوں یوں ارشاد ہوتا:

واللّٰہ لولا اللّٰہ ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا

بخدا اگر فضلِ الٰہی شاملِ حال نہ ہوتا تو نہ ہم ہدایت پا سکتے تھے اور نہ زکوٰۃ و صلوٰۃ ادا کر سکتے تھے

فَأَنزِلن سکینۃ علینا وثبت الاقدام ان لاقینا

لہٰذا ہم پر سکینت نازل فرما اور جب ہم دشمن سے دوچار ہوں تو ہمیں ثابت قدم رکھ

ان الذین قد بغوا علینا اذا ارادو فتنۃ ابینا

ہم پر دشمن چڑھ آئے ہیں اور جب وہ کوئی فتنہ کھڑا کرنا چاہیں گے تو ہم اسے رد کر دیں گے۔

ہر شخص نے ایک گز لمبی اور پانچ ہاتھ گہری زمین کھودی۔ چوڑائی اتنی تھی کہ خندق میں اترے بغیر کوئی آدمی یا گھوڑا جست کر کے اس پار نہ آسکے۔ سرورِ کونینؐ بھی ان سب کے ساتھ زمین کھودنے اور مٹی پھینکنے میں برابر کے شریک تھے۔ ایک شخص کو زمین کھودتے کھودتے ایک چٹان ملی جس پر کوئی ضرب کام نہ کرتی تھی۔ حضورؐ موقعے پر تشریف لے گئے۔ اس وقت حضورؐ کو تین دن سے فاقہ تھا مگر نبوت کی قوت تیز تر ہو رہی تھی۔ حضورؐ نے تین ضربوں میں اس چٹان کے پرخچے اڑا دیے۔

پیغمبری نگاہ

ذرا اس نازک موقعے پر نظر ڈالیے کہ کفر کی تمام عربی قوتیں متحد ہو کر اس ارادے سے آرہی ہیں کہ اسلام اور اہلِ اسلام کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا۔ ادھر مسلمان محصور ہونے کے علاوہ خشک سالی اور شدید سردی سے دوچار ہیں اور کئی کئی وقت کے فاقے ہو رہے ہیں۔ کلیجے منہ کو آ گئے ہیں (و بلغت القلوب الحناجر) ایسے جھٹکے پڑ رہے ہیں کہ دل ہلے جا رہے ہیں (زلزلوا زلزالاً شدیداً) غرض اس سے پہلے کبھی ابتلا نے اس طرح اپنا چہرہ نہ

دکھایا تھا۔ مگر عین اس مرحلے پر چٹان کو توڑتے ہوئے پیغمبرؐ کی نور چمک کر سامنے آتا ہے اور حضورؐ اس نور میں مستقبل کو اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح کوئی اپنی ہتھیلی کو دیکھے۔ کہاں مسلمانوں کی یہ بے بسی کہ جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور کہاں رسولؐ کا یہ ارشاد کہ:

میری ضرب نے کسریٰ و قیصر کے خزانوں کے منہ کھول دیئے۔" کون یقین کر سکتا ہے کہ یہ باتیں کبھی حقیقت بن کر سامنے آسکیں گی؟ لیکن بیس سال نہیں گزرے کہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ لیا۔

شکم پر پتھر

اس موقعے پر تقریباً ہر سیرت نگار نے حضورؐ اور صحابہؓ کے متعلق فاقوں میں پیٹ پر پتھر باندھنے کا ذکر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ذرا غور طلب ہے۔ چند نکات پر غور کیجیے:

(۱) کیا فاقوں میں پیٹ پر پتھر باندھنے کا رواج پہلے بھی تھا؟ یا بعد میں رہا؟ یا اب کہیں ہے؟

(۲) کیا فاقہ چہرے سے، آواز سے، یا دھنسا ہوا پیٹ دکھانے سے یا محض زبانی کہہ دینے سے ظاہر نہیں ہو سکتا جو کپڑا اٹھا کر شکم پر بندھا ہوا پتھر دکھانے کی ضرورت پڑے؟

(۳) کیا اس عمل سے فاقوں میں فی الواقع کوئی تسکین ہوتی ہے اور کیا روزوں میں بھی ایسا کیا جاتا رہا ہے؟

(۴) پیٹ پر پتھر باندھنا کوئی محاورہ تو نہیں؟

قلعہ بندی اور مقابلے کا انداز

یہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ بنو نضیر کے جلا وطن ہونے سے پہلے بنو قریظہ نے مسلمانوں سے تجدیدِ معاہدہ کر لی تھی اس لیے اب تک وہ ان دشمن اتحادیوں سے الگ تھے مگر بنو نضیر کے سردار حُیی بن اخطب نے بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کو ردو قدح کے بعد ہموار کر لیا اور یہ بھی معاہدے کا احترام کیے بغیر دشمنوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ حضورؐ کو یہ خطرہ پہلے ہی سے تھا اس لیے دو سو صحابہ کو اس محاذ پر متعین کر دیا جدھر سے بنو قریظہ کے حملے کا خطرہ تھا۔ عورتوں اور بچوں کو محفوظ قلعوں میں بند کر دیا گیا۔ اور کوہ سلع کو پشت کی طرف رکھ کر مسلمانوں نے اپنی صفیں آراستہ کیں۔ جماعتِ مسلمین میں کچھ منافقین بھی تھے جو متعدد بہانے کر کے کھسک گئے مگر اہلِ ایمان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش آنے کی بجائے اور زیادہ استحکام پیدا ہو گیا۔

دشمنوں کی ٹڈی دل فوج بڑے زور شور سے آگے بڑھی مگر خندقوں کو دیکھ کر رُک گئی۔ ایک ماہ تک دشمن محاصرہ کیے رہے۔ دست بدست مقابلہ نہیں ہوا۔ بس اُدھر سے تیر اور پتھر برسائے گئے اور اِدھر سے تیروں اور پتھروں سے جواب دیا گیا۔

ایک محلِ نظر روایت

اس موقعے پر ابن اسحاق کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ اوپر بیس دن کی سخت آزمائش کے بعد آں حضرتؐ نے سردارانِ غطفان۔ عینیہ بن

حصن اور حارث بن عوف ۔۔۔۔ کے نام ایک خط لکھوایا کہ ہم مدینے کی تہائی پیداوار دیں گے بشرطیکہ تم اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو جاؤ۔" غرض یہ تھی کہ دشمنوں کا ایک بڑا حصہ کٹ کر الگ ہو جائے۔ حضورؐ نے انصار سے اس کے متعلق مشورہ فرمایا تو انہوں نے پوچھا کہ: یہ وحی کا حکم ہے یا حضورؐ کی اپنی تجویز ہے؟" حضورؐ نے فرمایا کہ: میری اپنی تجویز ہے۔" اس پر سعد بن معاذ انصاری نے کہا کہ: یا رسول اللہ! کیا آج ہم اسلام لانے کے بعد یہ خراج دیں جب کہ کفر کی حالت میں بھی ہم نے انہیں کبھی یہ چیز نہیں پیش کی؟ ہمارا ان کا فیصلہ صرف تلوار سے ہوگا۔" اس کے بعد سعد نے وہ تحریر مٹا دی۔

یہ تو ہو سکتا ہے کہ بنی غطفان نے یہ تجویز خود پیش کی ہو یا کسی کمزور دل مسلمان نے گھبرا کر یہ رائے دی ہو اور حضورؐ نے انصار کے سامنے یہ معاملہ پیش فرما دیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضورؐ نے انصار کی ہمت و غیرت کا اندازہ کرنے کے لیے امتحاناً یہ دریافت فرمایا ہو۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نبی کی غیرت نے یہ گوارا کر لیا ہو کہ بنی غطفان کو توڑنے کے لیے اس قسم کی ذلت آمیز پیش کش کی جائے۔ جو پیغمبر اسی موقعے پر قیصر و کسریٰ کی فتوحات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو اور جو یہ بھی بتا چکا ہو کہ اس کے بعد دشمن کبھی ایسا متحدہ محاذ نہ قائم کر سکیں گے اور جس کی غیرت و خودی میں نازک ترین مراحل پر بھی سرِ مو فرق نہ آیا ہو اس سے ایسی سیاسی اور گری ہوئی چاپلوسی کا اظہار ممکن ہی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ رسولؐ کی طرف اس پیش کش کے انتساب کی ہمیں جرأت نہیں ہوتی۔

حضرت زبیرؓ کی ہمت مردانہ

ایک دن حضورؐ نے فرمایا: کوئی ہے جو دشمنوں کی خبر لائے؟ کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ یوں بھی چوبیس ہزار دشمنوں میں مخبری کے لیے تنہا جانا آسان نہ تھا۔ حضورؐ نے تین بار آواز دی لیکن ہر بار ایک ہی شخص نے اٹھ کر اپنے آپ کو پیش کیا اور یہ تھے سیدنا زبیر بن عوامؓ ـــ عشرہ مبشرہ کے ایک فرد ـــ یہی وہ نازک مرحلہ تھا جہاں حضورؐ نے جناب زبیرؓ کو حواری رسول کا زندۂ جاوید لقب عطا فرمایا۔

سیدنا علیؓ کی شجاعت

محاصرے کی طوالت کے بعد دشمنوں نے خندق پار کرنے کی وہ جگہ ڈھونڈ لی جہاں خندق کی چوڑائی ذرا کم رہ گئی تھی۔ اس راستے سے ضرار بن خطاب، عکرمہ بن ابوجہل، نوفل، ہبیرہ بن ابی وہب، اور عمرو بن عبدوُد نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور خندق پار کر لی۔ عمرو بن عبدوُد بدر میں بری طرح زخمی ہوا تھا اور اسی سبب سے وہ اُحد میں شرکت نہ کر سکا تھا۔ وہ آج نوّے سال کا بڈھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عمر میں وہ کیا جنگ کر سکتا تھا لیکن جوانی میں وہ ہزار سواروں کے برابر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اور اسی قدیم دبدبے کے بل بوتے پر وہ میدان میں آیا تاکہ جوانوں کو غیرت آئے اور بوڑھے بھی اس کے بہادرانہ اقدام سے سبق لیں۔ وہ بالکل کمزور بوڑھا ہو چکا تھا لیکن ہمت جوان تھی۔ اس نے خندق پار کر کے مسلمانوں کو للکارا۔ حضورؐ نے تین بار آواز دے کر دریافت فرمایا کہ اس کے مقابلے کو کون جائے گا؟ ہر بار حضرت علیؓ ہی اٹھے۔ حضرت علیؓ کے ساتھ

چند اور صحابہ بھی گئے۔ حضرت علیؓ نے عمرو بن عبدود کے سامنے اسلام پیش کیا اس نے انکار کیا۔ سیدنا علیؓ نے اسے گھوڑے سے اتر کر مقابلہ کرنے کی فرمائش کی۔ وہ اترا اور آپؓ پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ خود کو کاٹ کر پیشانی کو زخمی کر دیا۔ اور یہ نشان ساری عمر رہا۔ اس کے جواب میں آپؓ نے اس کے شانے پر ایسا وار کیا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ رنگ دیکھ کر اس کے ساتھی بھاگے۔ مگر نوفل بن عبداللہ آگے بڑھا جسے زبیر بن عوامؓ یا علیؓ بن ابی طالب نے ایک ہی وار میں ختم کیا۔ اور میدان نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھا۔

مشرکوں نے اپنے مقتول (ابن عبدود) کی لاش کے لیے دس یا بارہ ہزار درہم پیش کیے مگر حضورؐ نے کوئی رقم قبول نہ فرمائی اور لاش واپس کر دی (رواہ ابن اسحٰق و احمد والبیہقی)۔ اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ حضورؐ کا مقصد جنگ کیا تھا۔ محض حصولِ دولت یا قیام اقتدار؟

تین یا چار نمازوں کی قضا

اگرچہ باقاعدہ دست بدست جنگ تو نہ ہوئی لیکن ایک دن تیروں اور پتھروں کی اتنی بارش کی گئی کہ مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ اس دن نصف شب کے بعد ظہر، عصر، مغرب اور عشاء ایک ساتھ ادا کی گئی۔ ایک اذان اور چار اقامتیں کہی گئیں۔

صفیہؓ کی شجاعت و حکمت

ایک دن بنو قریظہ کا ایک آدمی حملے کے لیے راستہ ڈھونڈتا ہوا اس قلعے کے پاس آ گیا جہاں عورتوں کو محفوظ کیا گیا تھا۔ مردوں میں سے یہاں کوئی

نہ تھا۔ صرف حسان بن ثابت تھے جو عارضۂ قلب میں مبتلا تھے۔ مقابلے کی جرأت نہ کر سکے۔ مگر حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب (حضرت حمزہؓ کی بہن اور حضورؐ کی پھوپھی) نے خیمے کی ایک چوب اکھیڑ کر اس یہودی کے سر پر وہ ضرب لگائی کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد خود اس کا سر کاٹا اور قلعے کی دیوار کے نیچے پھینک دیا۔ جناب صفیہؓ نے یہ بڑا عقلمندی کا کام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنو قریظہ ڈر گئے اور انہیں حملے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ یہ سمجھے کہ ادھر بھی حفاظت کے لیے فوج متعین ہے۔

قدرت کی امداد

محاصرے کی طوالت سے دشمن بھی گھبرا گئے۔ چوبیس ہزار آدمیوں کی رسد کا انتظام بجائے خود ہی ایک مشکل مسئلہ تھا۔ اس پر سردی کی شدت نے مشکلات میں مزید اضافہ کر دیا۔ اور سب سے عجیب بات یہ ہوئی کہ بڑی زور کی آندھی آ گئی جس نے حملہ آوروں کے خیمے اکھاڑ دیے اور ان کی ہانڈیاں الٹ گئیں۔ یہ ایک قدرتی امداد تھی جس نے حملہ آوروں کو پریشان کر دیا۔ ایک عجیب غیبی امداد اور بھی ہوئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قبیلۂ غطفان کے ایک سردار نعیم بن مسعود ثقفی اسلام لے آئے تھے لیکن کسی کو اس کی اطلاع نہ تھی۔ ان کا اثر قریش مکہ اور یہود مدینہ دونوں پر تھا۔ یہ ایک دن حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! میں مسلمان ہو چکا ہوں لیکن کسی کو بتایا نہیں ہے۔ کوئی خدمت میرے سپرد بھی فرمائی جائے۔" حضورؐ نے فرمایا کہ: "دشمنوں کو دفع کرنے میں ہماری کوئی امداد کر سکتے ہو تو کرو" ـــ حضرت نعیم پہلے تو بنو قریظہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ: دیکھو قریش آج تو حملہ کرنے یہاں آ گئے ہیں

لیکن آخر وہ جنگ ختم ہونے کے بعد واپس چلے جائیں گے۔ تمہارا اور مسلمانوں کا ہمیشہ کا ساتھ ہے۔ اس قضیے میں پڑ کر ساری زندگی کے لیے اپنے پڑوسیوں (مسلمانوں) کی مخالفت مول لینا کون سی عقلمندی ہے۔ تم لوگ ایسا کرو کہ قریش سے چند نوجوانوں کو بطور یرغمال کے طلب کرو تاکہ قریش جنگ کا آخری فیصلہ کیے بغیر تمہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں۔ اور اگر وہ ایسا کریں تو تمہیں یہ حق ہو گا کہ قریشی نوجوانوں کو واپس نہ کرو۔ ورنہ قریش تمہیں احمق بنا کر خود چل دیں گے اور تمہیں ایک دائمی مصیبت میں ڈال جائیں گے"۔—— یہ باتیں جناب نعیم بن مسعود ثقفی نے کچھ اس انداز سے کہیں کہ یہود بنی قریظہ کے دل میں اترتی چلی گئیں اور انہوں نے نعیم کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

حضرت نعیم ادھر سے فارغ ہو کر اپنے قبیلہ غطفان اور قریش کے پاس پہنچے اور کہا کہ: بنو قریظہ چونکہ مسلمانوں کے ہمسائے ہیں اس لیے وہ اس حق ہمسائگی کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دل سے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ محض نمائشی طور پر تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔

قریش جناب نعیم کی زبان سے یہ سن کر سوچ میں پڑ گئے۔ آزمائش کے طور پر انہوں نے بنی قریظہ سے کہلا بھیجا کہ: کل تم لوگ مسلمانوں پر حملہ کرنے میں پہل کرو۔ بنو قریظہ کو حضرت نعیم تو سمجھا ہی چکے تھے۔ انہوں نے قریش کو جواب بھجوا دیا کہ: اوّلاً تو کل یوم سبت (ہفتے کا دن) ہے جو عبادت کا دن ہے اور اس دن حملہ تو درکنار کوئی معمولی سا کام بھی نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں اپنے چند نوجوانوں کو بطور یرغمال ہمارے پاس بھیج دو جو اس بات کی ضمانت ہو کہ تم ان کی خاطر جمے رہو گے اور بیچ میں جنگ کو معلق چھوڑ کر اور ہمیں دائمی مصیبت (مسلمانوں سے تلخ تعلقات) میں ڈال کر واپس نہ چلے جاؤ گے"۔

یہود بنی قریظہ کی طرف سے یہ جواب سن کر قریش کو یقین ہو گیا کہ نعیم بن مسعود نے سچ کہا تھا کہ بنو قریظہ دل و جان سے جنگ میں ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ محسوس کر کے ابو سفیان نے کہا کہ: یہود کھسکتے جاتے ہیں۔ موسم بھی سخت ہے اور سامانِ رسد بھی ختم ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے اور کوچ کا سامان کیا جائے" ——— غرض طبلِ کوچ بجا، یہود اپنے قلعوں میں واپس آ گئے اور قریش و غطفان وغیرہ اپنی اپنی سمت روانہ ہو گئے۔

لمحۂ فکریہ

ہمیشہ سے سیاست اور تقوےٰ میں کچھ بیر سا رہا ہے۔ تقوےٰ سچائی چاہتا ہے اور سیاست میں مطلب بر آری اصل الاصول ہے خواہ یہ سچائی سے ہو یا سچائی کو پس پشت ڈال کر ہو پھر اگر جنگ ہو رہی ہو تو بفحوائے الحرب خدعۃ (جنگ دھوکا ہے) اس میں ہر کا نشانہ دکھا کر پھرتی سے پاؤں میں مار دینا ایک ضروری جنگی چال ہے۔ اثنائے جنگ میں اخلاقی قدروں کا کب خیال رکھا جاتا ہے۔ ایسے نازک مواقع پر تو اقدار کو بے تکلف ذبح کر دیا جاتا ہے لیکن اسلام کا مبلغِ اول ؐ کیا سکھاتا ہے اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ حضورؐ جناب نعیم سے کسی ایسی چیز کی فرمائش نہیں کرتے جو اخلاقی قدروں کو مجروح کرے۔ صرف اتنی بات فرماتے ہیں کہ: دشمن کو دفع کرنے میں ہماری کوئی امداد کر سکتے ہو تو کر دو"۔ پھر حضرت نعیم کو دیکھیے جو حضورؐ کی صحبت میں نہیں رہے بلکہ آج سے پہلے انہوں نے اپنے اسلام کا اظہار بھی نہیں کیا تھا لیکن انہوں نے بنو قریظہ اور قریش سے جو باتیں کیں اس میں کوئی کذب صریح یا

فریب صریح نہیں دکھایا جا سکتا۔ بات انہوں نے خدا لگتی ہی کہی جو دونوں کے دل میں اتر گئی اور مقصد حاصل ہو گیا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام انہی کے دلوں میں گھر کرتا ہے جو اونچے کردار اور بلند تصورات سے ہم آہنگی رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ جنگ جیسے نازک مواقع پر بھی اقدار انسانی کی نزاکت کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسلام انہی کو پہلے کھینچتا ہے جن کو اسلام اپنے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے اور جو نکہ وکردار اور سلامت ذوق کے لحاظ سے ذہنی ہم آہنگی رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا ذہن ایسا تیار ہوتا ہے کہ وہ فوراً پیغام حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگ عرصۂ دراز کے بعد سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ زندگی کی آخری سانس تک بھی نہیں سمجھ پاتے۔

نتیجۂ جنگ

یہ جنگ، کوئی باقاعدہ دست بہ دست تو ہوئی نہ تھی اس لیے موتیں بھی زیادہ نہ ہوئیں۔ صرف تین مشرکین اور چھ مسلمان مارے گئے جن میں قبیلۂ اوس کے سردار سعد بن معاذ بھی تھے۔ ان کو ایک کاری زخم لگا تھا جس سے ایک ماہ بعد انہوں نے وفات پائی۔ زخمی ہونے کی حالت میں بھی اللہ نے ان سے ایک بڑا کام لیا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

بیس بائیس دن یہ محاصرہ رہا۔ اہل اسلام کے خلاف اتنی بڑی اجتماعی یورش نہ اس سے پہلے ہوئی تھی اور نہ بعد میں ہوئی۔

ایک شبہے کا ازالہ

غزوۂ احزاب کے موقعے پر آپ نے سنا کہ ایک موقعے پر حضورؐ نے مجمع

عام کو مخاطب کر کے تین بار پوچھا کہ: کون دشمن کی خبریں لانے کو تیار ہے؟ جواب میں ہر بار صرف حضرت زبیر بن عوام کھڑے ہوئے۔ اسی طرح دوسرے موقعے پر حضورؐ نے تین مرتبہ پوچھا: عمرو بن عبدود کے مقابلے پر کون جائے گا؟ جواب میں ہر بار حضرت علیؓ بن ابی طالب کھڑے ہوئے۔ اس قسم کے واقعات سے بعض سادہ لوحوں کو یہ نتیجہ نکالتے دیکھا ہے کہ بعض مواقع پر ایک آدھ کے سوا سارے صحابہ بزدل ثابت ہوئے ہیں۔ العیاذ باللہ من ذلک۔ اگر آپ ایک مجمعے میں کہیں کہ: بھئی پانی کون پلائے گا؟ تو اس مجمعے میں کوئی ایک ہی آدمی آپ کو پانی پلانے اٹھے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ ایک کے سوا باقی سب کام چور ہیں یا آپ کو پیاسا مارنا چاہتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر ایک کا کمربستہ ہونا سب کی طرف سے نمائندگی ہوتی ہے۔

جب کسی مقصد کے لیے حضورؐ اس طرح تخاطب فرماتے تو زیرک صحابہ خود منشائے نبوی کو تاڑ جاتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس عام تخاطب میں روئے سخن کس کی طرف ہے۔ جو اس سپردکردہ خدمت کا اہل ہوتا وہ منشائے نبوی کو تاڑ جاتا اور خود کھڑا ہو کہ اس کام کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیتا۔ معرکۂ بدر سے قبل مجلس شوریٰ میں اسی منشائے نبوی کو تاڑ کر سردارِ خزرج جناب سعد بن عبادہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ: شاید حضورؐ کا اشارہ ہم انصار کی طرف ہے۔ اگر حضورؐ فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں گے۔" اور اسی وقت حضرت مقداد نے منشائے نبوی کو بھانپ کر عرض کیا تھا کہ: یا رسول اللہ ہم قوم موسیٰ نہیں جو یہ کہہ دیں کہ موسیٰ تم اور تمہارا رب جا کر جنگ کریں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔" اسی منشائے نبوی کو محسوس کر کے حضرت ابو دجانہ نے معرکۂ احد میں رسول اللہؐ کی تلوار لیک کر لی تھی۔ اسی منشائے

نبوی کو حضرت زبیر نے محسوس کر کے غزوۂ خندق کے موقعے پر مخبری کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں اور اسی منشائے نبوی کو معلوم کر کے عمرو بن عبدود کے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ خم ٹھونک کر آ گئے۔ نہ کوئی بزدل تھا نہ کام چور، اور نہ ایک کا کھڑے ہو جانا دوسروں کی بزدلی کی دلیل۔ وہ لوگ بزدلی کیا دکھائیں گے جو اپنے گھروں سے پہلے ہی ہتھیلی پر سر لے کر، اور اپنے جان و مال کو خدا کے ہاتھ جنّت کے عوض فروخت کر چکے ہیں؟ صحابہ جب کبھی کھڑے نہیں ہوئے یا خاموش رہے تو صرف اس وقت جب حضورؐ کا منشا معلوم کرنے میں انہیں تامل یا تردد ہوا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ہم سپرد کردہ مقصد کے لیے بے سمجھے بوجھے کھڑے ہو گئے اور حضورؐ نے بٹھا دیا تو نااہلی کا داغ ہمیشہ کے لیے چپک کر رہ جائے گا۔ اس لیے وہ اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ یا تو حضورؐ خود ہی کسی کو نامزد فرما دیں یا وہ شخص از خود کھڑا ہو جائے جو منشائے نبوی کو اور اصلی روئے سخن کو اچھی طرح بھانپ گیا ہو۔ انہیں یہ بھی علم تھا کہ حضورؐ جسے نامزد فرما دیں گے اس سے بہتر کوئی اہل ثابت نہ ہو سکے گا ایک کم سن اسامہ بن زید کو حضورؐ نے نامزد کیا تو وہ ایسا اہل ثابت ہوا کہ رومیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو حدود شام سے آگے قدم نہ رکھنے دیا۔ حضرت علیؓ اپنے کو عہدۂ قضا کے لیے اہل نہ سمجھتے ہوئے عذر و معذرت پیش کرتے رہے مگر حضورؐ نے انہیں قاضی یمن بنا کر بھیج دیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ویسا قاضی پھر نہیں پیدا ہوا۔

الغرض ایسے تمام مواقع پر صحابہ کی خاموشی یا تو اس لیے ہوتی تھی کہ حضورؐ خود ہی کسی کو نامزد فرما دیں یا اس لیے کہ روئے سخن کو بھانپ جانے والا اہل خود کھڑا ہو جائے۔ ان کو یہ ضرور خیال رہتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص

منشائے نبوی معلوم کیے بغیر خود کھڑا ہو جائے اور وہ غیر اہل (ان فٹ) سمجھ کر بٹھا دیا جائے یا کسی ایسے کام کا ذمہ لے لے جسے نبھا نہ سکے۔ بس اس سے زیادہ اور کوئی بات نہ تھی۔ نہ کوئی کام چور تھا نہ بزدل۔ یہ کون تسلیم کر سکتا ہے کہ جب مخبری کے لیے حضرت زبیر کھڑے ہوئے تو سارے صحابہ حضرت علیؓ سمیت بزدل ہو گئے تھے یا جب ابن عبدود کے مقابلے کے لیے حضرت علیؓ آگے بڑھے تو سارے صحابہ مع حضرت زبیر ڈرپوک بن گئے تھے؟

غزوۂ بنی قُریظہ

اوپر آپ یہ پڑھ چکے ہیں کہ مدینے میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قُریظہ۔ یہ بھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ معاہدہ شکنی کی وجہ سے بنو قینقاع جلاوطن ہو کر شام کے علاقہ اذرعات میں آباد ہو گئے تھے اور جب بنو نضیر نے غدّاری کی تو جلاوطنی کے بعد یہ خیبر کے علاقہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ تیسرا قبیلہ بنو قریظہ کا تھا۔ یہ اب تک اپنے معاہدے پر قائم تھا اور انہیں امن وامان، دینی آزادی اور تمام طرح کے مساویانہ شہری حقوق حاصل تھے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے انہیں حُیَیّ بن اخطب نے اکسایا اور بہکایا اور غزوۂ خندق میں ان سبھوں نے علانیہ غداری اور عہد شکنی کر کے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ ان بنو قریظہ نے جہاں مسلمانوں سے معاہدہ کیا تھا وہاں یہ انصار کے حلیف بھی تھے۔ اس کے باوجود یہ اہل اسلام کا محاصرہ کرنے میں کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ رہے۔ بلکہ حملے کا راستہ معلوم کرنے کے لیے اپنا ایک شخص

اس قلعے تک بھی بھیجا جہاں مسلمان عورتیں اور بچے محفوظ تھے اور مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن حُیی بن اخطب کو اپنے ہاں پناہ دی۔ ان تمام تجربوں کے بعد فوجی، سیاسی، قومی اور ملکی نقطۂ نگاہ سے ان مارہائے آستین پر ایک منٹ کے لیے بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضور اکرمؐ اور تمام باتوں کو برداشت فرما سکتے تھے لیکن غداری و عہد شکنی حضورؐ کی نگاہوں میں اتنا بڑا اخلاقی جرم —— انفرادی نہیں بلکہ قومی جرم —— تھا کہ اس کی معافی نہیں دی جا سکتی تھی۔ وفائے عہد اخلاقی زندگی کی وہ بنیادی قدر ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد زندگی کے ہر شعبے سے امان و اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ سیاسی روابط، قومی تعلقات، تجارتی لین دین، ملکی آمد و رفت، سفارتوں کا مبادلہ، غرض ہر شے خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کسی کو دوسرے پر کسی معاملے میں بھی اعتماد نہیں رہتا اور امن و امان ایک دائمی بے چینی اور بے اطمینانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کاروبارِ حیات کس طرح جاری رہ سکتا ہے؟ اس لیے جو شخص یا قوم ایک بار اپنے عہد سے پھر جائے اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ حضورؐ تو مبعوث ہی ہوئے تھے اخلاقی اقدار قائم کرنے کے لیے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اخلاقی گراوٹ کی اس انتہا کو —— جس کا مظاہرہ بنو قریظہ کی طرف سے ہوا —— حضورؐ گوارا فرما لیتے۔ ایسے غدار یقیناً ایسی عبرت ناک سزا کے مستحق ہیں جو دوسرے بدنیتوں کی آنکھیں کھول دے اور ہر شخص اس حقیقت کو سمجھ لے کہ اس اخلاقی گراوٹ —— قومی عہد شکنی و غداری —— کا یہ انجام ہوتا ہے۔

غزوۂ احزاب سے مدینے واپس تشریف لاتے ہی حضورؐ نے حکم دیا کہ کوئی مسلمان اپنے ہتھیار نہ اتارے بلکہ سارے سر فروش بنو قریظہ کی طرف روانہ

ہو جائیں۔ مسلمان حکم کے بندے تھے۔ فوراً کوچ کر گئے اور بنو قریظہ کو محاصرے میں لے لیا۔

اس حالت میں اگر بنو قریظہ شرافت اور اظہارِ ندامت سے کام لیتے تو عجب نہیں کہ رحمۃ للعالمین کا جذبۂ عفو و کرم انہیں معافی دے دیتا۔ مگر انہوں نے بڑی کج خلقی برتی۔ اکڑ دکھائی اور حضورؐ کی شان میں بڑے گستاخانہ کلمات نکالے۔ مسلمان انہیں تقریباً ایک ماہ گھیرے میں لیے رہے، اور آخر کار بنو قریظہ عاجز آ گئے، اور مصالحت کی درخواست پیش کی اور حضورؐ کی خدمت میں کہلوا بھیجا کہ ہمارے سابق حلیف ابو لبابہؓ کو گفتگوئے مصالحت کے لیے بھیج دیجیے۔

جناب ابو لبابہؓ کو جہاں مسلمانوں کے جوش کا اندازہ تھا وہاں وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ حضورؐ کی نگاہوں میں معاہدہ شکنی اور غداری کتنا سنگین جرم اور اس کی کیا عبرت ناک سزا ہو سکتی ہے۔ جب وہ بنو قریظہ کے پاس پہنچے تو بنو قریظہ نے ان سے نجی طور پر دریافت کیا کہ مسلمان ہمارے ساتھ کس قسم کے سلوک کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ابو لبابہؓ نے اشارے سے بتایا کہ: تم سب گردن زدنی ہو۔" ابو لبابہؓ نے بتانے کو تو بتا دیا، لیکن فوراً ہی انہیں شدید ندامت ہوئی کیونکہ انہیں اولاً تو یہ بتایا ہی نہیں گیا تھا کہ فی الواقع ایسا ہو گا۔ دوسرے اگر برسبیل تذکرہ یہ کہا بھی گیا ہو کہ یہ سب گردن زدنی ہیں تو گفت و شنید سے پہلے انہیں اس کے اظہار کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اس طرح کی بے محل باتوں کے اظہار کی عادت ہو تو ہر وقت یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ کبھی فوجی و سیاسی راز افشا ہو جائے اور پوری قوم کو ذرا سی غلطی کی وجہ سے سخت نقصان اٹھانا پڑے۔ بہر حال اس غلطی کا حضرت ابو لبابہؓ کو اس شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ وہ اسی وقت

وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ندامت میں ڈوبے ہوئے سیدھے مسجدِ نبوی میں آئے اور ایک ستون سے اپنے آپ کو باندھ لیا اور یہ عہد کر لیا کہ: جب تک اللہ تعالیٰ میری اس غلطی کو معاف نہ کر دے اور حضورؐ خود اپنے ہاتھوں سے مجھے نہ کھولیں میں اسی طرح بندھا رہوں گا۔" صرف نماز باجماعت یا حاجت ضروریہ) کے وقت ابولبابہؓ اپنے آپ کو کھول لیتے تھے، باقی اوقات میں بندھے رہتے تھے۔ ایک یا دو ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ آخر ادھر ندامت و توبہ اپنے اوج کمال پر پہنچی اور اِدھر معافی و رحمت کا دروازہ بھی اپنی بھرپور وسعتوں کے ساتھ کھُل گیا۔ حضورؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ابولبابہؓ کی رسی کھول دی۔ مسجد نبوی میں یہ ستون اب بھی موجود ہے جس پر اسطوانۃ ابی لبابہ لکھا ہوا ہے۔ ابولبابہؓ کے ایمان، ندامت، توبہ اور قبولِ توبہ کے صحیح مقام کا اندازہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون کر سکتا ہے؟ توبہ کا یہ طریقہ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ جامد فقیہہ کے نزدیک تو ایک "بدعت" ہے جو ابولبابہؓ نے عین عہدِ نبوت میں اپنی طرف سے پیدا کی تھی مگر خدا صرف ظاہری رسموں کو نہیں دیکھتا۔ وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ کرنے والا کس دل سے کر رہا ہے:

تو ز سرمستاں قلاوُزی مجو — جامہ چاکاں را چہ فرمائی رفو

در حقِ او مدح و در حقِ تو ذم — در حقِ او شہد و در حقِ تو سم

خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ ترست — ایں خطا از صد صواب اولیٰ ترست

ابولبابہؓ کے بعد سعد بن معاذؓ

بہرحال ابولبابہؓ تو درمیان سے ہٹ گئے اور خود یہود بنی قریظہ کی خواہش کے مطابق حضرت سعد بن معاذؓ کو فیصلے کے لیے ثالث بنایا گیا۔

یہ وہی سعدؓ ہیں جو چند دنوں پہلے غزوۂ خندق میں زخمی ہو گئے تھے لیکن ابھی زندہ تھے۔ یہ بھی بنو قریظہ کے حلیف تھے اور انہیں امید تھی کہ یہ بڑی رعایت سے کام لیں گے۔ لیکن انہوں نے ان یہود کے بارے میں جو فیصلہ کیا وہ الہٰی کی آسمانی کتاب کے مطابق تھا۔ حضورؐ نے بھی اس کی تصویب فرمائی اور کہا کہ تمہارا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق ہوا۔ کتاب استثنا کے بیسویں باب کی دسویں آیت ملاحظہ ہو۔ اس کا فیصلہ یہ ہے :

"(اے موسٰی) جب تو کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے جائے تو پہلے پیغام صلح دے۔ اگر وہ تسلیم کر لیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہو جائیں گے۔ ..... لیکن اگر صلح نہ کریں تو تو ان کا محاصرہ کر اور جب تیرا خدا تجھ کو ان پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کر دے۔ باقی بچے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مالِ غنیمت ہوں گی۔"

یہود کتابِ موسٰیؑ پر ایمان رکھنے کے دعویدار تھے اور یہ فیصلہ اسی کتاب کا ہے۔ اس کتاب کے مطابق ہی چار یا چھ سو یہود بنی قریظہ قتل کیے گئے اور تمام متروکات مسلمانوں کو بطور غنیمت ملے۔

لمحۂ فکریہ

بہ ظاہر اس خوں ریزی کو سنگدلی سے تعبیر کیا جائے گا لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ایک قوم کے لیے معاہدہ و میثاق پر قائم رہنا اتنی بڑی اہم اور بنیادی قدر ہے کہ اس کے بغیر امنِ عالم کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں

اس کی بار بار تاکید آئی ہے اور حضورؐ کی سیرت میں ہر نازک سے نازک قدم پر اس کا عملی نمونہ ملتا ہے۔ جو قوم اپنے قومی میثاق پر قائم نہ رہے اس پر زندگی کے کسی مرحلے میں بھی وثوق نہیں کیا جا سکتا اور اس کی سزا وُثاق (مضبوط گرفت اور بندھن) کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی قوم اپنے مفادِ عاجل کی خاطر میثاقِ الٰہی کو بھی توڑ دیتی ہے۔ بائبل کے دو حصوں کا نام عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید ہے اور قرآن بھی جدید ترین اور آخری میثاق (عہد نامہ) ہے خدا اور اس کے بندوں کے درمیان۔ خدا اور بندوں کے درمیان معاہدے کا مقیاس اور کسوٹی صرف یہ ہے کہ اس کے بندوں کے درمیان جو میثاق و معاہدہ ہوتا ہے وہ قائم رہتا ہے یا نہیں؟ جو قوم اس پر قائم نہ رہے اس کے متعلق بے تامل سمجھ لینا چاہیے کہ وہ میثاقِ الٰہی پر بھی قائم نہیں اس لیے کہ میثاقِ خداوندی ہی کا یہ حکم ہے کہ بندے اپنے باہمی معاہدوں پر قائم رہیں۔ جو لوگ مفاد پرستی اور موقعہ پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں اور عین وقت پر عہد شکنی کر کے دغا دیتے ہیں وہ دوسروں کے لیے اخلاقی گراوٹ کی ایک گندی مثال پیش کرتے ہیں اور گویا دوسروں کو بھی اسی اخلاق کُشی پر ابھارتے ہیں۔ قومی، سیاسی اور فوجی نقطۂ نگاہ سے اس جرم کی جو سزا ہو سکتی ہے یا ہونی چاہیے وہ اپنی جگہ ہے ہی۔ اخلاقی زاویۂ نظر سے بھی یہ اتنا سنگین جرم ہے جس کے لیے بڑی سے بڑی سزا بھی کم ہے۔ اور یہ سزا محض اس لیے نہیں کہ اس جرم کے مرتکب کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے بلکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ بے کردار لوگ اس سے عبرت حاصل کریں اور ایسی غیر شریفانہ حرکت کی جرأت نہ کریں جو رسولؐ آیا ہی تھا اخلاقی اقدار کو قائم کرنے کی غرض سے، وہ ایسی انسانیت کُش اور اخلاق سوز حرکت کو اپنی کمال

رحمت و فراخدلی سے برداشت کر بھی لیتا تو سعدؓ بن معاذ نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی فیصلہ کیا بالکل صحیح کیا۔

جناب زینبؓ بنتِ جحش کا نکاح

اسی ۵ھ میں ایک اہم واقعہ نکاح زینبؓ کا ہے۔ زینبؓ بنتِ جحش حضورؐ کی پھوپھیری بہن تھیں۔ حضورؐ نے ان کا نکاح زید بن حارثہؓ سے کر دیا۔ حضرت زیدؓ پہلے حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے اور آپؓ ہی نے زیدؓ کو حضورؐ کے حوالے کر دیا۔ حضورؐ نے زیدؓ کو آزاد کر کے اپنا متبنّٰی (منہ بولا فرزند) بنا لیا جس کی وجہ سے یہ زیدؓ بن محمدؐ کہے جاتے تھے۔ حضورؐ کا بڑا منشا یہ تھا کہ آزاد و غلام کا فرق بتدریج مٹا دیا جائے۔ عرب کی ثقافت میں قیدی کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی اسے برابری کا درجہ نہ دیا جاتا تھا۔ حضورؐ نے اس دھبے کو یوں مٹایا کہ اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ کا نکاح جناب زیدؓ سے کر دیا۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد دونوں میاں بیوی میں کش مکش شروع ہو گئی اور یہ کش مکش یہاں تک بڑھی کہ زیدؓ طلاق دینے پر آمادہ ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا (جسے قرآن نے نقل کیا ہے) کہ:

امسک علیک زوجک واتق اللّٰہ۔ طلاق نہ دو اور تقوائے اللہ اختیار کرو۔

مگر نباہ نہ ہونے کی وجہ سے زیدؓ نے طلاق دے ہی دی۔ اس طلاق کے بعد زوجین نے خواہ کسی قدر سکون محسوس کیا ہو لیکن ایک عورت کے لیے نیک نامی کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں جناب زینبؓ کے لیے یقیناً ایک خلش اور

دل شکنی کا پہلو موجود تھا۔ محض اس دل شکنی کو دور کرنے کے لیے (بعد عدت) حضورؐ نے زیدؓ ہی کی معرفت جنابِ زینبؓ کو پیغامِ نکاح دیا جسے زینبؓ نے انتہائی فخر و مسرت کے ساتھ منظور کر لیا۔

اس نکاح نے سیرتِ نبوی کا ایک خاص کردار پیش کیا ہے اور بڑی اہم خصوصیتوں کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کے چند نکات سن لیجیے:

۱۔ عرب جاہلیت میں متبنّیٰ (لے پالک یا منہ بولے فرزند) کو حقیقی و صلبی فرزند کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کی بیوی کو حقیقی بہو کی طرح تصوّر کیا جاتا تھا اور حقیقی بہو کی طرح محرّمات میں شمار کیا جاتا تھا یعنی جس طرح حقیقی بہو کے ساتھ (فرزند کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد) نکاح حرام ہے اسی طرح اس "مجازی بہو" سے نکاح بھی ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ حضورؐ کے اس اقدام سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ متبنّیٰ صلبی و حقیقی فرزند نہیں ہو سکتا اور اس لیے اس پر رشتے اور وراثت وغیرہ کے وہ احکام جاری ہی نہیں ہو سکتے جو حقیقی فرزند کے ساتھ وابستہ ہیں۔

۲۔ اس میں ایک غلط عقیدے کی اصلاح بھی ہے۔ یعنی جب اولادِ آدم اور ہم جنس ہونے کے باوجود منہ بولا فرزند کبھی حقیقی فرزند نہیں ہو سکتا تو کوئی فرزندِ آدم خدا کا فرزند کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ نہ آدمی جنسِ خدا سے ہے اور نہ خدا جنسِ آدم سے ہے۔ عیسائیوں کے ابنیتِ مسیح کے عقیدے پر حضورؐ کے اس اقدام سے خاصی زد پڑتی ہے۔ اس لیے عیسائی حضرات حضورؐ کے اس اقدام سے بہت ناراض ہیں اور اس واقعے کو وہ اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عقل و نقل کسی لحاظ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ ان کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے جنابِ زینبؓ

کو کہیں دیکھ لیا اور دل پر قابو نہ رہا۔ العیاذ باللہ۔ سوچنے کی بات ہے جناب زینب رضؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ دیکھی بھالی تھیں۔ اگر حضورؐ کی خواہش ہوتی تو اسی وقت نکاح فرما لیتے جب کہ وہ کنواری تھیں اور حضورؐ کے پیغامِ نکاح کو جناب زینبؓ اور ان کا سارا خاندان سو جان سے منظور کر لیتا۔ حضورؐ کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ پہلے اپنے لے پالک فرزند سے اس کا نکاح کرا دیں اس کے بعد خود نکاح فرما کر قوم سے یہ طعنہ سنیں کہ محمدؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا؟ آخر اس "بدنامی" میں حضورؐ کو کیا لطف آسکتا تھا؟ اور اس "طعن و بدنامی" کے بغیر زید سے پہلے خود نکاح کر لینے سے حضورؐ کو کیا چیز مانع تھی؟

۲۔ حضورؐ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زیدؓ زینبؓ کو طلاق دیں اس لیے حضورؐ نے زیدؓ سے فرمایا کہ:

امسک علیک زوجک واتق اللہ۔ ۳۳ : ۳۷ — اے زید اپنی بیوی کو روکے رکھو (یعنی طلاق نہ دے) اور اللہ کا تقویٰ اختیار کر۔

حضورؐ یہ سمجھ رہے تھے کہ زینبؓ نے میرے ہی کہنے سے زید سے نکاح کیا ہے۔ اس لیے طلاق کے بعد زینبؓ کی دل شکنی کی تلافی کی شکل صرف یہی ہو سکتی ہے کہ میں ان سے نکاح کر لوں۔ مگر حضورؐ کے دل میں ایک خطرہ یہ گردش کر رہا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ محمدؐ نے اپنی بہو سے نکاح کر لیا۔ عوام کے طعن کا خوف حضورؐ کو دامنگیر تھا۔ گویا ایک اندرونی کش مکش حضورؐ کے اندر یہ تھی کہ حضورؐ یہ تو سمجھتے تھے کہ لے پالک فرزند کی بیوی حقیقی بہو نہیں۔ اس سے نکاح کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اس وقت زینبؓ کی کبیدہ خاطری دور کرنے کے لیے اور متبنیٰ اور حقیقی فرزند کا فرق واضح کرنے کے لیے یہ نکاح ضروری ہے لیکن رواجِ عرب اور عوام کی بے جا چہ میگوئی کا اندیشہ حضورؐ کو اس اقدام سے روک رہا تھا۔

گویا دو قدروں میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ ایک طرف تھی عوام کی رعایت، دلداری اور بظاہر بے ضرورت فتنہ وطعن سے بچنے کا جذبہ۔ اور دوسری جانب زینبؓ کی دلداری نیز حقیقی اور لے پالک فرزند کے فرق کا اظہار تھا۔ حضورؐ اس کشمکش کو چھپائے ہوئے تھے اور عوام کی رعایت کا رجحان رکھتے تھے۔ اور خدا یہ چاہتا تھا کہ ایک ضروری حقیقت کو واضح کرنے کے لیے عوام کے طعن کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ عوام کی خشیت پر خشیتِ الٰہی بہر حال مقدم ہے خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ ابنیتِ مسیح کے ایک غلط تصور کی بھی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کو قرآن پاک یوں بیان فرماتا ہے:

..... وتخفی فی نفسك ما اللّٰه مبديه وتخشى الناس واللّٰه احق ان تخشاه ..... (۳۳ : ۳۷)	..... اے رسول تم اپنے دل میں وہ چیز چھپا رہے تھے جسے اللّٰہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور تم عوام سے ڈر رہے تھے حالانکہ اللّٰہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو .....

گویا حضورؐ نے بحکمِ الٰہی یہ اخلاقی قدر قائم کی کہ عوام کی رعایت اگرچہ کچھ کم ضروری نہیں لیکن اگر ایک سچی حقیقت کو عملاً یا قولاً ظاہر کرنا پڑے تو عوام کی رعایت ضروری نہیں رہتی۔ متبنّٰی کو حقیقی فرزند کا درجہ دینے سے رشتہ و وراثت وغیرہ کے قوانین پر غلط اثر پڑتا ہے اس لیے ضروری تھا کہ صدیوں کے اس جمے ہوئے خیال کی پوری عملی تردید کر دی جائے۔ قرآن نے حضورؐ کے اس اقدام کی مصلحت یہی بتائی ہے کہ:

زوجنكها لكي لا يكون على	تمہیں اس سے بیاہ دیا تاکہ منہ بولے

المومنین حرج فی ازواج ادعیائھم ..... (۳۳: ۳۷)
فرزندوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں سلمانوں پر کوئی تنگی باقی نہ رہے۔

۴۔ نکاحِ زینبؓ کے واقعے کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ صرف الٰہی کے لیے زوجنکھا کا لفظ آیا۔ یعنی اے رسول ہم نے تمہیں اس سے بیاہ دیا یعنی زینبؓ سے نکاح کو جائز قرار دیا تاکہ مسلمانوں پر یہ مسئلہ واضح ہو جائے کہ منہ بولے فرزند کی بیوی حقیقی بہو نہیں ہوتی کہ اس سے نکاح حرام ہو۔

۵۔ ایک اور خصوصیت اس واقعے میں یہ بھی ہے کہ تمام صحابہؓ میں تنہا زیدؓ ہی وہ شخص ہیں جن کا نام قرآن مجید میں آیا ہے:

فلما قضی زید منھا وطرا
جب زید کا دل زینب سے بھر چکا

۶۔ ایک بڑا ہی اہم مسئلہ اس واقعے میں یہ ہے کہ فرمانِ رسول کی حدود کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ سورۂ احزاب کے پانچویں رکوع میں نکاح زینبؓ کے تمام ضروری تفصیلات موجود ہیں۔ اس کے شروع کی دو آیات خاص طور پر قابلِ غور ہیں:

وَمَا كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهُمُ الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا ٥ واذ

کسی مومن مرد و زن کو جب کہ اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کر دے کوئی اختیار ان کے اپنے معاملے میں بھی باقی نہیں رہتا۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے صریح گمراہی میں پڑ جائے گا۔ یاد کرو جب اے رسول، تم زید سے جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور خود تم نے

تقول للذی انعم اللہ علیہ و انعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ (۳۳/۳۷،۳۶)	جسے اللہ نے بھی انعام کیا یہ کہہ رہے تھے اپنی بیوی کو روکے رکھو (طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر۔

پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرمانِ نبوی کو رد کرنے کا اختیار کسی مسلمان کو نہیں اور اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے کہ:

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت و یسلموا تسلیماً۔	اے رسول تمہارے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک تمہیں اپنے اختلافی معاملات میں حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ پوری طرح سرِتسلیم خم کر دیں۔

اس سے بھی زیادہ واضح آیت یہ ہے کہ:

النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم۔	نبی مسلمانوں کا حقدار خود ان کی اپنی ذات سے بھی زیادہ ہے۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ، جناب زیدؓ سے فرما رہے ہیں کہ: اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔ اللہ سے ڈر۔" بایں ہمہ فرمانِ نبوی جناب زیدؓ اپنی بیوی (جناب زینبؓ) کو طلاق دے دیتے ہیں اور اس نافرمانی پر نہ خدا کوئی نوٹس لیتا ہے نہ اس کا رسول۔ بلکہ ان کے لیے انعم اللہ علیہ و انعمت علیہ (اس پر اللہ اور اس کے رسول دونوں نے انعام کیا) نازل ہوتا ہے۔ پہلی آیت میں ہے کہ فرمانِ رسول کو ٹالنے کا کسی مسلمان کو اختیار ہی نہیں اور یہ نافرمانی سخت گمراہی ہے۔ مگر اس سے اگلی آیت میں ہے طلاق سے روکے جانے

کے باوجود زید نے طلاق دیدی اور پھر زید منعم علیہ ہوئے۔ اس تناقض کو کس طرح دور کیا جائے؟ یہ ہے بڑا اہم سوال جس کے حل سے اطاعت رسول کی حدود متعین ہو سکتی ہیں۔

جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ حضورؐ کی کئی حیثیتیں ہیں اور ان کے احکام بھی جدا جدا ہیں۔ حضورؐ کی چار حیثیتیں بہت واضح ہیں:

ایک ہے رسول کی حیثیت۔ اس حیثیت سے حضورؐ صرف احکام وحی (قرآن) پہنچاتے ہیں۔ اس کی اطاعت فرض ہے۔ نہ فقط مسلمانوں پر بلکہ خود رسول پر بھی۔ واتبع ما اوحی الیک۔

دوسری حیثیت ہے امیر کی۔ اس حیثیت سے حضورؐ جو بھی حکم دیں گے اس کی اطاعت فرض ہے۔

تیسری حیثیت ہے قاضی یا جج کی۔ اس حیثیت سے بھی حضورؐ کا ہر فیصلہ تسلیم کرنا فرض ہے۔

چوتھی حیثیت ہے بشر کی۔ اس حیثیت سے حضورؐ جو کچھ فرمائیں وہ مشورہ ہوتا ہے خواہ امر ہی کے صیغے سے ہو۔ اول الذکر تینوں حیثیتوں میں حضورؐ کے فرامین کی اطاعت فرض ہے اور اس کا منکر مسلمان نہیں رہ سکتا۔ لیکن چوتھی حیثیت کی بات کو نہ ماننے والا مسلمان ہی رہے گا کافر نہیں ہوگا۔ اس کی بہت سی نظیریں ہمیں کتاب و سنّت میں ملتی ہیں:

(الف) میدانِ بدر میں حضورؐ نے ایک جگہ کیمپ لگانے کا حکم دیا۔ حباب بن منذر نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ کیا یہ جگہ وحی سے متعین کی گئی ہے؟ فرمایا نہیں۔ عرض کیا تو پھر یہ جگہ مناسب نہیں۔ اس کی بجائے فلاں جگہ زیادہ مناسب ہے۔ حضورؐ نے اپنی بات واپس لے لی اور حباب کی رائے پر عمل کیا گیا۔

(ب) حضورؐ نے لوگوں کو مدینے میں کھجوروں کے جوڑے ملاتے دیکھا تو اس سے روکا یا ناپسند فرمایا۔ اس سال پھل کم آئے۔ لوگوں نے شکایت کی تو حضورؐ نے اپنی بات واپس لے لی۔

(ج) حضرت مغیثؓ جناب بریرہؓ کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ گلی گلی روتے پھرتے تھے۔ حضورؐ نے بریرہؓ سے فرمایا کہ: تم مغیثؓ سے شادی کر لو۔ انہوں نے عرض کیا: اتامرنی؟ کیا حضورؐ حکم دیتے ہیں۔ فرمایا: نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں۔ عرض کیا: مجھے وہ بالکل پسند نہیں۔

(د) اوس بن صامت نے اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ سے ظہار کیا۔ خولہ نے حضورؐ سے مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا کہ طلاق ہو گئی۔ یہ فرمان رواج عرب کے مطابق تھا اور اس وقت تک اس بارے میں کوئی قرآنی حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ خولہ نے کہا: یارسول اللہ میرے شوہر نے طلاق کا لفظ تو زبان سے نکالا نہیں تھا۔ اس نے اپنی ماں سے تشبیہ دی ہے۔ میں اس کی ماں کیسے بن سکتی ہوں جو اس پر حرام ہو جاؤں۔ میں نے اسے جنا نہیں۔ اسے تو اس کی ماں نے جنا ہے۔ خولہ جھگڑتی رہیں۔ آخر وحی الٰہی نازل ہوئی کہ خولہ ٹھیک کہتی ہے۔ یہ اوس کی ماں کی طرح حرام نہیں۔ مگر اوس نے زبان سے بات بڑی نکالی ہے اس لیے اس کا فلاں طریقہ سے کفارہ ادا کرے — حضورؐ نے بحیثیت جج کے یہ فیصلہ نہیں دیا تھا۔

(ہ) صلح حدیبیہ کے موقعے پر چودہ سو مہاجرین و انصار نے صلح نامے کی دفعات سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے زیادہ جوش میں مکالمہ کیا۔ حضرت علیؓ کو حضورؐ نے حکم دیا کہ "محمد رسول اللہ" کو کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے تعمیل حکم نہیں کی۔ حضرت عمرؓ کو مکے جانے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ نے

عذر پیش کیا۔ حضورؐ نے اپنی بات واپس لے لی اور حضرت عثمانؓ کو بھیج دیا۔

(۶) اسی حدیبیہ کے موقعے پر صلح نامہ لکھے جانے کے بعد حضورؐ نے حکم دیا کہ: "سب لوگ اپنی اپنی قربانی کر لیں۔" لیکن ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ آخر جب ام سلمہؓ کی رائے سے خود حضورؐ نے اپنی قربانی کر لی تو دوسرے لوگوں نے بھی قربانیاں کیں۔

(۷) حضورؐ نے وفات سے چند دن پہلے فرمایا کہ: دوات قلم لاؤ، میں کچھ باتیں لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔ مگر کسی صحابی حتیٰ کہ حضرت علیؓ نے بھی اس حکم کی تعمیل نہ کی اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔

غرض ایسے بہت سے مواقع آئے ہیں جہاں صحابہ نے حضورؐ کی بات نہیں مانی یا حضورؐ کے فرمان سے اختلاف کیا اور آج دنیا کا کوئی صاحب عقل ان پر کفر کا فتوےٰ لگا کر اپنا ایمان سلامت نہیں رکھ سکتا۔

مسئلہ کچھ پیچیدہ نہیں سیدھی سی بات ہے۔ صحابہ بہ آسانی قرائن سے سمجھ لیتے تھے کہ حضورؐ کون سی بات بحیثیت رسول فرما رہے ہیں اور کون سی بحیثیت امیر۔ کون سی بحیثیت قاضی فرما رہے ہیں اور کون سی بات بحیثیت بشر کے بطور مشورہ ہے۔ اگر کہیں شبہ ہوتا تو حباب بن منذر یا بریرہؓ کی طرح دریافت کر لیتے تھے۔ ان میں ملکۂ تمیز موجود تھا۔ وحی، امر، قضا، اور رائے میں فرق کر لینا ان کے لیے دشوار نہ تھا۔ یہ دشواری تو ہمارے لیے ہے کہ اکثر روایات میں پس منظر نہیں ہوتا اور ہم ہر حدیث رسول کو ایک جیسا درجہ دے دیتے ہیں۔ اجتماعی اور انفرادی احکام میں فرق نہیں کرتے۔ وقتی اور مستقل حکم میں تمیز نہیں کرتے۔ وحی، امر، قضا اور مشورہ سب کو یکساں واجب التسلیم سمجھ

کر احکام استنباط کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس معاملے کو خود حضورؐ نے یوں صاف فرما دیا ہے کہ: ما امرتکم بشیءٍ من امور دینکم فخذوہ وما امرتکم من رأیی فانما انا بشر (رواہ مسلم) دینی معاملات میں میں جو کچھ حکم دوں اسے اختیار کرو اور جو بات میں اپنی رائے سے کہوں تو میں بھی ایک بشر ہوں (اس میں غلطی ہو سکتی ہے اور اس کا نہ ماننے والا منکرِ دین نہیں)۔

یہاں "رائے" کا مقابلہ "دین" سے کیا گیا ہے۔ یعنی وحی رسول، امرِ امیر اور قضائے قاضی کا تعلق تو دین سے ہے اور اس کو نہ ماننے والا مسلمان ہی نہیں رہ سکتا۔ مگر رائے بشری دین سے متعلق نہیں اور اسے نہ ماننے سے اگر کوئی خارج از اسلام ہو سکتا تو سب سے پہلے خود حضورؐ ان لوگوں کو خارج از اسلام قرار دیتے جنہوں نے (اوپر کی مثالوں میں) حضورؐ کی رائے سے اختلاف کیا یا وہ رائے نہ مانی۔

(۷) کہنا یہ تھا کہ حضرت زیدؓ کو حضورؐ نے جو امسک علیک زوجک واتق اللہ ۔ (اپنی بیوی کو روک کے رکھو اور خدا کا خوف کرو) فرمایا وہ نہ وحی رسالت تھی، نہ امرِ امیر اور نہ قضائے قاضی ۔ وہ صرف ایک بشری مشورہ تھا۔ مشورہ دینے کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ ماننے اور نہ ماننے دونوں کا اختیار حاصل ہے۔ جناب زیدؓ نے اگر حضورؐ کا مشورہ نہ مانا تو نہ خدا کی نافرمانی ہوئی نہ رسول کی ۔ وہ اسی طرح انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ باقی رہے جس طرح پہلے تھے۔

اگر اجازت ہو تو ایک بات اور بھی عرض کر دوں ۔ رسولؐ کا ہر مشورہ واجب التسلیم کیسے ہو سکتا ہے جب کہ خود خدا کا مشورہ بھی واجب الاطاعت نہیں۔ خدا نے مسافر اور مریض کے لیے روزہ قضا کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی یہ فرمایا

کہ و ان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون سفر و مرض میں (بشرط عدم نقصان) اگر روزہ رکھ لو تو بہتر ہے بشرطیکہ تم سمجھو۔ یہ خدا کا مشورہ ہے امر نہیں۔ اگر کوئی مسلمان خدا کے اس مشورے پر عمل نہ کرے جب بھی وہ مسلمان ہی رہے گا۔

بہرحال سیدہ زینبؓ بنت جحش کا مطلقۂ زید ہو کر بھی ام المومنین بننے کا شرف حاصل کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں جسے محض سرسری نگاہ سے دیکھا جائے اور ایک بات تو تحت حیرت میں ڈالتی ہے کہ ان کا نکاح حضورؐ سے ۵ھ میں ہوا اور ان کی رحلت ۲۰ھ میں ہوئی۔ گویا یہ چھ سال سے کچھ زیادہ حضورؐ کے ساتھ رہیں۔ اور حضورؐ کے بعد کم و بیش نو سال زندہ رہیں۔ لیکن حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ ان سے کوئی روایت مروی نہیں۔ حضرت خدیجہؓ تو روایت کے دور سے پہلے ہی مکے میں وفات پا چکی تھیں۔ ام المومنین زینبؓ بنت خزیمہ صرف تین ماہ زندہ رہیں۔ لہٰذا ان دونوں سے کسی روایت کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن زینبؓ بنت جحش سے کسی ایک روایت کا بھی نہ ہونا ہر صاحب عقل کو حیرت میں ڈالے گا۔ اور اس سے ہم صرف ایک ہی نتیجہ نکال سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جہاں ہزاروں جھوٹی روایتیں وضع ہوئیں وہاں بہت سی صحیح روایتیں درج ہونے سے رہ بھی گئیں۔

متفرقات

ظہار، حجاب[1]، لعان اور تیمم کے احکام اسی سال نازل ہوئے اور اسی سال صلوٰۃ الخسوف (چاند گرہن یا سورج گرہن کے وقت کی نماز) کا آغاز ہوا۔

---

(۱) پردے اور اس کی حدود کے متعلق ماہنامہ ثقافت ماہ جنوری و مئی ۱۹۶۰ء دیکھیے۔

غزوۂ بنولحیان سنہ ۶ھ

اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ قبیلۂ عضل وقارہ کی درخواست پر حضورؐ نے دس مبلّغین بھیج دیے تھے۔ ان لوگوں نے سخت غدّاری کی اور مبلّغین پر حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا۔ دو شخص زید بن دثنہؓ اور خُبیبؓ بن عدی کو زندہ گرفتار کر کے بعد میں بڑی بے دردی سے قتل کیا۔ ہم اوپر کئی جگہ بتا چکے ہیں کہ غدّاری و فریب ایسی انسانیت کُش حرکت ہے جس کے ہوتے ہوئے اخلاقی قدریں زندگی کے کسی گوشے میں باقی نہیں رہ سکتیں اور یہ جرم قطعاً قابلِ درگزر نہیں، نہ اخلاقاً نہ سیاستہً۔ عضل وقارہ کی غدّاری کسی طرح قابلِ معافی نہ تھی۔ اس لیے حضورؐ نے دو سو سواروں کے ساتھ جمادی اولاولیٰ سنہ ۶ھ کو بنولحیان کی طرف رُخ کیا۔ لیکن کوئی جنگ نہیں ہوئی کیونکہ مسلمانوں کی آمد کی خبر سن کر یہ سب پہاڑوں میں اس طرح چھپ گئے کہ تلاش کے باوجود نہ مل سکے اور حضورؐ وہاں سے مدینے واپس تشریف لے آئے۔

غزوۂ غابہ یا غزوۂ ذی قرد

کچھ دنوں کے بعد قبیلۂ غطفان کے سرغنہ عُیینہ بن حُصین نے چند سواروں کو ساتھ لے کر مدینے کی چراگاہ پر چھاپہ مارا۔ وہاں ایک غفاری اونٹوں کو اپنی حفاظت میں چرا رہا تھا۔ ان لٹیروں نے اس غفاری کو قتل کر دیا اور اس

کی بیوی کو گرفتار کر لیا اور اونٹوں کو ساتھ بھگا لے گئے۔ سلمہ بن اکوع نے جب یہ دیکھا تو مسلمانوں کو آواز دی اور خود بھی تعاقب میں دوڑ پڑے۔ حضورؐ نے خبر ملتے ہی سعدؓ بن زید کو چند سواروں کے ساتھ دوڑایا۔ بنو غطفان نے جب مسلمانوں کو آتا دیکھا تو بھاگ گئے۔ ان کا صرف ایک آدمی مارا گیا چند اونٹ اور کچھ چادریں ہاتھ آئیں۔ کوئی باقاعدہ جنگ نہیں پیش آئی۔

صلح حدیبیہ

مہاجرین کو مکے سے آئے ہوئے کوئی چھ سال ہو گئے تھے۔ بعض مہاجرین کے اہل و عیال ہنوز مکے ہی میں تھے۔ اس کے علاوہ اکثر مسلمانوں کے دل میں زیارت بیت اللہ کا شوق بھی چٹکیاں لے رہا تھا۔ گو مہاجرین مکے سے مستقل ہجرت کر کے مدینے میں آ گئے تھے۔ لیکن وطن کی یاد اتنی جلدی دل سے محو نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنا گھر بار، املاک، کھیتی، دوکان اور اہلِ کفر قرابتداروں کو چھوڑا تھا اور وطنیت کے بُت کو توڑا تھا، کعبے سے تو منہ نہیں موڑا تھا۔ بلکہ اس مرکزِ دین سے دُور ہونے کا تو شدید صدمہ تھا اور وہ اس قبلۂ عبادت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے تھے جس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کر رہے تھے اور جس کی زیارت اسلام کا چوتھا رکن ہے۔

اسی دوران میں حضورؐ نے خواب دیکھا کہ صحابہؓ کے ساتھ حضورؐ مناسکِ حج ادا فرما رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر آئندہ سال ظہور میں آنے والی تھی (جس کا ذکر آگے آئے گا)۔ تاہم زیارتِ بیت اللہ کا شوق حضورؐ پر اور تمام صحابہ پر

اس درجے غالب ہوا کہ سب کے سب سفرِ مکّہ کے لیے رختِ سفر باندھ کر تیار ہو گئے اور روانگی عمل میں آ گئی۔

یہ چودہ سو مہاجرین و انصار تھے جو عمرہ ادا کرنے کے شوق میں کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔ یکم ذی القعدہ سنہ ۶ھ کو روانگی ہوئی۔ مدینے سے چھ میل ذو الحلیفہ کے مقام پر حضورؐ نے اور تمام رفقاء نے عمرے کا احرام باندھا۔ مدینے کی طرف سے آنے والے حجاج کا میقات بھی ذو الحلیفہ ہے۔ احرام کے معنی ہیں حرام کر لینا۔ چونکہ احرام باندھتے ہی قتال، جدال، یا وہ گوئی وغیرہ حرام ہو جاتی ہے اس لیے اسے احرام کہتے ہیں۔ احرام ایک بے سلا کپڑا ہوتا ہے جسے جسم پر لپیٹ لیا جاتا ہے۔ یہ علامت ہے احرام کی تاکہ دور سے دیکھ کر سمجھ لیا جائے کہ یہ اپنے اوپر قتال و جدال وغیرہ کو حرام کر چکے ہیں۔ یہاں قربانی کے جانوروں کی گردن میں قلادے بھی ڈال دیے گئے تاکہ مزید اطمینان ہو جائے کہ ان آنے والوں میں کوئی جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا۔ صرف زیارتِ کعبہ اور ادائے عمرہ کی نیت ہے۔ اس سفر میں دستورِ عرب کے مطابق مسلمانوں کے پاس تلواریں بھی تھیں لیکن وہ سب نیام میں تھیں۔ یہ بھی ایک اعلان تھا کہ مسلمانوں کی حیثیت صرف زائرین کی ہے۔ مسلمان جا بجا پڑاؤ کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس کی خبر اہلِ مکہ کو ہو گئی۔ انہیں یہ تو یقین تھا کہ اہلِ اسلام چڑھائی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے صرف عمرہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ مسلمان ادائے عمرہ کی نیت سے مکے میں داخل ہوں۔ اس لیے انہوں نے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ خالد بن ولید (جو ہنوز اسلام نہ لائے تھے) ایک دستہ فوج لے کر کراع الغمیم روانہ ہو گئے۔ حضورؐ ابھی مقام عسفان میں تھے کہ خالد کے آنے کی خبر ملی۔ خالد کے دستے کو پیس کر رکھ دینا ان چودہ سو مہاجرین

وانصار کے لیے دشوار نہ تھا لیکن حضورؐ چونکہ صرف عمرے کا ارادہ رکھتے تھے اور ماہ حرام (ذی قعدہ) کی حرمت بھی قائم رکھنا چاہتے تھے اس لیے دستۂ خالد کا سامنا کرنا بھی گوارانہ فرمایا۔ چنانچہ حضورؐ نے داہنی طرف کترا کر ایک دوسرا کٹھن راستہ اختیار فرمایا۔ خالد نے دور سے مسلمانوں اور سواریوں کی اڑتی ہوئی گرد دیکھی اور اہل اسلام کی قوت و شوکت کا اندازہ کر لیا۔ فوراً واپس ہوئے اور اہل مکہ کو خبر دی کہ مسلمان عمیم کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ یہ مقام مکے سے نو میل پر ہے۔ حضورؐ کی اونٹنی (قصویٰ نامی) مقام حدیبیہ میں رُکی۔ حضورؐ اور تمام صحابہ وہیں اتر پڑے۔ حُدیبیہ دراصل ایک کنوئیں کا نام ہے جو مکے سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں کچھ آبادی بھی تھی اور یہ پورا علاقہ حدیبیہ ہی کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں چودہ سو صحابہ کے لیے ایک کنواں کیا کفایت کر سکتا تھا؟ پہلی ہی مرتبہ میں کنواں خالی ہو گیا اور پانی کی قلت محسوس ہوئی۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو دعا فرمائی جس کے بعد پھر پانی کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔

حدیبیہ میں قافلۂ زائرین کے پہنچنے کی خبر جب بنو خزاعہ کو ملی تو ان کے سردار بُدیل بن ورقاء چند آدمیوں کو لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہ لوگ اسلام نہیں لائے تھے لیکن مسلمانوں کے حلیف تھے اس لیے ان کی ہمدردیاں اہل اسلام کے ساتھ تھیں اور مسلمانوں کے یہ رازدار بھی تھے۔ بدیل نے آکر حضورؐ کو خبر دی کہ اہل مکہ نے بڑی تعداد میں جنگجو جوانوں کو جمع کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ ہرگز مسلمانوں کو مکے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ حضورؐ نے بدیل ہی کی معرفت قریش کو یہ پیغام بھیجا کہ: ہم لوگ لڑنے نہیں آئے ہیں۔ صرف عُمرہ ادا کر کے واپس چلے جائیں گے۔ متعدد جنگوں نے تمہیں یوں بھی کمزور کر دیا ہے (اس لیے ارادۂ جنگ ترک کر دو اور) ایک مدتِ معینہ کے لیے

معاہدۂ صلح کر لو۔ (اگر لڑوگے تو) خدا کی قسم جب تک میرے شانوں پر سر موجود ہے میں بھی اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نہ فرمادے۔"

بدیل نے مکّہ پہنچ کر جب قریش کو حضورؐ کا یہ پیغام سنانا چاہا تو چند جوشیلے عاقبت نااندیش بول اٹھے کہ: "ہمیں محمدؐ کا کوئی پیغام سننے کی ضرورت ہی نہیں۔" مگر سنجیدہ طبقے نے سکون سے یہ پیغام سنا اور کہا کہ: "یہ تو ہم جانتے ہیں کہ مسلمان عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔ لڑنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن اگر وہ زائرین کی حیثیت سے بھی مکّے میں داخل ہوئے تو سارا عرب ہمیں یہی طعنہ دے گا کہ مسلمان فاتحانہ و غالبانہ مکّے میں داخل ہو گئے۔ اور ہم یہ طعنہ نہیں سُن سکتے۔"

بدیل یہ جواب لے کر واپس ہو گئے اور اہل مکّہ نے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے لیے حلیس بن علقمہ کو حدیبیہ بھیجا۔ حلیس نے واپس آکر اسی قسم کی گفتگو کی جو بدیل نے کی تھی۔ مگر قریش کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ بنو ثقیف کے سردار عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا کہ: "اگر تم کہو تو میں خود جا کر محمدؐ سے گفتگو کروں۔ انہوں نے جو باتیں پیش کی ہیں وہ معقول ہیں۔" قریش نے عُروہ کو اپنا نمایندہ بنا کر حضورؐ کے پاس بھیجا۔ حضورؐ نے عُروہ سے بھی وہی باتیں فرمائیں جو بُدیل کی وساطت سے قریش کو کہلوائی تھیں۔ عُروہ نے حضورؐ کی باتیں سن کر کہا کہ: "اے محمدؐ! اگر تم قریش کو فنا کرو گے تو گویا اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قوم کو برباد کرو گے۔ اور اگر کہیں جنگ نے پانسہ پلٹا تو تمہارے یہ رفقا گرد کی طرح اڑ جائیں گے۔" ـــــ عُروہ کا یہ جملہ سن کر حضرت ابوبکرؓ کو تاؤ آگیا۔ فرمایا "او بدبخت! کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم لوگ رسول اللہؐ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟"

عُروہ نے کہا "اے ابوبکر! میری گردن پر تمہارا ایک احسان ہے جس کا بدلہ میں نے ابھی تک نہیں اتارا ہے۔ اس لیے میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ ورنہ تمہاری سخت کلامی کا مزہ چکھا دیتا۔"

عُروہ حضورؐ سے گفتگو کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بار بار حضورؐ کی ریش مبارک تک لے جاتا۔ حضورؐ کے پاس مغیرہ بن شعبہ کھڑے تھے۔ عروہ کی یہ حرکت انہیں سخت ناگوار گزری۔ کڑک کر بولے: "عروہ! اگر اب تیرا ہاتھ حضورؐ کی ریش مبارک تک آیا تو تیرا ہاتھ پھر واپس نہ جائے گا۔" عروہ نے کہا: احسان فراموش میرے احسان کو بھول گئے؟ (ایک موقعے پر چند مقتولین کا خوں بہا مغیرہ کی طرف سے عروہ نے ادا کیا تھا) ——— یہ عربی فطرت دورِ جاہلیت میں بھی تھی کہ نہ دوسرے کے احسان کو فراموش کرتے تھے نہ اپنے احسان کو بھلاتے تھے ——— عروہ نے ایک ہی موقعے پر دونوں جذبے کا اظہار کر دیا۔

عروہ کی گفتگو ناتمام سی رہی۔ وہ مکے میں آ گئے اور قریش سے کہا:

اے ابنائے قریش! میں نے نجاشی کا دربار بھی دیکھا ہے اور قیصرو کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ لیکن عقیدت، احترام اور پروانگی وادب کا جو منظر اس وقت دیکھ کر آرہا ہوں وہ کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ محمدؐ جب گفتگو کرتے ہیں تو سارے مجمعے پر سکوت طاری ہو جاتا ہے اور سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں۔ کوئی شخص محمدؐ کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ وضو کرتے ہیں تو ایک قطرہ بھی زمین پر گرنے نہیں دیا جاتا۔ سارا مجمع اسے اپنے چہرے اور سینے پر ملنے کے لیے ٹوٹ پڑتا ہے۔

محمدؐ کا تو لعاب دہن بھی زمین پر گرنے سے پہلے عقیدت مند

اپنے چہروں پر مل لیتے ہیں[1]" محمدؐ کے اصحاب میدان چھوڑ کر بھاگنے والے نہیں۔ اب تم جو مناسب سمجھو وہ کرو۔"

عروہ کی گفتگو سے قریش پر سناٹا چھا گیا اور ان کی قوتِ فیصلہ درہم برہم ہو گئی۔ کوئی فیصلہ کر چکنے سے پہلے ہی حضورؐ نے ایک دوسرے خزاعی خراش بن امیہ کو اپنی سواری کا اونٹ دے کر مکّے روانہ فرمایا۔ خراش ابھی اپنی بات بھی پوری نہ کر پائے تھے کہ ظالموں نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ سردار احابیش جلیس بن علقمہ نے انہیں پناہ دیدی اور خراش کی جان بچی۔ مگر ان ظالموں نے ان کے اونٹ کو ہلاک کر دیا۔

اس واقعے کے بعد قریش کے اسّی جوشیلے نوجوانوں کا ایک دستہ مسلمانوں سے جنگ چھیڑنے کے لیے کوہِ تنعیم سے اتر کر حدیبیہ کی وادی میں پہنچ گیا۔ لیکن

---

(۱) ممکن ہے اس وقت کچھ ایسے عقیدتمند بھی موجود ہوں جو غسالۂ وضو یا تھوک وغیرہ کو اپنے چہرہ جسم پر بطور تبرک مل لیتے ہوں۔ اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے گروؤں کے ساتھ اسی قسم کی ارادت کا اظہار کر لیتے ہیں لیکن یہ بات مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضورؐ جیسا نظافت پسند اسے خوشی سے گوارا کرے۔ ویسے خود میری بھی عقیدت یہی ہے کہ حضورؐ کے غسالۂ قدم کے ایک گھونٹ پر کونین کی دولت لٹا دوں۔ لیکن حضورؐ بھی اسے پسند فرمائیں گے یا نہیں یہ غور طلب ہے اور یہ بھی غور طلب ہے کہ حضورؐ کی پسند کو ترجیح دی جائے یا اپنے جذبۂ عقیدت کو۔ ممکن ہے یہ خود عروہ یا بعد کے راویوں کا اضافہ ہو یا بطور محاورہ استعمال ہوا ہو۔ ہماری زبان میں بھی "پاؤں دھو دھو کے پینا" کمالِ احترام و قدردانی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ آخر حضورؐ ہر روز وضو فرماتے تھے اور تھوک بھی پھینکتے ہوں گے۔ لیکن قریب ترین صحابہؓ سے اس نوع کے اظہارِ عقیدت کی پابندی نظروں سے نہیں گزری ہے۔ حد تو یہ ہے بعض صحابہ سے حضورؐ کا بول و براز فرد کر لینا بھی مروی ہے۔ ایسی تمام روایتیں ہمارے نزدیک محلِ نظر ہیں۔

حملے کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے محافظ دستے نے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ ان کا یہ اقدام فوجی نقطۂ نگاہ سے قابلِ معافی نہ تھا لیکن کچھ تو قربِ حرم کا احترام تھا اور کچھ ماہِ حرام کا پاس اور سب سے بڑھ کر رحمت کے تقاضے تھے اور صلح پسندی کا سچا جذبہ۔ اس لیے رحمۃ للعٰلمین نے ان سب کو معافی دے کر رہا کر دیا۔ قرآن نے ماہِ حرام میں حملہ آوروں کے جواب میں قتال کی اجازت دی ہے، وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتال کے موقعے نہیں تلاش فرماتے تھے بلکہ قتال کو روکنے اور صلح کو قائم کرنے کے بہانے ڈھونڈتے تھے۔ صحابہ میں قریشی نوجوانوں کی اس جسارت سے یقیناً جوشِ انتقام پیدا ہوا ہوگا لیکن جو رسول آیا ہی ہو انسانی اقدار کے قیام کے لیے، وہ کیونکر گوارا کر سکتا تھا کہ جذبۂ انتقام —— اگرچہ جائز اور جوابی ہو —— بلدِ حرام اور شہرِ حرام کی حرمت کو مجروح کرے! اگر ان حملہ آوروں کو قتل کر دیا جاتا تو یہ اس کے مستحق تھے لیکن اہلِ مکہ کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ ان مسلمانوں نے زائرین کا روپ تو دھار لیا ہے لیکن دراصل یہ قتال ہی کی نیت سے آئے ہیں۔ اور بظاہر ہمیں معاہدۂ صلح کا پیغام بھجوا رہے ہیں۔ بہرحال اس موقعے پر حضورؐ نے ان مجرموں کو معافی دے کر دینی و اخلاقی قدروں کی محافظت کا انتہائی بلند مظاہرہ فرمایا۔

سیدنا عمرؓ کا عذرِ مقبول

حضورؐ نے اتمامِ حجت اور مصالحت کی کوششِ مزید کے لیے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ: "قریش کے پاس اب تم جا کر بات کرو۔" حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ مجھ سے قریش کو انتہائی بُغض و عناد ہے کیونکہ میں نے دینی معاملات

میں ان کے ساتھ کبھی مداہنت و نرمی نہیں برتی ہے۔ علاوہ ازیں میری قوم (بنی عدی) کا کوئی ایسا آدمی بھی مکے میں موجود نہیں جو مجھے اپنی پناہ میں لے لے۔ میری رائے ہے کہ حضورؐ اس نامہ و پیام کا کام عثمانؓ سے لیں کیونکہ وہ بنوامیہ کے ایک معزز رکن ہیں اور بنوامیہ پر ان کا بڑا اثر ہے۔" حضورؐ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو پسند فرمایا اور سیدنا عثمانؓ کو مکے بھیج دیا۔

یہاں یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اگر محض جان کی قربانی پیش کرنا مقصود ہوتا تو نہ حضرت عمرؓ کو انکار ہوتا اور نہ کسی دوسرے صحابی کو۔ یہاں محض جان کی قربانی پیش کرنا یا اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا مقصود ہی نہ تھا مقصد تو تھا ایک کام کو بہتر طریق پر انجام دینا اور نتیجہ خیز طریقہ اختیار کرنا۔ یہاں عشق و محبت یا بہادری و بزدلی کا کوئی امتحان پیش نظر تھا ہی نہیں۔ یہاں صرف عقل و حکمت اور حسن تدبیر سے ایک کام انجام دینا تھا۔ حضرت عمرؓ کی معذرت نہ بربنائے بزدلی تھی نہ بربنائے نافرمانی۔ غزوۂ احزاب کے بیان میں ہم اس موضوع کی وضاحت کر چکے ہیں۔

دوسرا ضروری قابل غور نکتہ یہ ہے کہ رسول کی بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا ماننا فرض نہیں ہوتا اور نہ ماننے والا خارج از اسلام نہیں ہو جاتا۔ نکاح ام المومنین زینبؓ بنت حجش کی تفصیلات میں ہم اس نکتے کی پوری وضاحت کر چکے ہیں۔ اسے دیکھ لینا چاہیے۔

رسول اللہؐ اور بیت اللہ سیدنا عثمانؓ کی نظر میں

حضورؐ کے ارشاد کے مطابق سیدنا عثمان بن عفانؓ مکے تشریف لے گئے اور اپنے ایک قرابتدار اَبان بن سعید کے گھر ٹھہرے۔ جب اہل مکہ کو حضورؐ کا

پیغامِ مصالحت پہنچایا تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ: ہم محمدؐ اور اصحابِ محمدؐ کو ہرگز مکّے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ ہاں اگر تم خود عمرہ ادا کرنا چاہو تو کر لو۔" سیدنا عثمانؓ نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اوراقِ تاریخ پر ہمیشہ ابھرے ہوئے حروف میں ہیرے کی طرح چمکتا رہے گا۔ آپ نے فرمایا: یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں یہاں تنہا عمرہ وطواف کر لوں اور میرا کعبۂ حقیقت (صلی اللہ علیہ وسلم) بیت اللہ سے دور حدیبیہ میں بیٹھا رہے۔" اللہ اللہ۔ ظاہر بیں فقیہہ کی نگاہوں میں جناب عثمانؓ طوافِ کعبہ کے ایک بڑے ثواب سے محروم رہے مگر حقیقت بیں نگاہ میں اس ترکِ طواف کا ثواب، ثوابِ طواف سے کہیں زیادہ ہے۔

محمدؐ اور عثمانؓ کے درمیان روحانی وائرلیس لگا ہوا تھا۔ یہاں حدیبیہ میں بعض لوگ بولے کہ: عثمانؓ بڑے خوش قسمت ہیں۔ وہ کم سے کم عمرہ تو ادا کر ہی لیں گے۔" عثمانؓ کے نبض شناس پیغمبرؐ نے فرمایا: مجھے یقین نہیں کہ عثمانؓ میرے بغیر عمرہ وطواف کر لیں۔" صدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ عثمانؓ کو حقیقتِ کعبہ کا کیا علم تھا۔ قوم نے تو اس بیت اللہ کو بیت الاصنام بنا دیا تھا۔ یہ کعبۂ حقیقتؐ ہی تھا جس نے حقیقتِ کعبہ سے دنیا کو روشناس کرایا:

از جمالِ تو کعبہ شد قبلہ　　　　پیش ازیں ورنہ بود بت خانہ

قتلِ عثمانؓ کی افواہ اور بیعتِ رضوان

سیدنا عثمانؓ نے اہلِ مکّہ کو پیغامِ مصالحت دینے کے بعد واپسی کا ارادہ کیا تو روک لیے گئے۔ واپسی میں دیر ہو گئی تو افواہ پھیل گئی کہ عثمانؓ شہید

کر دیے گئے۔ حضورؐ نے یہ خبر سنتے ہی فرمایا: اگر ایسا ہے تو خون عثمانؓ کا قصاص لینا فرض ہے۔" یہ فرما کر ایک ببول کے درخت کے سائے میں تشریف لے گئے۔ اور آواز دی کہ: بایعوا علی الموت (مر دھڑ کی بازی لگانے پر بیعت کرو)۔ آوازِ رسولؐ کا سننا تھا کہ تمام صحابہ بیعت کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ اتنا اہم ہے کہ قرآن پاک نے ان تمام بیعت کرنے والوں کو رضائے الٰہی کی دائمی سند یوں عطا فرمائی کہ:

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونك تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم و اثابھم فتحا قریبا ۴۸:۱۸

اللہ ان تمام مسلمانوں سے راضی ہے جنہوں نے اس درخت کے نیچے (اے رسول) تمہاری بیعت کی۔ پھر اس نے ان کے دلوں کی بات (نیت و اخلاص) جان لی اور ان پر سکینت نازل فرمائی اور انہیں جلد آنے والی فتح سے سرفراز کیا۔

صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس بیعت (سودے) کو اتنی اہمیت دی کہ:

ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم ۴۸:۱۰

جو لوگ (اے رسول) تم سے سودا کر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں (تمہارا کیا) خدا کا ہاتھ تھا

خون عثمانؓ کی قدر و قیمت اللہ اور رسولؐ کی نگاہ میں

ذرا غور کیجیے۔ دنیا میں کسی کے خون کا قصاص لینے کے لیے بارگاہِ نبوت سے کبھی یہ اہتمام ہوا ہے؟ کس کی جان اتنی پیاری تصور کی گئی ہے جس کے قصاص کے لیے بیعت کرنے والوں کے حق میں خدا نے اپنی رضامندی کا غیر فانی پروانہ نازل کیا ہو؟ کس کی شخصیت اتنی اہم ہے جس کی حرمت کی خاطر جان کی بازی

لگانے والوں ہی کا نہیں بلکہ اس درخت کا ذکر بھی قرآن نے کیا ہو جس کے سائے میں جاں بازی کا معاہدہ ہوا تھا؟ کس ہستی کا خون اتنا قیمتی سمجھا گیا ہے کہ اس کا قصاص لینے والوں کی بیعت کو محض بیعتِ رسولؐ ہی نہیں بلکہ عین بیعتِ خدا سے تعبیر کیا گیا ہو؟ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ حضورؐ کو اس کا پورا اندازہ تھا کہ عثمانؓ مکے میں قتل نہیں کیے گئے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے یہ اہتمام کیوں فرمایا گیا؟ اس کی دو وجہیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے جوش و خروش کی اطلاع اہلِ مکہ کو مل جائے تاکہ اگر وہ جناب عثمانؓ کے ساتھ کسی قسم کی برائی کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس سے باز آجائیں۔ نیز وہ مسلمانوں کی طاقت کا اندازہ بھی کرلیں اور معاہدۂ صلح میں تامل نہ کریں۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ جناب عثمانؓ پر جو مصیبت آنے والی تھی اس کے بارے میں حضورؐ یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس نازک وقت میں مسلمان خونِ عثمانؓ کو ایسا ہی قیمتی سمجھ کر محافظت کریں اور ہر فردِ امت ان کا قصاص لینے کے لیے اسی طرح اٹھ کھڑا ہو جس طرح آج حضورؐ ہر ایک کو کھڑا کر رہے ہیں۔ مگر آہ خونِ عثمانؓ بڑی ہی بے دردی سے بہایا گیا۔ امت نے غفلت سے کام لیا جس کے خمیازے میں امت کو پھر کبھی امن و اتفاق دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ آج کون عثمانؓ کے بے دردانہ قتل پر آنسو بہانا ثواب سمجھتا ہے؟ آج کس جگہ ان کی بیگناہی و مظلومی کا ماتم کیا جاتا ہے؟ آج کہاں ان کے قاتلوں اور سازشیوں کو بدترین خلائق سمجھا جاتا ہے؟ سننے والے اپنے اپنے ایمان کا جائزہ لیں۔

مگر خوب ہوا جو حضرت عثمانؓ کے غم کو کوئی مذہبی حیثیت نہ حاصل ہوئی ورنہ ایک اور الگ فرقہ پیدا ہو جاتا جس کا مذہب صرف ماتمِ عثمانؓ رہ جاتا اور محض چند ایجاد کردہ رسموں پر نجات کا انحصار قرار پاجاتا۔

سیدنا عثمانؓ زندہ تھے

بیعتِ رضوان کی ایک عجیب امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ جب تمام صحابہ کی بیعت ہو چکی تو حضورؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے فرمایا کہ: "یہ میرا ہاتھ ہے اور یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اب میں عثمانؓ کی بھی بیعت لیتا ہوں۔" گویا حضورؐ نے اشاروں میں بتا دیا کہ عثمان زندہ ہیں۔ کیونکہ بیعت زندوں ہی کی لی گئی تھی اور لی جاتی ہے۔

یہاں یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ خدا نے رسول کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا۔ ید اللہ فوق ایدیھم اور آج بیعتِ رضوان کے وقت رسولؐ اپنے ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے رہا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ رومیؒ نے شاید ٹھیک ایسے موقعے کے لیے کہا ہے:

چوں قبولِ حق شود آں مردِ راست دستِ او در کارہا دستِ خداست

اس شرف کے واحد مستحق تھے بھی سیدنا عثمانؓ ہی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ: جس دن میں نے اسلام قبول کرتے ہوئے اپنا سیدھا ہاتھ رسول اللہؐ کے ہاتھ میں دیا اس دن سے کبھی میرا وہ ہاتھ میری شرمگاہ سے مس نہیں ہوا۔" غالباً یہی سبب ہے کہ اشاعتِ قرآن کا کام اسی مبارک ہاتھ سے لیا گیا۔ یہ "مصحفِ آسمانی" خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں مکمل ہو چکا تھا اور اسی کی نقول کی اشاعت کا کام حضرت عثمانؓ نے کیا۔ جناب عثمانؓ صرف "ناشرِ قرآن" ہیں۔ "جامعِ قرآن" قطعاً نہیں۔ بہرحال دستِ قدرت نے اشاعتِ قرآن کا کام دستِ عثمانؓ ہی سے لیا کیونکہ عثمانؓ کا ہاتھ رسولؐ کا ہاتھ، اور رسولؐ کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ دستِ او در کارہا دستِ خداست

حتی کنت یدہ التی یبطش بھا (حدیث قدسی)

صلح نامے کی کتابت

ابھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ حضورؐ یہ خوب جانتے تھے کہ عثمانؓ قتل نہیں ہوئے ہیں، اس کے باوجود افواہِ قتل پر بیعتِ سرفروشی لینے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہلِ مکہ کو مسلمانوں کے جوش و خروش کا اندازہ ہو جائے، اور وہ معاہدۂ صلح کرنے میں زیادہ تامل نہ کریں۔ فی الواقع اس کا یہی نتیجہ ہوا کہ جب قریش کو مسلمانوں کے اس جوش و خروش کا علم ہوا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے اور انہوں نے فوراً ایک زیرک اور معاملہ فہم شخص کو سفیر بنا کر حضورؐ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ تھے سہیل بن عمرو۔ اپنی طلاقتِ لسانی اور معاملہ فہمی کی وجہ سے وہ خطیبِ قریش کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ یہ حضورؐ کے پاس آئے اور دیر تک باہم گفتگو کے بعد صلح نامہ لکھا جانے لگا۔ اس تاریخی صلح نامے کے کاتب سیدنا علی بن ابی طالب تھے۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سہیل بن عمرو بولے کہ عرب کے دستور کے مطابق باسمک اللّٰھم لکھوایئے۔ حضورؐ نے فرمایا: جو سہیل کہتے ہیں وہی لکھو۔ حضرت علیؓ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کی بجائے باسمک اللّٰھم لکھ دیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا: لکھو ھٰذا ما قضٰی علیہ محمد رسول اللہ (یعنی اس صلح نامے پر اللہ کے رسول محمدؐ صاد کرتے ہیں)۔ سہیل بولے: اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے تو جھگڑا ہی کس بات کا تھا۔ اسے کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھوایئے۔" حضورؐ نے فرمایا: اسے کاٹ کر وہی لکھو جو سہیل کہتے ہیں۔"

سیدنا علیؓ چند سیکنڈ کے لیے عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے ایک طرف الامر فوق الادب اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ اور دوسری جانب الادب فوق الامر اپنی کشش دکھا رہا تھا:

خال او فتویٰ دہد از کعبہ در بتخانہ شو ۔۔۔ زلف او دعوی کند گر عاقلی دیوانہ شو

آخر جذبۂ اطاعت پر جذبۂ محبت و ادب غالب آ گیا۔ دوات قلم چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے الگ ہو گئے کہ: "رسول اللہ" کا لفظ کاٹنے کا کام مجھ سے نہ ہو گا" کون جانتا ہے کہ اس "نافرمانی" پر کتنی فرماں برداریاں قربان ہیں:

خوں شہیداں را ز آب اولیٰ تر است ۔۔۔ ایں خطا از صد صواب اولیٰ تر است

یہ بھی مقام غور ہے کہ جناب مرتضیٰؓ نے اسم الٰہی الرّحمٰن الرحیم کاٹنے میں ذرا تامل نہ کیا مگر محمدؐ کے لقب و منصب رسول اللہ کو قلمزد کرتے وقت ظاہری نافرمانی کی بھی پروا نہ کی۔ سچ ہے:

با خدا دیوانہ و با مصطفےٰ ہشیار باش

یہاں دوات بھی ہے، قلم بھی ہے، قرطاس (کاغذ) بھی ہے اور رسولؐ کا حکم بھی ہے مگر جذبۂ عشق و ادب کی وجہ سے ظاہری نافرمانی قابلِ ملامت نہیں بلکہ قابلِ ستائش ہے۔ اسی طرح حضورؐ کے آخری عین حیات میں جبکہ نہ دوات موجود تھی، نہ قلم اور نہ قرطاس، اگر دوسرا جاں نثار ظاہری نافرمانی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے ہدفِ طعن کیوں بنایا جائے خصوصاً جب کہ وہ ایک خدا لگتی بات بھی کہہ دیتا ہے کہ حسبنا کتاب اللہ (اللہ کی کتاب ہم سب کے لیے کافی ہے) اور اس جواب پر رسولؐ مطمئن ہو کر خاموش ہو جاتا اور زندگی کے بقیہ ایام میں پھر دوات قلم کاغذ لانے کی کوئی فرمائش کسی سے بھی نہیں کرتا؟

ادھر سیدنا علیؓ نے "رسول اللہ" کا لفظ کاٹنے سے انکار کر دیا، اور

اُدھر رسول اللہؐ کی نگاہوں سے حجابات اٹھ گئے۔ حضورؐ نے فرمایا: "اے علی! ایک دن تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آنے والا ہے"۔ چنانچہ جب سیدنا علیؓ اور جناب امیر معاویہؓ کے درمیان صلح نامہ مرتب ہونے لگا تو اس پر یہ لکھا تھا کہ: ھٰذا ما قاضی علیہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب جناب معاویہؓ نے کہا: اگر ہم آپ کو امیر المومنین تسلیم کرتے تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا تھا؟ سیدنا علیؓ کی زبان سے بے اختیار نکلا: صدق النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضورؐ نے سچ فرمایا تھا۔ دونوں معاملے یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اہل کفر اور اہل اسلام کے درمیان معاہدہ ہو رہا تھا اور یہاں دونوں جانب کلمہ گو مسلمان تھے۔ فرق صرف مرتبوں کا تھا۔

شرائطِ صلح

الغرض حضرت علیؓ کے انکار کے بعد حضورؐ نے خود لفظ "رسول اللہ" مٹا کر "بن عبداللہ" لکھ دیا، یا لکھوا دیا۔ اس کے بعد معاہدے کی مندرجہ ذیل دفعات لکھی گئیں:

۱۔ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔

۲۔ آئندہ سال آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس ہو جائیں۔ اپنے ساتھ صرف تلواریں لائیں جو نیام میں ہوں اور نیام تھیلے میں ہوں۔ اس اثناء میں قریش باہر چلے جائیں گے۔

۳۔ جو مسلمان اس وقت مکے میں ہیں انہیں مسلمان اپنے ساتھ واپس نہ لے جائیں بلکہ جو مسلمان اس وقت مدینے سے آئے ہیں ان میں سے بھی جو مکے میں رہنا چاہے اسے رہنے دیا جائے گا۔

۴۔ مکّے سے جو مسلمان یا غیر مسلم مدینے چلا جائے اسے واپس کر دیا جائے گا لیکن مدینے سے جو مسلمان مکّے آئے گا اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

۵۔ مسلمان اور قریش جس قبیلے کو چاہیں اپنا حلیف یا معاہد بنا سکتے ہیں۔

۶۔ فریقین امن و امان کے ساتھ رہیں گے اور دس سال تک یہ معاہدہ قائم رہے گا۔

اقدارِ معاہدہ کی عجیب محافظت

اس معاہدے میں اور تو جو کچھ تھا وہ تھا دفعات ۲ اور ۴ اس قدر لہجے حوصلہ شکن تھیں کہ مسلمان تڑپ اٹھے۔ ہر شخص اسے اسلامی اور قومی وقار کے سخت خلاف سمجھ رہا تھا۔ اس زخم پر نمک یوں پڑا کہ عین اسی معاہدے کے وقت مکّے سے ایک مسلمان بھاگتا، ہانپتا کانپتا اور فریاد کرتا ہوا حضورؐ کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنے جسم پر زخموں کے داغ دکھائے۔ زنجیروں میں جکڑے جانے اور ماریں کھانے کی دردناک داستان سنائی۔ مسلمان اس کی فریاد سن کر لرز اٹھے۔ اس وقت مسلمانوں کا جوش اور ولولہ ایسا تھا کہ ایک اشارے میں مکّہ خاک سیاہ ہو سکتا تھا لیکن اقدارِ انسانیت، امن پسندی، صلح جوئی، تحمل و بردباری اور ایثار و قربانی کا جو مظاہرہ آج حضورؐ کی طرف سے ہوا ہے اس کی نظیر تاریخ میں تلاش کرنا سب سے زیادہ ناکام کوشش ہوگی۔

یہ بھاگ کر آنے والا مظلوم کون ہے؟ یہ ہیں حضرت ابوجندلؓ۔ خدا کی شان دیکھیے۔ سہیل بن عمرو ان کے باپ ہیں جو کفارِ قریش کے نمائندے بن کر آئے ہوئے ہیں۔ اور ابوجندلؓ ان کے فرزند ہیں جو پکّے مومن ہیں۔ کوئی خوف اور کوئی لالچ ان کے ضمیر کو نہ خرید سکا۔ قید و بند میں رہے۔ زنجیروں میں جکڑے گئے۔ صبح و شام ماریں کھاتے رہے لیکن کوئی شے انہیں ایمان سے نہ ہٹا سکی۔

آج یہ مسلمانوں سے فریاد کرتے ہوئے بھاگ کر آئے ہیں اور امداد کے طالب ہیں۔ حضورؐ نے سہیل سے فرمایا کہ: ابوجندل کو ہمارے ساتھ جانے دو۔" سہیل بولے کہ: پابندی عہد کے مظاہرے کا یہی پہلا موقع ہے۔" حضورؐ نے فرمایا: ابھی نہ معاہدہ مکمل ہوا ہے نہ دستخط ہوئے ہیں۔ سہیل نے کہا: اگر ابوجندل واپس نہ کیا گیا تو ہمیں یہ معاہدہ ہی منظور نہیں۔

ابوجندل کو روکنے کے لیے اور بھی کئی حجتیں کی جاسکتی تھیں مگر معاہدے کا احترام تمام جذبات پر مقدم تھا۔ ابوجندل سے بصد حسرت فرمایا کہ "تم واپس چلے جاؤ۔ خدا تمہارے لیے کوئی بہتر سبیل نکال دے گا۔"

واہ رے ابوجندل کا جذبۂ اطاعت وایثارِ نفس۔ وہ صریحاً دیکھ رہے تھے کہ بھاگ کر آنے کے بعد پھر واپس جانا پہلے سے کہیں زیادہ کٹھن موت کے منہ میں جانا ہے مگر اطاعتِ رسولؐ کے جذبے نے ساری متوقع تکالیف جھیلنے پر آمادہ کر دیا۔ اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ حضورؐ کے اس فرمان پر بھی ابوجندل کا ایمان پختہ تھا کہ "اللہ تعالیٰ کوئی بہتر سبیل پیدا فرما دے گا۔" اور فی الواقع ایسا ہی ہوا۔

حضرت ابوجندلؓ کا حیرت انگیز کارنامہ

حضرت ابوجندل جانے کو تو واپس چلے گئے مگر مسلمانوں کو بیتاب کر گئے اور خود مکے میں قید کر دیے گئے۔ اور ایک شخص ان پر نگراں مقرر کر دیا گیا تاکہ وہ کہیں بھاگنے نہ پائیں۔ جناب ابوجندل کو موقع غنیمت ملا۔ انہوں نے اپنے نگراں کے سامنے اسلام پیش کیا اور کچھ ایسے ڈھنگ سے تبلیغ کی کہ وہ بصد خوشی اسلام لے آیا۔ قریش کو معلوم ہوا تو انہوں نے اس نگراں کو بھی قید میں ڈال

دیا اور ان دونوں پر ایک اور آدمی کو نگراں مقرر کر دیا۔ اب ان دونوں نے مل کر تبلیغ شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اسلام لے آیا۔ الغرض ایک سال کے اندر حضرت ابوجندل اور ان کے ساتھیوں نے تین سو کافروں کو مسلمان کر لیا۔

سیدنا عمرؓ کا جوشِ دینی اور تیز گفتگو

سیدنا ابوجندل کے واپس جانے سے سارے مسلمان تڑپ اٹھے۔ جنابِ عمرؓ سے نہ رہا گیا۔ بے تاب ہو کر حضورؐ کے پاس آئے اور یوں مکالمہ ہوا:

"یا رسول اللہ! کیا حضورؐ پیغمبر برحق نہیں؟"

"ہاں۔ ہوں۔"

"یا رسول اللہؐ! کیا ہم مسلمان حق پر نہیں؟"

"بے شک حق پر ہیں۔"

"تو پھر ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟"

"اللہ ہمارا مددگار رہے۔ وہ ہمیں ہرگز رسوا نہ کرے گا۔"

حضرت عمرؓ کے پاس اس کے بعد خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ لیکن جوش اتنا تھا کہ وہ وہاں سے سیدھے سیدنا ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور وہاں بھی اسی قسم کی گفتگو کی۔ رازدارِ نبوت صدیق اکبرؓ نے اس کا مختصر جواب یوں دیا کہ: "محمد اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ کی مرضی سے کر رہے ہیں۔" اس جواب نے حضرت عمرؓ کا سارا جلال ٹھنڈا کر دیا۔ آپؓ کو اس وقتی دینی جوش اور اپنی تیز گفتگو پر اتنی ندامت رہی کہ ساری عمر مختلف کارِ خیر سے اس کی تلافی فرماتے رہے۔ نفل نماز اور روزے، صدقات، قیدیوں کی رہائی اور دوسرے کارِ خیر سے اس لغزش کا کفارہ ادا کرتے رہے۔

ام المومنین ام سلمہؓ کی اصابت رائے

معاہدہ مکمل ہونے کے بعد حضورؐ نے ان تمام لوگوں کو جو قربانی کے جانور ساتھ لائے تھے قربانی ادا کرنے کا حکم دیا۔ کئی بار حضورؐ نے آوازیں دیں لیکن ایک مسلمان بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بہ ظاہر یہ بھی "نافرمانی" ہی معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم نکاح زینبؓ کی تفصیلات میں بتا چکے ہیں ہر حکم کی عدم تعمیل نافرمانی کی حدود میں داخل نہیں ہوتی اور نہ اسے نعوذ باللہ کفر قرار دیا جا سکتا ہے۔ صحابہ کرام سے زیادہ حضورؐ کی فرماں برداری کا کون دعویٰ کر سکتا ہے؟ حضورؐ کے بار بار فرمانے پر بھی کسی کا قربانی کے لیے نہ اٹھنا نعوذ باللہ کسی نافرمانی کے جذبے سے نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ سب رسولؐ کے نافرمان ہوں، اور خدا ان سب سے راضی ہونے کی آسمانی سند نازل فرمائے؟ سیرت نگار حضرات اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمان اس حوصلہ شکن معاہدے سے اتنے دل گرفتہ ہو گئے تھے کہ قربانی کے لیے اٹھنا ان کے لیے دوبھر ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی وجہ ہو۔ لیکن ایک اور سبب بھی اس کا ہو سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ صحابہؓ کو ہنوز یہ امید تھی کہ شاید اب بھی حالات میں کوئی ایسا تغیر پیدا ہو جائے اور کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ یہ قربانیاں اپنے اصلی موقع و محل پر ادا ہوں۔ دستور کے مطابق عمرہ ادا کرنے کے بعد ہی قربانیاں ہونی چاہئیں۔ اور بغیر عمرہ ادا کیے قربانی کا ہونا صحابہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تین سو میل سے ادائے عمرہ کی بے تاب تمنائیں لے کر آئے تھے اس لیے ان کی توقع فطری تھی۔ وہ اسے حضورؐ کی ایک اجتہادی رائے سمجھ رہے تھے، جس میں "لا و نعم" کی گنجائش ہوتی ہے۔ اگر وہ اسے وحی الٰہی یا امر امیر، یا

قضائے قاضی سمجھتے تو عدم تعمیل کی مجال نہ ہوتی۔

بہر کیف جب حضورؐ نے پوری قوم کی یہ دل گرفتگی دیکھی تو ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس تشریف لائے جو اس سفر میں حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ واقعات سُن کر ام المومنینؓ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! حضورؐ خود باہر نکل کر اپنی رسم قربانی ادا فرمالیں اور سر کے بال اترواکر احرام اتار ڈالیں۔" ام المومنینؓ کا یہ مشورہ صحیح اور صائب نکلا اور تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا۔ جب حضورؐ نے قربانی ادا کر کے بال اتروائے اور احرام اتار لیا تو تمام صحابہ کو یقین آگیا کہ اب معاہدے میں کوئی تغیر نہیں ہوگا اور معاہدے کے مطابق عمرہ ادا کیے بغیر ہی یہاں سے واپس جانا پڑے گا۔ چنانچہ حضورؐ کا عمل دیکھ کر ان سب نے اپنی اپنی قربانیاں ادا کر کے بال اتروائے اور احرام اتار دیے۔

صلح حدیبیہ اور فتح مبین

معاہدے کے بعد تین دن حدیبیہ میں قیام رہا پھر مدینے کو روانگی ہوئی۔ راستے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

انا فتحنا لك فتحا مبينا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ

اے رسول! ہم نے تمہارے لیے واضح فتح کے دروازے کھول دیے۔

وحی الٰہی کی گہرائیوں تک پوری طرح کون پہنچ سکتا ہے؟ مسلمان اس معاہدے کو اپنی قومی شکست اور دینی رسوائی سمجھ رہے تھے اور وحی آسمانی اسے فتح مبین بتا رہی ہے۔ سیدنا عمرؓ یہ آیات سن کر حیرت میں آگئے۔ ان سے رہا نہ گیا۔ حضورؐ سے دریافت کیا کہ: یا رسول اللہؐ! کیا یہ فتح مبین ہے؟

ارشاد ہوا: ہاں۔ حضرت عمرؓ کی سمجھ میں بات نہ آسکی اور شاید کوئی بھی نہ سمجھ سکا ہوگا۔ ہاں صرف ایک ہی رفیق نظر آتا ہے جو اس پوری داستانِ تگ و دو میں خاموش، مطمئن اور شروع سے آخر تک رسولؐ کا ہم نوا، ہم آہنگ، اور ہم خیال ہے۔ وہ محض اپنے کمالِ ایمان و عشق کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مومنانہ فراست و حکمت کی وجہ سے ان تمام نزاکتوں، مصلحتوں اور گہرائیوں کو سمجھ رہا ہے جو رسولؐ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ یہ ہے رازدارِ نبوّت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ عنا۔

اس معاہدے کے فتح مبین ہونے کی تصدیق بعد کے واقعات نے کر دی۔ اس کے مصالح و فوائد مختصراً یوں ہیں:

۱۔ مکّے اور مدینے کا راستہ ہر راہی مسافر کے لیے بے خطرہ کھل گیا اور کاروباری لین دین کی سہولتیں حاصل ہو گئیں۔

۲۔ مکّہ و مدینہ کے علاوہ بھی آس پاس اور دور دراز کے قبائل کی آمد و رفت نے مسلمانوں سے روابط پیدا کر دیے۔ دور دور اور کھنچے رہنے کی وجہ سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ دور ہو گئیں۔ انھوں نے براہِ راست اہلِ اسلام کی ستھری زندگی دیکھی، ایمان و عبادات کو پرکھا، اخلاق و معاملات کو جانچا اور ان کی معاشرتی زندگی کا معائنہ کیا۔ اخوت، مساوات، ہمدردی، اخلاص، عدل، صداقت اور تمام اخلاقی اقدار کا تجربہ کیا۔ اس طرح ہر ملنے والے کے دل میں اسلام گھر کرتا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سال کے اندر اندر اتنی کثرت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا کہ اس سے پہلے برسوں میں بھی اتنے لوگ اسلام نہ لائے تھے۔ فاتح شام و عراق خالد بن ولیدؓ، فاتح مصر عمرو بن العاصؓ، اور عدی بن حاتم طائی وغیرہ سب انہی ایام

میں ایمان لائے۔

۳۔ اب تک اہلِ اسلام کو عربوں کے اندرونی فتنوں سے ہی فرصت نہ ملی تھی مگر اب عام طور پر عرب میں امن و امان قائم ہو گیا اور حضورؐ کو باہر کے فرماں رواؤں کو بھی دعوتِ اسلام دینے کا موقع ملا (اس کا ذکر آگے آئے گا)۔

۴۔ ایک بڑا فائدہ جو اس معاہدے سے ہوا اس کی طرف سیرت نگاروں کی نظر نہیں گئی۔ وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اصل خطرہ ہر وقت اہلِ مکہ سے تھا کیونکہ مکہ عرب کا مرکز تھا اور اہلِ مکہ کا اثر و اقتدار سارے عرب پر تھا۔ اب ان سے NON-AGGRESSION PACT (ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا معاہدہ) صلح حدیبیہ کی شکل میں ہو چکا تھا۔ اور اہلِ مکہ مسلمانوں کی طاقت سے مرعوب بھی ہو چکے تھے۔ گویا ان کے حملوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اب یہودِ خیبر تنہا رہ گئے تھے، اور ان کی سرکوبی کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ یہ خطرہ نہ تھا کہ اہلِ مکہ ان یہود کی حمایت میں مسلمانوں سے جنگ کریں گے۔ چنانچہ جلد ہی (جیسا کہ آگے ذکر آئے گا) یہودِ خیبر جیسی فتنہ پرور قوم کا زور توڑ دیا گیا اور فتحِ خیبر فتحِ مبین کی تفسیرِ مبین بن کر سامنے آ گئی۔ حضورؐ یا صدیق اکبرؓ کے سوا کون اس سیاسی گہرائی کو سمجھ سکتا تھا کہ دو بڑے دشمنوں میں سے ایک سے مصالحت کر کے دوسرے کا خاتمہ کر دیا جائے؟

۵۔ اس معاہدے سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ اس معاہدے کی بعض شرطیں خود قریش کے لیے وبالِ جان بن گئیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اہلِ مکہ مکے کے مسلمانوں پر طرح طرح کی سختیاں کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس سے گھبرا کر

ایک مسلمان حضرت عتبہ بن اُسید (ان کی کنیت ابوبصیر ہے) مکّے سے نکل بھاگے اور سیدھے مدینے پہنچے۔ اہلِ مکّہ نے دو آدمیوں کو مدینے بھیجا اور مطالبہ کیا کہ اس بھاگے ہوئے آدمی کو شرائطِ معاہدہ کے مطابق واپس کر دیا جائے۔ حضورؐ نے جس طرح حضرت ابوجندل کو حدیبیہ سے واپس فرمادیا تھا اسی طرح جناب عتبہ کو بھی واپس ہونے کا حکم دیا۔ عتبہ بہت گڑگڑائے اور مظلومیت کی داستان بیان کرکے واپس جانے سے معذوری ظاہر کی مگر حضورؐ کو اقدار معاہدہ کا اتنا پاس و لحاظ تھا کہ صاف فرمادیا: معاہدے کی پابندی ضروری ہے اور میں تمہیں اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ تم واپس جاؤ۔ اللہ تعالےٰ تمہارے لیے کوئی بہتر سبیل پیدا فرمادے گا۔" کتنے بڑے جگرے کا کام تھا ان سخت آزمائشوں میں پھر واپس جانا مگر عہد کی پابندی اور اطاعت رسول کا جذبہ انہیں واپس لے گیا۔ عتبہ ان دونوں کافروں کی حراست میں مدینے سے روانہ ہوگئے۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر عتبہ نے ایک کو قتل کر دیا۔ دوسرا بھاگا ہوا مدینے پہنچا۔ پیچھے سے عتبہ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا کہ: یارسول اللہ! حضورؐ نے معاہدے کے مطابق اپنی طرف سے مجھے واپس فرمایا۔ اس لیے حضورؐ تو بری الذمہ ہوگئے۔" عتبہ کو یہ معلوم تھا کہ حضورؐ انہیں مدینے میں نہیں رہنے دیں گے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ مکّے واپس جانا موت کے دہانے میں جانا ہے۔ لہذا انہوں نے مدینہ تو چھوڑ دیا لیکن مکّے بھی واپس نہ گئے بلکہ سمندر کے کنارے ذومرہ کے پاس عیص نامی ایک جگہ پہ مقیم ہوگئے۔ مکّے کے مظلوم مسلمانوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ عتبہ نے اپنا ایک ٹھکانا بنالیا ہے تو وہ بھی بھاگ بھاگ کر ان کے پاس آنا شروع ہوگئے، اور تھوڑے دنوں میں ایک اچھی خاصی جماعت ہوگئی۔ قریش کے تجارتی قافلے

عموماً ادھر ہی سے گزر کر مکّے سے شام کی طرف آتے جاتے تھے۔ یہ لوگ ان قافلوں کو روک لیتے اور اسی مالِ غنیمت سے اپنی گزر اوقات کرتے۔ اس سے اہلِ مکّہ کی تجارت و معاش پر اتنا بُرا اثر پڑا کہ قریش نے حضورؐ کے پاس پیغام بھیجا کہ: ہم اس شرط سے باز آئے۔ آپ سارے مسلمانوں کو مدینے میں بلوا لیجیے۔ ہماری طرف سے سب مسلمانوں کو مدینے جانے کی اجازت ہے"۔ ـــــ

آپ نے دیکھا؟ ـــــ وہی شرطِ معاہدہ جسے قریش اپنی سب سے بڑی فتح سمجھ رہے تھے ان کے لیے سب سے زیادہ وبالِ جان بن گئی:

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جناب عتبہؓ اور ان کے رفقاءؓ نے اخلاقی قدروں کا کچھ اچھا مظاہرہ نہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے یہ بھی سوچ لینا چاہیے کہ مسلمانوں کو صرف اسلام لانے کے جرم میں مکّے میں قید رکھنا کون سا مظاہرۂ اخلاق تھا۔ ان سے معاملات، اخلاق اور سوشل زندگی کی کوئی ادنے شکایت بھی نہ تھی۔ پھر انہیں کس جرم میں تحت سے سزائیں دی جا رہی تھیں؟ حضورؐ نے شرائطِ معاہدہ کی پوری پوری پابندی فرمائی اور کسی مسلمان کو جو مکّے سے بھاگ کر آئے اپنے پاس نہیں رکھا۔ اب یہ ان مکّی مسلمانوں کا کام تھا کہ انہوں نے مظالم سے عاجز آکر اپنے بچاؤ کے لیے ایک نیا راستہ نکال لیا۔

۶۔ حدیبیہ کے معاہدۂ صلح میں جو سب سے بڑا انسانی فائدہ ہے وہ اخلاقی فتح ہے۔ ذرا دیکھیے کتنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی محافظت کی گئی ہے۔ یہ چودہ سو مہاجرین و انصار ایسے جاں باز تھے کہ ان کے تین سو تیرہ نے بدر کے معرکے میں ایک ہزار نبرد آزماؤں کے منہ پھیر دیے۔ ایک اشارے میں

یہ چودہ سو جاں باز سارے مکے کو تہس نہس کر سکتے تھے۔ ان کی ایک یورش سارے ظالموں کو خاک میں ملا سکتی تھی۔ اور اس کے لیے کافی وجوہ بھی موجود تھیں۔ صرف ابوجندل ہی کے معاملے پر اڑ جانا معاہدے کو نامکمل چھوڑ کر حملے کا بہانہ بن سکتا تھا۔ لیکن والصلح خیر کی اعلیٰ قدریں حضورؐ کے پیش نظر تھیں۔ چودہ سو صحابہ اس معاہدے سے دل شکستہ ہو گئے تھے۔ حضورؐ کا اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ ہماری قوم اس معاہدے پر راضی نہیں۔ مگر صلح کی جا رہی ہے۔ دب کر صلح کی جا رہی ہے۔ رفقا کی خفگیوں کی پروا نہیں کی جاتی خون کا ایک قطرہ نہیں بہایا جاتا۔ کیا اقدارِ صلح و امن کی محافظت کا اس سے بہتر نمونہ بھی دنیا کے لیے ہو سکتا ہے؟

اس پورے سفرِ حدیبیہ میں جہاں سیدنا عثمان ذوالنورینؓ کی عظمت و شخصیت نمایاں ہوتی ہے وہاں صدیقؓ کی عاقلانہ تسلیم و رضا، فاروقؓ کے والہانہ جوشِ حق اور مرتضےٰؓ کے کمالِ عشق و ادب اور ام المومنین ام سلمہؓ کی فراست و دانائی کا بھی واضح اندازہ ہوتا ہے۔

فرمانرواؤں کو دعوتِ اسلام

اگر ایک تالاب کے وسط میں ایک ڈھیلا پھینک دیا جائے تو پانی اچھل کر ایک چھوٹا سا دائرہ بنا دے گا اور وہ دائرہ دھیرے دھیرے بڑھتا جائے گا اور کناروں تک پہنچ جائے گا۔ یہی صورت اصلاحِ قوم کی ہوتی ہے۔ سب سے پہلے حضورؐ کو اپنی ذات کو سنوارنے کا حکم ہوا قُمْ فَاَنْذِرْ ہ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ

وثیابک فطہر، والرجز فاہجر الخ اس کے بعد یہ دائرہ گھر اور قریب رہنے والوں تک وسیع کرنے کا حکم ملا: وانذر عشیرتک الاقربین اس کے بعد اہل مکہ کی باری آئی۔ لتنذر ام القری پھر مکے کے آس پاس تک یہ دائرہ پہنچا: ومن حولھا اور اس طرح یہ دائرہ عرب میں پھیلتا گیا۔ اس کے بعد سارے عالم کی ذمے داری ڈالی گئی۔ (کافۃ للناس بشیراً ونذیراً)

ابھی پورے عرب پر اسلام نہیں پھیلا تھا۔ اس لیے بقیۂ حصۂ عرب اور بیرونِ عرب کی طرف ایک ساتھ توجہ دی گئی۔

ہر دین پہلے عوام سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد بااقتدار لوگوں تک پہنچتا ہے۔ فطرت کا کچھ تقاضا بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ نیچے طبقے کے عوام دینِ حق کو اس لیے پہلے قبول کرتے ہیں کہ یہ ان کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ اسی میں ان کی روح کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اسی میں ان کے ٹوٹے دلوں کا سہارا ہوتا ہے۔ اسی میں اخوت و مساوات ہوتی ہے۔ اسی میں ان کی ذلت و محرومی کا مداوا ہوتا ہے اور اسی میں ان کی خودی بیدار ہوتی ہے۔ اونچے، دولتمند اور بااقتدار لوگوں میں بہت کم سعید روحیں ہوتی ہیں جو پیغامِ حق کو جلد قبول کرلیں۔ یہ لوگ عموماً اپنے عیش و تنعم اور دولت و اقتدار کے نشے میں مست رہتے ہیں۔ اگر حق سمجھ میں آبھی جائے تو قبول کرنے میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ حق ان سے اقتدار، دولت اور عیش سب کا ایثار چاہتا ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتے۔ یہ لوگ پیغامِ حق اگر قبول بھی کرتے ہیں تو اس وقت جب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو اور وہ اپنی مسندِ اقتدار کو سہارا دینے کا اسی کو ذریعہ سمجھیں۔ ان کی مسندِ اقتدار عوام ہی کے بل بوتے پر قائم رہتی ہے۔ عوام ہی کی محنت و خدمت کے سہارے یہ دادِ عیش دیتے ہیں

اس لیے یہ فقط یہی نہیں کرتے کہ خود قبولِ حق میں تامل یا انکار سے کام لیں بلکہ عوام کو بھی قبولِ حق سے روکتے ہیں کیونکہ ان عوام کے بغیر ان کا پورا نقشۂ زندگی درہم برہم ہو جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر پیغامِ حق پہلے عوام میں پہنچایا جاتا ہے اور پہلے وہیں مقبول ہوتا ہے۔ اس کے بعد مسندِ اقتدار رکھنے والوں کو متوجہ کیا جاتا ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب تک اسلام کو قبول کرنے والے عوام ہی تھے جن کو حضورؐ نے اپنی تربیت سے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ اب جب کہ قریش کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس فرصت سے حضورؐ نے بلا تاخیر یہ فائدہ اٹھایا کہ فرمانرواؤں کو دعوت نامے ارسال فرمائے۔ اس موقعے پر حضورؐ نے مہر دار انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ کے الفاظ اس طرح کندہ تھے کہ نیچے محمدؐ، اس کے اوپر رسول، اور اس کے اوپر اللہ، کا لفظ تھا۔ اس ترتیب میں یہ اشارہ ہے کہ محمدؐ بندہ ہے۔ اس کا منصب رسول ہے اور مقصود اللہ ہے۔ حضورؐ نے اپنی عبدیت و فروتنی کے اظہار سے اپنی مہر کو بھی خالی نہ رکھا۔

ان رسالت ناموں کی خصوصیت یہ ہے کہ سب کا اندازِ تحریر الگ الگ اور دعوت ایک ہی ہے۔ جسے دعوت دی گئی اس کے ماحول، اس کی ذہنیت اور اس کے نفسیاتی تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر بلیغ، مؤثر اور دلنشیں انداز میں دعوتِ اسلام دی گئی اور ہر خط پر مہر بھی ثبت کی گئی۔ ان تمام رسالت ناموں کی نقل، ترجمہ اور ضروری تشریح کے لیے ایک الگ تصنیف درکار ہے۔ بعض مولفات میری نظروں سے گزرے ہیں جن میں رسالت ناموں کو یکجا کیا گیا ہے اور بعض کے عکسی فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔

کئی رسالت نامے آج بھی دنیا میں محفوظ ہیں۔ مثلاً اصحمہ بن ابجر اور مقوقس مصر کو جو دعوت نامے بھیجے گئے تھے وہ اب تک محفوظ ہیں اس وقت اس کی تفصیلات میں گئے بغیر ہم صرف ایک مختصر سی فہرست پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

۱۔ ایک دعوت نامہ فرمانروائے حبشہ اصحمہ بن ابجر (ملقب بہ نجاشی) کے نام تھا جسے عمرو بن امیہ ضمری لے کر گئے تھے۔ یہ عیسائی تھے۔ شروع سے ہی اسلام کی طرف مائل تھے۔ خط پاتے ہی اسلام لے آئے۔ انہوں نے مسلمان مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ جو شریفانہ برتاؤ کیا اس کا بیان آپ ہجرت حبشہ کے ذکر میں پڑھ چکے ہیں۔ حضرت ام حبیبہؓ بنت ابوسفیان کے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش کے ارتداد کے بعد آنحضرتؐ نے نجاشی ہی کی معرفت پیغامِ نکاح بھیجا تھا۔ نکاح خالد بن سعید نے پڑھایا۔ مہر چار سو دینار طلائی تھا جو حضرت نجاشیؓ ہی نے اپنے پاس سے اسی وقت ادا کر دیا۔ نجاشی کے قبولِ اسلام کے بعد پادریوں نے اور دوسرے بکثرت عوام نے اسلام قبول کر لیا۔ نجاشی پہلے ہرقل روم کے باجگزار تھے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد اسے ایک درہم بھی خراج نہ دیا۔ حضورؐ کو خیبر میں نجاشی کی وفات کی خبر ملی تو جماعتِ صحابہ کے ساتھ ان کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا فرمائی۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نجاشی کے بعد والے نجاشی کو بھی دعوت نامہ گیا تھا مگر اس نے اسلام قبول نہیں کیا۔ بہرحال دونوں میں سے ایک نے تو ضرور اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی کی غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی تھی۔

۲۔ ایک رسالت نامہ فرمانروائے بحرین منذر بن ساوی کے پاس

علاء بن حضرمی لے کر گئے۔ یہ بھی اسلام لے آئے۔

۳۔ ایک نامۂ رسالت فرمانروائے عمان اور اس کے بھائی جیفر اور عبد (فرزندان جلندی) کے پاس عمرو بن العاص لے کر گئے۔ دونوں کئی دن گفتگو کرنے کے بعد مطمئن ہوئے اور اسلام لے آئے۔

۴۔ ایک دعوتی رقعہ شام کے گورنر منذر بن حارث بن ابی شمر کے پاس شجاع بن وہب اسدی لے کر گئے۔ یہ ایمان نہ لایا۔ پہلے تو یہ بہت ناراض ہوا پھر اعزاز کے ساتھ شجاع کو رخصت کیا۔

۵۔ ایک دعوت نامہ حاکم یمامہ ہوذہ بن علی کے پاس سلیط بن عمرو لے کر گئے۔ اس نے خط پڑھ کر کہا کہ: باتیں تو معقول ہیں لیکن اسلامی حکومت میں آدھا حصہ میرا رکھا جائے تو اسلام لانے کو تیار ہوں۔ اس جواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہوذہ ہلاک ہو گیا۔

۶۔ ایک نامۂ مبارک فرمانروائے مصر جریج بن متی (ملقب بہ مقوقس) کے پاس حاطب بن ابی بلتعہ لے کر گئے۔ اس نے اسلام کا نہ اقرار کیا نہ انکار۔ ایک گول مول سا جواب دے کر حاطب کو رخصت کر دیا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک خچر (دُلدل نامی)، کچھ کپڑے اور دو کنیزیں بھیجیں۔ یہ دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ ایک کا نام سیرین اور دوسری کا نام ماریہ تھا۔ حاطب نے ان دونوں کو اسلام کی تبلیغ کی اور ان دونوں نے مدینے پہنچنے سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا۔ سیرین حضرت حسان بن ثابت کی بیوی بنیں اور ماریہؓ آنحضرتؐ کی۔ معلوم نہیں لوگ ماریہؓ قبطیہ کو امہات المومنین کی فہرست میں کیوں داخل نہیں کرتے۔

۷۔ ایک نامۂ تبلیغ کسرائے ایران خسرو پرویز کے پاس عبداللہ بن حذافہ لے کر گئے۔ گستاخ اور بدقسمت خسرو پرویز نے نامۂ مبارک پڑھ کر چاک

کر دیا اور بولا: میرا غلام مجھے یوں خط لکھتا ہے جس میں میرے نام سے پہلے اپنا نام لکھا ہے۔" العیاذ باللہ! اس کے بعد خسرو نے اپنے گورنر یمن باذان کو لکھا کہ: محمدؐ کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔" العیاذ باللہ۔ باذان نے دو آدمیوں (بابویہ اور خرخرہ) کو تعمیل حکم کے لیے مدینے بھیجا۔ آنحضرتؐ نے ان کی آمد کا سبب معلوم کرنے کے بعد فرمایا: تمہارا فرمانروا (خسرو پرویز) ہلاک ہو چکا۔ جا کر تحقیق کر و۔" وہ دونوں یمن واپس گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ خسرو پرویز کو اس کے بیٹے شیرویہ نے قتل کر کے تختِ حکومت پر قبضہ کر لیا ہے۔ جب عبداللہ بن حذافہ مدینے واپس آئے تو انہوں نے آنحضرتؐ کو بتایا کہ خسرو پرویز نے نامۂ مبارک کو چاک کر ڈالا" آنحضرتؐ نے فرمایا: مزّق ملکہ (اس نے اپنی سلطنت کے پرزے اڑا دیے)۔ ان دو کلموں کی تفسیر عہدِ فاروقیؓ میں دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

۸۔ ایک رسالت نامہ فرمانروائے بُصریٰ کے پاس حارث بن عمیر ازدی لے کر گئے۔ شرجیل بن عمرو نے انہیں قتل کر دیا جو روم کی طرف سے حاکم بلقا تھا۔ یہی قتل آگے چل کر غزوۂ موتہ کا سبب بنا۔

۹۔ ایک تبلیغ نامہ فرمانروائے قسطنطنیہ یعنی ہرقل کے پاس دحیہ کلبی لے کر گئے۔ ہرقل اس وقت بیت المقدس میں تھا۔ اس نے دربارِ عام کیا جس میں جناب ابوسفیانؓ کو بھی بلایا۔ یہ ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ بلکہ آنحضرت کی ہر مخالفت و جنگ میں پیش پیش تھے۔ یہ بہ سلسلۂ تجارت یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان سے ہرقل کے جو جو سوال و جواب ہوئے ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انہیں یہاں درج کیا جائے۔

ہ۔ "تم میں اس (مدعی نبوت) کا حسب کیسا ہے؟"

ا : "وہ ہم میں حسب (یعنی خاندانی شرافت) رکھتا ہے۔"

ہ : "انبیاء اسی طرح اپنی قوم کے شریف خاندان میں بھیجے جاتے ہیں۔"

ہ : "اس کے مورثوں میں کوئی بادشاہ بھی تھا؟"

ا : "نہیں"

ہ : "اگر اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس بادشاہت کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

ہ : "اس دعوائے نبوّت سے پہلے اس پر دروغ گوئی کا الزام لگایا گیا ہے؟"

ا : "نہیں"

ہ : "جو بندوں سے جھوٹ بولنا ترک کر دے وہ خدا پر جھوٹ بہتان کیسے باندھ سکتا ہے۔"

ہ : "اس کے پیرو بڑے لوگ ہوتے ہیں یا کمزور قسم کے لوگ؟"

ا : "کمزور لوگ"

ہ : "رسولوں کے پیروانِ اوّل ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

ہ : "پیرووں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یا کم ہوتی رہتی ہے؟"

ا : "بڑھتی جاتی ہے۔"

ہ : "ایمان کی الفت جب دلوں میں اتر جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

ہ : "کیا کوئی پیرو ایسا بھی ہے جو لوگوں کی ناراضی کے سبب اپنے دین سے پھر جائے؟"

ا : "نہیں"

ہ : "ایمان کی قوت ایسی ہی ہوتی ہے تاآنکہ وہ مشن مکمل ہو جائے۔"

ہ : "تمہاری اس سے جنگ بھی ہوئی ہے؟"

ا: "ہاں"

ھ: "انبیاء کی آزمائش اسی طرح ہوتی ہے اور نتیجہ ان ہی کے حق میں ہوتا ہے۔"

ھ: "جنگ کے نتائج کیا رہے؟"

ا: "جنگ ہمارے اور اس کے درمیان اس ڈول کی طرح رہی ہے جس کو کبھی وہ ہم سے اور کبھی ہم اس سے چھین لیتے ہیں (یعنی کبھی ایک فریق غالب ہوتا ہے اور کبھی دوسرا)۔"

ھ: "ہاں نتیجہ انبیاء ہی کے حق میں نکلتا ہے۔"

ھ: "وہ غداری (معاہدہ شکنی) بھی کرتا ہے؟"

ا: "اب تک تو نہیں کی ہے لیکن اس دوران میں جب کہ ہم لوگ یہاں ہیں ہمیں علم نہیں کہ اس کا طرزِ عمل کیا رہا ہے؟" (ابوسفیان کا بیان ہے کہ سوال و جواب کے دوران میں مجھے حضورؐ کے خلاف کہنے کا اور کوئی موقع اس کے سوا نہ مل سکا)۔

ھ: "انبیاء کا کیرکٹر ایسا ہی ہوتا ہے۔"

ھ: "کیا اس سے پہلے بھی وہاں کسی نے یہ دعویٰ کیا ہے؟"

ا: "نہیں"

ھ: "اگر ایسا ہوتا تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ کسی مدعی کی نقّالی کر رہا ہے۔"

اس کے بعد ہرقل نے پھر ایک سوال کیا کہ: "وہ تمہیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے؟" ہم نے کہا کہ: وہ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صلۂ رحمی اور پاکدامنی وغیرہ کا حکم دیتا ہے۔ ہرقل بولا کہ: جو کچھ تم بیان کرتے ہو، اگر یہ صحیح ہے تو وہ یقیناً نبی ہے مجھے یہ تو علم تھا کہ وہ ظہور کرنے والا ہے لیکن یہ گمان نہ تھا کہ وہ تمہاری قوم میں پیدا ہوگا۔

اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ میں اس تک پہنچ سکوں گا تو میں خود اس کی زیارت کرتا، اور اگر میں اس کے پاس ہوتا تو اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ اس کا اقتدار اس سرزمین تک جو آج میرے قدموں کے نیچے ہے پہنچ کر رہے گا۔
اس کے بعد ہرقل نے رسالت نامہ منگوا کر یوں پڑھنا شروع کیا: (ترجمہ) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: یہ خط ہے محمدؐ رسول اللہ کی جانب سے ہرقل عظیم روم کے نام۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اما بعد۔ میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرلو تو سلامتی نصیب ہو گی۔ تم اسلام قبول کرلو تو اللہ تمہیں دُہرا اجر عطا فرما دے گا۔ اور اگر یہ دعوت رد کردی تو تم پر خود تمہارا گناہ بھی ہو گا اور رعایا تحتوں کا بھی جو تمہاری وجہ سے اسلام سے محروم رہیں گے۔ اے اہل کتاب! ایک ایسے کلمے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہو، اور وہ یہ ہے کہ ہم بجز اللہ تعالےٰ کے اور کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کریں اور اس کے سوا ہم میں کسی کو کوئی رب نہ بنائے۔ اگر وہ اس پیغام کو رد کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہنا ہم تو مسلم ہیں ——— ہرقل جب یہ رسالت نامہ پڑھ چکا تو مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں اور شور سا مچ گیا۔ ہم لوگوں کو اس نے واپس جانے کی اجازت دی اور ہم لوگ باہر چلے آئے۔ پھر باہر نکل کر ہم نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ: ابوکبشہ کے فرزند (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کا اثر تو بڑھتا جارہا ہے۔ اس سے تو رومیوں کا فرمانروا بھی خوف کھا رہا ہے۔" اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ حضورؐ کا اثر واقتدار غالب ہو کر رہے گا۔ آخر ایک دن اللہ تعالےٰ نے میرے دل میں بھی اسلام کو داخل کرہی دیا۔
زہری اس کے بعد کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ: ہرقل نے تمام حکام روم کو

بلا کر اپنے ایک گھر میں جمع کیا اور کہا کہ: اے قوم روم! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری فلاح اور رشد ہمیشہ قائم رہے اور تمہارا ملک بھی تمہارے ہی پاس رہے؟ یہ سن کر سب کے سب دروازے کی طرف اس طرح بھاگنے لگے جیسے جنگلی گدھے بھاگتے ہیں۔ لیکن دروازوں کو بند پایا۔ ہرقل نے کہا کہ: ان سب کو ادھر بلاؤ۔ وہ آ گئے تو ہرقل نے (پینترا بدلتے ہوئے) کہا کہ: میں نے تمہاری دینی پختگی کا امتحان لیا تھا، سو میں نے وہی بات دیکھ لی جو میں چاہتا تھا۔ یہ سن کر سب اس کے آگے سجدے میں گر گئے اور اس سے خوش ہو گئے۔

ان فرمانرواؤں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جن کو دعوت نامۂ اسلام بھیجا گیا، مثلاً:

۹۔ فرمانروائے غسان جبلہ بن ایہم۔ اس نے اسلام قبول کر لیا مگر دماغ سے پندارِ فرمانروائی نہیں نکلا تھا۔ عرصۂ دراز کے بعد عہدِ فاروقی میں طوافِ کعبہ کرتے ہوئے اس کی چادر کا ایک کونہ کسی کے پاؤں سے دب گیا۔ اس نے اس غریب کو ایک طمانچہ رسید کیا۔ مقدمہ حضرت عمرؓ کی عدالت میں پیش ہوا۔ آپؓ نے جبلہ کے خلاف طمانچے کے بدلے طمانچے کا فیصلہ دیا۔ جبلہ نے کہا کہ میں سردارِ قوم ہوں اور ایک معمولی آدمی سے مجھے برابر کا بدلہ دلوایا جاتا ہے۔ آپؓ نے فرمایا کہ اسلام کے قانون کے سامنے کوئی بڑا چھوٹا نہیں، سب برابر ہیں۔ جبلہ نے کچھ دیر کی مہلت لی اور چپکے سے بھاگ نکلا اور پھر مرتد ہو کر مرا۔

۱۰۔ فروہ بن عمرو خزاعی شام کے گورنر تھے۔ دعوت نامہ دیکھنے کے بعد اسلام لے آئے۔ قیصرِ روم نے انہیں قید کر لیا اور پھر سزائیں دے کر قتل کر دیا، مگر کوئی شے انہیں اسلام سے برگشتہ نہ کر سکی۔

۱۱ - اُکیدرِ حکمرانِ دومۃ الجندل تھے۔ یہ دیر بعد ۹ھ میں اسلام لے آئے۔

۱۲ - ذوالکلاع حمیری یمن وطائف کے اکثر علاقوں پر حکومت کرتے تھے اور لطف یہ ہے کہ الوہیت کے مدعی تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ایک دن میں اٹھارہ ہزار غلام آزاد کیے۔ عہدِ فاروقی میں اپنی حکومت سے دست بردار ہو کر مدینے میں بس گئے اور زہد و ریاضت میں ساری زندگی گزار دی۔

ثُمامہ بن اُثال کا اسلام

۱۳ - کہا جاتا ہے کہ سردارِ نجد ثمامہؓ بن اثال کو بھی دعوت نامۂ اسلام بھیجا گیا تھا۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن یہ ایک دوسری طرح اسلام لے آئے۔ یہ مسلمانوں کو خصوصیت سے لوٹتے اور قتل کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ جو ثمامہ کو گرفتار کر کے لائے گا میں اپنے پاس سے اسے انعام دوں گا۔ صحابہ اس فکر میں لگے رہتے تھے مگر ثمامہ ہاتھ نہ آتے تھے۔ آخر ایک موقعے پر گرفتار ہوئے اور آنحضرتؐ کی خدمت میں اس طرح لائے گئے کہ پیچھے سے ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ان کے ہاتھ کھول دو۔ ایک سردارِ قوم کو اس طرح باندھنا کوئی شریفانہ طریقہ نہیں۔" صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! یہ بڑی مشکل سے گرفتار ہوا ہے۔ ہاتھ کھولے جائیں گے تو یہ فرار ہو جائے گا؟" آنحضرتؐ نے فرمایا: مجھے ثمامہ سے ایسی توقع نہیں۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے پوچھا: ثمامہ! ہمارے اور اسلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ ثمامہ ایک مردِ دلیر تھے بولے:

اے محمدؐ! اس روئے زمین پر تمہارے چہرے سے زیادہ قابلِ نفرت چہرہ تمہارے دین سے زیادہ قابلِ نفرت دین اور تمہارے شہر سے زیادہ قابلِ نفرت شہر میرے نزدیک کوئی نہیں۔" آنحضرتؐ نے فرمایا: اسے لے جا کر (مسجدِ نبوی کے سامنے) حراست میں رکھو اور کل پھر میرے سامنے پیش کرو۔ دوسرے دن پیش کیا گیا اور بالکل اسی طرح کے سوال و جواب ہوئے اور تیسرے دن بھی بعینہٖ یہی ہوا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دو۔" صحابہؓ حیران تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بڑی مصیبتوں سے تو اسے گرفتار کیا گیا ہے اور وہ اتنی سخت کلامی سے پیش آیا ہے اور اسے پھر مسلمانوں کو لوٹنے کے لیے رہا کیا جا رہا ہے۔ مگر حکیم امت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ تمام نقوش پڑھ لیے تھے جو ان تین دنوں کے اندر تاثراتِ قلبی نے ثمامہ کے چہرے پر تحریر کر دیے تھے۔

ثمامہ ان تین دنوں میں کیا دیکھتے رہے؟ ایک مجرم قیدی کے ساتھ انتہائی شریفانہ برتاؤ۔ جماعتِ نماز میں پوری قوم کی فروتنی، عاجزی اور سنجیدگی۔ اخوت، مساوات، ہمدردی، ایثار، اعلیٰ انسانی اقدار، بلند اخلاق، اونچے کردار، ہر فرد کی پیشانی پر ایمان و صداقت کے انوار۔ اسلامی تعلیمات ایک پورے معاشرے کے اندر مجسم شکل میں نمودار۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک کھلے ہوئے مجرم کو سخت کلامی کے باوجود کوئی سزا دیے بغیر صاف رہائی کا فرمان ——— ثمامہ کا دل ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ مگر وہ کھرا تھا، دلیر تھا۔ وہ یہ نہیں پسند کرتا تھا کہ قید و بند اور دباؤ کی وجہ سے اسلام قبول کرنے کا طعنہ سنے۔

وہ رہا ہو کر سیدھے اپنی قوم میں پہنچے۔ پہلے اعلان کیا کہ کسی کا کوئی قرض

یا اور کوئی حق ہو تو وہ طلب کرے۔ اللہ اللہ ثمامہ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ قرض سے بچنے کے لیے مسلمان ہونے کا طعنہ دیا جا سکے۔ وہ اپنے گھر سے سیدھے مدینے کی طرف چل پڑے۔ آبادی سے باہر اپنے کپڑے دھوئے، غسل کیا اور شہر میں داخل ہو گئے۔ صحابہ نے دیکھا تو سمجھے کہ معلوم نہیں یہ کیا نیا فتنہ لایا ہے۔ فوراً چوکس ہو کر آنحضرتؐ کی اور اپنی حفاظت کے لیے تیار ہو گئے ثمامہ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں درخواست کی کہ کل جس جگہ اور جس طرح حضورؐ بیٹھے تھے۔ اسی جگہ اور اسی طرح بیٹھ جایئے۔ آنحضرتؐ نے اس کی درخواست منظور کر لی اور وہیں بیٹھ گئے۔ صحابہ ہر چہار طرف تحفظ کے لیے موجود تھے کہ کہیں یہ اچانک حملہ نہ کر دے۔ ثمامہ آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور آنحضرتؐ کے گھٹنوں کو پکڑ کر کہا: یا رسول اللہ! آج اس روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ محبوب چہرہ میری نظروں میں کوئی نہیں۔ آپ کے دین سے زیادہ پیارا میرے لیے کوئی دین نہیں اور آپ کے شہر سے زیادہ پسندیدہ شہر میرے لیے کوئی نہیں۔"

اسلام لانے کے واقعات تو آپ نے بہت پڑھے ہوں گے۔ مگر اس انوکھی شان سے یا تو عمرؓ بن خطاب ایمان لائے تھے یا ثمامہؓ بن اثال۔

یہ بھی سن لیجیے کہ مکے میں غلہ نجد ہی سے جایا کرتا تھا۔ ثمامہؓ نے واپس آکر حضورؐ سے اذن لیے بغیر سارا غلہ رکوا دیا اور اہل مکہ تڑپ اٹھے۔ بھوکے مرنے لگے۔ آخر انہوں نے اپنا ایک نمائندہ (غالباً ابوسفیان کو) بھیجا۔ اس نمائندے نے آکر کہا کہ: اے محمدؐ! کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارے قریشی قرابت دار بھوکے مر جائیں؟ ثمامہؓ نے غلہ روک کر ہم سب کو بھوکا مار دیا ہے۔" رحمۃ للعالمینؐ یہ کہاں گوارا فرما سکتے تھے؟ قیدی ثمامہ کو بھوکا

نہ مارا تو مکّی دشمنوں کا بھوکا مرنا کب برداشت فرما سکتے تھے۔ انسانیت کو بلند کرنے والا اور انسانی اقدار کو قائم کرنے والا، یہ انسانیت سوز انتقامی کارروائی کہاں دیکھ سکتا تھا کہ انسان بھوکے مریں؟ جو خود بھوکا رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرتا ہو وہ کسی پوری قوم کی بھوک کو کیونکر انگیز کر سکتا تھا؟ آنحضرتؐ نے فوراً ثمامہ کو پیغام بھجوا دیا کہ اہلِ مکّہ کے لیے غلّہ کھول دو۔"

غزوۂ خیبر محرم ۷ھ

خَیبر مدینے سے تقریباً دو سَو۲۰۰ میل کے فاصلے پر ایک جگہ کا نام ہے بنو قینقاع اور بنو نضیر مدینے سے جلاوطن ہوئے تو وہ دونوں قبیلے خیبر ہی میں آ کر سکونت پذیر ہوئے۔ مدینے میں انہیں ہر طرح کی آزادی حاصل تھی مگر یہ غدّاری سے باز نہ آئے۔ خیبر میں رہ کر بھی ان کی ریشہ دوانیاں ہمیشہ جاری رہیں۔ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ غزوۂ احزاب انہی کی سازش و انگیخت سے ظہور میں آیا تھا اور غزوۂ بنو قریظہ بھی انہی کی شر انگیزیوں کا نتیجہ تھا۔ ان یہودیوں نے اپنے کھوئے ہوئے عزت و اقتدار کو واپس لانے کے لیے پھر پرپُرزے نکالنے شروع کیے۔ غزوۂ بنو قریظہ میں حُیی بن اخطب کے مارے جانے کے بعد ابو رافع سلاّم بن ابی الحقیق اس کا جانشین ہوا۔ یہ قتل کیا گیا۔ (اس کی داستانِ قتل پر ہم آگے تبصرہ کریں گے) تو اسیر بن زرام مسند آرائے ریاست ہوا۔ یہ پہلے اپنے

قریب کے حلیف قبیلے بنی غطفان کے پاس گیا اور پورے قبیلے کو مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔ اس کے بعد دوسرے کئی قبائل کو ساتھ ملایا گیا۔ یہاں تک کہ بیس پچیس ہزار کی فوج مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے جمع کر لی۔ آنحضرتؐ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ کو تحقیقِ حال کے لیے بھیجا۔ انہوں نے چھپ کر اپنے کانوں سے یہود کی سازشوں کی گفتگو سنی اور واپس آ کر آنحضرتؐ کو اطلاع دی۔ آنحضرتؐ نے پھر تیس آدمیوں کو عبداللہ بن رواحہ کے ساتھ خیبر بھیجا۔ عبداللہ بن رواحہ نے اسیر سے ملاقات کی اور کہا کہ: "تمہاری حکومت تمہیں کو مبارک رہے تم رسول اللہؐ سے مل تو لو۔ تمہاری حکومت تمہارے ہی پاس رہے گی۔" عبداللہ بن رواحہ نے یہ گفتگو اسی توقع پر کی تھی کہ اسیر آنحضرتؐ سے مل کر یا تو اچھا اثر لے گا اور ایمان لائے گا یا اتنا متاثر ضرور ہو گا کہ انسانیت کے ساتھ مصالحت کر لے۔ اسیر تیار ہو گیا اور اس نے بھی تیس آدمی اپنے ساتھ لے لیے۔ راستہ یوں طے ہوا کہ ہر مسلمان کے ساتھ ایک یہودی تھا۔ گویا دو آدمی ایک ساتھ چل رہے تھے اور ان کے پیچھے پھر دو آدمی۔ اسی طرح تیس تیس آدمیوں کی دو قطاریں تھیں۔ قرقرہ میں پہنچ کر اسیر کی نیت بدل گئی۔ غالباً اس نے یہ سوچا ہو گا کہ اگر یہاں کچھ چھیڑ ہو گئی تو خیبر سے فوراً امدادی کمک آ جائے گی اور ان تیس مسلمانوں کو ختم کر کے مسلمانوں پر ہیبت قائم کر دی جائے گی۔ اسیر نے چھیڑ خانی کے لیے اپنے ساتھ کے مسلمان عبداللہ بن انیس کی تلوار چھین لینی چاہی۔ عبداللہ بن انیس پہلے ہی سے ہوشیار تھے۔ انہوں نے اسیر سے کہا: "تو ابھی سے غدّاری کرنے لگا؟" یہ کہہ کر انہوں نے اسیر

کی ران پر ایک تلوار ماری۔ وہ گھوڑے سے گرا اور گرتے گرتے تلوار کا ایک ہاتھ مار کر عبداللہ بن انیس کو بھی زخمی کر گیا۔ بس کیا تھا فوراً میدان کارزار گرم ہوگیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک کے سوا سارے یہودی کھیت ہوگئے۔

صحابہ نے اس قسم کی غداری کبھی نہیں کی تھی اور یہود پہلے بھی بارہا غداری کا عملی ثبوت دے چکے تھے۔ قرینہ یہی ہے کہ یہ اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ یہود نے پہلے ہی سے راستے میں چھیڑ کر مسلمانوں کو ختم کرنے کا پروگرام بنایا ہوگا۔

مقصدِ جنگ کا اعلان

اس واقعے کے بعد آنحضرتؐ نے مشورہ فرمایا۔ یہ یقینی بات تھی کہ اسیر بن زرام نے جو فوجیں جمع کی تھیں وہ مدینے پر حملہ کرنے ہی کے لیے تھیں۔ اگر یہ چھوٹا سا معرکہ نہ بھی پیش آتا تو وہ اپنی اسکیم پوری کرتا۔ اور اب تو دشمنوں کا حملہ اور بھی یقینی ہوگیا تھا۔ اس لیے رائے یہ قرار پائی کہ اس سیلاب کو امنڈنے سے پہلے ہی روک دیا جائے۔ اس موقعے پر اسلامی جیش کو تیار ہونے کا حکم دیا گیا اور ساتھ ہی آنحضرتؐ نے اعلان فرمایا کہ: اس جنگ میں صرف وہی لوگ شریک ہوں جن کا مقصد صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔" یعنی حصولِ غنیمت یا جذبۂ انتقام کی تسکین یا اور کوئی مقصد پیشِ نظر نہ ہو۔ اس اعلان کے مطابق اس غزوے میں سولہ سو[۱۶۰۰] مہاجرین و انصار شریک تھے جو صلح حدیبیہ کے موقعے پر بیعت رضوان میں شریک تھے۔ ان میں صرف چند

رحلت کر چکے تھے) بعد میں دو سو۲۰۰ وہ مہاجرین حبشہ بھی آکر مل گئے جو حبشے سے واپس آتے ہوئے خیبر پہنچ گئے تھے۔

یہاں قدرۃً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی شرط تو تمام ہی مواقعِ قتال پر ضروری تھی۔ پھر آج خاص طور پر اس اعلان کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ یہ بڑا اہم سوال ہے مگر سیرت نگاروں نے اس سوال کو حل کرنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی ہے۔ ہماری سمجھ میں جو کچھ آسکا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن پاک نے صحابہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک قبل فتح کے مسلمان اور دوسرے بعد فتح کے مسلمان۔ ارشاد ہے:

لا یستوی منکم من انفق	تم میں سے وہ جس نے قبل فتح خرچ کیا
من قبل الفتح وقاتل	اور جنگ کی، یکساں نہیں۔ یہ لوگ
اولئک اعظم درجۃ	درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں،
من الذین انفقوا من بعد	جنہوں نے بعد فتح خرچ کیا اور جنگ کی
وقاتلوا ط وکلا وعد اللہ	ہاں حسنیٰ کا وعدہ اللہ نے دونوں ہی سے
الحسنیٰ ط واللہ بما تعملون	کیا ہے اور اللہ تمہارے اعمال سے
خبیر ہ (۵۷ : ۱۰)	باخبر ہے۔

تمام مفسرین یہاں الفتح سے مراد فتح مکہ لیتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے بالکل صحیح ہے کہ الفتح کا ظہور فتح مکہ ہی ہے۔ لیکن اگر قرآن پاک سے اس کی تفسیر تلاش کی جائے تو اس فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہو گی کیونکہ اس صلح حدیبیہ کے بعد ہی راستے میں انا فتحنا لک فتحا مبینا نازل ہوئی۔ گویا صلح حدیبیہ ہی فتح مبین تھی۔ یعنی یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد کی

ساری فتوحات ــــ فتح خیبر، فتح وادی القریٰ، فتح مکہ، اور فتح حنین، فتح اوطاس، فتح طائف ــــ اسی آغاز کا انجام اور اسی مبتدا کی خبر تھیں۔ ان ساری فتوحات کا مجموعہ ہے فتح مبین۔ صرف فتح مکہ ہی فتح مبین نہیں۔ بلاشبہ فتح مکہ سب سے بڑی فتح مبین ہے اور آنحضرتؐ داخلۂ مکہ کے وقت انا فتحنا لک فتحاً مبیناً تلاوت فرما رہے تھے۔ لیکن بعد کی تمام فتوحات بھی فتح مبین ہی میں داخل ہیں اور ان سب کا پہلا زینہ صلح حدیبیہ ہے۔ لہٰذا "قبل فتح اور بعد فتح" کی تقسیم صلح حدیبیہ ہی سے شروع ہونا قرین قیاس ہے۔

اب دیکھیے صلح حدیبیہ میں جو لوگ تھے انہی نے بیعت رضوان کی اور انہی کے لیے رضائے الٰہی کی آسمانی سند نازل ہوئی کیونکہ اب تک یہ مردانِ خدا جس جنگ میں بھی شریک ہوئے صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہی کے لیے شریک ہوئے اور کوئی دوسری غرض ان کے پیشِ نظر نہ تھی۔ نہ مالِ غنیمت ان کے پیشِ نظر تھا نہ ہوس ملک گیری اور نہ کوئی اور شے۔ ان لوگوں کو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ تم صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کوچ کرو۔ یہی صورت حال ان مہاجرین حبشہ کی بھی تھی جو دو سو کی تعداد میں یہاں آکر مل گئے تھے۔ ان کا مقصد بھی بجز اعلائے کلمۃ اللہ کے اور کچھ نہ تھا۔ ان کی ہجرتِ حبشہ بھی اسی لیے تھی اور ہجرتِ مدینہ بھی۔ بخلاف اس کے جو لوگ صلح حدیبیہ کے بعد اسلام لائے تھے ان میں ابھی وہ پختگی نہ پیدا ہوئی تھی خواہ بعد میں کتنے ہی پکے مومن ہو گئے ہوں۔ ان کے اندر حصولِ غنیمت یا ملک گیری یا انتقامی کارروائی کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لیے آنحضرتؐ کو یہ

اعلان فرمانا پڑا کہ: غزوۂ خیبر میں صرف وہی لوگ شریک ہوں جن کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ نہ ہو۔

ذرا یہاں پر غور کیجیے۔ چوبیس پچیس ہزار کی فوج کی خبر سننے کے بعد کوشش یہ ہونی چاہیے تھی کہ جتنے زیادہ سے زیادہ جنگ جو مقابلے کے لیے تیار ہوں اتنا ہی بہتر ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ صرف سولہ سو[16] ایسے افراد اس معرکے میں شریک ہوئے جن سے زیادہ مخلص اور صادق انسان چشم فلک نے کبھی نہیں دیکھے۔ بتانا یہ تھا کہ اہل ایمان کا مقصد نہ جنگ ہے نہ فتوحات، نہ غنیمت نہ انتقام، نہ ملک گیری نہ کوئی اور شے۔ ان کے پیش نظر صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہے جسے آپ دوسرے لفظوں میں انسانی اقدار کا قیام کہہ لیجیے۔ جو رسولؐ اتنے بڑے اعلیٰ مقصد کو لے کر اٹھا ہو وہ یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوں جنہیں اعلیٰ اقدار کو زندگی میں جذب کرنے کا ابھی پورا موقع میسر نہیں آیا ہے۔ اگر محض فوج کشی مقصود ہوتی تو نہ فقط ان حدیث الاسلام مسلمانوں کو بلکہ آنحضرتؐ بہت سے غیر مسلم حلیف قبیلوں کو بھی ساتھ لے سکتے تھے۔ لیکن آنحضرتؐ کو آج واضح طور پر یہ بتانا تھا کہ مقصدِ جنگ صرف انسانیت کا قیام ہے۔

خیبر کے موقعے پر اس اعلان کی ایک اور بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہود بڑے دولتمند تھے۔ ان کی زمینیں بھی بہت تھیں۔ ان کے قلعے بھی بڑے بڑے تھے۔ زن، زر، زمین وغیرہ کی یہ کشش بہت سے حدیث الاسلام لوگوں کے اخلاص میں فرق ڈال کر اعلیٰ اقدار کو مجروح کر سکتی تھی۔ لہٰذا یہی صحیح موقع تھا کہ قبلِ صلح حدیبیہ اور بعد از صلح حدیبیہ ـــــ یا یوں کہیے کہ قبلِ فتح، اور بعدِ فتح ـــــ میں ایک خطِ امتیاز کھینچ دیا جائے اور واضح طور پر عملاً مقصدِ

قتال کی بلند قدروں کو قائم کر دیا جائے۔

خیبر کی چند اور خصوصیات

اس غزوے کی چند اور خصوصیتیں بھی ہیں۔ ام المومنین ام سلمہؓ حدیبیہ میں موجود تھیں اس لیے وہ اس غزوے میں بھی ساتھ رہیں۔ ان کے علاوہ بعض دوسری عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ ان کی شرکت کا کیا مقصد تھا اسے اس روایت سے سمجھنا چاہیے:

عن نجدۃ بن عامر حروری انہ کتب الی ابن عباس ھل کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغزو بالنساء وھل کان یضرب لھن بسھم؟ ... فقال ابن عباس ... وقد کان یغزو بھن فیداوین الجرحی ویحذین من الغنیمۃ واما سھم فلم یضرب لھن (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

نجدہ بن عامر حروری نے ابن عباسؓ کو خط لکھ کر دریافت کیا کہ کیا آں حضورؐ عورتوں کی معیت میں جہاد فرماتے تھے؟ اور ان کا کوئی حصہ مقرر تھا؟ ... ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ ... ہاں حضورؐ عورتوں کی معیت میں جہاد فرماتے تھے۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور ان کو مناسب حصۂ غنیمت بھی ملا کرتا تھا لیکن (مردوں کی طرح) ان کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا۔

ایک دوسری روایت میں انسؓ سے مروی ہے کہ:

ولقد رأیت عائشۃ وام سلیم وانھما لمشمرتان اری خدم سوقھما تنقلان القرب علی متونھما ثم تفرغانہ فی افواہ القوم ثم ترجعان فتملاٰن فتفرغانہ فی افواھھم (بخاری ومسلم)

میں نے عائشہؓ اور ام سلیمؓ کو (غزوۂ احد میں) دیکھا کہ دونوں بڑی تیز رفتاری

سے کام کر رہی ہیں۔ ان کی پنڈلیاں اس وقت میری نگاہوں کے سامنے تھیں۔ دونوں اپنی اپنی پشت پر مشکیزے اٹھائے ادھر سے ادھر جاتیں اور لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتیں اور پھر واپس آکر مشکیزے بھرتیں اور لوگوں کے منہ میں پانی ڈالتیں۔

گویا عورتوں کی معیت کا مقصد تھا زخمیوں کی مرہم پٹی اور پیاسوں کو پانی پلانا (اور موقع ہو تو تلوار بھی چلانا)۔

دوسری خصوصیت اس غزوے کی یہ ہے کہ اس سے پہلے غزوات میں چھوٹی جھنڈیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن اب کے تین علم (بڑے جھنڈے) تیار کیے گئے۔ ایک عَلَم جو ام المومنین عائشہ رضؓ کے دوپٹے سے تیار کیا گیا تھا حضرت علیؓ کو دیا گیا۔ دوسرے حباب بن منذر کو اور تیسرا اسعد بن عبادہ کو مرحمت ہوا۔

نقشۂ میدانِ جنگ

میدانِ بدر کی طرح یہاں بھی حباب بن منذر ہی کی رائے سے مقام رجیع پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہ اس لیے کہ یہ مقام یہودِ خیبر اور غطفان کے درمیان میں واقع تھا۔ یہود نے غطفانیوں کو یہ لالچ دیا تھا کہ مدینہ فتح ہو جانے کے بعد خیبر کی پیداوار کا آدھا حصہ تم لوگوں کو دیا جایا کرے گا۔ غطفانی چار ہزار سپاہی لے کر خیبر کی طرف چلے لیکن انہوں نے اپنے اور یہود کے درمیان مسلمانوں کے لشکر کو حائل پایا تو انہیں خود اپنی فکر پڑ گئی۔ اور وہ چپکے سے واپس ہو گئے اور یہود کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔

آنحضرتؐ نے ضروری سامان اور عورتوں بچوں کو ایک محافظ دستے کی

نگرانی میں چھوڑ دیا اور تمام جاں نثاروں کو ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہو گئے۔ محافظ دستے کے کیمپ کے سردار سیدنا عثمان رضؓ تھے۔ پیش قدمی کرنے والی فوج کے افسر میمنہ سیدنا عمر رضؓ تھے۔ اور افسر میسرہ ایک دوسرے صحابی۔ مقدمۃ الجیش کی افسری جناب عکاشہ بن محصن کے سپرد تھی۔ حملہ آور دستے کی کمان جناب محمود بن مسلمہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور کمال یہ ہے کہ افسرِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم بذاتِ خود ایک سپاہی کی حیثیت سے اسی حملہ آور دستے میں تھے جس کے کمانڈر سیدنا محمود بن مسلمہ تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے امامِ دو جہاں ہونے کے باوجود آنحضرتؐ نے سیدنا ابوبکر صدیقؓ اور سیدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی اقتدا میں بھی نماز ادا فرمائی ہے۔ یہ اندازِ تربیت دنیا کے ہر مصلح کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔

الغرض یہ جیشِ اسلامی بڑی تیزی سے بڑھا۔ مقامِ صہبا میں نمازِ عصر ادا کی اور رات ہو۔۔۔ تک خیبر پہنچ گیا۔ شب کو جنگ کرنا آنحضرتؐ کے معمول کے خلاف تھا اس لیے سب لوگوں نے رات یہیں گزاری۔

ادھر یہود نے خبر ہوتے ہی جنگی تیاریاں شروع کر دیں لیکن میدان میں آکر مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اس لیے قلعے بند ہو گئے۔ ایک قلعے میں عورتوں بچوں کو محفوظ کیا اور دوسرے میں سامانِ رسد مہیا کیا۔ باقی تمام یہود نے مختلف قلعوں میں داخل ہو کر اندر سے دروازے بند کر لیے ان کے نو دس قلعے تھے جو تین حصوں میں یوں منقسم تھے کہ پہلا حصہ حصنِ نطاۃ تھا جس میں ناعم، صعب، اور زبیر نامی تین قلعے تھے۔ دوسرا حصن شق تھا۔ اس میں برادر اُبی نامی دو قلعے تھے۔ تیسرا حصن کتیبہ تھا اور اس میں وطیح قموص اور سلالم نامی تین قلعے تھے۔

آغازِ جنگ

سب سے پہلے قلعہ ناعم پر محمود بن مسلمہ نے حملہ کیا۔ چار پانچ دن جنگ ہوتی رہی۔ اس دوران میں حضرت محمود ذرا دم لینے کے لیے سایۂ دیوار میں بیٹھ گئے۔ اوپر سے کنانہ بن ربیع بن ابی الحقیق نے ایک چکی کا پاٹ ان کے اوپر گرا دیا اور محمود اس کے صدمے سے جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے بھائی محمد بن مسلمہ نے فوراً کمان سنبھال لی اور یہ قلعہ فتح ہو گیا۔

اسی رات سیدنا عمرؓ پاسبانی کر رہے تھے کہ ایک یہودی پر نظر پڑ گئی اور اسے گرفتار کر لیا۔ اسے امان دیدی گئی اور اسی نے یہ اطلاع دی کہ یہودی آج اپنی عورتوں بچوں کو قلعہ شن میں بھیج رہے ہیں اور نقد و جنس وغیرہ کو قلعۂ نطاۃ میں چھپا رہے ہیں۔ نطاۃ فتح ہونے کے بعد اسی یہودی نے مسلمانوں کو وہ تہہ خانے بھی بتا دیے جہاں یہ چیزیں چھپائی گئی تھیں۔

قلعۂ ناعم فتح ہونے کے بعد سیدنا حباب بن منذر نے قلعۂ صعب کو محاصرے میں لے لیا اور تیسرے دن اسے فتح کر لیا۔ اس قلعے کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس کا فتح کرنا بے حد دشوار (صعب) تھا۔ یہاں سے روغن زیتون، چربی، کپڑے اور قلعہ شکن آلے (منجنیق) ہاتھ آئے۔ اس سے مسلمانوں کی قلتِ رسد کی دشواری بھی کم ہو گئی۔ اور منجنیق قلعۂ بر کو فتح کرنے میں کام آئے۔ اگلے روز حصن نطاۃ بھی فتح ہو گیا لیکن اس حصن میں قلعۂ زبیر کو فتح کرنا دشوار نظر آیا کیونکہ یہ ایک اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ دو روز کے بعد ایک یہودی ہی نے مسلمانوں کو بتایا کہ تم اس قلعے کو مہینہ بھر میں بھی فتح نہیں کر سکتے۔ فتح کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس زیر زمین نالی پر قبضہ کر لو جس کے ذریعے

قلعے کے کنوؤں میں پانی کا ذخیرہ جمع ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے جب اس نالی پر قبضہ کر لیا تو یہود کھلے میدان میں باہر آ کر لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر جلد ہی یہ قلعۂ زبیر بھی فتح ہو گیا۔

اب حباب بن منذر —— جو ابھی قلعۂ صعب کو فتح کر چکے تھے —— قلعۂ اُبَی کی طرف بڑھے۔ عزوان نامی ایک یہودی بہادر مقابلے کے لیے نکلا۔ جناب حباب نے پہلے ہی وار میں اس کا دایاں بازو الگ کر دیا وہ بھاگا، مگر حباب نے تعاقب کر کے اسے تلوار پر رکھ لیا۔ دوسرا بہادر مقابلے کے لیے باہر آیا۔ ایک مسلمان سپاہی کو گرا کر ختم کر دیا۔ مگر فوراً حضرت ابو دجانہ لپکے اور اس کے پاؤں کاٹ کر اسے قتل کر دیا۔ اب کسی یہودی کو آگے بڑھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے یہودیوں کے اس احساسِ مرعوبیت کو بھانپ لیا اور جناب ابو دجانہ مسلمانوں کو لے کر تکبیر کے دل ہلا دینے والے نعروں کے ساتھ جھپٹ پڑے اور ہر طرف سے دیواروں پر چڑھنے لگے۔ یہ دیکھ کر اہل قلعہ بھاگ کھڑے ہوئے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ یہاں سے کافی مقدار میں بکریاں، کپڑے، اور کچھ دوسرے سامان ہاتھ آئے۔

اس کے بعد مسلمانوں نے حصن البر پر حملہ کیا۔ یہاں کے قلعہ نشینوں نے بے حد تیر اور پتھر برسائے۔ اس کے مقابلے کے لیے مسلمان وہ منجنیق لائے جو قلعہ صعب سے ہاتھ آئے تھے۔ قلعہ شکن منجنیقوں سے قلعۂ بر کی دیواریں گرا دی گئیں، اور مسلمانوں کی ایک یورش میں قلعہ فتح ہو گیا۔

اب قلعہ قموص دیا قموص، کی باری آئی۔ اس کا بیس دن محاصرہ رہا۔ سیدنا ابو بکرؓ و سیدنا عمرؓ نے بھی کوشش کی لیکن اندر پہنچنے کی کوئی سبیل نظر نہ آئی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ باہر کوئی مقابلے کے لیے نکلا ہی نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا: کل میں یہ

عَلَم اس کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محب بھی ہے ، اور محبوب بھی۔ اللہ اس کے ہاتھ سے یہ قلعہ فتح کرا کے رہے گا۔" دوسرے دن آنحضرتؐ نے وہ عَلَم حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا۔ ان کی دُکھتی ہوئی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگایا جس سے جوشِ چشم کی تکلیف جاتی رہی۔

یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ اس نازک موقعے پر آنحضرتؐ نے رخصت کرتے وقت سیدنا علیؓ سے فرمایا: "پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کرنا۔ قتال کی نوبت اس کے بعد آتی ہے۔ یاد رکھو اگر ان میں سے ایک شخص بھی اسلام قبول کر لے تو یہ نعمت سو سرخ بالوں والے اونٹوں سے بہتر ہے۔" یقین ہے کہ سیدنا علیؓ نے اس ارشادِ نبوی کی حرف بہ حرف تعمیل کی ہو گی اگرچہ سیرت نگار اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ آں حضرتؐ نے دوسرے نبرد آزماؤں کو بھی ایسی ہی ہدایت فرمائی ہو گی ، اور انہوں نے بھی تعمیل حکم کی ہو گی کیونکہ یہ اعلان آنحضرتؐ نے شروع ہی میں فرما دیا تھا کہ "اس معرکے میں وہی شریک ہو جس کا مقصد صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔"

اس موقعے پر سب سے پہلے مرحب رجز پڑھتا ہوا میدان میں آیا۔ اور اس کے جواب میں سیدنا عامر بن اکوع رجز پڑھتے ہوئے بڑھے۔ مرحب نے ان پر وار کیا جسے انہوں نے اپنی سپر پر صاف روک لیا اور ساتھ ہی مرحب کے پاؤں پر ایک وار کیا۔ ان کی تلوار چھوٹی تھی۔ گھوم کر تلوار خود ان کے اپنے پاؤں پر لگی اور اس زخم سے یہ جانبر نہ ہو سکے۔ اس کے بعد سیدنا علیؓ رجز پڑھتے ہوئے بڑھے اور تلوار کا ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ تلوار اس کے خود اور سر کو چیرتی ہوئی گردن تک پہنچ گئی۔ یہ دیکھ کر مرحب کا بھائی یاسر تیزی سے

اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے حضرت علیؓ کی طرف لپکا مگر ابھی راستے ہی میں تھا کہ حضرت زبیر بن عوام کا ایک بھرپور ہاتھ یاسر کے سر پر پڑا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس کے بعد عام یورش ہوئی۔ سیدنا علیؓ نے ایک ہی دھکے میں قلعے کا دروازہ توڑ کر گرا دیا اور مسلمان قلعے کے اندر گھس گئے۔ اس طرح یہ مستحکم قلعہ بھی فتح ہو گیا۔

پھر قلعۂ وطیح اور قلعۂ سلالم کی نوبت آئی۔ سلالم کو حصن ابن ابی الحقیق بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے ان دونوں قلعوں کا محاصرہ کر لیا اور چودہ دن تک یہ محاصرہ جاری رہا۔ آخر یہاں بھی منجنیقوں کو کام میں لانے کا ارادہ کیا گیا۔ یہود یہ دیکھ کر ڈر گئے اور صلح کی درخواست کی۔ مصالحت کے بعد یہ دونوں قلعے بھی فتح ہو گئے۔

اب صرف قلعۂ شق رہ گیا۔ اس کو فتح کرنے میں کوئی مقابلہ نہ پیش آیا، کیونکہ یہاں صرف عورتیں بچے تھے۔ بغیر کسی معرکے کے یہ قلعہ بھی آسانی سے فتح ہو گیا۔

یہ تمام فتوحات کس چیز کا نتیجہ تھیں؟ صرف صلح حدیبیہ کا۔ صلح حدیبیہ کے بعد اہلِ مکہ کی کوئی امداد اہل خیبر کو نہ مل سکتی تھی کیونکہ ایک تو یہ (NON-AGGRESSION PACT) تھا اور دوسرے بیعتِ رضوان کے جوش و خروش نے اہلِ مکہ کو مرعوب کر دیا تھا اور تیسرے خود اہلِ مکہ میں اسلام کے اثرات تیزی سے نفوذ کر رہے تھے۔ ان تمام باتوں کے اجتماع نے صلح حدیبیہ کو فتحِ مبین بنا دیا اور خیبر کے قلعوں کی فتح پہلی فتحِ مبین تھی۔ یہ فتحِ مبین کا آغاز تھا اور بعد کی فتوحات اسی فتحِ مبین کے سلسلۂ دراز کی کڑیاں تھیں۔

یہود کی درخواست

خیبر کے اس پورے معرکے میں ۹۳ یہود اور ۱۵ مسلمان کام آئے۔ فتح کے بعد یہودِ خیبر نے آں حضرتؐ کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ خیبر کی زمینیں انہی کے قبضے میں رہنے دی جائیں اور وہ پیداوار کا نصف حصہ مسلمانوں کو ادا کر دیا کریں گے۔ آں حضرتؐ نے یہود کی یہ درخواست منظور فرمالی۔ اسی لفظ خیبر سے لفظِ مخابرت نکلا ہے جسے مزارعت اور مساقات بھی کہتے ہیں جس کے معنی ہیں زمین کو بٹائی پر دینا۔ فقہا میں بڑا اختلاف ہے کہ زمین کو بٹائی پر دینا جائز ہے یا نہیں اور جائز ہے تو کن شرائط کے ساتھ جائز ہے؟ ہمارے نزدیک یہ اولی الامر کی صوابدید پر موقوف ہے

یہاں قدرت کا ایک کرشمہ دیکھیے۔ یہود نے عطفانیوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے پر خیبر کی نصف پیداوار کی شرط پر ابھارا تھا۔ مگر آج وہ یہود اسی شرط پر مسلمانوں سے صلح کی درخواست کر رہے ہیں۔

عدل کا مثالی نمونہ

خیبر میں جب بٹائی کا وقت آتا تو آں حضرتؐ عبداللہ بن رواحہ کو وہاں بھیجتے۔ عبداللہ بن رواحہ پیداوار کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے یہود سے کہتے کہ: ان دونوں میں سے جو حصہ تم پسند کرو وہ لے لو۔" یہود یہ انصاف وتنصیف دیکھ کر کہتے کہ: بلاشبہ زمین و آسمان ایسے ہی عدل سے قائم ہیں۔"

تقسیم کا یہ انداز ایسا ہے کہ خود غرضی کی جگہ فراخدلانہ عدل کار فرما ہوتا ہے اور کوئی باہمی جھگڑے کا موقع نہیں آسکتا۔

تقسیم غنائم اور اسوۂ رسولؐ

آں حضرتؐ نے غنیمتوں کو اٹھارہ سو ۱۸۰۰ حصوں میں تقسیم فرمایا۔ ایک ایک حصہ تو سولہ سو پیدل فوج کو ملا۔ ان میں دو سو سوار بھی تھے جن کو ایک ایک حصہ مزید دیا گیا۔ اس طرح کل اٹھارہ سو حصے ہوئے۔ اس تقسیم میں جو اعلیٰ ترین انسانی قدر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ سرورِ دو عالمؐ نے اپنا حصہ بھی ایک معمولی سپاہی کے برابر ہی رکھا۔ آں حضرتؐ اپنے لیے جتنا چاہتے رکھ سکتے تھے اور ایک مسلمان فرد کو بھی اس میں کوئی عذر نہ ہوتا لیکن آں حضرتؐ نہ فقط عدل و مساوات کا عملی نمونہ پیش فرمانا چاہتے تھے بلکہ رہتی دنیا تک ہر مصلح قوم کے لیے ایک اسوۂ عمل بھی چھوڑنا چاہتے تھے۔ یہی تو ہیں وہ اعلیٰ انسانی اقدار جن کے لیے رسالت کی ساری تگ و دو ہو رہی تھی۔

آں حضرتؐ نے جو غنیمت تقسیم فرمائی وہ کل غنیمت کا نصف حصہ تھی۔ بقیہ نصف کو وفود کی میزبانی، ناگہانی ضروریات اور دیگر مصالح امت کے لیے محفوظ فرما دیا۔ ہر اسٹیٹ کے لیے ایسے فنڈ ضروری ہوتے ہیں جو اسٹیٹ کی اجتماعی ضروریات کے کام آئیں اور عین وقت پر دشواریوں کا سامنا نہ ہو۔

سیدنا عمرؓ نے اپنا حصہ کارِ خیر کے لیے وقف کر دیا اور یہ اسلام میں پہلا وقف تھا۔

غطفانیوں پر نظرِ کرم

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ یہودِ خیبر نے غطفانیوں کو نصف پیداوارِ خیبر

کی شرط پر مسلمانوں کے خلاف ابھارا تھا اور یہ چار ہزار فوج لے کر خیبر کی طرف چل بھی پڑے تھے اور اگر یہ رجیع میں مسلمانوں کو حائل نہ پاتے تو یہودِ خیبر کی مدد کو پہنچ بھی جاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ غطفانی مجبوراً واپس گئے اور براہِ راست مسلمانوں سے لڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔ انھوں نے مسلمانوں سے جنگ نہ کر کے مسلمانوں پر کوئی احسان نہ کیا تھا بلکہ خود اپنے اوپر احسان کیا تھا۔ اور کم سے کم اتنی بات تو یقینی تھی کہ یہود کی حمایت میں مسلمانوں پر مدینے پہنچ کر حملہ کرنے کے لیے آمادہ ہو جانا اور مسلمانوں کی آمد سن کر چار ہزار آدمیوں کو لے کر یہود کی امداد کے لیے چل پڑنا بجائے خود ایک قابلِ سزا اقدام تھا، ورنہ کم از کم یہ کسی انعام کے مستحق تو ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ لیکن آں حضرتؐ جن اقدار کو قائم کرنے کے لیے آئے تھے ان میں صرف عدل ہی نہ تھا بلکہ تقاضائے رحمت ہر چیز پر غالب تھا۔ اور تقاضائے رحمت میں انتقامی کارروائیوں کی گنجائش کہاں رہتی ہے؟

یہ غطفانی آں حضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ: ہم لوگوں نے اس جنگ میں یہود کا ساتھ نہیں دیا اس لیے غنیمت میں کچھ حصہ ہمارا بھی ہونا چاہیے۔" ——— ظاہر ہے کہ صرف دشمن کا ساتھ نہ دینا کسی انعام کا حقدار نہیں بناتا۔ قانونِ عدل کے مطابق غنیمت کے مستحق وہ ہوتے ہیں جو جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں یا کم سے کم وہ پہلے مسلمانوں سے مل کر انعام کے وعدے پر دشمن کا ساتھ نہ دینے کا عہد کریں۔ یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی، اور قانونی لحاظ سے یہ کسی انعام کے مستحق نہ ہو سکتے تھے جب کہ دشمن کا ساتھ دینے کے لیے گھروں سے چل بھی پڑے تھے۔ لیکن رحمۃٌ للعالمینؐ کے در سے سوالی خالی ہاتھ لے کر کیسے واپس جا سکتا تھا۔ آں حضرتؐ نے ان کی درخواست

منظور فرمالی اور ذوالرقیبہ کا پہاڑی علاقہ انہیں دے دیا۔ دراصل تالیفِ قلب بھی ایسی اخلاقی قدر ہے جسے کوئی ریاست نظر انداز نہیں کر سکتی۔ خود قرآن نے بھی مالِ صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا ہے۔ اس کے خوشگوار نتائج دور رس ہوتے ہیں فوری نہیں ہوتے۔

جعفر بن ابی طالبؓ کی آمد

آں حضرتؐ ابھی خیبر ہی میں تھے کہ حبشے سے حضرت جعفر بن ابی طالب آکر مل گئے۔ انہوں نے حبشے میں جو اسلامی خدمات انجام دیں ان کا حال آپ ہجرت حبشہ کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کی آمد کی آں حضرتؐ کو بےحد خوشی ہوئی۔ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ: میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے فتح خیبر کی خوشی زیادہ ہوئی یا آمدِ جعفر کی۔

نکاح ام المومنین صفیہؓ

سیدہ صفیہؓ سیدنا ہارونؑ کی نسل سے تھیں اور اس حیی بن اخطب کی دختر تھیں جو اسلام اور اہلِ اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ جنابِ صفیہؓ قلعہ قموص کے قیدیوں میں آئی تھیں اور بحیثیت قیدی کنیز کے حضرت دحیہؓ کلبی کے حصے میں آئی تھیں۔ بعض صحابہ نے حضورؐ سے عرض کیا کہ: یہ بنو نضیر کے سردار کی بیٹی ہیں، ان کے ساتھ عام قیدیوں کا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔" دحیہؓ نے انہیں آں حضرتؐ کے سپرد کیا۔ آں حضرتؐ نے انہیں آزاد کر دیا۔ اس کے بعد ان کی مرضی سے نکاح فرمالیا۔ وہ قید ہو کر نہ آتیں جب بھی اور دحیہؓ کلبی کے پاس رہتیں جب بھی، آج انہیں کون جانتا؟ مگر آں حضرتؐ نے نہ فقط عورتوں

ہی کا درجہ بلند فرمایا بلکہ ایک دشمنِ دین کی بیٹی کو یہ درجہ مرحمت فرمایا کہ وہ ام المومنینؓ اور زندۂ جاوید شخصیت بن گئی۔ آں حضرتؐ کی خدمت میں انہیں جو دولتِ ایمان نصیب ہوئی اس لاثانی مسرت کو صفیہؓ ہی بتا سکتی ہیں۔ باپ (حیی بن اخطب) زندہ ہوتا تو صفیہؓ اللہ جانے کتنی بار اسے اپنے مقدس شوہر کے قدموں پر قربان کر دیتیں۔

اس مبارک نکاح کے بعد یہود سے آں حضرتؐ کی مصاہرت قائم ہو گئی اور ان تک آوازِ اسلام کے پہنچنے کے ذرائع آسان و وسیع ہو گئے۔ مغلوبیت نے سیاسی طور پر اور اس نکاح نے معاشری و اخلاقی طور پر یہ نتیجہ پیدا کیا کہ اس کے بعد پھر کبھی یہود کا کوئی فتنہ سر نہ اٹھا سکا۔

ارادۂ قتل کے بعد درگزر

اجتماعی طور پر تو یہود پھر نہ اُٹھے لیکن انفرادی طور پر یہ شرارتیں کرنے سے باز نہ آتے تھے۔ ایک دن ایک یہودیہ زینب بنت حارث نے آں حضرتؐ کی خدمت میں بھنا ہوا گوشت زہرِ ہلاہل ملا کر بھیجا۔ اس وقت آں حضرتؐ خیبر ہی میں تشریف فرما تھے۔ آں حضرتؐ نے گوشت کا پہلا ہی لقمہ چکھ کر تھوک دیا اور فرمایا کہ: یہ گوشت بتاتا ہے کہ زہر ملا ہوا ہے۔" اس وقت حضرت بشیر بن براء بن معرور بھی آں حضرتؐ کے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ جب آں حضرتؐ نے اپنا پہلا لقمہ اگل دیا تو عرض کیا: یا رسول اللہ! لقمہ مجھے بھی بدمزہ معلوم ہوا تھا لیکن چبائے ہوئے لقمے کو حضورؐ کے سامنے تھوکنا خلافِ ادب تھا۔ اس لیے میں اسے نگل گیا۔" زینب سے باز پرس ہوئی تو اس نے اقرارِ جرم کرتے ہوئے اپنا بیان دیا کہ: میں نے یہ حرکت اس لیے

کی تھی کہ اگر آپ نبی ہیں تو آپ کو اس کا حال معلوم ہو جائے گا اور اگر آپ نبی نہیں ہیں تو آپ کا ختم ہو جانا ہی مناسب ہے۔" آں حضرتؐ نے زینب سے کوئی انتقام نہ لیا حالانکہ عرصۂ دراز تک زہر کی تکلیف محسوس فرماتے رہے لیکن جب حضرت بشیرؓ نے اسی زہر سے انتقال فرمایا تو ان کے قصاص میں زینب کو قتل کر دیا گیا۔ اور کنانہ ابن ربیع کو بھی جس نے چکی کا پاٹ گرا کر حضرت محمود بن مسلمہ کو شہید کیا تھا، قصاص میں محمد بن مسلمہ نے قتل کیا۔

غزوہ وادی القریٰ

خیبر سے فارغ ہو کر آں حضرتؐ وادی القریٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ جگہ تیما اور خیبر کے درمیان واقع ہے۔ یہاں جب اہل اسلام پہنچے تو یہاں کے یہودیوں نے کوئی گفت و شنید کیے بغیر ہی تیر اندازی شروع کر دی۔ آں حضرتؐ کے ایک خادم مدعمؓ اونٹ سے محمل اتارتے ہوئے ایک تیر کھا کر جاں بحق ہوئے۔ جب اہل اسلام نے حملے سے اس کا جواب دیا تو تھوڑے مقابلے کے بعد یہ لوگ گفتگوئے مصالحت پر مجبور ہو گئے اور نصف پیداوار ادا کرنے پر اسی طرح صلح کر لی جس طرح اہل خیبر نے کی تھی۔

فتح فدک

وادی القریٰ سے متصل ہی یہود کا ایک اور مسکن تھا جس کا نام ہے

فدک۔ انہوں نے جب فتح خیبر کا حال سنا تو مقابلے کا ارادہ ہی ترک کر دیا، اور آنحضرتؐ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ: ہماری جانوں کو محفوظ رہنے دیا جائے اور اس کے عوض میں ہمارا تمام مال و اسباب لے لیا جائے۔" آں حضرتؐ نے اسے منظور فرمالیا۔

جو کچھ دشمن سے جنگ کیے بغیر حاصل ہوا اسے قرآنی اصطلاح میں فَے کہتے ہیں۔ قرآن پاک نے ایسی جائدادوں کا مصرف بھی بتا دیا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْ اَھْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰہِ — اللہ نے اپنے رسول کو جو کچھ ان اہل آبادی سے دلوایا وہ اللہ یعنی بیت المال کا ہے

(ا) وَلِلرَّسُوْلِ رسول کے لیے ہے (اور بعد از رسولؐ سربراہِ ریاست کے لیے)۔

(ب) وَلِذِی الْقُرْبٰی (سربراہِ ریاست کے) قرابتداروں کے لیے۔

(ج) وَالْیَتٰمٰی یتیموں کے لیے۔

(د) وَالْمَسٰکِیْنِ مسکینوں کے لیے۔

(ہ) وَابْنِ السَّبِیْلِ ...... مسافر کے لیے۔ ۵۹:۷

(و) لِلْفُقَرَآءِ الْمُھٰجِرِیْنَ..... حاجتمند مہاجرین کے لیے۔

(ز) وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ جو ان مہاجرین کی ہجرت سے پہلے ہی ایمان لاکر مدینے میں مقیم ہو گئے یعنی انصار کے لیے۔ ۵۹:۹

(ح) وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْ بَعْدِھِمْ... جو لوگ ان کے بعد آئیں ان کے لیے۔ ۵۹:۱۰

جو کچھ جنگ کے بعد دشمن سے حاصل ہوا اسے غنیمت کہتے ہیں اور اس کا مصرف یہ بتایا گیا ہے:

واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ خمسہ ۔ — جو کچھ تمہیں غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے یعنی حکومتِ اسلامیہ کے بیت المال کے لیے ہے (باقی مجاہدین کے لیے)

(ا) وللرسول اور (اس پانچویں میں سے ایک حصہ) رسول کے لیے، (اور بعد از رسول سربراہِ حکومت کے لیے)

(ب) ولذی القربیٰ اور قرابتداروں کے لیے

(ج) والیتٰمیٰ اور یتیموں کے لیے

(د) والمساکین اور مسکینوں کے لیے

(ہ) وابن السبیل اور مسافر کے لیے ۔ ۸: ۴۱

امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک بعد از رسولؐ، رسولؐ کا حصہ، اور قرابتدار رسول کا حصہ یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل پر صرف کیا جائے گا۔ لیکن ہماری ناچیز رائے میں رسولؐ کے بعد جو بھی رسولؐ کے مشن کو چلانے کی ذمے داری لے گا وہی حصۂ رسولؐ پانے کا حقدار ہوگا اور اس کے قرابتداروں کے لیے وہی حصہ ہوگا جو قرابتداران رسول کے لیے تھا کیونکہ سربراہِ مملکت کی صرف اپنی ذاتی ہی ضرورتیں نہیں ہوتیں۔ اس کے بال بچے وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ ہاں اگر مملکت کوئی دوسرا متبادل انتظام کر دے تو پھر امام اعظم کے مسلک پر عمل ہوگا۔ یعنی سب کچھ اسٹیٹ کی ملکیت ہوگا اور اسٹیٹ ہر فردِ مملکت کی ضروریات کی ذمے دار ہوگی۔ سربراہِ مملکت بھی تمام افرادِ مملکت کی طرح ایک غیر ممتاز فرد ہوگا اور وہ بھی عام لوگوں کی طرح — جن میں یتامیٰ، مساکین، مسافر وغیرہ سب داخل ہیں — ایک فردِ مملکت ہوگا۔

خمس غنیمت اور فے کے متعلق جو للہ وللرسول کہا گیا ہے اس سے

مراد رسولؐ کی ملکیت نہیں۔ آں حضرتؐ نے نہ اپنی کوئی جائداد بنائی اور نہ اس لیے آں حضرتؐ دنیا میں تشریف لائے تھے۔ آں حضرتؐ چونکہ خدا کا کام کر رہے تھے اس لیے خدا نے آپؐ کے اور آپ کے اہل و عیال کے لیے خمس غنیمت اور فے کو "خالصہ" قرار دیا۔ آں حضرتؐ کے بعد یہ خالصہ بطور وراثت تقسیم نہیں ہوگا بلکہ یہ اس کے مصرف میں آئے گا جو آں حضرتؐ کے بعد اسلامی نظام کو چلانے کی ذمے داری لے اور اپنے تمام وقت کو اور ساری قوتوں کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دے اور اس کے پاس کوئی وقت اپنے یا اہل و عیال کے معاشی سہارے کے لیے نہ رہے۔ اگر کسی گورنر سے یہ کہہ دیا جائے کہ فلاں گاؤں کی آمدنی سے اپنا گزارا کرو تو وہ گاؤں اس گورنر کی ملکیت نہیں بن جائے گا۔ اور وہ اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں میں تقسیم نہیں ہوگا بلکہ جب تک وہ گورنر ہے اس گاؤں کی آمدنی کو مصرف میں لائے گا اور جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگا تو اس گاؤں کی آمدنی سے وہ فائدہ اٹھائے گا جو اس کی جگہ گورنر بن کر آئے۔ اور اگر اس گاؤں کی آمدنی کی بجائے کوئی اور روزینہ یا تنخواہ یا الاؤنس ریاست کی طرف سے مقرر ہو جائے تو گاؤں کی آمدنی ریاست کے دوسرے مصارف میں صرف ہوگی۔

ہمارے عقیدے میں تو سارا جہان ہی محمد رسول اللہ کا ہے اور امت کے پاس جو کچھ ہے وہ سب آں حضرتؐ ہی کا ہے لیکن اسے فراموش نہ کرنا چاہیے کہ حضورؐ کے پاس جو کچھ ہے وہ ساری امت کا ہے۔ چند مخصوص افراد کا نہیں۔ ذاتی ملکیت کے گھٹیا تصور اور خاندان کے لیے جائداد بنانے کے پست رجحان سے سید عالمؐ کی ذات اقدس بلند، بہت بلند، ارفع اور بے حد ارفع ہے آں حضرتؐ کسی کے معاشی سہارے کے لیے اگر کوئی

جائداد چھوڑ جاتے تو سب سے پہلے اپنی ازواجِ مطہرات کے لیے چھوڑتے اس لیے کہ عقدِ ثانی از روئے قرآن ان کے لیے حرام تھا اور ان کی گزر اوقات کا اور کوئی سہارا موجود نہ تھا۔ آں حضرتؐ اپنی بیوی بچوں کے لیے جائداد بنانے کا کوئی ادنیٰ تصور بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ ہاں ایک ایسی مثالی مملکت اور ایسے پاکیزہ معاشرے کی بنیاد رکھ گئے جو ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کی ذمے دار تھی۔ خواہ بیوی ہو یا اولاد، رشتے دار ہوں یا غیر رشتے دار، بڑے ہوں یا چھوٹے، عورتیں ہوں یا مرد، اور مسلم ہوں یا غیر مسلم، خود سربراہ ہو یا رعایا، اس مملکت میں جو بھی تھا اس کی ساری ذمے داریاں مملکت کے کاندھے پر تھیں۔ ذرا سوچیے کہ ایک ایسی مثالی مملکت میں بال بچوں کے لیے جائداد بنانے کا کام خواہ کسی اور کے لیے زیب دے مگر محمد رسول اللہؐ جیسے سربراہِ مملکت کے لیے تو تصور میں بھی نہیں آتا۔ اگر سربراہ بننے سے پہلے کسی نے کچھ پیدا کیا ہو تو وہ اس کی ملکیت ہو سکتا ہے لیکن سربراہ بننے کے بعد اسے اپنے لیے کچھ پیدا کرنے کی نہ مہلت مل سکتی ہے اور نہ اسے اس کا حق رہتا ہے۔ اس کا سارا وقت اور تمام صلاحیتیں مملکت کے لیے مختص ہو جاتی ہیں۔ اور مملکت اس کی ضروریات کی ذمے دار ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جو سربراہ ہو گا اس کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو گا۔ سرورِ دو عالمؐ نے یہی مثال قائم فرمائی اور خلفائے راشدینؓ نے اسی سنّت کی پیروی کی۔

کعب بن اشرف اور ابو رافع کا قتل

یہ دونوں واقعاتِ قتلِ خیبر سے پہلے کے ہیں لیکن ہم ان کو آخر میں اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ محلِ نظر ہیں۔

سیرت نگار بڑی بے تکلفی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کعب ابن اشرف یہودی کو قتل کرنے محمد بن سلمہ، عباد بن بشر، حارث بن اوث، ابوعبیس بن جبر اور ابونائلہ سلکان بن سلامہ حضورؐ کی مرضی سے روانہ ہوئے، اور ایک خاص دھوکے سے کعب بن اشرف کو اس کے گھر جاکر قتل کر دیا۔ اور حضورؐ اس سے خوش ہوئے۔ یہ قاتلین انصاری بنی اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ لہذا بنی خزرج کو بھی ایسی ہی "نیکی" کرنے کا شوق پیدا ہوا اور عبداللہؓ بن عتیک، عبداللہ بن انیس، ابوقتادہ حارث بن ربعی، مسعود بن سنان اور خزاعی بن اسود نے حضورؐ کی مرضی سے ابورافع یہودی کو شب کی تاریکی میں مکان کے اندر قتل کر دیا۔ اور حضورؐ نے اسے بھی پسند فرمایا۔ ان دونوں روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے قتل کعب کے لیے دھوکے سے کام لینے کی خود ہدایت فرمائی۔ اور اس وفد کو بقیع الغرقد تک رخصت فرمانے کے لیے تشریف لے گئے۔ اور قتل ابورافع کے لیے عبداللہؓ بن عتیک کو امیر مقرر فرمایا۔ نیز قتل کعب کے بعد حارث بن اوس کو جو زخم لگا تھا، اسے حضورؐ نے لعاب دہن لگا کر اچھا کر دیا۔ اور قتل ابورافع کے سلسلے میں عبداللہؓ بن عتیک کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ حضورؐ نے اسے بھی ہاتھ پھیر کر اچھا کر دیا۔ کیونکہ حضورؐ دھوکے کے اس قتل سے ہر طرح راضی تھے۔

اس وقت ہم ان تمام اسلامی قوانینِ قتال و قتل اور اخلاقی اقدار کا ذکر نہیں کریں گے جن کو ایک ایک قدم پر حضورؐ نے خود بھی ملحوظ رکھا۔ اور سب کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ہم صرف اتنا ہی عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ بغیر حالت حرب کے کسی کے مکان پر جاکر دھوکے سے قتل کرنے کی اجازت نہ اسلام میں ہے۔ اور نہ رسول اللہؐ کی اعلیٰ ترین سیرت سے اسے کوئی

تطابق حاصل ہے۔ محمد رسول اللہؐ کی طرف اس کا وہم بھی نہیں ہو سکتا ہم دیکھتے ہیں کہ ابو برار کلابی کی درخواست پر حضورؐ نے ستر قرار و فضلاء کو قبیلہ کلاب میں دین پھیلانے کے لیے بھیجا۔ بیر معونہ پر پہنچ کر یہ سب کے سب دھوکے سے قتل کر دیے گئے۔ دو آدمی بچ گئے جن میں سے ایک عمرو بن امیہ نے باغ میں پناہ لیتے ہوئے بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا۔ یہ دھوکے کا جواب تھا۔ لیکن حضورؐ نے ان دونوں کا خون بہا ادا کرنے کا حکم دیا۔ ہمارے سیرت نگار اس واقعے کو بھی لکھتے ہیں اور کعب و ابو رافع کے قتل کے واقعے کو بھی۔ لیکن ذرا سوچیے کہ ان دونوں کے اخلاقی اقدار میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ ان دونوں واقعات کے محلِ نظر ہونے پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے ہم اس وقت زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔

ادائے عمرہ

آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے مطابق جو ۱۴۰۰ مسلمان حدیبیہ سے واپس آ گئے تھے اور آئندہ سال انہیں ادائے عمرہ کی اجازت دی گئی تھی۔ اب فتح خیبر سے واپس ہونے کے بعد آں حضرتؐ نے اعلان فرما دیا کہ: تمام وہ لوگ جو صلح حدیبیہ میں موجود تھے خصوصاً اور دوسرے مسلمان عموماً ادائے عمرہ کے لیے سفر کی تیاری کریں۔" چنانچہ ذوقعدہ ۷ھ میں دو ہزار مسلمان آں حضرتؐ کی معیت میں مکے کی سمت روانہ ہو گئے۔ مکے سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک جگہ بطن یاجج میں تمام اسلحہ رکھ دیے گئے، اور دو سو

سواروں کا دستہ حفاظت اسلحہ کے لیے یہاں متعین کر دیا گیا۔ عربوں کا یہ عام دستور ہی تھا کہ ہتھیاروں کے بغیر کہیں سفر نہیں کرتے تھے۔ اس عادت کے علاوہ بھی مسلمانوں کو ہر وقت چوکس اور ہوشیار رہنا پڑتا تھا۔ بطن یا جج میں آٹھ میل کے فاصلے پر ہتھیاروں کو سوار دستے کی حفاظت میں اس لیے بھی رکھ دیا گیا ہو گا کہ خدانخواستہ اگر اہل مکہ اپنے معاہدے کے خلاف چھیڑ چھاڑ کریں؛ اور دفاع کی نوبت مجبوراً آجائے تو نہتے ہونے کی وجہ سے مسلمان مار نہ کھائیں بلکہ ایک آواز میں بطن یا جج سے اسلحہ پہنچ جائیں۔

اس کے بعد اہل اسلام اپنی دبی ہوئی آرزوئیں لیے مکے میں داخل ہوئے۔ آں حضرتؐ کی اونٹنی کی مہار عبداللہ بن رواحہ تھامے تھے اور خوشی سے رجز پڑھتے جاتے تھے۔ معاہدۂ حدیبیہ کے مطابق کسی مسلمان کے پاس تلوار کے سوا اور کوئی ہتھیار نہ تھا۔ تلواریں بھی نیام میں اور نیام تھیلوں میں۔ اہل مکہ نے اپنے عہد کے مطابق مکہ خالی کر دیا تھا اور جبل ابوقبیس پر چڑھ کر اہل اسلام کے عمرے کا نظارہ کرتے رہے۔ مسلمان خیبر سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ پھر یہ طویل سفر طے کیا تھا۔ علاوہ ازیں یہ آسودہ حال بھی نہ تھے۔ پیہم ریاضتوں، اور جہادوں میں مصروف رہتے اس لیے ان کے چہروں پر وہ شگفتگی نہ تھی جو خانہ نشین آرام طلب اور عیش پسند لوگوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔ ان کے معصوم چہروں پر طہارت و تقوے کے جو آثار ایمان و عمل کے جو انوار برس رہے تھے وہ ان بے بصیرت اہل مکہ کو کہاں سے نظر آ سکتے تھے؟ انہیں اہل اسلام کے تن و توش نظر نہ آئے تو سمجھے کہ مسلمانوں کو مدینے کی آب و ہوا نے کمزور کر دیا ہے۔ آنحضرتؐ نے ان کے اس وہم کو محسوس فرما لیا اور حکم دیا کہ: تمام مسلمان پہلے تین طوافوں میں دبدبے اور شان کے ساتھ مونڈھوں کو جنبش دیتے ہوئے دوڑیں۔" اس

طریق کو ہرمَل کہتے ہیں اور یہ سنت آج تک جاری ہے۔

تین دن پورے ہوتے ہی قریش نے حضرت علیؓ کی معرفت کہلا بھیجا کہ معاہدے کی رو سے اب مسلمانوں کو واپس جانا چاہیے۔ آں حضرتؐ نے فوراً کوچ کا حکم دیا اور مسلمان واپس ہو گئے۔ اہل مکہ نے جب واپس آکر اپنے گھروں کو دیکھا تو حیرت سے ان کے منہ کھلے رہ گئے کیونکہ کسی کا ایک تنکا ادھر سے ادھر نہیں ہوا تھا اور کسی کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ نقصان بھی نہیں ہوا تھا۔ یہی تو ہیں وہ اخلاقی اقدار جن کے بقا و تحفظ کے لیے آں حضرتؐ مبعوث ہوئے تھے۔ اگر صحابہ میں اتنی بات بھی پیدا نہ ہوئی ہوتی تو محض عمرہ و حج سے کیا ہو سکتا تھا؟

دختر کشی اور دختر پروری

بعض عرب لڑکی کی پیدائش کو اپنے لیے ننگ تصور کرتے تھے اور اس ننھی سی معصوم جان کی ولادت سے اس درجے کبیدہ خاطر ہوتے تھے کہ زمین میں گڑھا کھود کر اسے زندہ دبا دیتے تھے اور اسے ظلم نہیں بلکہ نشانِ عزت و فخر سمجھتے تھے۔ آج کے مہذب دور میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور یقین نہیں آسکتا کہ کیا باپ اپنی لختِ جگر کے ساتھ ایسی انسانیت سوز اور اخلاق کش حرکت بھی کر سکتا ہے۔ لیکن احادیث میں اس کے واقعات موجود ہیں اور خود قرآن پاک نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

واذا بشر احدھم بالانثی ظل	ان میں سے کسی کو لڑکی پیدا ہونے کی خوشخبری
وجھہ مسودا وھو کظیم ۝ یتواری	دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر سیاہی
من القوم من سوء ما بشر بہٖ ط	دوڑنے لگتی ہے اور اندر اندر گھٹنے لگتا ہے

اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○ ۱۶: ۵۸ و ۵۹

اس خوش خبری سے اسے جو کبیدگی ہوتی ہے اسے یہ لوگوں سے مخفی رکھنا چاہتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس ذلت کو اٹھائے پھرے یا اسے پیوند خاک کر دے۔ سُن لو ان کے منصوبے بہت بُرے ہیں۔

ایسی عجیب قوم میں صحیح انسانی اقدار کو قائم کرنے کے لیے رحمتہ للعالمینؐ مبعوث ہوتا ہے۔ دیکھیے وہ انسانیت کش ذہنیت میں کیا انقلاب پیدا کرتا ہے۔

آں حضرتؐ مکّے سے چلنے لگتے ہیں تو سیدنا امیر حمزہؓ (سید شہداء) کی کمسن صاحبزادی جناب امامہؓ جو ہنوز مکّے میں تھیں "چچا چچا" کہتی ہوئی آں حضرتؐ کے پاس دوڑ کر آئیں۔ سیدنا علیؓ نے گود میں اٹھا لیا۔ سیدنا زید بن حارثہ اور سیدنا جعفر بن ابی طالب بھی موجود تھے۔ جھگڑا یہ ہوا کہ اس یتیم بچی کی پرورش کا ذمہ کون لے؟ ان تینوں نے اپنا اپنا حق جتانا شروع کیا۔ علیؓ نے کہا: یہ سب سے پہلے میرے پاس آئی ہے اور یہ میری چچا زاد بہن بھی ہے۔" زید نے اپنا دعویٰ یوں پیش کیا کہ: حمزہؓ میرے دینی بھائی تھے اس لیے میں بھی امامہ کا چچا ہوں۔" جعفر نے اپنا حق یوں جتایا کہ: حمزہؓ تو میرے بھی دینی بھائی تھے اور اس یتیمہ کی خالہ میرے گھر ہے۔" آں حضرتؐ نے تینوں کے دعووں کو برابر کا درجہ دیا اور فرمایا: خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔" اس کے بعد امامہ کو جناب اسماءؓ کے حوالے کر دیا۔

ہم جانتے ہیں کہ جعفرؓ، علیؓ اور زیدؓ کا کوئی تعلق دختر کش طبقے سے نہ تھا لیکن قبل از اسلام لڑکیوں پر ایسا مہربان بھی کون تھا؟ دیکھنے کی بات تو یہ ہے

جس قوم میں دختر کُشی کی عادت باعث افتخار ہو اسی قوم کے افراد میں تعلیم رسول کی بدولت یہ اخلاقی قدریں پیدا ہو گئیں کہ اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی لڑکی کے لیے جھگڑے ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنا اپنا حق پرورش جتاتا ہے۔ اس جھگڑے سے واقعے سے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ نبوی تربیت نے اس امت کی نگاہوں میں انسانی خون کی کیا قدر و قیمت پیدا کر دی ہوگی۔ ساری انسانی قدروں کا نقطۂ آغاز یہی ہے کہ انسان پہلے انسان کی قدر پہچانے۔ انسان دوسرے انسان کے ساتھ بے رحمانہ اور غیر انسانی برتاؤ اسی وقت کرتا ہے جب وہ اسے محض حیوانی سطح پر رکھ کر دیکھتا ہے۔

غزوۂ مُوتہ ۸ھ

یہ ایک معرکہ ہے جو عرب سے باہر بمقام موتہ عیسائیوں کے خلاف پیش آیا تھا۔ چونکہ اس میں بظاہر مسلمانوں کو کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لیے سیرت نگار بھی اسے سرسری واقعے کی طرح لکھ دیتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح صلح حدیبیہ عرب کی تمام فتوحات کا پیش خیمہ تھی اسی طرح غزوۂ مُوتہ بھی رومیوں کے مقابلے میں آئندہ کی تمام کامیابیوں کا ضامن ہوا قیصری قوت کتنی ہے؟ ان کا طریقۂ جنگ کیا ہے؟ ان سے کس طرح کامیاب مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟ ان تمام باتوں کا اندازہ غزوۂ موتہ ہی سے ہو گیا اور یہی تجربہ رومیوں کے مقابلے میں آئندہ کام آیا۔ ایک بڑا فائدہ اس سے یہ بھی ہوا کہ خود رومیوں کو بھی اہل اسلام کے سرفروشانہ جذبے کا اندازہ ہو گیا اور وہ مسلمانوں پر

جو کبھی جارحانہ حملہ کرنے کا ارادہ کر سکتے تھے اس میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ اس سے ایک اور اندرونی فائدہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کے یہ بڑھتے ہوئے حوصلے دیکھ کر اندرونِ عرب بھی ایک ہیبت طاری ہو گئی اور جو باغیانہ و غدّارانہ فتنے سر اٹھا سکتے تھے ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ غرض جنگ موتہ محض ایک سرسری سی جنگ نہ تھی بلکہ اس سے بے شمار سیاسی فائدے ہوئے اور یہی آئندہ کام آئے۔

اہل اسلام کا یہ اقدام بلا وجہ نہیں ہوا تھا بلکہ جیسا کہ آپ اوپر پڑھ چکے ہیں جہاں مختلف فرماں رواؤں کو دعوتِ اسلام دی گئی تھی، وہاں بصریٰ کے حاکم کو بھی ایک دعوت نامہ بھیجا گیا تھا جو حضرت حارث بن عمیر ازدی لے کر گئے تھے۔ حارثؓ کو شرجیل بن عمرو نے قتل کر دیا۔ شرجیل عربی النسل عیسائی تھا اور رومی حکومت کی طرف سے علاقہ بلقار کا حکمران تھا۔ آں حضرتؐ کو حارث کے قتل کیے جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ یہ صدمہ محض اس لیے نہ تھا کہ اپنا ایک آدمی مارا گیا بلکہ کسی سفیر کے ساتھ بُرے برتاؤ کو آں حضرتؐ انتہائی اخلاق سوز حرکت تصور فرماتے تھے۔ سفیر تو مملکت کا ایک نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک پوری مملکت کے لیے چیلنج کا حکم رکھتا ہے۔ احترامِ آدم تو اپنی جگہ ہے ہی۔ سفیر کا احترام اس سے بھی زیادہ ضروری ہے اور اگر سفیروں کے ساتھ غیر شریفانہ برتاؤ ہوا کرے تو حکومتوں کی باہمی خوش اعتمادی ختم ہو جائے اور دنیا کا نظامِ امن درہم برہم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آں حضرتؐ نے آخری حینِ حیات میں جو چند وصیتیں فرمائیں ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ: وفود اور سفرا کے ساتھ اسی طرح حسنِ سلوک ہوتا رہے

جس طرح میں کر رہا ہوں۔" آں حضرتؐ کسی وفد یا سفیر کے ساتھ بے احترامی کو انتہائی غداری اور انسانیت سوز حرکت تصور فرماتے تھے۔ سفیر نہ فقط ایک واجب الاحترام انسان ہے بلکہ وہ ایک مہمان بھی ہوتا ہے اور اس کی حیثیت ایک پیغام رساں کی ہوتی ہے۔ وہ تن تنہا لڑنے کے لیے نہیں آتا۔ اس کی بے حرمتی ہی نہیں بلکہ اسے قتل بھی کرنا نہ تو سیاست کی نگاہ میں قابل معافی جرم ہے نہ اخلاق کی نظر میں۔ یہ آپ اوپر بھی کئی مواقع پر پڑھ چکے ہیں کہ آں حضرتؐ اس قسم کی امن شکن اور اخلاق سوز کارروائی کو ختم کر کے انسانی اقدار کو قائم فرمانا چاہتے تھے۔

صلح حدیبیہ نے قریش مکہ کی طرف سے مطمئن کر دیا تھا اور فتح خیبر کے بعد یہود کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ آں حضرتؐ نے حارث بن عمیر ازدی کے قصاص کے لیے تین ہزار مسلمانوں کی ایک فوج تیار کی۔ اس میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ موجود تھے۔ آں حضرتؐ کے عم زاد بھائی سیدنا جعفر بن ابی طالب موجود تھے جو حبشہ کے مہاجرین اولین میں تھے اور حبشے میں تبلیغ اسلام کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ سیدنا عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے جن کی شخصیت، اور اسلامی اور فوجی خدمات کا ذکر آپ گزشتہ صفحات میں کئی موقعوں پر پڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس اسلامی جیش کی سرداری کس کے سپرد کی گئی؟ اس کے لیے آں حضرتؐ نے اپنے مولیٰ یعنی آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ کو منتخب فرمایا۔ آں حضرتؐ نے جو سب سے بڑی عادلانہ قدر قائم فرمائی وہ اخوت و مساواتِ انسانی ہے۔ محض وعظ نہیں فرمایا بلکہ عملاً غلاموں کو آقائی بخشی۔ گرتوں کو سہارا دیا۔ انسانی بلندی کا معیار صرف کردار و تقوےٰ اور صلاحیت کو قرار دیا۔ دولت، خاندان، وطن، رنگ، زبان اور پیشے نے

انسانوں میں جو پست و بلند کی تفریق پیدا کر رکھی تھی اسے مٹا دیا۔ ان غلط بنیادوں پر جو پست تھے انہیں بلند کیا اور جو بلند تھے انہیں پست کیا اور اس طرح بنی آدم کو قانون کی نگاہ میں ایک سطح پر کھڑا کر دیا:

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے سازو برگ

آں حضرتؐ کے اس انتخاب پر بعض لوگوں نے چہ میگوئیاں بھی کیں، لیکن آں حضرتؐ نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور زید ہی کو سردارِ لشکر رکھا۔ آنحضرتؐ نے اس جیش کو رخصت کرتے وقت چند ہدایات دیں:

"ان کے سامنے پہلے اسلام پیش کرو۔ اگر وہ جزیئے پر مصالحت کر لیں تو ان سے جنگ نہ کرو جو لڑنا نہ چاہیں ان سے بھی جنگ نہ کرو۔ فوج پہلے وہاں جائے جہاں حارث بن عمیر کو قتل کیا گیا ہے۔ اگر سردار لشکر زید بن حارثہ جنگ میں کام آجائیں تو جعفر بن ابی طالب کے ہاتھ میں کمان دی جائے۔ اگر وہ بھی کام آجائیں تو عبداللہ بن رواحہ کو قائد لشکر بنایا جائے۔ اگر وہ بھی رخصت ہو جائیں تو جسے مناسب سمجھو اپنا امیر جیش بنالو۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے پیش آنے والا پورا نقشۂ جنگ آں حضرتؐ کی دوربین نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ گویا ان تینوں کمانداروں کی شہادت کی خبر دے رہے تھے، اور چوتھے امیر جیش کے متعلق خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ یہ جنگ میں کام نہ آئے گا۔ ایک پیغمبر کے سامنے سے حجابات کا کسی وقت اٹھ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ بسا اوقات مستقبل آئینے کی طرح حال بن کر اس کے سامنے آجاتا ہے۔

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں یہ اسلامی جیش مدینے سے روانہ ہوا۔ آں حضرتؐ نے ثنیۃ الوداع تک اس کی مشایعت فرمائی۔ جاں نثاروں کی

یہ جماعت جب معاون تک پہنچی تو اطلاع ملی کہ سرحدِ بلقار، مآب یا موآب میں ایک لاکھ رومی فوج مقابلے کے لیے تیار ہو کر آپہنچی ہے۔ دراصل اس جیش اسلامی کی روانگی کے وقت ہی رومی جاسوسوں نے قیصر روم کو خبر پہنچا دی تھی۔ رومی لشکر میں عربی النسل عیسائی بکثرت موجود تھے۔

رومیوں کی تیاری کی خبر سن کر حضرت زید ذرا سوچ میں پڑ گئے۔ یہ تامل اس لیے نہ تھا کہ وہ سرفروشی سے گریزاں تھے بلکہ اس لیے کہ ایک لاکھ کے مقابلے میں صرف تین ہزار کا تناسب عالم اسباب کے مطابق نہ تھا اس لیے زیدؓ نے یہ سوچا کہ مدینے سے کچھ اور امدادی کمک منگوانے کا انتظار کیا جائے۔ کئی دن اسی بحث میں گزر گئے اور اہل لشکر کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ آخر عبداللہ بن رواحہ نے اٹھ کر ایک پُرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا کہ: ہمیں دشمنوں کی قلت و کثرت سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں تو جہاد فی سبیل اللہ کرنا ہے۔ ہمیں دو میں سے ایک سعادت تو ضرور نصیب ہوگی۔ یا فتح ہوگی یا شہادت کا رتبہ نصیب ہوگا۔" عبداللہ بن رواحہ کی اس تقریر نے پوری فوج میں جوش و خروش کی ایک نئی لہر دوڑا دی اور لشکر موتہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہاں رومی فوج پہلے سے مقابلے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ جنگ چھڑ گئی۔ زیدؓ علم لیے آگے آگے پوری دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ ایک غسانی گروہ نے انہیں ہر چہار طرف سے گھیر لیا اور برچھیاں مار مار کر زید کو گرا لیا۔ ہدایت نبوی کے مطابق فوراً جعفر بن ابی طالب لپکے اور علم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد اس بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں میں تہلکہ ڈال دیا۔ آخر یہ بھی ابدی نیند سو گئے۔ عبداللہ بن عمر بھی اس جنگ میں موجود تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ: میں نے جعفرؓ کے زخم شمار کیے تو نوے تھے۔ اور ایک زخم بھی پشت پر نہ تھا۔ سارے

زخم سامنے تھے۔ ان کے دونوں بازو بھی کٹ گئے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ارشادِ نبوی کے مطابق عبداللہ بن رواحہ نے علمِ لشکر سنبھال لیا اور یہ بھی پوری دادِ شجاعت دیتے ہوئے موتِ شہادت سے ہم آغوش ہو گئے۔ اب ثابتؓ بن اقرم نے جھپٹ کر علم کو سنبھال لیا اور پکار کر کہا: "مسلمانو! فکر نہ کرو، علم میرے پاس ہے۔ جسے چاہو امیرِ لشکر بنا کر علم اس کے سپرد کر دو۔" لوگوں نے کہا کہ: "ہم آپ کی امارت پر راضی ہیں۔" ثابت نے کہا: "میں اس کا اہل نہیں، میری رائے میں خالد بن ولید مناسب ہیں۔" سب نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا اور فوج کی کمان خالد کے ہاتھ میں دیدی گئی۔

یہ وہی خالد ہیں جنہوں نے جنگِ احد میں مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچایا تھا اور یہی خالد ہیں جو مسلمانوں کو ادائے عمرہ سے روکنے کے لیے فوجی دستہ لے کر کراع الغمیم کی طرف گئے تھے۔ یہ خالد صرف بہادر ہی نہ تھے بلکہ جنگی تدابیر کے ماہر بھی تھے۔ دور بین، مصلحت آشنا اور موقع شناس بھی تھے۔ ان کی یہ تمام قوتیں پہلے کفر کے کام آ رہی تھیں اور اسلام لانے کے بعد یہ تمام صلاحیتیں راہِ حق میں اور اعلیٰ انسانی اقدار کو بلند کرنے میں لگ گئیں۔

اس غزوے میں خالد نے شجاعت کے بڑے بڑے جوہر دکھائے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس دن ان کے ہاتھ سے آٹھ تلواریں ٹوٹیں۔ لیکن ایک لاکھ کا مقابلہ تین ہزار کہاں تک کر سکتے تھے؟ حضرت خالد نے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور سارے مسلمانوں کو موت کے منہ میں جھونکنے کی بجائے ان کی صلاحیتوں کو دوسرے قیمتی موقعوں کے لیے محفوظ کر لیا۔ بڑی خوبصورتی سے پورے لشکر کو بچا کر لے آئے۔ جب یہ مدینے پہنچے تو بعض لوگوں نے یہ طعنہ دیا کہ تم لوگ زندہ کیوں واپس آئے اور راہِ حق میں مرنے سے فرار کیوں اختیار

کیا؟" آں حضرتؐ کو یہ طعنہ ناگوار ہوا۔ فرمایا: یہ اللہ کا گروہ ہے۔ میدانِ قتال سے واپس آیا ہے اور پھر میدانِ جنگ میں جائے گا۔"

یہاں سلسلۂ قتال میں ایک بڑی اعلیٰ قدر ملی۔ اور وہ یہ ہے کہ جس طرح ایک موقعے پر راہِ خدا میں جان دینا نیکی ہے اسی طرح دوسرے موقعے پر خدا ہی کے لیے جانوں کو بچا لینا بھی نیکی ہی ہے۔ ہم اوپر بھی کہیں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ شہادت صرف مرنا ہی نہیں۔ راہِ خدا میں زندہ رہنا بھی شہادت ہی ہے۔ زندگی ہو یا موت۔ جو کچھ خدا کے لیے ہے اور جس چیز سے بوقتِ ضرورت گواہی (شہادت) پیش کی جائے اسی کو شہادت کہتے ہیں مقصد محض مرنا نہیں بلکہ کام کو نتیجہ خیز بنانا ہے خواہ مر کر ہو یا زندہ رہ کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ مَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ط

غزوۂ موتہ میں اسلامی فوج کے تین سپہ سالار اور نو سپاہی شہید ہوئے آں حضرتؐ کو ان سب کا صدمہ تھا لیکن جعفر کا بہت غم ہوا۔ عورتوں نے بھی جاہلیت کے انداز کا ماتم شروع کر دیا۔ آں حضرتؐ نے آدمی بھیج کر عورتوں کو اس ماتم سے رکوایا۔ مگر کسی نے نہ سنا۔ آں حضرتؐ نے پھر آدمی بھیجا اور فرمایا کہ: ان ماتمیوں کے منہ میں خاک جھونک دو۔"

آں حضرتؐ نے سیدنا حمزہؓ کے ماتم کو کچھ ہی دنوں برداشت کیا تھا اس کے بعد حکماً رکوا دیا تھا۔ موت پر غم ہونا ایک فطری جذبہ ہے لیکن جاہلیت کے انداز پر اس کا اظہار اور پھر اس میں رسمی تصنع اسلامی روح سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ زندہ قومیں وقفِ ماتم نہیں ہوتیں۔ سرگرمیِ عمل کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ گزری ہوئی موت پر غم کے لیے وقف ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ماضی کی یاد میں فنا ہو کر حال کے تقاضوں اور مستقبل کی تعمیر سے غافل ہو جاتا

ہے۔ معلوم نہیں کب سے اور کیوں اور کس طرح ماتم ہمارا دین بن گیا ہے؟

فتحِ مکّہ ۸ھ

یہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے رو سے فریقین (مسلمان اور قریش) کو کسی قبیلے سے معاہدہ کرنے کا اختیار حاصل تھا چنانچہ بنو خزاعہ سے مسلمانوں نے اور ان کے دشمن قبیلے یعنی بنو بکر سے قریش نے عہد و پیمان کر لیا۔ بنو خزاعہ اور بنو بکر میں مدت سے سخت عداوت و جنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن اسلام و اہلِ اسلام کی عداوت میں یہ دونوں ہم نوا تھے اس لیے ان کی باہمی آتش عناد دب گئی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جو امن و سکون پیدا ہوا تو ان دونوں قبیلوں کی خاکستر سے عناد باہمی کی چنگاریوں نے پھر سر نکالا۔ بنو خزاعہ چونکہ مسلمانوں کے حلیف ہو گئے تھے اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے تھے اس لیے قریش کے دل میں بنو خزاعہ کی طرف سے عناد پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ بنو بکر نے اس موقعے کو غنیمت جانا کہ قریش ایک تو ان کے دوست ہیں اور دوسرے ان کے دشمنوں (بنو خزاعہ) کے مخالف بھی ہیں۔ لہٰذا گزشتہ عداوتوں کی کسر نکال لینے اور جذبۂ انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے بنو بکر نے بنو خزاعہ پر ایک دھاوا بول دیا۔ قریش نے بنو بکر کی محض زبانی ہی ہمدردی سے کام نہیں لیا بلکہ عملی طور پر ان کا یوں ساتھ دیا کہ عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو وغیرہ نے شب کو بھیس بدل کر بنو خزاعہ پر تلواریں چلائیں۔ بنو خزاعہ نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی۔ انہیں یقین تھا کہ حرم کا روایتی احترام تو ضرور

ملحوظ رکھا جائے گا۔ مگر بنو بکر کے سرگروہ نوفل نے کہا کہ: حرم میں پناہ لینے کی کوئی پرواہ نہ کرو۔ کیونکہ پھر ایسا موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔" چنانچہ حرم کے اندر بھی بنو خزاعہ کا بے دریغ خون بہایا جانے لگا۔ خزاعی مظلوموں نے حملہ آوروں کو خدا کا واسطہ دے دے کر فریاد کی مگر ان ظالموں کی طرف سے یہ جواب ملا کہ: لا الٰہ الیوم۔ آج خدا کوئی شے نہیں۔"

کچھ دنوں کے بعد چالیس بچے کھچے خزاعیوں کا ایک گروہ فریادی اشعار پڑھتا ہوا مدینے میں داخل ہوا۔ آں حضرتؐ اس وقت مسجد نبوی میں تشریف رکھتے تھے۔ خزاعیوں کے سرگروہ سالم بن عمرو نے جب پُر درد اشعار میں بنو بکر کی داستانِ ظلم سنائی تو رحمۃ للعالمین بے تاب ہو گئے۔ آں حضرتؐ نے جلد ہی ایک قاصد قریش کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا:

(۱) یا تو خزاعی مقتولوں کا خوں بہا قریش اور بنو بکر مل کر ادا کریں۔

(۲) یا قریش بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔

(۳) یا صلح نامہ حدیبیہ کے فسخ ہونے کا اعلان کر دیں۔

باتیں نہایت معقول تھیں اور پہلی بات کو مان لینا رواج عرب، عقل اور انصاف کے عین مطابق تھا۔ اگر قریش اور بنو بکر یہ مان لیتے تو معاملہ صاف ہو جاتا اور امن و امان قائم رہتا۔ مگر غالباً وہ ادائے خوں بہا کو اپنی اہانت تصور کرتے تھے۔ یہ پیغام نبویؐ سن کر قرظہ بن عمرو نے قریش کی طرف سے کہہ دیا کہ: ہمیں صرف تیسری بات منظور ہے۔" یعنی صلح نامہ حدیبیہ فسخ سمجھا جائے۔ قاصد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا تو قریش کو اپنے اس جواب پر تاسف ہوا۔ اور انہوں نے فوراً ہی ابوسفیانؓ کو معاہدۂ حدیبیہ کی تجدید کے لیے مدینے روانہ کر دیا۔ تجدیدِ معاہدہ کا مطلب یہ تھا کہ یہ معاہدہ علیٰ حالہا برقرار رہے گا۔

ابو سفیانؓ سب سے پہلے اپنی بیٹی ام المومنین امّ حبیبہؓ کے پاس گئے۔ بیٹی نے اپنے باپ کو آتا دیکھا تو بستر ہ لپیٹ کر کنارے کر دیا۔ ابو سفیانؓ نے اسے محسوس کر لیا اور پوچھا: بیٹی میں نہیں سمجھ سکا کہ تم مجھ سے بستر ے کو دُور رکھنا چاہتی ہو یا مجھ کو بستر ے سے؟ (یعنی میں اس بستر ے کے لائق نہیں ہوں یا بستر ہ میرے لائق نہیں؟)۔ ام المومنین ــــــ مومنۂ صادقہ ام المومنینؓ ــــ نے جواب دیا: یہ رسولِ پاک کا بستر ہ ہے۔ جو تمہاری طرح کفر کی ناپاکیوں میں پڑا ہو وہ اس پاک بستر ے پر بیٹھنے کا حق نہیں رکھتا" ابو سفیانؓ اپنی بیٹی کی اس تعظیم رسولؐ پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے اور رنجیدہ ہو کر کہنے لگے: تیری فطرت مجھ سے جدا ہو کر بالکل بدل گئی ہے۔ نہ بڑوں کا پاس رہا نہ خاندان کا لحاظ"۔ ام المومنینؓ نے فرمایا: میری تبدیلِ فطرت تو کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔ البتہ ان لوگوں پر ضرور حیرت ہونی چاہیے جو عقل و دانائی کے مدّعی ہونے کے باوجود بے جان مورتیوں کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں"۔ ابو سفیانؓ یہ دو ٹوک جواب سن کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے آں حضرتؐ کی خدمت میں پہنچے۔ معاہدے کی بحالی کے متعلق گفتگو کرنی چاہی مگر آں حضرتؐ نے کوئی توجّہ نہ دی۔ اس کے بعد یہ سیدنا ابو بکرؓ اور سیدنا عمرؓ کے پاس یکے بعد دیگرے گئے اور بیچ میں پڑ کر معاہدے کی بحالی کی درخواست کی۔ مگر ان دونوں نے یہ دیکھ کر کہ آں حضرتؐ نے کوئی توجّہ نہ دی خود کوئی دخل دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابو سفیانؓ جناب فاطمہ زہراؓ کے پاس گئے۔ انھوں نے بھی شیخین کی طرح درمیان میں پڑنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہاں سے مایوس ہو کر سیدنا علیؓ کے پاس آئے۔ آپ نے ابو سفیانؓ کو یہ تدبیر بتائی کہ: مسجد میں جا کر اعلان کر دو کہ میں نے معاہدۂ حدیبیہ کو بحال کیا۔ اس کے بعد فوراً مکے

واپس چلے جاؤ۔" ابو سفیانؓ نے یہی کیا اور مکّے واپس ہو گئے۔

قریش کو ابو سفیان نے جب داستانِ سفر سنائی تو وہ اور زیادہ شش و پنج میں پڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ: یہ کارروائی نہ تو صلح ہے کہ ہم اطمینان سے بیٹھیں اور نہ اعلانِ جنگ ہی ہے کہ ہم مقابلے کی تیاری کریں۔"

اُدھر قریش اس حیص بیص میں پڑ گئے اور اِدھر ابو سفیان کے واپس جاتے ہی آں حضرتؐ نے مسلمانوں کو مکّے کی طرف کوچ کرنے کا حکم صادر فرما دیا اور حلیف قبائل کو بھی پیغام بھجوا دیا کہ وہ تیار رہیں اور جب مسلمان گزرنے لگیں تو راستے میں ساتھ ہوتے جائیں۔ یہ تمام کارروائی خاموشی کے ساتھ رازدارانہ طریقے پر کی گئی تاکہ اہلِ مکہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

ایک شبہے کا جواب

یہاں پڑھنے والوں کو ایک شبہہ ضرور پیدا ہوگا کہ جب ایک شخص قرظہ بن عمرو نے قاصدِ رسولؐ سے یہ کہا کہ: ہمیں تیسری بات یعنی فسخ معاہدہ منظور ہے۔" تو آں حضرتؐ نے معاہدۂ حدیبیہ کو فسخ تصور فرما لیا۔ لیکن جب اس سے زیادہ ذمے دار شخص ابو سفیان نے مسجدِ نبوی میں آکر اعلان کر دیا کہ: ہم نے معاہدۂ حدیبیہ کو بحال کیا" تو اسے معاہدے کی بحالی نہ سمجھا گیا۔ اور اسلامی جیش کو کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ آخر یہ کیوں؟ سیرت نگاروں نے اس سوال کا کوئی حل نہیں پیش فرمایا ہے۔ بہر کیف ہمارے خیال میں معاملہ صاف ہے۔ بات یہ ہے کہ محض معاہدے کی بحالی کا اعلان کوئی شے نہیں۔ اگر معاہدے کو بحال رکھنا تھا تو پہلی اور دوسری شرط میں سے کسی ایک بات کا صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فیصلہ بھی کر کے بتا دینا چاہیے تھا یعنی خزاعی مقتولوں کا خوں بہا ادا کرنا ہے یا

بنو بکر کی حمایت سے دست کش ہو جانا ہے؟ عمداً ہو یا سہواً اصل معاملے کو بہر حال ابو سفیانؓ نے صاف نہیں کیا اور اس بات کو بالکل مبہم رکھا کہ اگر تیسری شرط منظور نہیں ہے تو پھر کون سی شرط منظور ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ قریش اصل مطالبے سے گریز کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے حلیف خزاعیوں کا جو نقصان ہوا ہے اس کی وہ کوئی تلافی کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا ایسی صورت میں ایک آدمی کا محض یہ کہنا کہ: "میں نے معاہدۂ حدیبیہ کو بحال کیا" اس کے بعد واپس چلے جانا ہرگز کافی نہیں ہو سکتا۔

سیدنا حاطبؓ سے درگزر

ادھر مسلمان کوچ کی تیاری کر رہے تھے اور ادھر ایک عظیم المرتبت صحابی سیدنا حاطب بن ابی بلتعہ نے ایک خفیہ خط قریش کو لکھا جس میں مسلمانوں کی تیاری کی اطلاع تھی۔ نامہ بر ایک عورت تھی۔ آں حضرتؐ کو اس کا علم ہو گیا اور حضرت علیؓ کو دوڑایا۔ آپ نے اسے راستے ہی میں جا لیا۔ خط مانگا تو اس نے کہا: "میرے پاس کوئی خط نہیں۔" حضرت علیؓ نے کہا: "رسول اللہ غلط خبر نہیں دے سکتے۔" اس کے بعد ڈرا دھمکا کر اس کی تلاشی لی تو اس کے جوڑے میں سے وہ خط نکلا۔ حاطب بن ابی بلتعہ ایک جلیل القدر صحابی ہیں۔ مہاجر مدینہ ہیں، بدری ہیں۔ اب تک معرکوں میں آں حضرتؐ کے ساتھ رہے اور مقوقسِ مصر کے پاس دعوت نامۂ اسلام لے کر ہی گئے تھے۔ ایک ایسے صحابی کی طرف سے جرمِ مخبری کا سرزد ہونا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ تمام صحابہ کو حیرت تھی سیدنا عمر بن خطابؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! اجازت دیجیے کہ حاطبؓ کی گردن اڑا دوں۔" آں حضرتؐ نے فرمایا: "تمہیں کیا معلوم؟ شاید اللہ کا

یہ فیصلہ ہو کہ اہلِ بدر سے کوئی مواخذہ نہیں۔"

جناب حاطب رضؓ کے بال بچے ہنوز مکّے ہی میں تھے اور اہل و عیال کے تحفظ کی فکر ایک ایسی فطرت ہے جو بدلی نہیں جا سکتی۔ حاطب کو بجا طور پر یہ خطرہ تھا کہ قریش ان کے اہل و عیال کو ستاتے ہوں گے اور آئندہ بھی ستائیں گے۔ اس لیے انھوں نے سوچا کہ مسلمانوں کی آمد کی اطلاع قریش کو دے کر ان پر ایک احسان کر دیا جائے تاکہ وہ اس احسان کے عوض کم از کم اتنا کریں کہ ان کے بال بچوں کو نہ ستائیں۔ خدمتِ نبوی میں حاطب نے اسی مصلحت کو بطورِ عذر پیش کیا اور آں حضرتؐ نے اس عذر کو قبول کر کے حاطب سے درگزر فرمائی۔

دراصل آں حضرتؐ نے یہاں کئی نئی قدریں عطا فرمائی ہیں:

۱۔ تعزیر و سزا محض ظاہری نوعیتِ جرم کو دیکھ کر متعین نہیں ہوتی۔ کچھ خارجی احوال و ظروف ایسے بھی ہوتے ہیں جو جرم کی سنگینی کو ہلکا کر دیتے ہیں یا معمولی جرم کو سنگین بنا دیتے ہیں۔ ہر چوری کے عوض ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ بھوکا قحط میں چوری کرے، سپاہی حالتِ جنگ میں چوری کرے، فرزند باپ کی یا بیوی شوہر کی یا غلام آقا کی چوری کرے تو اگرچہ ظاہر میں یہ ساری چوریاں عین چوریاں ہیں لیکن قطعِ ید کسی میں بھی نہیں۔ اسی طرح ہر قتل کا قصاص یکساں نہیں۔ اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں قتل ہی ہے لیکن قتلِ عمد اور قتلِ خطا کی سزا میں فرق ہے۔ ہر زنا اپنی ظاہری شکل میں زنا ہے لیکن زنا بالجبر میں عورت پر حد جاری نہیں ہو گی۔ ٹھیک اسی طرح ہر جاسوسی یا مخبری سبوتاژ نہیں جس کی سزا قتل ہو۔ جاسوس وہ ہے جو دشمن سے ساز باز رکھتا ہو۔ یہی کام کیا کرتا ہو۔ اسی لیے بھیجا گیا ہو۔ دشمن سے باقاعدہ معاوضہ

حاصل کیا کرتا ہو۔ جناب حاطب رضؓ کے متعلق ایسا گمان ہی نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ آں حضرتؐ نے اس موقعے پر ایک قدر یہ بھی بخشی کہ کسی کی پچھلی خدمات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ ایک دو غلطیوں سے کسی کی ساری عمر کی نیکیاں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ اگر کسی خادم کا اصل رجحان (ATTITUDE) وفاداری ہو تو ایک دو نقصان رساں کام سے اس کو اس وقت تک بے وفا نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کے جرم کی نوعیت اتنی سنگین نہ ثابت ہو جائے۔ سیدنا حاطب رضؓ کی وفاداریاں اور قربانیاں مسلّم ہیں اس لیے ان کی حیثیت فرمانِ قرآن کے مطابق اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ:

خلطوا عملاً صالحاً	اپنے عمل صالح میں کوئی برائی بھی شامل
و اخر سیئاً عسی اللّٰہ ان	کر لی۔ امید ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول
یتوب علیھم ۹ : ۱۰۲	فرمالے گا۔

۴۔ آں حضرتؐ نے اس موقعے پر اہل بدر کی عظمت و قدر بھی بتا دی۔ معرکۂ بدر میں شرکت کرنے والے وہ اجلّۂ صحابہ ہیں جو اوّلون سابقون میں ہیں اور جن کی قربانیوں کو نظر انداز کرنے کے بعد اخلاص و ایثار کا کوئی تصور ہی نہیں باقی رہتا۔ ان کے متعلق قرآنِ پاک نے واضح الفاظ میں اپنا فیصلہ یوں سنا دیا ہے کہ:

والسّٰبقون الاوّلون	مہاجرین و انصار کے سابقون اولون
من المھجرین والانصار	بلکہ وہ بھی جنھوں نے ان کی عمدگی سے
والّذین اتبعوھم باحسان	پیروی کی ان سب سے خدا راضی ہے
رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ	اور وہ خدا سے راضی ہیں۔ اور خدا
واعدّ لھم جنّٰت تجری	نے ان کے لیے ایسی جنّت مہیا کر رکھی ہے

تحتها الانہار خالدین فیہا (۱) ۹: ۱۰۰ — جس کے نیچے نہریں رواں ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

رضائے الٰہی اور خلودِ بہشت کی اس آسمانی سند کے بعد ان پر زبان طعن دراز کرنے والوں کو اپنے ایمان کی خبر لینی چاہیے۔ ان بدریوں کے ایمان و ایثار کا کون مقابلہ کر سکتا ہے؟ انہی کے متعلق تو ارشادِ نبوی ہے کہ: آج اگر کوئی شخص جبلِ اُحد کے برابر سونا راہِ خدا میں صرف کرے تو ان کے ایک مُدّ غلے کی بھی برابری نہیں ہو سکتی۔

۴۔ سیدنا حاطبؓ کے درگزر میں ایک اور اخلاقی درس یہ ہے کہ قاضی کو محض قانونِ تعزیر ہی پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔ تعزیرات کے علاوہ کچھ اخلاقی تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ خدا نے صرف قانونِ مکافات ہی نہیں دیا ہے۔ صحیح محل پر عفو و درگزر بھی خدا ہی کی تعلیمات میں شامل ہے۔ جرم کی خفت و سنگینی کا پورا لحاظ رکھنے کے علاوہ قاضی کا رجحان تعزیر سے بچانے کی طرف ہونا چاہیے۔ اسی لیے آں حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ:

انک ان تخطئ فی العفو خیر من ان تخطئ فی العقوبۃ۔ — ناقابلِ معافی کو معاف کر دینا اس سے بہتر ہے کہ ناقابلِ سزا کو سزا دی جائے۔

نیز یہ بھی فرمایا کہ:

---

(۱) چونکہ سابقون اولون مہاجرین و انصار کی شان سب سے نرالی ہے اس لیے یہاں اندازِ بیان بھی بالکل نرالا ہے۔ سارے قرآن میں ہر جگہ من تحتہا الانہار ہے، اور یہاں بغیر من کے صرف تحتہا الانہار ہے۔

ادرؤا الحد ودعن الشبھات اشتباہ پیدا ہو تو حد کو ٹال جاؤ۔

غرض سیدنا حاطبؓ کی غلطی اور معافی محض ایک سرسری واقعہ نہیں بلکہ اس کے اندر بڑی اعلیٰ اقدار کی محافظت کا درس ہے۔

قدّوسیوں کی پُرشکوہ روانگی

لشکرِ اسلام پورے شکوہ وجلال کے ساتھ آٹھویں یا دسویں رمضان ۸ھ کو مدینے سے روانہ ہوا۔ یہ سفر بڑی تیزی کے ساتھ طے ہوا۔ راستے میں حلیف قبائل بھی ساتھ ہوتے گئے، جن کی تعداد کم وبیش دو ہزار تھی۔ یہ کُل رفقائے سفر دس ہزار کی تعداد میں تھے۔ علمِ قدیم نے اپنی انگلیوں سے تاریخ کے ورق الٹنے شروع کیے اور چشمِ کائنات ہزاروں سال کے انتظار کے بعد غزل الغزلاتِ سیدنا سلیمانؑ کے اس صفحے پر جم کر رہ گئی جس میں لکھا تھا:

میرا محبوب ۔ ۔ ۔ ۔ دس ہزار آدمیوں میں جھنڈے کی مانند کھڑا ہوتا ہے۔

ذوالحافیہ یا جحفے میں آں حضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب ملے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ مکّے سے روانہ ہو کر مدینے جا رہے تھے۔ یہ اب تک معاہدۂ حدیبیہ کے مطابق مکّے ہی میں مقیم تھے اور "سقایت" یعنی حُجاج کے لیے آب رسانی کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ آں حضرتؐ کو جناب عباسؓ کی آمد سے بڑی مسرت ہوئی۔ عباسؓ نے اپنے اہل و عیال کو تو مدینے روانہ کر دیا اور خود جیشِ اسلامی کے ساتھ ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے اس موقعے پر سیدنا عباسؓ سے فرمایا کہ: جس طرح نبوّت آخری ہے اسی طرح تمہاری ہجرت بھی آخری ہے۔"

اسی موقعے کے لیے آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ لا ھجرۃ بعد الفتح

(اس فتح یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت ختم ہے)۔ یہاں الفتح سے مراد خاص فتح مکہ ہے۔ فتوحات تو فتح مکہ سے پہلے اور بعد میں بھی ہوتی رہی ہیں اور وہ سب فتوحات جو صلح حدیبیہ کے بعد ہوئیں فتح مبین میں شامل ہیں لیکن جس فتح کے بعد ہجرت کی فضیلت ختم ہوئی وہ فتح مکہ ہی ہے۔ دوسری فتوحات نہیں۔ فتح مکہ کے بعد بھی بہت سے لوگ مدینے میں آکر آباد ہوئے لیکن قرآنی اصطلاح کے مہاجرین میں ان کا شمار نہیں کیونکہ فتح مکہ سے پہلے جو ہجرت تھی وہ ایک وطن، گھر بار اور اقربا و احباب کی قربانی تھی اور فتح مکہ کے بعد کی ہجرت صرف ایک سفر ہے خواہ وہ کیسے ہی اعلیٰ مقصد کے لیے ہو۔

یہ جیش اسلامی ایک ہفتے میں مرّ الظہران پہنچ گیا جو مکّے سے کم و بیش دس میل کے فاصلے پر ہے۔ اور مسافرانِ مکہ کے لیے آخری پڑاؤ ہے۔ یہاں آں حضرتؐ کے حکم سے ایک ایک ہزار کی جماعت نے تمام صحرا کے کونوں میں پھیل کر اپنے اپنے کیمپ لگا لیے۔ شب کو رواج عرب کے مطابق سب نے اپنے اپنے الاؤ روشن کیے اور سارا میدان بقعۂ نور اور نورِ ہدایت سے وادی طور بن گیا۔

سفرائے قریش

جناب عباسؓ کو یہ انبوہ کثیر دیکھ کر خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں اہل مکہ کل ہی پیس کر نہ رکھ دیے جائیں۔ اس خونریزی کے خوف سے وہ رات ہی کو مکے کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ اہلِ مکہ کو اعترافِ قصور اور درخواست معافی کی طرف متوجہ کریں۔ ادھر قریش کو بھی مسلمانوں کی آمد کی خبر مل گئی تھی اس لیے انہوں نے اپنے تین سفیر دریافتِ حال کے لیے بھیج دیے۔

یہ تین سفیر سیرت نگاروں کے بیان کے مطابق حکیم بن حزام (سیدہ خدیجہؓ کے برادر زادے) ابوسفیان اور بُدیل بن ورقا تھے۔ اول الذکر دو کا سفیر قریش بن کر آنا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن بدیل بن ورقاء کا سفیر قریش بن کر آنا محلِ نظر ہے۔

ابوسفیان کی آمد اور عمرؓ کا جوش

بہر حال یہ تینوں سفیر مر الظہران کے قریب آئے اور روشنی دیکھ کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ یہ لوگ دفعۃً ایک لشکر کے پہنچ جانے پر حیران تھے۔ ابوسفیان بولے: "صرف بنو خزاعہ تو اتنی کثیر تعداد میں ہو نہیں سکتے یہ کوئی اور لشکر ہے جو چڑھ آیا ہے۔" اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ حضرت عباس ادھر سے گزرے۔ انہوں نے ابوسفیان کی آواز پہچان لی۔ اور ان سے مل کر تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ پھر امن دلانے کے خیال سے انہیں ساتھ لے کر آں حضرتؐ کی خدمت میں تشریف لائے۔ ابوسفیان کو آتا ہوا دیکھ کر جناب عمرؓ بے تاب ہو گئے اور عرض کیا کہ: "یا رسول اللہؐ! اجازت ہو تو میں دشمنِ اسلام کا سر اتار لوں۔" عباس بولے کہ: "یہ جوش اس لیے ہے کہ ابوسفیان عبد مناف کی اولاد ہے۔ اگر تمہارے قبیلے (بنی عدی) کا کوئی فرد ہوتا تو شاید اتنا جوش نہ دکھاتے۔" جناب عمرؓ نے جواب دیا: "بخدا یہ بات نہیں مجھے اپنے باپ (خطاب) کے ایمان لانے کی بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی خوشی تمہارے ایمان لانے کی ہوئی تھی۔"

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

اس رات ابوسفیان یہیں رہے۔ تمام صحابہ نے یہ رات بڑی بے چینی

سے کاٹی۔ ان سب کو یہ انتظار تھا کہ دیکھیں کل صبح ابوسفیان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے؟ صبح ابوسفیان خدمتِ نبوی میں پیش کیے گئے۔ آں حضرتؐ نے ان سے پوچھا: کیوں ابوسفیان! کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں؟" ابوسفیان نے جواب دیا: اگر واقعۃً کوئی اور الٰہ ہوتا تو آج ہمارے کام نہ آتا؟" آں حضرتؐ نے پھر دریافت فرمایا: کیا اب بھی تمہیں میرے رسول اللہؐ ہونے میں شک ہے؟" ابوسفیان نے کہا: اس میں تو ابھی کچھ شک باقی ہے۔"

گویا اس وقت ابوسفیان لا الٰہ الا اللہ کے تو قائل ہو گئے مگر محمد رسول اللہ کے ابھی پوری طرح قائل نہ ہوئے تھے —— مگر آنحضرتؐ نے انہیں اس یقین پر چھوڑ دیا کہ آج جو توحید کا قائل ہو گیا ہے وہ کل رسالت کا بھی قائل ہو ہی جائے گا۔ بعد کے واقعات نے بتا دیا کہ آں حضرتؐ کا یہ یقین بالکل سچا تھا۔ فتح مکہ کے بعد ہی غزوۂ حنین میں یہ بڑی جوانمردی سے مسلمانوں کی طرف سے لڑے اور ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ اور بعہدِ فاروقی غزوۂ یرموک میں بھی دادِ شجاعت دیتے ہوئے اپنی دوسری آنکھ بھی کھو بیٹھے۔

دو حقیقتیں

آج ابوسفیان دس ہزار کی فوج میں تنہا گھرے ہوئے ہیں۔ ابوجہل کے مارے جانے کے بعد اہل مکہ اور اطراف مکہ کی سیادت و قیادت انہی کے حصے میں آئی تھی۔ اور آج تک جس جس انداز سے اور جو جو مخالفتیں اہل اسلام کی کرتے رہے ہیں وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ شدید اذیت رساں اور ذلت آمیز طریقے سے انہیں قتل کر کے دنیا کے لیے عبرت کا نمونہ

بنایا جائے۔ لیکن رسول اللہؐ انتقام کی تسکین کے لیے نہیں آئے تھے۔ آپؐ کی آمد کا مقصد سفل جذبات کو دبانا اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کو پھیلانا تھا۔ آنحضرتؐ نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ: ابوسفیان! ہم مسلمانوں پر تم نے جو جو زیادتیاں کی ہیں وہ تمہیں یاد ہیں؟ بتاؤ آج تمہیں کیا سزا دی جائے؟" نہیں نہیں اتنا کچھ بھی تو آنحضرتؐ نے نہیں پوچھا۔ بات کی تو صرف وہ جو کام کی تھی۔ جو مشن سے تعلق رکھتی تھی۔ جو مقصدِ بعثت تھی۔

یہاں "برہمن کی پختہ زنّاری" کو بھی دیکھتے چلیے۔ جناب ابوسفیانؓ نے بات وہی کی جو سمجھ میں آئی۔ آج سے زیادہ خطرناک بے بسی کی کوئی ساعت ابوسفیان پر نہیں آئی تھی۔ ایک چھپا تیر کے پنجے تلے دبی تھی۔ ناخن کے ایک اشارے میں ملک الموت حاضر ہونے کے منتظر تھے۔ دس ہزار چمکتی ہوئی تلواروں کے درمیان ایک گردن تھی۔ اگر ڈر، خوف، سے تقیہ کر کے اسلام قبول کرنا ہوتا تو آج سے زیادہ ابوسفیان کے لیے اور کوئی نازک موقع زندگی میں نہ آیا تھا۔ آج ابوسفیان کو ہر بات کا اقرار کر لینا چاہیے تھا لیکن قریش کا یہ نڈر فرزند منافق نہ تھا۔ اس بے بسی میں بھی بات وہی کہی جو سمجھ میں آئی۔ صرف توحید کا اقرار کیا اور رسالت کے بارے میں جو شک تھا اسے اپنی جان کی پروا کیے بغیر دس ہزار کے مجمعے میں برملا ظاہر کر دیا۔ جب دشمن تھا تو یکّا دشمن تھا اور جب دوست ہوا تو یکّا دوست ہوا۔ یہ فرض کر لینا کہ فتح مکہ کے بعد جو بھی اسلام لایا وہ جان کے ڈر سے لایا کچھ معقولیت پسندی کا ثبوت نہیں۔

فتح مکہ کے بعد کبھی اللہ یا اس کے رسول نے یہ حکم نہیں دیا کہ جو اسلام نہ لائے اسے قتل کر دو۔ فتح مکہ کے پندرہ مہینے کے بعد ذی الحجہ سنہ ۹ھ میں

بموقع حج اکبر یہ آیت سنا دی گئی کہ:

فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر ۲:۸ مشرکو! چار ماہ حرم میں اور چل پھر لو۔

گویا فتح مکہ کے بعد انہیں ۱۹ مہینے کی مہلت مل گئی کہ اس درمیان میں اپنا فیصلہ کر لیں۔ فیصلہ بھی یہ نہیں کرنا تھا کہ قتل ہوں یا اسلام لائیں بلکہ یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مسلمان ہو کر عام مسلمانوں کے بھائی بن کر رہیں یا اپنے شرک کے ساتھ خدا کی وسیع زمین میں کہیں چلے جائیں۔ پھر یہ بھی واضح رہے کہ یہ فرامنِ الٹی میٹم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہ تھا یا وہ مشرک جو خود عہد شکنی کر کے معاہدے کو ختم کر چکے تھے۔ باقی رہے وہ لوگ جن کا معاہدہ ہنوز باقی تھا ان کے لیے یہ الٹی میٹم تھا ہی نہیں۔ ان کے لیے آخر وقت تک معاہدے پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ آگے ان شاء اللہ یہ تفاصیل آئیں گی۔

ان حالات میں کون کہہ سکتا ہے کہ ان پر اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دباؤ ڈالا گیا تھا یا قتل کی دھمکی دی گئی تھی اور وہ قتل کے ڈر سے اسلام لے آئے تھے؟ ان کے قبولِ اسلام کی وجہ صرف وہ تھی جس کی طرف جناب ابوسفیان نے اشارہ کیا ہے کہ: اگر اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہوتا تو آج ہماری مدد ضرور کرتا۔ ان اہلِ مکہ کے دماغ پر صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ شرک کا قبضہ چلا آ رہا تھا۔ مخصوص اہلِ بصیرت کے سوا عام طور پر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کعبۃ اللہ میں رکھے ہوئے بُت جھوٹے اور بے اثر ہو سکتے ہیں۔ انہیں آخر وقت تک یقین تھا کہ سرزمین مکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا کوئی تسلط نہیں ہو سکتا۔ اگر ادھر مسلمانوں نے رخ کیا تو ہمارے دیوی دیوتا انہیں دھتکار دیں گے۔ ان کے اس غلط اعتقاد کا قلعہ اس وقت بھسم ہوا جب

انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اہلِ اسلام خدا کا نام لیتے ہوئے داخلِ مکہ ہو گئے۔ ان کا تسلط ہو گیا اور ہمارے بُت دھرے کے دھرے رہ گئے بلکہ کعبۃ اللہ کے ایک ایک دیوی دیوتا کو ذلّت و خواری کے ساتھ باہر کر دیا گیا۔ یہ مناظر دیکھنے کے بعد اہلِ مکّہ کے اعتقاد میں تزلزل پیدا ہو گیا اور ان کے باطل تصورات میں انقلاب آ گیا۔ اس حقیقت کی طرف ہند بنتِ عتبہ رضؓ (جناب ابو سفیان کی بیوی) نے بڑا واضح اشارہ کیا ہے۔ یہ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے گھر گئیں اور اس بڑے بُت کو (جو انہوں نے اپنے ہاں حاجت روائی کے لیے رکھ چھوڑا تھا) اپنے ہاتھ سے یہ کہتے ہوئے پارہ پارہ کیا کہ: کمبخت تو ہی نے اب تک ہمیں دھوکے میں رکھ چھوڑا تھا"

غرض اہلِ مکّہ کے اسلام قبول کرنے کا سبب بتوں کی وہ بے بسی تھی جو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور وہ تسلط تھا جو خدا پرستوں کو حاصل ہوا۔ نہ یہاں تلوار کا دباؤ تھا نہ قتل کی دھمکی تھی کہ اسلام قبول کرو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔ انہیں تو کم سے کم انیس۱۹ مہینے کی یا اختتامِ میعاد تک کی مہلت دی گئی اور وہ بھی اس لیے نہ تھی کہ اس کے بعد قتل کر دیے جاؤ گے بلکہ یہ اس لیے تھی کہ اگر اسلام پسند نہیں تو اہلِ توحید کے نظامِ معاشرہ کو ان کے اپنے تصورات کے مطابق چلنے دو اور خود جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔

ذرا سوچیے وہ اسلام ہی کیا ہوا جو دباؤ سے قبول کیا جائے؟ دباؤ یا قتل کی دھمکی کے بعد پھر خدا کا صریح حکم لا اکراہ فی الدین کدھر جائے گا؟ اسلام تو نام ہی ہے اس منظوری کا جس میں خوش دلانہ رضا کاری) یا

رضاکارانہ خوش دلی ہو۔ آنحضرتؐ نے کب کسی ایسے شخص کا اسلام قبول کیا ہے جسے دباؤ سے منوایا گیا ہو؟ حضرت خالد تک سے تو باز پرس فرمائی کہ ھلا شققت قلبہ؟ کیا تم نے اس شخص کا (جسے تم نے قتل کر دیا) دل چیر کر دیکھا تھا کہ وہ تلوار کے ڈر سے اسلام لے آیا ہے؟ یعنی جناب خالد بھی یہ سمجھتے تھے کہ تلوار کے ڈر سے جو اسلام لایا جائے وہ اسلام نہیں ہوتا۔ لیکن ان سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ ایسے شخص کو واجب القتل سمجھ بیٹھے۔ مطلب یہ ہے کہ قبول اسلام کے بعد کسی کے متعلق اور خصوصاً اہل مکہ کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ وہ تلوار کے ڈر سے اسلام لے آئے تھے سرے سے درست نہیں۔

ہاں ان کی یہ بڑی غلطی تھی کہ انہوں نے عقل و بصیرت اور دلائل و براہین کی راہ سے اسلام کو نہیں سمجھا بلکہ اسلام کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کا معیار اس بات کو قرار دیا کہ اہل توحید ہمارے دیوی دیوتاؤں پر غالب آ گئے۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے بعض لوگ حقیقت پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ معجزہ دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ مسلمان وہ بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا وہ درجہ نہیں ہوتا جو بے معجزہ دیکھے ایمان لے آتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ صلح حدیبیہ کی فتح مبین کے بعد ایمان لانے والوں کا وہ درجہ نہیں جو اس سے پہلے کے اہلِ اسلام کا ہے۔ مگر مسلمان سب ہیں اور حسنیٰ کا وعدہ دونوں ہی طبقوں سے ہے۔ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ! تلوار کے دباؤ سے اسلام لانے والے تو نہ کبھی سچے مسلمان ہو سکتے ہیں اور نہ ان سے خدا حسنیٰ کا وعدہ کر سکتا ہے۔ (1) (اوپر ہم اس کے متعلق الفتح کی تفسیر میں

(1) قتل مرتد کا مسئلہ یہاں صاف ہو جاتا ہے۔ قتل کی دھمکی دے کر اگر کسی مسلمان کو تبدیلیٔ دین سے روکا جائے تو اس کا اسلام دباؤ والا اسلام ہوگا اور لا اکراہ فی الدین کے خلاف

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں وضاحت کر چکے ہیں)۔ کچھ بھی ہو ان کا ایمان ہم جیسے لوگوں سے ہزار درجے بہتر تھا جو فتحِ مبین کے صدیوں بعد کے مسلمان ہیں۔

شاہی یا فقیری

جب لشکرِ اسلام مرالظہران سے مکّے کی طرف روانہ ہوا تو آنحضرتؐ نے جناب عباسؓ سے فرمایا کہ: ابوسفیان کو گزرگاہ کی کسی پہاڑی پر کھڑا کر دو تاکہ وہ جیشِ اسلامی اور حزب اللہ کا جاہ و جلال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔" آنحضرتؐ کو یہ علم تھا کہ ابھی تک بعض لوگوں کے نزدیک حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی بصیرت و دلائل کی بجائے غلبہ و استیلا ہے۔ بہرحال ابوسفیان اور عباس ایک ٹیلے پر کھڑے تھے اور عسکرِ الٰہی کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جلال و جمال کے پھریرے اڑاتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس وقت ان دونوں میں جو گفتگو ہوئی ہے اس سے جاہلیت اور اسلام کے تصورات کا فرق بڑی خوبی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ابوسفیان نے عباس سے کہا: لقد اصبح ملک بن اخیک عظیما؟ (عباس! تمہارے برادر زادے کی بادشاہت تو بڑی زبردست ہو گئی ہے)۔ عباس نے مسکرا کر جواب دیا: لیس بملک انما ھٰذہ النبوۃ (ارے نادان ابوسفیان! تو ابھی تک نہیں سمجھا۔ یہ بادشاہت نہیں۔ یہ نبوت ہے)۔ اللہ اللہ! جناب عباس کے اس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) ہو گا۔ قتل مرتد کا مسئلہ جس طرح ہمارے ہاں سمجھا گیا ہے وہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ قتل صرف اس مرتد کو کیا جائے گا جس کے ارتداد کا مطلب ہی ہو مخالف کیمپ سے مل کر اسلامی معاشرے کو سبوتاژ کرنا۔

ایک جملے میں پوری کتاب سمٹی ہوئی ہے۔ اسلامی تصورات کا حقیقت نما نچوڑ اس جملے میں اس طرح بند ہے جس طرح ایک تخم کے اندر پورا درخت چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کجا بادشاہت اور کجا نبوت؟ بادشاہت خود غرضانہ شخصی پوجا ہے اور نبوت صرف خدا کی اطاعت کا پیغام اور انسانی پوجا کے لیے پیام موت۔ بادشاہت ظاہری جاہ و جلال کی نمائش ہے اور نبوت ایک ایسی فقیری ہے جس کے سامنے شاہانہ جاہ و جلال سرنگوں ہے۔ بادشاہت کا اعضاء و جوارح پر جابرانہ و ظالمانہ قبضہ ہے اور نبوت روح کی گہرائیوں پر خوش دلانہ تسلط۔ بادشاہت مفاد پرستی کے لیے قانون ساز ہے اور نبوت انسانی اقدار کے قیام کی ذمے دار ــــ بادشاہت ملک گیری ہے اور نبوت حقیقت پسندی۔

جناب عباسؓ کے ایک جملے نے ابوسفیان کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ توحید کو از خود ایک دوسری راہ سے سمجھے تھے اور رسالت کی حقیقت نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے تذبذب میں پڑے ہوئے۔ مگر عباس کے جملے نے ابوسفیان کے دل و دماغ کی وہ کھڑکی کھول دی جو اب تک بند پڑی تھی۔ آگے کے واقعات نے بادشاہت اور نبوت کا فرق اور بھی اچھی طرح واضح کر دیا۔

پُر امن اور پُر جلال کوچ

سب سے پہلے غفاری قبیلے کا جھنڈا لہراتا ہوا گزرا۔ پھر جہینہ، اندیم سلیم وغیرہ کے قبائل اپنے اپنے علم اڑاتے اور نعرہائے تکبیر سے ایتھر میں ارتعاش پیدا کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے نکلتے چلے گئے۔ آخر میں

انصار رسولؐ کی باری آئی۔ یہ لوہے میں غرق تھے اور سعدؓ بن عبادہ ان کا پھریرا فضائے آسمانی میں لہراتے جا رہے تھے۔ سیدنا سعد کی نظر جناب ابوسفیان پر پڑی تو دھمکانے کے لیے بولے: الیوم یوم الملحمۃ، الیوم تستحل الکعبۃ آج گھمسان کا رن پڑنے کا دن ہے اور آج سرزمین حرم بھی خونریزی سے نہیں بچ سکے گی ـــــ ابوسفیان یہ سن کر گھبرا گئے اور سوچ میں پڑ گئے۔ یوں تو ہر گزرنے والا جیش پہلے سے زیادہ گہرا نقش ابوسفیان کے دل پر بٹھا کر کفر کی باقی ماندہ تاریکیاں دُور کر رہا تھا۔ لیکن سعد بن عبادہ کی خلافِ حقیقت للکار نے ان کی کیفیت دگرگوں کر دی۔ ابھی ابھی جناب عباس کی بات سے بادشاہت و نبوت کے فرق کا جو نقش ابھرا تھا تھوڑی دیر کے لیے دھندلا پڑ گیا۔ اتنے میں ابوسفیان نے دیکھا کہ رحمۃ للعالمینؐ تشریف لا رہے ہیں اور سیدنا زبیرؓ بن عوام ایک ہمیشہ اونچا رہنے والا عرش رفعت عَلَمِ رحمت لہراتے ہوئے ساتھ ساتھ ہیں۔ ابوسفیانؓ کی نظر رحمتِ مجسم پر پڑی تو پکار کر کہا: ابھی سعد بن عبادہ آج کے دن کو گھمسان کی جنگ اور خونریزی کا دن بتا گئے ہیں۔" آنحضرتؐ کو سعد کا یہ قول ناگوار گزرا کیونکہ بات خلاف واقعہ تھی۔ فرمایا: سعد نے غلط کہا۔ آج تو بارانِ رحمت کا دن ہے۔" (الیوم یوم الملحمۃ نہیں بلکہ یوم المرحمۃ) اس کے بعد آنحضرتؐ کے حکم سے علم سعدؓ سے لے کر ان کے فرزند قیس بن سعد کو دیدیا گیا۔ بادشاہت اور نبوت کے فرق کا دھندلا نقش پھر ابوسفیان کی لوحِ دل پر پوری طرح ابھر آیا۔ لیکن اس کی مکمل عملی تصدیق آگے چل کر اسی دن ہو گئی۔

داخلۂ مکہ سے پہلے ہدایات

ذرا دیر کے بعد مکے کے اندر داخلہ ہوا۔ عَلَمِ نبوی مقام حجون میں نصب

کیا گیا۔ حضورؐ کے حکم کے مطابق پانچ قبیلے —— اسلم، سلیم، غفار، مزینہ اور جہنیہ حضرت خالدؓ کی سرکردگی میں مکے کے حصہ زیریں سے داخل ہوئے۔ دوسرے لشکر بالائی حصے سے داخل ہوئے اور خود آنحضرتؐ نے اپنے داخلے کے لیے مقام ذی طویٰ کے راستے کو پسند فرمایا۔ خالد اور زبیر کو یہ حکم ملا کہ:

"حرم میں ہرگز کوئی خونریزی نہ ہو۔ مقابلہ اسی کا کیا جائے جو سامنے آ کر حملہ آور ہو۔" مزید اعلان یہ فرمایا کہ: جو شخص کعبے کے اندر داخل ہو جائے اسے پناہ۔ جو ابوسفیان کے گھر کے اندر داخل ہو اسے پناہ، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے اسے پناہ۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ جو ہتھیار پھینک دے اس سے تعرض نہ کیا جائے۔ زخمی اور اسیر قتل نہ کیے جائیں۔"

لمحۂ فکریہ

ذرا ان احکام پر غور کیجیے۔ خونریزی کو روکنے کی کون سی تدبیر ہے جو باقی رہ گئی ہو؟ ذرا دیکھیے:

۱ - سب سے پہلے ابوسفیان کو ایک ٹیلے پر کھڑا کر کے ان کے دل کو مرعوب کر دیا گیا تاکہ اس سردار قریش کے ساتھ قریش کے حوصلے بھی پست ہو جائیں اور وہ جنگ کی جرأت نہ کر سکیں جس کے نتیجے میں قریش کی شکست کے علاوہ سینکڑوں انسانوں کا خون بہہ سکتا تھا۔

۲ - پھر تین طرف سے جیوش قاہرہ داخل کیے گئے تاکہ اہل مکہ ارادۂ خونریزی سے دست کش ہو جائیں۔

۳ - پھر سرزمین حرم کی حرمت کو باقی رکھنے کی سختی سے تاکید کی گئی۔

۴ - پھر ہر اس شخص کو پناہ حاصل ہونے کا اعلان کیا گیا جو کعبے میں داخل

ہو جائے اور ابو سفیان کے گھر کے اندر چلا جائے اور حد یہ ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کرے۔

۵ - پھر مقابلے سے الگ رہنے والے کے لیے بھی پناہ کا اعلان کر دیا گیا۔

۶ - پھر ہتھیار پھینک دینے والے کے لیے بھی امن کا پیغام سنا دیا گیا۔

۷ - پھر زخمی یا اسیر ہونے والے پر بھی تلوار اٹھانے کی ممانعت کر دی گئی۔

۸ - بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ: جو حکیم بن حزام کے گھر کے اندر داخل ہو جائے اسے بھی پناہ۔

یہ ہے وہ موقع جہاں انسانی اقدار کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ فتح مبین تھی اور ایسی غالبانہ فتح تھی کہ ایک اشارے میں پورا مکہ خاک سیاہ بن سکتا تھا۔ فاتحین فتح کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں اور وہاں جذبۂ انتقام ابھر آتا ہے۔ چُن چُن کر لوگوں سے بدلہ لیا جاتا ہے لیکن یہاں تو فتح کی ایسی نئی قدریں پیش کرنی تھیں جو بلند ترین انسانیت کا مظہر ہوں اور رہتی دنیا تک ہر فاتح کے لیے اسوہ حسنہ ہو۔ اپنی طرف سے حضورؐ نے ہر وہ ممکن تدبیر کی کہ کسی انسان کا خون نہ بہے۔ لیکن

قضائے الٰہی

ایک جگہ غالب آ گئی۔ خالدؓ جس راستے سے گزر رہے تھے وہاں قریش کے ایک گروہ نے مزاحمت کرتے ہوئے تیر برسائے جس سے کرز بن جابر فہری اور حُبیش بن عامر شہید ہو گئے۔ مجبوراً خالدؓ کو جواب دینا پڑا اور تیرہ قریشی مارے گئے۔ حضورؐ کو معلوم ہوا تو خالدؓ سے باز پرس فرمائی۔ خالدؓ نے یہ عذر پیش کیا کہ ابتدا قریش کی طرف سے ہوئی تھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ قضائے الٰہی تھی۔"

چند سرکش

جہاں پناہِ عام کا یہ اعلان تھا وہاں آنحضرتؐ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ:
عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عبدالعزیٰ بن خطل، عکرمہ بن ابی جہل، مقیس بن صُبابہ اور ام سارہ جہاں بھی ملیں انہیں قتل کر دیا جائے خواہ وہ کعبے کے پردے کو پکڑے ہوئے ہوں۔" عبداللہ بن خطل کو تو سعید بن حریث نے قتل کیا۔ یہ اس وقت کعبے کے پردے کو پکڑے ہوئے تھا۔ مقیس کو لوگوں نے بازار میں دیکھا اور قتل کر دیا۔

عکرمہ بن ابی جہل ایک کشتی میں سوار ہو کر بھاگے مگر راستے ہی میں شدید طوفان سے دوچار ہوئے۔ کشتی سوار آپس میں باتیں کرنے لگے کہ: اس وقت خالص اللہ کو پکارو کیونکہ دوسرے معبود اس وقت تمہارے کسی کام نہ آئیں گے۔ عکرمہ نے کہا: بخدا اگر سمندر میں بجز اخلاص للہ کے اور کوئی چیز نہیں بچا سکتی تو خشکی پر بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں بچا سکتا۔ اے اللہ! اگر تو مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دے تو میں عہد کرتا ہوں کہ میں محمدؐ کے پاس جا کر آپؐ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیدوں گا اور میں انہیں عفوّ و کریم ہی پاؤں گا۔" اس کے بعد عکرمہ آ گئے اور ایمان لے آئے۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح حضرت عثمانؓ بن عفان کے پاس روپوش ہو گئے اور جب لوگ بیعت کے لیے حضورؐ کے پاس آنے لگے تو حضرت عثمانؓ انہیں لے کر آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! ان کی بیعت لے لیجیے۔" آنحضرتؐ نے انہیں تین بار دیکھا اور ہر بار گویا بیعت سے انکار فرمایا۔ اس کے بعد پھر بیعت لے لی۔ اس کے بعد صحابہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ: جب تم مجھے دیکھ رہے تھے کہ میں اس

کی بیعت لینے میں لیس و پیش کر رہا ہوں تو کیا تم میں کوئی ایسا سمجھدار نہ تھا جو اسے اٹھ کر قتل کر دیتا؟" صحابہ نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! حضورؐ کے دل کی بات کا ہمیں کیا علم تھا۔ حضورؐ نے ذرا آنکھ سے اشارہ فرما دیا تھا۔" فرمایا: کسی نبی کو خیانتِ چشم زیب نہیں دیتی۔

لمحۂ فکریہ

عبداللہ بن ابی سرح سیدنا عثمانؓ کا رضاعی بھائی تھا۔ اسے واجب القتل اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ یہ کتابتِ وحی کرتا تھا تو اس میں رد و بدل کر دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ارتداد کی سزا قتل کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سزاوارِ قتل قرار دیا لیکن سیدنا عثمانؓ کی سفارش سے اس کا دوبارہ اسلام قبول فرما کر بیعت کر لی۔ یہ رحمت کی انتہا ہے۔ پھر اس موقعے پر جو سب سے بڑی نبوی قدر ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ نبی یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ بہ ظاہر تو چپ رہ کر خون معاف کر دے اور دوسری طرف آنکھوں سے اشارہ کرے کہ اسے قتل کر دو۔ اس کا حکم قتل بھی علانیہ ہو گا اور معافی بھی علانیہ ہو گی۔ نبی کوئی سیاسی دوغلا پن سکھانے نہیں آتا۔ وہ ایماندارانہ اندازِ زیست کی تعلیم دیتا ہے جس میں منافقت کا کوئی شائبہ نہ ہو۔

اس روایت سے ایک اور حقیقت کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ ایک ایسی امتِ رشیدہ پیدا فرمانا چاہتے تھے جس میں منشائے نبوی کو تاڑ جانے کی کمال صلاحیت ہو۔ ہر ایک بات صاف لفظوں میں نہیں کہی جاتی کہیں الفاظِ کنایہ ہوتے ہیں۔ کہیں خاموشی ہوتی ہے اور کسی جگہ محض تیور ہوتے

ہیں اور ان سب کے خاص خاص منشا ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص میں باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس کا فقیہہ ہونا مشکل ہے۔ تفقّہ فی الدین کے لیے محض مخلص و فداکار ہونا کافی نہیں۔ اس کے لیے کلام الٰہی اور حدیث نبوی —— جس میں قول، فعل اور سکوت سب داخل ہیں —— کے تیور پہچاننا بھی ضروری ہے تاکہ صحیح منشا معلوم ہو سکے۔ محض الفاظ کی پیروی سے وہی غلط فہمی ہو سکتی ہے جو بعض مخلص، سادہ لوح صحابہ کو قرآن کے الفاظ "خیطِ ابیض اور خیطِ اسود" سے ہوئی تھی جس کے معنی تو ہیں افق کی سفید و سیاہ دھاریاں لیکن وہ اس کا مطلب سمجھے تھے سفید و سیاہ دھاگے۔

شانِ رسالت اور تطہیر کعبہ

۲۰ رمضان ۸ھ کو فاتح القلوب رسولِ رحمتؐ فاتحانہ مکے میں داخل ہوا۔ اونٹنی پر سوار تھا اور آزاد کردہ غلام زید شہیدؓ کا یتیم فرزند اسامہؓ ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ انا فتحنالك فتحا مبینا کی سورت تلاوت فرمائی جارہی تھی۔ فاتحانہ داخلہ تھا لیکن جھکا ہوا سر اقدس عبدیت کاملہ کا اظہار کر رہا تھا۔ حضرت اکرمؐ کا قیام مقام خیف میں ہوا تھا جیسا کہ اکثر روایات سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی حضورؐ نے کعبۃ اللہ کو بتوں سے پاک صاف کیا۔ بیت اللہ اس وقت تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن تھا۔ ایک چھڑی کی نوک سے حضورؐ ایک ایک بت کو اس طرح ٹھوکر لگاتے تھے کہ بت سر بسجود ہو کر الٹ جاتے تھے یا چت ہو جاتے تھے۔ زبانِ مبارک پر اس وقت یہ آیت تھی جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا یعنی حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ باطل تو مٹنے والی چیز ہی تھی۔ کبھی یہ آیت تلاوت فرماتے جاء الحق وما یبدی ئ ج

الباطل وما یعید یعنے حق آگیا اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا۔ کعبے کے اندر جاکر حضرت عمرؓ تمام تصاویر پہلے ہی مٹا چکے تھے جب بیت اللہ حقیقی معنے میں پاک ہو چکا تو حضورؐ نے عثمانؓ بن ابی طلحہ کو، جو کلید بردار کعبہ تھے بلوایا اور ان سے بیت اللہ کی چابی طلب فرمائی۔ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے طواف کعبہ کیا پھر چابی مانگی۔

ایک پیشین گوئی کا ظہور

ابتدائے نبوّت کے ایام میں ایک دن حضرت اکرمؐ نے عثمانؓ بن ابی طلحہ سے خانۂ کعبہ کھولنے کو فرمایا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ عثمانؓ دیکھ لینا ایک دن خانۂ کعبہ کی چابی میرے ہاتھ میں ہو گی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا۔" آج اس پیشین گوئی کا پورا ظہور ہوا۔ آں حضرتؐ نے عثمانؓ سے چابی لی اور قفل کھول کر اندر تشریف لے گئے۔ آج کعبہ اپنی قسمت پر ناز کر رہا ہے کہ اس کے اندر اس کا وارث حقیقی اپنے مبارک قدم رکھ رہا ہے۔ وہ وارث جس کا ہر نقش قدم قبلہ گاہِ عالم ہے:

گری پڑتی ہے اک دنیا جبینِ شوق گھسنے کو
جہاں ان کا قدم پڑتا ہے کعبہ ہو ہی جاتا ہے

کعبۂ دو جہاں کعبۃ اللہ میں

حضور اکرمؐ بلالؓ اور طلحہؓ کو ساتھ لے کر اندر گئے اور بارگاہِ الٰہی میں اپنا سرِ نیاز خاک پہ رکھ کر عبدیت و تشکر کا نذرانہ پیش فرمایا۔ باہر تشریف لائے تو عباسؓ نے کلیدِ کعبہ بنو ہاشم کو دیے جانے کی درخواست کی۔

رحمتِ عالمؐ نے فرمایا: الیوم یوم البر والوفا آج ہی کا دن تو ہے جب کہ بُروں کے ساتھ نیکی اور بے وفاؤں کے ساتھ وفا کی جائے گی۔" یہ فرماکر کنجی عثمان ہی کے حوالے کر دی اور فرمایا کہ جو تم سے یہ کلید چھینے گا ظالم ہوگا۔ ممکن ہے یہ حکم صرف عثمانؓ بن ابی طلحہ کے ساتھ مخصوص ہو لیکن امت نے اس فرمان کا اتنا احترام کیا ہے کہ ان تیرہ صدیوں میں آج تک یزید کے سوا کسی نے اس خاندان سے یہ حق سلب نہ کیا۔

عجیب خطبہ

اس کے بعد حضورؐ نے مجمع پر نگاہ ڈالی تو ان خونخواران قریش کو دیکھا جو اگرچہ اس وقت بے کس تھے اور مسلمانوں کے قبضے میں تھے لیکن ان کے پچھلے مظالم کا ہر واقعہ تلواروں کو گردن زدنی کی دعوت دے رہا تھا۔ پہلے حضورؐ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: حمد و ثنا کے بعد

یامعشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباء الناس من آدم وآدم من تراب۔

اے قریشیو! آج اللہ تعالیٰ نے تمہارے جاہلانہ گھمنڈ اور نسب کے تفاخر کو خاک میں ملا دیا۔ سارے انسان ایک آدم سے پیدا ہوئے اور آدم مٹی سے بنے۔

پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

یاایھا الناس اِنّا خلقنکم من ذکر وانثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔

اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک ایک مرد و زن سے پیدا کیا ہے اور تمہیں قبیلوں اور خاندانوں میں اس لیے بانٹ دیا کہ تم ایک دوسرے کو (بآسانی) شناخت کر سکو۔ ورنہ

اللہ کے نزدیک تو سب سے زیادہ قابل
عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو

اعداء سے درگذر کی عجیب مثال

اس خطبے کے بعد ظالم خونخواران قریش کی طرف حضورؐ نے متوجہ ہو کر پوچھا۔ کہ "اے قریشیو! تمہیں معلوم ہے کہ آج میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ قریش اگرچہ ظالم تھے مگر حضور اکرمؐ کے مزاج شناس تھے۔ فوراً بول اٹھے اخ کریم وابن اخ کریم یعنے شریف النفس بھائی اور شریف الطبع بھائی کے فرزند ہیں۔" یعنے حضورؐ سے خیر ہی کی توقع ہے۔ حضورؐ نے فرمایا:

فانی اقول کما قال یوسف	آج میں تم بھائیوں سے وہی کہتا ہوں
لاخوته لاتثریب علیکم	جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا
الیوم اذهبوا فانتم	کہ آج تم پر کوئی دار و گیر نہیں۔ جاؤ آج
الطلقاءً۔	تم سب چھوڑ دیے گئے۔"

ادھر جسم آزاد ہوتے ادھر قلوب مسخر ہونے لگے۔ روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ حضور اکرمؐ نے مہاجرین سے ان تمام مملوکات سے دستبردار ہو جانے کو فرمایا جن پر اہل مکہ نے قبضہ کر لیا تھا۔

کعبہ میں پہلی اذان اور جماعت

ظہر کا وقت آیا تو مؤذن رسولؐ سیدنا بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی اور اس لشکر جرار کے ساتھ حضورؐ نے نماز ادا فرمائی۔ یاد کرو اس وقت کو جب کہ اسی حرم میں یاد الٰہی اور نماز کی حالت میں

سردارِ دو جہاں کی گردن پر اوجھڑی ڈالا گیا تھا اور گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بل دیا گیا تھا۔ آج کہاں ہیں وہ جبارانِ قریش اور آج وہ مستہزئین کدھر گئے۔ جاء الحق وزھق الباطل۔

ہر گھر میں اسلام

نماز کے بعد رسولِ خدا کوہِ صفا پر چڑھ گئے۔ قریباً سارا مکہ اسی روز اسلام لا کر اہلِ صفا میں داخل ہو گیا۔ پہلے مردوں کی جماعت نے آ کر بیعتِ اسلام کی پھر عورتوں نے آنا شروع کیا۔ عورتوں سے بیعت اس طرح لی جاتی کہ ان سے ارکانِ اسلام اور اصلاحِ اعمال و اخلاق وغیرہ کا عہد لیا جاتا - پھر ایک پانی سے بھرے برتن میں حضور اکرمؐ اپنا دستِ مبارک ڈال کر نکال لیتے اور پھر عورتیں اس میں ہاتھ ڈالتیں۔ یہ بختگیٔ عہد کا طریقہ تھا۔ عورتوں سے علاوہ دیگر ضروری باتوں کے یہ بھی اقرار لیا جاتا تھا کہ کسی کے سوگ میں قبر پر نہ بیٹھنا۔ سیاہ کپڑے نہ پہننا گریباں نہ چاک کرنا۔ سر کے بال نہ نوچنا، چہرہ اور سینا نہ پیٹنا۔

ہند بنتِ عتبہ کا اسلام

ان ہی ایمان لانے والی عورتوں میں ہند بنتِ عتبہ بھی تھیں۔ جو ابوسفیان کی بیوی اور امیر معاویہؓ کی والدہ ہیں۔ یہ نقاب اوڑھ کر حاضر ہوئیں۔ انہیں غالباً یہ خیال ہو گا کہ جگرِ حمزہؓ چبانے کی پاداش میں شاید کوئی پہچان کر قتل نہ کر دے۔ بہر حال حضورؐ نے ان سے عہدِ بیعت لیتے ہوئے فرمایا: اقرار کرو کہ شرک نہ کرو گی۔ ہند نے کہا "منظور"۔ حضورؐ نے فرمایا:

اور چوری بھی نہ کرنا۔ ہند نے جواب دیا "میں اپنے شوہر کے مال میں سے کبھی تھوڑا بہت لے لیا کرتی ہوں معلوم نہیں یہ چوری میں داخل ہے یا نہیں" حضورؐ نے فرمایا "اور زنا بھی نہ کرنا"۔ ہند بولیں "شریف عورتیں ایسا نہیں کیا کرتیں"۔ پھر حضورؐ نے ارشاد فرمایا "اور اولاد کو قتل نہ کرنا"۔ ہند نے کہا "ہم نے تو چھوٹے بچوں کو پرورش کر کے بڑا کیا اور جب وہ بڑے ہوئے تو آپؐ نے جنگ میں انہیں قتل کیا"۔ (بدر میں ہندؓ کے لڑکے مارے گئے تھے)۔ حضور سرور کائناتؐ سراپا رحمت تھے اس بے باکانہ برجستگی پر ہنس پڑے۔ اور فرمایا: "تم ہندؓ معلوم ہوتی ہو"۔ انہوں نے کہا "ہاں یا رسول اللہ اپنے کیے پر نادم ہوں"۔ اسلام لانے کے بعد ہندؓ اپنے گھر گئیں اور بڑے بُت کو اپنے ہاتھ سے یہ کہہ کر توڑا کہ "تو ہی نے مجھے آج تک دھوکے میں رکھا" غزوۂ یرموک میں یہ شریک تھیں اور بڑے جوش کے ساتھ یہ مردوں کو ہمت دلا رہی تھیں۔ یاد کرو وہ وقت جب کہ کل یہ کفار قریش کو جوش دلانے کے لیے میدانِ احد میں سب سے آگے آگے تھیں اور آج یرموک میں کیا انقلاب ہو گیا ہے۔ مکّے میں جو مرد و زن باقی رہ گئے تھے وہ تھوڑے ہی دنوں بعد ایمان لے آئے۔

نبی اکرمؐ نے پندرہ روز مکّہ معظمہ میں قیام فرمایا اس کے بعد حنین کی جانب ہوازن و ثقیف کی تادیب کے لیے روانہ ہو گئے۔

اپنی نوعیت کی پہلی فتح

آپ نے فتح مکّہ کے حالات سنے اور اس کے علاوہ بھی آپ نے اور بہت فتوح کے واقعات سنے اور پڑھے ہوں گے۔ کیا ایسی شاندار

فتح دنیا میں اور بھی کہیں دیکھی یا سنی ہے؟ ایسی فتح جس میں خون کا ایک قطرہ بھی بہانے کا از خود اقدام نہ کیا گیا ہو؟ ایسی فتح جس میں عام دشمنوں کے لیے عام درگزر کا پیغام سنایا گیا ہو؟ ایسی فتح جس نے ملک کے ساتھ ساتھ اسی دن ہزاروں قلوب کو بھی فتح کر لیا ہو؟ ایسی فتح جس نے فاتح کے خلاف آج تیرہ صدیوں میں پھر کبھی بغاوت نہ پیدا ہونے دی ہو؟ ایسی فتح جس نے اپنے مشن کی تکمیل کا آخری نمونہ دکھا دیا ہو؟ ایسی فتح جس نے فاتحؐ کو پہلے سے زیادہ منکسر، متواضع اور رحیم بنا دیا ہو؟ ایسی فتح جس نے ایک طرف رؤسائے قریش کا سر نیچا کیا ہو تو دوسری طرف ایک غلام زادے (اسامہ) کو فاتح کے ساتھ اونٹ پر بٹھا کر غلاموں کا درجہ شاہنشاہوں سے زیادہ بلند کر دیا ہو؟ ایسی فتح جو فتح مبین ہو اور ایسی فتح جس نے خائنوں کو امین، ڈاکوؤں کو نگہبان، چوروں کو محافظ، دختر کشوں کو دختر پرور، ظالموں کو عادل، سنگدلوں کو رحیم، وحشیوں کو متمدن، جاہلوں کو معلم، غلاموں کو فرمانروا، ذرّے کو آفتاب، دشمنوں کو جاں نثار، اور جہنمیوں کو "مطلوب جنّت" بنا دیا ہو؟ کس قوم کی تاریخ کا کوئی ورق اور کس فاتح کی سیرت ان سوالوں کا جواب اثبات میں دے سکتی ہے لطف کی بات دیکھو۔

عجیب عنایت وکرم

دوستوں پر بھی عنایات کرتے ہیں۔ اگر ابوبکرؓ و عمرؓ پر عنایات ہوئیں تو ہونی چاہیے تھی۔ مگر یہاں فاتحانہ رحم، کرم کس پر ہوتا ہے؟ ابوسفیانؓ پر جو قریش کے ہر معاندانہ اقدام کا ہیرو رہے۔ کس پر؟ ہندؓ پر۔ جو ابوسفیان

کی بیوی اور حمزہؓ کا جگر چبانے والی ہے۔ کس پر؟ وحشیؓ پر۔ جو حمزہؓ کا قاتل ہے۔ کس پر؟ راہ میں کانٹے بچھانے والوں پر، گلے میں کپڑے کا پھندا کسنے والوں پر، پیٹھ پر اوجھ کا بوجھ ڈالنے والوں پر، گالیوں اور تالیوں سے ہر جگہ استقبال کرنے والوں پر، پتھروں سے مار مار کر خون بہانے والوں پر، ان ظالموں پر جنہوں نے صرف خدا پرستی کے جرم میں تین سو میل کے فاصلہ پر بھی امن کا سانس نہ لینے دیا۔ اللہ اللہ درگزر، عفو و کرم، مہر و رحم کا یہ نمونہ رحمت للعالمینؐ کے سوا کون پیش کر سکتا تھا؟ کون ایسے خونخواروں کو انتم الطلقاء کا پیغام سنا سکتا ہے؟ رحم ہی نہیں بلکہ حد تو یہ ہے جس ابوسفیانؓ نے گھر سے بے گھر کیا، حرم سے بے پناہ کیا آج اسی ابوسفیانؓ کے گھر کو پناہ گاہ بنایا جا رہا ہے اور حرم کی طرح اسے بھی امن گاہ بنایا جا رہا ہے۔ جس عثمانؓ بن ابی طلحہ نے کبھی کلید کعبہ دینے سے انکار کیا تھا، آج اسی عثمانؓ کو ہمیشہ کے لیے کلید برداری کعبہ کا منصب سونپا جا رہا ہے۔

غزوۂ حنین

سرحد مکّہ کے پاس مشرقی سمت عرفات سے تین میل پر حنین ایک مقام ہے جہاں قبائل ہوازن و ثقیف آباد تھے۔ یہ قبیلے فن حرب کے ماہر اور سرکشی میں ممتاز تھے۔ فتح مکہ کی خبر سننے کے بعد ان کے اندر خوف و رجا کی دو حالتیں پیدا ہوئیں۔ خوف تو اس سے ہوا کہ کہیں اہل مکہ کی طرح مسلمان ہمیں بھی مغلوب نہ کر لیں اور رجا (امید) اس بات کی پیدا ہوئی کہ

ہم نے مسلمانوں کو مغلوب کر لیا تو علاوہ انتقام بت شکنی کے اہل مکہ کے جو باغ اور املاک طائف میں ہیں ان پر ہم قابض ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر ہم مغلوب ہو گئے تو جس طرح آج بھی مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنی ہے اسی طرح کل بھی بسر کر لیں گے۔

دراصل ہوازن و ثقیف کی تیاریاں صلح حدیبیہ کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھیں اور کم و بیش ایک سال ان کی یہ جد و جہد جاری رہی۔ تمام قبائل عرب کو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف ابھار کر اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ایک متحدہ حملہ کر کے شوکتِ اسلام کو ختم کر دیا جائے۔ یہ موقع ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ فتح مکہ کی خبر دفعۃً ملی اور یہ اپنے لیے اور زیادہ خطرہ محسوس کرنے لگے۔ انہیں مسلمانوں کے مدینے سے روانگی کے وقت ہی خبر ہو گئی تھی لیکن یہ سمجھے کہ حملے کا رُخ ہماری طرف ہے اس لیے انہوں نے زور و شور سے تیاریاں شروع کر دیں۔ اب فتح مکہ کی خبر ملنے کے بعد انہیں کوئی اور تیاری کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف پیش قدمی کی حاجت تھی سامان و مواد سب تیار تھے اس لیے یہ خود مسلمانوں کی طرف بڑھے۔ چار ہزار آزمودہ کار جنگجو سپاہیوں کا دستہ تھا۔ اور ہر قبیلے نے اپنے اہل و عیال کو بھی اس لیے ساتھ رکھ لیا تھا کہ ان کی حفاظت کا خیال پیٹھ پھیرنے نہ دے گا۔ یہ لشکر وادی حنین میں خیمہ زن ہوا۔ فوجی قیادت کے لیے دو شخصوں کا انتخاب ہوا۔ ایک مالک بن عوف کا جو سردار ہوازن تھا۔ دوسرے دُرید بن صمہ کا جو قبیلۂ جشم کا سردار اور آتش زبان شاعر تھا۔ درید سو برس کا بڈھا اور ہڈیوں کا پنجر تھا لیکن اس کی دانائی و تدبر کے باعث پلنگ پر اٹھا کر اسے میدانِ جنگ میں لایا گیا تھا۔

حضرت اکرمؐ کو جونہی خبر ملی فوراً عبداللہ بن جدرد کو تحقیق حال کے لیے بھیجا۔ عبداللہ نے واپس آکر تصدیق کی تو حضور اکرمؐ نے فوراً کوچ کی تیاریاں شروع فرما دیں۔ سامان ونقد کی کچھ کمی تھی۔ اس لیے عبداللہ بن ربیعہ سے تیس ہزار درہم اور صفوان بن امیہ سے سو (یا اس سے زیادہ) زرہیں قرض لیں۔ اس کے بعد یہ لشکر جرار جس میں دس ہزار مسلمان مجاہدین اور ان کے علاوہ قریباً دو ہزار نو مسلم تھے، حنین کی طرف روانہ ہوا۔ بعض روایات سے ان دو ہزار نو مسلموں میں معاہد و حلیف غیر مسلموں کا شریک ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ حضورؐ کو اس کی ضرورت تو نہ تھی لیکن ممکن ہے کہ خود انہوں نے یقین فتح کے بعد حصولِ غنیمت کی غرض سے شرکت کی درخواست کی ہو اور حضورؐ نے اسے منظور فرما لیا ہو۔

تنبیہہ مقربین اور قلت وکثرت کا فریب

اُدھر چار ہزار تھے اور اِدھر بارہ ہزار۔ بہ ظاہر کیا قیاس ہو سکتا تھا؟ بعض مسلمان بول اٹھے کہ "آج ہم پر کون فتح پا سکتا ہے"۔ اللہ تعالیٰ کو یہ اطمینان اور اکڑ پسند نہ آئی اس لیے فوراً ہی ایک ٹھوکر بھی دیدی گئی۔ یعنے پہلے ہی حملے میں یہ بارہ ہزار مجاہدین میدان چھوڑ بھاگے جس کی تفصیل ابھی آتی ہے۔ پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ جو بندے جتنے زیادہ مقرب ہوتے ہیں اسی قدر جلد ان کی لغزش پر تنبیہہ اور غلطی کی اصلاح کر دی جاتی ہے۔ ورنہ ان کے پیچھے چلنے والے فوراً ہی بے راہ ہو جائیں۔ لیکن گمراہوں میں جو جتنا زیادہ گمراہ ہو اسی قدر ڈھیل دی جاتی ہے۔ جب سارا مواد اکٹھا ہو جاتا ہے تو ایک بار "اِنَّ

کیدی متین" کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ نیک بندوں کی ذرا ذرا سی باتوں پر گرفت ہوتی ہے اور جلد سے جلد ہوتی ہے۔ اور بدکاروں کو بڑی بڑی بدکاریوں پر بھی مہلت دی جاتی ہے۔ یعنی یوں سمجھئے کہ:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

جو شیلے مسلمانوں کا اترانا اور پھولنا کیونکر پسند آسکتا تھا جب کہ نفسیاتی لحاظ سے بھی یہ مضر ہے کیونکہ اس طرح کا اطمینان قوت مدافعت میں کمی اور پائے ثبات میں لغزش پیدا کر دیتا ہے۔ جب ہی تو قرآن کریم نے قلت و کثرت کے تصور ہی سے بے نیاز رکھا ہے۔ جس طرح قلت کا ڈر ایک شرکِ خفی ہے اسی طرح کثرت پر بھروسہ بھی خدائی مدد سے بے نیازی کے مترادف ہے۔ اللہ تعالےٰ کو ایک سبق دینا مقصود تھا کہ مسلمان اگر ڈرتا ہے تو صرف خدا سے ڈرے قلتِ تعداد کوئی ڈرنے کی چیز ہی نہیں اسی طرح اگر بھروسہ کرنا ہے تو صرف اللہ پر کرے کثرت تعداد کوئی توکل و اعتماد کی شے ہی نہیں۔ یہی قرآنی نظریہ ہے جسے بعض اترانے والے نومسلم نوجوانوں نے سمجھنے کے باوجود وسعتِ ظرف سے کام لینے میں لغزش کی ہو گی۔ لیکن پروردگارِ عالم کو اتنا بھی گوارا نہ ہوا کیونکہ انہیں تا قیامت آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ بننا تھا۔ لتکونوا شھداء علی الناس۔

کیفیتِ جنگ اور اعلانِ صداقت

ہر کیف ادھر بے خطا تیر اندازی کرنے والوں کا ہجوم تھا جنہوں نے

مناسب مقامات اور کمین گاہوں پر پہلے سے قبضہ کر رکھا تھا۔ غاروں اور گھاٹیوں میں تیر اندازہ بہادر بیشتر سے بٹھا دیے تھے۔ ادھر خالدؓ کی کمان میں نوخیزوں کا دستہ مقدمۃ الجیش بنا ہوا تھا جن میں وہ ناآزمودہ کار نومسلم تھے جن کے پاس اسلحۂ جنگ بھی نہ تھے۔ تشیب میں جگہ ملی تھی اور ہتھیاروں کی جگہ جوشِ شباب اور زعم شجاعت تھا۔ صبح کی تاریکی میں جنگ کا آغاز ہوا۔ ہوازن و ثقیف اور دیگر قبائل کے ہزاروں تیر اندازوں نے یکبارگی حملہ کر کے تیروں کی بارش شروع کر دی۔ مقدمۃ الجیش کا دستہ پیچھے ہٹا۔ اس کے ریلے میں پیچھے کے لوگ بھی ہٹے اور اسلامی فوج میں ایسی ابتری پھیلی کہ بجز چند صحابہؓ کے سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ حضور اکرمؐ معرکۂ اُحد کی مانند یہاں بھی میخ آہنی کی طرح جمے رہے۔ ایک کوہِ مردانگی تھا جو دشمن کی طرف ہی رُخ کیے کھڑا تھا۔ شہسوار اپنی سواریوں پر بھاگ رہے ہیں لیکن صرف ایک شہسوارؐ ہے جو اپنے سفید خچر سے اتر کر بہ وقفہ کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ:

انا النبی لا کذب   انا ابن عبد المطلب

میں نبی ہوں یہ غلط نہیں   میں عبد المطلب کا فرزند ہوں

اس مردانہ رجز میں بھی وہی تبلیغ کارفرما ہے جس کے لیے بعثت ہوئی ہے یعنی چاہے سارے مجاہدین پیٹھ پھیر لیں مگر میں، میری رسالت، میرا پیغام سب سچے ہیں خواہ کوئی ثابت قدم رہے یا نہ رہے۔ پھر حضورؐ نے انصار کو للکارا۔ کہ یامعشر الانصار! جدھر رُخ کر کے پکارا ادھر ہی سے جواب ملا لبیک یا رسول اللہ پھر عباسؓ سے کہا کہ تم انصار و مہاجرین کو آواز دو۔ عباسؓ نے یامعشر الانصار اور یا اصحاب الشجرۃ بہ آواز بلند کہا۔

ان آوازوں کا کانوں میں پڑنا تھا کہ دفعتہً ہوا کا رُخ بدل گیا۔ تمام مجاہدین پلٹ پڑے۔ آپ کے انصار و مہاجرین آگے آ گئے تھے۔ یہ نہ رُکنے والا سیلاب دشمنوں کی طرف بڑھا تو جنگ کا نقشہ پلٹ گیا۔ دشمنوں کے ستّر آدمی مارے گئے۔ ان کا علمبردار عثمان بن عبداللہ بھی قتل ہوا۔ اور اس کے قتل ہوتے ہی عسکرِ اسلامی کا چہرہ تھا اور فوج اعداء کی پشت۔ مالک بن عوف تو تمام جنگجو بہادروں کو لے کر قلعۂ طائف میں گھس گیا۔ اور درید بن صمہ عورتوں بچوں کو لے کر اوطاس میں پناہ گزین ہوا۔

غزوۂ اوطاس

حنین سے فارغ ہو کر حضرت اکرمؐ نے ایک دستہ ابو عامرؓ اشعری کی سرکردگی میں اوطاس کی طرف بھیجا۔ ابو عامرؓ درید کے بیٹے سلمہ کے ہاتھ سے شہید ہوئے اور علمِ اسلامی قاتل نے لے لیا۔ ابو موسیٰ اشعریؓ فوراً بڑھے اور اسے مار کر علم پر قبضہ کر لیا۔ تھوڑے مزید مقابلے کے بعد عسکرِ اسلامی کی فتح ہوئی۔ چھ ہزار عورتیں اور بچے، چوبیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں، چار ہزار اوقیہ چاندی بطور غنیمت ہاتھ آئی۔ یہ کل غنیمت حضور اکرمؐ کے حکم سے مقام جعرانہ میں محفوظ کر دی گئی۔

محاصرۂ طائف

حنین کے بقیۃ السیف نے طائف میں آکر پناہ لی تھی۔ جو ایک نہایت محفوظ مقام تھا۔ چاروں طرف شہر پناہ کھڑی تھی جس کے اوپر جا بجا منجنیقیں نصب تھیں اور تیر انداز دستے بٹھا دیے گئے تھے۔ اندر

کوئی سال بھر کی رسد بھی جمع تھی۔ یہاں کے ثقفی قبائل بھی جنگ و پیکار میں مشہور تھے۔ جیشِ اسلامی نے طائف کا محاصرہ کر لیا۔ اور بیس دن محاصرہ رہا۔ لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ مجاہدین میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے کیونکہ وہ اوپر سے پتھر، تیر اور لوہے کی گرم سلاخیں مسلسل برسا رہے تھے۔ حضرت اکرم ؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ نوفل بن معاویہ نے کہا کہ "اگر مسلسل محاصرہ قائم رکھا جائے تو ایک دن یہ قابو میں تو آ جائیں گے۔ لیکن اگر انہیں اسی حال میں چھوڑ دیا جائے جب بھی کوئی خاص نقصان نہیں۔" یہ رائے حضور ؐ نے پسند فرمائی اور محاصرہ اٹھا لیا گیا۔ لوگوں نے ثقیف کے لیے بددعا کی درخواست کی۔ حضور ؐ نے فرمایا: "الٰہی ثقیف کو ہدایت دے اور میرے پاس حاضر کر دے۔" آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ کس طرح اس کا ظہور ہوا۔

تقسیمِ غنائم اور ایک پیچیدگی کا حل

اس کے بعد حضور اکرم تقسیمِ غنیمت کے لیے جعرانہ تشریف لائے۔ اسیروں کی تقسیم کا معاملہ ملتوی رکھا گیا۔ اس خیال سے کہ شاید ان کے قبیلہ کا کوئی آدمی آ کر فدیہ وغیرہ کی گفت و شنید کرے۔ باقی مال کی تقسیم پنجگانہ کی گئی جس میں سے ایک حصہ بیت المال کے مصارف کے لیے رکھا گیا اور باقی مجاہدین پر تقسیم کیا گیا۔

سب سیرت نگاروں نے تسلیم کیا ہے کہ خیبر کی غنیمت میں پیدل کا ایک حصہ اور سواروں کے دو حصے لگائے گئے تھے اور یہی دستور ہمیشہ رہا کیا ہے۔ لیکن غنیمت حنین کے متعلق سب لکھتے ہیں کہ ہر پیدل کے

کے حصے میں چار اونٹ اور چالیس بکریاں اور سوار کے حصے میں بارہ اونٹ اور ایک سو بیس بکریاں آئیں۔ یعنی پیدل کا ایک حصہ اور سوار کے تین حصے لگائے گئے۔ مولانا شبلی بھی خیبر کے بیان میں لکھتے ہیں "سواروں کو گھوڑوں کے مصارف کے لیے پیدل سے دوگنا ملتا تھا" اور خود ہی حنین کے بیان میں لکھتے ہیں کہ۔۔۔ "چونکہ سواروں کو تگنا حصہ ملتا تھا" بہ ظاہر تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دو میں سے ایک ہی بات صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دونوں باتیں صحیح ہیں۔ تاہم یہ افسوس ہے کہ کسی سیرت نگار نے ان دونوں باتوں کے صحیح ہونے کا کوئی حل نہیں پیش کیا۔

ہم جہاں تک سمجھ سکے ہیں یہ ہے کہ اس کا حل خود حنین کی روایتِ تقسیم میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ دستور یہی رکھا گیا تھا کہ سوار کو پیدل سے دوگنا (نہ کہ تگنا) دیا جائے لیکن غنیمتِ حنین کی تقسیم اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس تقسیم میں شروع سے آخر تک وہ اصول نہیں قائم رکھا گیا تھا جو عام طور سے رائج تھا۔ امیرِ وقت کو خصوصاً جب کہ امیرِ وقت محمد رسول اللہ جیسا انسان ہو، کیوں یہ اختیار نہیں کہ حالات کا لحاظ کر کے ضروری تغیر و تبدل کر دے۔ اس سے پیشتر مولفۃ القلوب کا کوئی اہم معاملہ سامنے نہ آیا تھا۔ اب اس وقت آ گیا اس لیے اس غزوے کے حالات بالکل جداگانہ تھے اور اسی لحاظ سے تقسیم غنیمت نے بھی جداگانہ شکل اختیار کر لی۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں کہ ابتدا ہی سے وہ اصول نہیں برتا گیا جو معمول بہ تھا۔ چنانچہ جن جن حضرات کو جو کچھ دیا گیا ہے ان کی فہرست یہ ہے:

ابوسفیان کو تین سو اونٹ اور ایک سو بیس اوقیہ چاندی۔ حکیم بن حزام کو دو سو اونٹ۔ نضیر بن حارث، صفوان بن امیہ، قیس بن عدی، سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ، اقرع بن حابس، عینیہ بن حصین، اور مالک بن عوف میں سے ہر ایک کو سو سو اونٹ دیے گئے۔ اور بہتوں کو پچاس پچاس اونٹ دیے گئے۔ باقی لوگوں میں پیدل کو چار اونٹ اور بیس بکریاں اور سوار کو اس کا تگنا دیا گیا۔ عبداللہ بن مرداس کو صرف چالیس اونٹ ملے تھے۔ اس نے غصے میں ہجویہ قصیدہ کہا۔ حضورؐ نے فرمایا: میری طرف سے اس کی زبان کاٹ لو۔ صحابہ نے اسے کچھ اور دے کر اسے راضی کر لیا اور قطع لسان کا مطلب واضح ہو گیا (اصح السیر ص ۲۹۶)۔ یہاں سزائے قطع ید کے مفہوم پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔

اب آپ اس پوری تقسیم کو دیکھ جائیں جو مصلحت کہ تقسیم کی ابتدا میں ہو سکتی ہے وہی پیدل اور سوار کو دیتے وقت بھی ہو سکتی ہے، جب اس پر اعتراض نہیں تو اس پر شبہہ کیوں ہو؟ یہ حالات کا اقتضا تھا اور آئندہ ہونے والے امرائے امت کے لیے مشعل ہدایت۔

ایک تاریخی پیچیدگی

ہاں سو اونٹ والی فہرست میں بعض نام محل نظر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً مالک بن عوف اگر وہی ہیں جو ابھی قلعۂ طائف میں ایک جنگجو دستے کے ساتھ بند ہیں اور جن کو ابھی حضورؐ محاصرے سے چھوڑ کر آئے ہیں تو ان کا، دراں حالیکہ یہ ہنوز حریف ہیں، تقسیم غنیمت میں شریک ہونا سمجھ میں نہیں آتا واللہ اعلم۔ باقی لوگوں میں یا تو ایسے ہیں جن کے قلوب

میں نورِ ایمان آچکا ہے یا کم از کم وہ ہیں جو شریک جنگ (حنین) تھے یا کم سے کم برسرِ پیکار نہ تھے۔ مگر مالک تو ابھی گویا برسرِ پیکار ہی ہیں۔ ان ہی سے حاصل کیے ہوئے مالِ غنیمت میں سے ان ہی کو حصہ ملنا ذرا بعید معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہ مالک بن عوف مسلمان ہو گئے تھے)۔

حضورؐ نے مالک سے کہوایا تھا کہ اگر وہ اسلام لے آئے تو اس کے مال واہل کے علاوہ سو اونٹ بھی دیے جائیں گے۔ مالک شب کو جرانے یا مکے میں آکر مسلمان ہو گئے اور قصیدہ کہا جس کا ایک شعر یہ ہے:

ما ان رأیت ولا سمعت بمثله

فی الناس کلھم بمثل محمد

(اصح السیر ص ۲۹۴)

تقسیم پر اعتراض اور عجیب تسکین

حضور اکرمؐ کی اس تقسیم پر بعض انصار کو اعتراض ہوا۔ کسی نے کہا کہ "رسول اللہؐ نے قریش کو نوازا اور ہمیں بھول گئے۔" کوئی بولا: "تلوار چلانے کو ہم ہیں اور غنیمت لینے کو قریش۔" حضورؐ کو خبر معلوم ہوئی تو پہلے خبر کی تحقیق فرمائی۔ معلوم ہوا کہ بعض نوخیز انصار نے ایسے فقرے کہے ہیں۔ حضورؐ نے تمام انصار کو بلایا اور ایک عجیب بلیغ و مؤثر خطبہ دیا۔ فرمایا کہ "اے انصار کیا یہ سچ نہیں کہ تم پہلے گمراہ تھے۔ پھر اللہ نے میرے ذریعے سے تمہاری ہدایت فرمائی۔ تم میں پھوٹ تھی اور میرے وسیلے سے تم کو متحد کیا۔ تم مفلس تھے اور میرے ذریعے سے تم کو غنی کر دیا؟" انصار ہر سوال کے جواب میں عرض کرتے جاتے تھے کہ

ہاں ہاں اللہ اور اس کے رسول کا احسان سب سے بڑھ کر ہے۔"
اب تصویر کا رُخ پلٹا اور حضورؐ نے فرمایا کہ: "اے انصار تم بھی یہ جواب دے سکتے ہو کہ اے محمدؐ جب آپؐ کی لوگوں نے تکذیب کی تو ہم نے تصدیق کی۔ جب لوگوں نے نکالا تو ہم نے پناہ دی۔ آپؐ مفلس تھے اور ہم نے مدد کی۔ اے انصار تم بھی یہ کہتے جاؤ تو میں جواب دیتا جاؤں گا۔ کہ ہاں یہ سچ ہے۔" "اے انصار! کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمدؐ کو اپنے گھر لے جاؤ؟" انصار اس تقریر کو سُن کر بے اختیار چیخ اٹھے کہ: "ہمیں فقط محمدؐ درکار ہے۔" اکثر انصار روتے روتے ہلکان ہو رہے تھے۔ پھر حضورؐ نے انصار کو سمجھایا کہ ان جدید الاسلام لوگوں کو جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ ان کے استحقاق کی بنا پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ تالیف قلب مقصد ہے۔

اس کے بعد قیدیوں کی تقسیم کا وقت آیا تو چھ سرداران ہوازن آئے اور قیدیوں کے لیے درخواست رحم پیش کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں اپنے اور اس سے آگے ابنائے عبدالمطلب کے حصوں کو چھوڑ سکتا ہوں۔ عام لوگوں کے حق کے متعلق مجمع عام میں یہ سوال پیش کرو۔ دوسرے دن صبح یا ظہر کی نماز کے بعد مجمع عام میں ان سرداروں نے اپنا سوال پیش کیا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنے اور بنو عبدالمطلب کے حق سے دست بردار ہوتا ہوں اور عام لوگوں سے بھی تمہارے لیے میری یہی سفارش ہے۔ مہاجرین نے کہا: "یا رسول اللہؐ ہم بھی اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ انصار وہی انصار جن کے بعض نوخیزوں نے کل مال کم ملنے پر اعتراض کیا تھا۔۔

اُٹھے اور عرض کیا کہ "یارسول اللہ ہم سب بھی حضورؐ ہی کی پیروی کرتے ہوئے اپنے حصے کے قیدیوں کو آزاد کرتے ہیں۔ بنی فزارہ اور بنی سلیم جو ابھی اسلام نہ لائے تھے حیران تھے کہ دشمن پر قابو پانے کے بعد یہ لطف کیوں کیا جا رہا ہے۔ بہرحال انہوں نے اپنے حق کو آزاد کرنے میں تامل کیا تو حضور اکرمؐ نے ہر قیدی کے عوض چھ چھ اونٹ دیا (اس کی قیمت) اپنے پاس سے دے کر ان کے حصے کے قیدیوں کو رہائی دلائی۔ اس طرح تھوڑے عرصے میں چھ ہزار قیدی آزادی کا سانس لیتے ہوئے اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ ان میں سے اکثر وں کو حضورؐ نے اپنے پاس سے جوڑے بھی مرحمت فرمائے۔

ان ہی قیدیوں میں شیما بنت الحارث بھی تھیں۔ یہ حلیمہ سعدیہؓ کی بیٹی یعنی حضور اکرمؐ کی رضاعی بہن تھیں۔ حضرت کریمؐ نے انہیں پہچانا۔ اپنی چادر بچھا کر بٹھایا۔ پچھلے ایام رضاعت یاد آئے تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پوچھا تم میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو یا اپنے گھر جانا چاہتی ہو؟ شیما نے گھر جانے کی خواہش ظاہر کی تو حضورؐ نے اونٹ اور بکریاں دے کر اعزاز کے ساتھ گھر پہنچوا دیا۔

متفرقات

حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے اسی سال حضور اکرمؐ کو خدا نے ایک فرزند بخشا جس کا نام آنحضرت اکرمؐ نے ابراہیم رکھا۔ قریباً ڈیڑھ سال کے بعد ابراہیمؑ نے وفات پائی۔ اسی دن سورج گرہن ہوا۔ بعض لوگوں نے قدیم عربی توہم کے ماتحت کہا "یہ گہن ابراہیمؑ کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے۔"

حضورؐ کے لیے اپنی عقیدت واقتدار پیدا کرنے کا بڑا اچھا موقع تھا۔ اگر حضورؐ اس توہم کی تصدیق فرما دیتے تو کسی کو شک نہ رہتا۔ لیکن حضرت اکرمؐ ایسی کمزور اور ناپائیدار اور غلط چیز کو عقیدت مندی کا ذریعہ بنا کر توہم پرست اُمّت پیدا فرمانا نہیں چاہتے تھے اس لیے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ "چاند یا سورج کا گہن اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں کسی کے مرنے جینے سے اسے کچھ تعلق نہیں۔" اس کے بعد صلوٰۃ الکسوف ادا فرمائی۔ سیدہ زینبؓ بنتِ رسولؐ (سیدنا ابوالعاص کی حرم) کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔

ایلا و تخییر سنہ ۱۱

وہ کونسا انسان ہے جس نے ازدواجی زندگی گزاری ہو اور کبھی باہمی شکر رنجی اور نوک جھونک (میاں بیوی کے درمیان) نہ ہوئی ہو۔ یہ فطرت ہے اور اس کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ہو تو کس حد تک ہو، کن معاملات میں ہو، ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ ان سارے معاملات کا اس شخص کے لیے جاننا ضروری ہے جو ازدواجی معاشرت کی اصلاح کا خواہش مند ہو۔ حسنِ معاشرت کا جو سبق ہمیں حضرت اکرمؐ کی عملی زندگی سے مل سکتا ہے دنیا میں کسی دوسری ہستی سے مل ہی نہیں سکتا لیکن قدرت کو یہ بھی مقصود تھا کہ ایک نمونہ اس کا بھی نبوی زندگی میں دکھا دیا جائے کہ اگر صنفِ ضعیف کی بعض لغزشوں سے شوہر کو

بشریت کے تقاضے سے رنج شدید بھی پہنچے تو اس کا نباہ کس طرح کیا جائے۔ نبی اکرمؐ کی پوری زندگی میں صرف یہی ایک موقع ایسا آیا ہے کہ اسے باہمی تلخی کہا جا سکے لیکن اس میں بھی بڑے بڑے اسباق ہیں۔

بہ تقاضائے بشری حضور اکرمؐ کو ازواج مطہراتؓ کی طرف سے بعض رنج پہنچے۔ مثلاً باہمی رقابت میں تجاوز عن الحد۔ یا بعض ناقابلِ اظہار باتوں کو ظاہر کر دینا۔ یا کسی معاملے میں مرضی مبارک کے خلاف کرنا، اور سب سے بڑھ کر امیرانہ زندگی کی خواہش کا پیدا ہونا اور اسی کے مطابق توسیع نفقہ کی فرمائش کرنا۔ دراصل یہی بات حضورؐ کو زیادہ ناگوار ہوئی۔ ازواجِ مطہراتؓ لوگوں میں بے شمار اموال غنیمت تقسیم ہوتے اور آہستہ آہستہ آسودہ حال ہوتے دیکھتی تھیں اس لیے طبعاً ان کے دل میں بھی مزید آسودگی کی آرزو پیدا ہوئی ہوگی۔ لیکن یہاں الفقر فخری تھا۔ بیٹی (فاطمہ زہراؓ) نے ایک کنیز مانگی تو جواب مل گیا کہ "اصحاب صفہؓ زیادہ حقدار ہیں"۔ حضورؐ کو اپنے بال بچوں سے زیادہ امت کا خیال تھا۔ ازواجِ مطہراتؓ کی یہ فرمائش ہزار فطرتِ نسوانی کے مطابق ہو لیکن حضورؐ کو ناگوار ہوئی تھی اور ہوئی اور حضور اکرمؐ نے ایک ماہ تک ازواج سے ملنے کی قسم کھائی "ایلاء"۔ شرع میں کم از کم چار ماہ بیوی سے جُدا رہنے کی قسم کھانے کو کہتے ہیں۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِن فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۲:۲۲۶	یعنی جو لوگ اپنی عورتوں سے الگ رہنے کی قسم کھا بیٹھیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ پس اگر اس درمیان میں قسم توڑ کر رجوع کر لیں (اور کفارۂ قسم ادا

کر دیں) تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

اگر رجوع نہ کیا جائے تو چار ماہ کے بعد طلاق بائن پڑ جائے گی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس واقعہ کے بعد اتری ہے۔ عرب میں ایلاء کے لیے چار ماہ کی مہلت نہ تھی کم مدت بھی ایلاء کے لیے کافی تھی اور ایلاء عرب میں طلاق کا مترادف تھا۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے اس ایلاء کی خبر سن کر حضورؐ سے یہی سوال کیا تھا کہ کیا حضورؐ نے ازواجِ مطہراتؓ کو طلاق دیدی؟ پس اس لحاظ سے حضور اکرمؐ کی خفگی مسئلہ ایلاء کی اصلاح و تسہیل کے لیے فتح باب ہوئی۔ اور اگر اس آیت کا نزول واقعے سے پہلے مانا جائے تو اس واقعے کو ایلاء کہنا شرعاً صحیح نہ ہوگا۔ بہرحال حضورؐ نے کامل ایک ماہ، جو حسنِ اتفاق سے ۲۹ دن کا واقع ہوا تھا، بالاخانے پر تنہانشینی میں گزارا۔ صرف نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔ اس کے بعد آیت تخییر بھی اُتری اور حضورؐ بھی بالاخانے سے اُترے۔ آیت تخییر یہ ہے کہ:

یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن و امرحکن سراحاً جمیلاً ہ وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الآخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجراً عظیماً ہ ۳۳:۲۸و۲۹	اے نبیؐ! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت کی طلب گار ہو تو آؤ میں تمہیں مال و اسباب دے کر عمدگی سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ، اور اخروی ٹھکانا پسند کرتی ہو تو تم میں سے تمام نیکوکار بیویوں کے لیے اللہ نے اجرِ عظیم مہیا کر رکھا ہے۔"

ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ یا تو ازواجؓ دنیا اور زینت دنیا کو پسند کریں یا اللہ، رسولؐ اور دارِ آخرت کو ترجیح دیں۔ پہلی صورت میں انہیں چھوڑ دینے کا حکم ہے اور دوسری شکل میں ان کے لیے من جانب اللہ اجرِ عظیم ہے۔ اب دیکھو کیا حضورؐ نے ازواجؓ کو چھوڑ دیا؟ یقیناً نہیں۔ تو نتیجہ کیا نکلا؟ یہی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ، رسولؐ اور اجرِ آخرت پر سب کچھ قربان کر دیا۔ اگر ایسا نہ کرتیں تو حضورؐ اکرم انہیں علیحدہ کر دیتے۔ لیکن علیحدہ کرنا تو کجا۔ اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہراتؓ کے دائمی ارادۂ عمل کا امتحان لے لیا تو یہ حکم دیا کہ:

لا یحل لک النساء من بعد ولا ان تبدل بھن من ازواج ولو اعجبک حسنھن الا ما ملکت یمینک ۳۳: ۵۲

ان وفاشعار بیویوں کے بعد اے رسولؐ آپ کے لیے مزید دوسری عورتیں جائز نہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ آپ ان کی جگہ دوسری بیبیاں کریں، خواہ ان کا حسن و جمال آپ کو پسند کیوں نہ آئے۔ ہاں کنیزیں جائز ہیں۔

(حضورؐ نے اجازت ہونے کے باوجود بھی اس کے بعد کوئی کنیز نہیں رکھی) یہی نہیں کہ صرف حضورؐ کو روکا گیا ہو بلکہ دوسری طرف سے بھی مسلمانوں پر دروازہ بند کر دیا گیا کہ

ما کان لکم ان تؤذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا ۵ ۳۳: ۵۳

یعنی اے مسلمانو! تمہارے لیے یہ روا نہیں کہ تم رسول اللہؐ کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ کہ تم ان کے بعد کبھی ان کی ازواج کو نکاح میں لاؤ۔

اللہ اکبر۔ اتنا قوی رشتہ، ایسا دائمی تعلق تو ماں بیٹی، اور پدر و فرزند

کا بھی نہیں ہوتا۔ عورتوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے کسی ماڈل اور نمونے کی ضرورت تھی۔ حضور اکرمؐ اگر خفا ہو کر علیحدگی کی قسم نہ کھاتے تو یہ فضائل اور یہ مسائل کب معلوم ہوتے؟ آیۂ تطہیر بھی آیۂ تخییر سے متصل ہی ہے اور اس کا تخاطب بھی ازواجِ مطہراتؓ ہی سے ہے۔

جیشِ عسرت یا غزوۂ تبوک

آپ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں حضور اکرمؐ نے تین ہزار کا ایک لشکر زیدؓ بن حارثہ کی افسری میں شرجیل بن عمرو غسانی کے ایک لاکھ فوجیوں کے مقابلے کے لیے بہ مقام مُوتہ بھیجا تھا۔ یہ مہم قوتِ قیصری کا اندازہ کرنے میں بڑی ممد و معاون ہوئی تھی اور ایک بڑا فائدہ اس سے یہ بھی ہوا تھا کہ رومیوں کا سیلاب روک لیا گیا۔ ورنہ اگر وہ مسلمانوں پر چڑھ آتے تو اس بیرونی فتنے اور پھر اندرونِ ملک کے فتنے دونوں کا یکجا مقابلہ مسلمانوں کے لیے دشوار ہو جاتا۔ مُوتہ کی مہم نے رومی طاقت اور طریقِ جنگ کا اندازہ بھی کر لیا۔ اور ان کا فتنہ اس طرف آنے سے رُکا رہا یہاں تک کہ اندرونِ ملک کے فتنے بہت حد تک سر ہو گئے اور تبلیغِ دین اس قدر ہوئی کہ جب تو تین ہزار مجاہدین کو لے کر زیدؓ گئے تھے اور اب صرف ایک سال کے بعد تیس ہزار کی جمعیت لے کر زیدؓ کا آقا جاتا ہے۔ جو لوگ موتہ سے عسکرِ اسلامی کے واپس آجانے کو "ناکامی" سے تعبیر کرتے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوئے ہیں اگرچہ ادھر سیرت نگاروں

کی نظر نہیں گئی ہے۔

وسط ۹ھ کا ذکر ہے کہ شامی تاجروں کے ایک قافلے نے مدینہ میں آکر یہ خبر دی کہ رومیوں نے ایک بھاری فوج مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیار کی ہے۔ اور قبائل لخم، جذام، عاملہ و غسان (یہ عربی قبائل پہلے بھی موتہ میں رومی لشکر میں تھے) بھی شامل ہیں۔ یہ خبر ایک وجہ سے بہت شہرت پکڑ گئی۔ وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو غسانیوں کے حملہ کا ہر وقت کھٹکا لگا ہوا تھا اور یہی کھٹکا ان کی قوتِ مدافعت کو باقی رکھے ہوئے تھا۔ قافلۂ تجارت نے یہاں تک بیان کیا کہ اس رومی لشکر کا مقدمۃ الجیش بلقاء تک آگیا ہے خبر کی گرمی محسوس فرما کر حضرت اکرمؐ نے عسکری تیاری کا حکم دیدیا۔ اگرچہ موسم شدید گرمی کا تھا اور پھلوں کے پکنے کا زمانہ بھی تھا۔ قحط بھی تھا اس لیے پھلوں کے پکنے کا انتظار معمول سے زیادہ تھا۔ اس پر یہ کہ سامانِ رسد کی بڑی قلت تھی۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے عموماً لوگوں پر یہ سفر گراں تھا۔ منافقین بھی انہیں مذکورہ وجوہ کو پیش کر کے لوگوں کو بہکا رہے تھے۔ یہ تمام رکاوٹیں پہاڑ بن کر سامنے آتی رہیں لیکن رسولِ خداؐ کے آہنی عزم کے سامنے یہ پہاڑ خس و خاشاک سے زیادہ نہ تھے۔ روانگی کی تیاریاں اسی طرح جاری رہیں۔

چندے کا عدیم المثال نمونہ

پہلے تیاری کا حکم دیا گیا پھر چندے کی عام فہرست کھولی گئی۔ اس سے پہلے اس اہتمام کے ساتھ کوئی چندہ نہ ہوا تھا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اس وقت تنگی و عسرت زیادہ تھی اسی لیے اس مہم کا نام جیش العسرۃ بھی ہے چندہ دینے والوں نے بھی ایثار و قربانی کے عجیب عجیب نمونے دکھائے

عثمان غنیؓ نے ایک ہزار دینار طلائی، نو سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے دیے۔ اونٹ اور گھوڑے کے لیے تمام سامان اس طرح مکمل فرمائے کہ ان کے باندھنے کے لیے رسی تک مہیا کر دی۔ عثمان غنیؓ کو اس کے صلے میں دو انعام فوراً ہی ملے جو دنیا و آخرت دونوں کے لیے بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ایک تو مجھّز جیش العسرہ کا خطاب ملا دوسرے یہ ارشاد نبوی کہ آج کے بعد سے عثمانؓ کچھ بھی کریں ان کا مواخذہ نہیں ہو گا۔ یہ دراصل ایک پیشین گوئی ہے کہ عثمانؓ آیندہ کوئی کام ایسا کر ہی نہ سکیں گے جو اللہ کی نگاہ میں قابلِ گرفت ہو۔ عبدالرحمنؓ بن عوف نے چالیس ہزار درہم نقرئی حاضر کیے۔ حضرت عمرؓ گھر گئے اور اپنے تمام نقد وجنس و مواشی کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ گھر میں رہنے دیا اور دوسرا خدمتِ اقدس میں حاضر کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تن پوشی کے سوا وہ تمام چیزیں جن پر چیز کا اطلاق ہو سکے حضورؐ کے قدموں میں لا کر رکھ دیں۔ حضرت عمرؓ نے (جیسا کہ خود فرماتے ہیں) اکثر مواقع پر حضرت ابوبکرؓ سے نیکی میں بڑھ جانے کی کوشش کی تھی۔ آج ان کے پاس نقد وجنس زیادہ تھے اس لیے خیال ہوا کہ آج تو ضرور میں اس نیکی میں سبقت لے گیا ہوں گا۔ خدا کا رسولؐ ان تمام خطرات قلب کو محسوس فرما رہا تھا اس لیے ابوبکرؓ کے سامنے عمرؓ سے پوچھا کہ تم نے اپنے اہل وعیال کے لیے کیا رکھا ہے؟" عمرؓ نے عرض کیا "نصف"۔ پھر ابوبکرؓ سے پوچھا کہ "تم نے گھر والوں کے لیے کیا رکھ چھوڑا ہے؟" کہا "اللہ ورسولہٗ" (اللہ اور اس کے رسول کو رکھ چھوڑا ہے) یہ ہی وہ صدیقیت تھی جس کو معلوم کرنے کے بعد عمرؓ نے مقابلہ ومسابقت کا خیال ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

یہ بڑے بڑے دولتمند اور صاحب ایثار مجلس مبارک میں دست بستہ حاضر ہیں اور خوشنودی رسولؐ کی لازوال دولت لوٹ رہے ہیں پیش کردہ مال واسباب کا ڈھیر لگا ہوا ہے اتنے میں ایک مسکین مزدور (ابوعقیل انصاریؓ) حاضر ہوتا ہے جس کے ہاتھوں میں رات بھر رہٹ چلاتے چلاتے چھالے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں دو سیر کھجوروں کی ٹوکری ہے۔ پونجی کی کمی سے آنکھوں میں شرمندگی جھلک رہی ہے مگر ساغر دل سے بادۂ اخلاص چھلکا پڑتا ہے۔ اس نے رات بھر مزدوری کر کے چار سیر کھجوریں حاصل کی ہیں۔ دو سیر گھر دے آیا ہے اور دو سیر اس مجلس میں چندے کے لیے لایا ہے جہاں عثمانؓ وعبدالرحمٰنؓ جیسے دولتمندوں اور ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ارباب ایثار کی پیش کش کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ابوعقیل انصاری کی اس جرأت پر بعض لوگ تبسم زیرلب ہوئے۔ رسولؐ کی باریک بین نگاہوں نے تاڑ لیا اور حکم دیا کہ تمام مال واسباب کے اوپر ابوعقیل کی کھجوریں بکھیر دو۔" اللہ اللہ اخلاص کی قدر افزائی، مسکینوں کی دلداری اور بیکسوں کی دردمندی وحوصلہ افزائی کی یہ نظیر اور کس کی سیرت میں مل سکتی ہے؟

ایثار و قربانی کے یہ تمام نمونے دیکھنے کے باوجود قریباً ۸۲ نفر ایسے تھے جو جھوٹے بہانے عذر پیش کر کے مجاہدین کے ساتھ جانے سے رہ گئے۔ حضورؐ نے سباعؓ بن عرفط کو حاکم مقرر کیا۔ حضرت علیؓ کو ازواج وعیال کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ اس سفر میں امہات مومنینؓ میں سے کوئی ساتھ نہ تھا حضرت علیؓ اس سفر میں ساتھ نہ گئے تھے جیسے حضرت عثمانؓ شریک بدر نہ ہوئے تھے۔

روانگی اور فضیلت مرتضویؓ

یہ سب انتظامات مکمل کر کے حضورؐ تیس ہزار کے لشکر جرار کے ساتھ

تبوک کی طرف روانہ ہوئے۔ تبوک مدینہ اور دمشق کے درمیان مدینے سے قریباً ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر ایک مقام کا نام ہے۔ یہ روانگی رجب ۹ھ میں واقع ہوئی، دس ہزار گھوڑے ساتھ تھے، اور ہر ۱۸ آدمی کے درمیان ایک اونٹ تھا۔ کھانے پینے اور گرمی کی سخت سخت آزمائشیں ہوئیں لیکن مردانِ خدا تبوک پہنچ ہی گئے۔ راستے میں حضرت علیؓ تیزی سے روانہ ہو کر لشکر سے مل گئے۔ بعض لوگوں نے آپ کو طعنے دیے تھے اس لیے غیرت نے مدینے میں بیٹھنے نہ دیا۔ جب حضرت اکرمؐ نے دیکھا تو پھر مدینے واپس کیا اور یہ فرمایا کہ: "اما ترضی بان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ" (کیا تم یہ پسند نہیں کرتے تم میرے لیے ویسے ہی ہو جس طرح حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے لیے تھے)۔ حضرت موسیٰؑ جب کوہِ طور پر چالیس دن کے لیے گئے تھے تو قوم کو حضرت ہارونؑ کے سپرد کر گئے تھے وقال موسیٰ لاخیہ ھٰرون اخلفنی فی قومی اس تشبیہ نے حضرت علیؓ کا درجہ وفضل پہلے سے زیادہ بلند کر دیا۔ اثنائے سفر میں اُن عمارات کے آثار ملے جو قوم ثمود نے پہاڑ کاٹ کر بنائے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اس معذّب خطّے سے جلدی گزر جاؤ اور یہاں کا پانی تک استعمال نہ کرو۔ یہ اُمت قوم طالوت نہ تھی جو یہاں کا تھوڑا پانی بھی استعمال کر لیتی۔ تبوک پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ رومی تیاریوں کی خبر صحیح نہ تھی۔ غالباً مسلمانوں کی سرفروشانہ آمد دیکھ کر رومیوں نے حملے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ اندریں حالات کوئی جنگ پیش نہ آئی لیکن رسولؐ کا آنا بے نفع نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سفر کے سلسلے میں چند باتیں قابلِ ذکر ہیں جنھیں ہم نمبروار لکھتے ہیں:

متعدد قبائل کی مصالحت

۱۔ رئیس غسان تمام اطراف وجوانب میں مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال بچھا رہا تھا حتےٰ کہ مدینے تک میں اس کا آدمی پہنچ چکا تھا۔ عسکر اسلامی کی پیش قدمی اور غسانیوں اور رومیوں کی مرعوبیت سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ متعدد قبائل مصالحت پر مجبور ہو گئے۔ ایلہ کا رئیس یوحنا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جزیے پر مصالحت کر لی۔ یوحنّا نے ایک سپید خچر بھی پیش کیا جس کے عوض حضورؐ نے ایک چادر تحفے میں دی۔ نیز جربا اور اذرع کے نصاریٰ حاضر ہوئے اور جزیہ دینا منظور کر لیا۔ پھر حضورؐ نے خالدؓ بن ولید کی افسری میں چار سو سواروں کا ایک دستہ دومۃ الجندل کی طرف بھیجا۔ خالدؓ نے یہاں کے سردار اُکیدر کو گرفتار کر لیا۔ اور اس شرط پر کہ وہ خود بارگاہِ رسالت میں آکر شرائط صلح پیش کرے گا اسے رہائی دی۔ اُکیدر اپنے بھائی کے ساتھ آئے اور امان لے کر واپس ہوئے پھر کچھ دنوں کے بعد اسلام لے آئے۔

شہیدِ ناز عبداللہ ذوالبجادینؓ

۲۔ اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ عبداللہ ذوالبجادین کی وفات بھی ہے۔ ان کا قدیم نام عبدالعزیٰ تھا۔ مدینے سے منزل دو منزل کے فاصلہ پر کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ بچپن میں باپ نے انتقال کیا تھا۔ ابھی نوجوان ہی تھے کہ اسلام کی آواز کانوں میں پڑی۔ وُلی چچا تھا جو تمام مال و اسباب اور جائداد پر قابض تھا۔ دیدارِ رسولؐ کا شوق عبداللہ کو بے چین

کر رہا تھا مگر ظالم چچا کے خوف سے خاموش تھے۔ آخر شوقِ دیدار ہر خوف پر غالب آیا۔ چچا سے خدمتِ نبوی میں حاضری کی اجازت چاہی۔ چچا نے خوب مارا پھر جسم کے کپڑے تک اتار کر گھر سے نکال دیا۔ لیکن:

گر تن ہمہ ریزہ ریزہ گردد — مہر تو ز جاں رود محال است

عبداللہ اسی حالتِ عریانی میں اپنی ماں کے پاس آئے۔ ماں نے ایک کمل دیا جس کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے ستر پوشی کی اور ایک بدن کے اوپر ڈال لیا اور اسی حالت میں مدینے پہنچے۔ بیعتِ اسلام کی اور شوقِ شہادت ظاہر کیا۔ اسی دن سے ان کا نام عبداللہؓ اور لقب ذوالبجادین (کملی کے دو ٹکڑوں والا) رکھا گیا۔ یہ اصحابِ صُفّہ میں داخل ہو گئے۔ دن رات تعلّمِ دین میں بسر کرتے۔ نوجوان تھے قرآن زور دار آواز میں پڑھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن شکایت کی کہ "یا رسول اللہؐ ان کی آواز سے نمازیوں کی نماز میں خلل پہنچتا ہے۔" رحمت للعالمینؐ نے فرمایا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ یہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے آیا ہے۔" ان ہی ایام میں سفرِ تبوک پیش آیا۔ عبداللہؓ بھی مجاہدین میں شامل ہوئے اور حضور اکرمؐ سے شہادت حاصل ہونے کے لیے دعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ:
اگر تمہیں راستہ میں موت آجائے تب بھی تم شہیدوں میں داخل ہو جاؤ گے۔"
الغرض لشکر روانہ ہوا اور راستے ہی میں عبداللہ کو تیز بخار آیا جس سے انہوں نے وفات پائی۔ بوقتِ وفات عبداللہ کے سرہانے مقصودِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے۔ جمالِ اقدسؐ پر نظر جمی ہوئی تھی کہ پیامِ اجل آگیا:

بہ چہ ناز رفتہ باشد ز جہاں نیاز مندے — کہ بوقتِ جاں سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

بعض روایتوں میں ہے کہ عبداللہ کی تکفین کے لیے حضورؐ نے اپنی چادر مبارک عنایت فرمائی اس لیے کہ خدا و رسولؐ کی راہ میں عبداللہ نے برہنہ ہو کر گھر سے نکلنا گوارا کیا تھا۔ ان کی تدفین بھی عجیب شان سے ہوئی۔ اجلّۂ صحابہ نے قبر کھودی۔ قبر تیار ہونے کے بعد حضور اکرمؐ قبر میں خود اترے اور تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئے۔ پھر اٹھ کر کہا کہ لاؤ اپنے بھائی کو۔" حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ نے اس مبارک اور سراپا ناز لاشے کو سہارا دے کر اتارا۔ حضورؐ نے فرمایا" ادبا الی اخیکما " یعنی عبداللہ عام مرنے والوں جیسا نہیں اسے دھیرے دھیرے ادب سے اتارو:

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزارِ او | بس نازک ست شیشۂ دل در کنار او

بلالؓ ہاتھ میں مشعل لیے تھے اس لیے کہ شب کے وقت تدفین عمل میں آئی تھی۔ حضرت اکرمؐ نے اس "ہمہ تن فدا" کی لاش کو اپنی گود میں لے کر اتارا۔ زمین پر لٹا کر ماتھے پر بوسہ دیا اور فرمایا: الٰہی آج شام تک میں اس مرنے والے سے راضی رہا ہوں تو بھی اس سے راضی رہنا۔" حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابہ اس مرنے والے کی موت پر غبطہ (رشک) کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ "اے کاش! اس قبر میں ہم دفن کیے جاتے۔" ایک عمرؓ پر اور ابن مسعودؓ پر کیا موقوف ہے؟ دیکھنے والے تو الگ رہے سننے والوں میں کون اہل ایمان ہے جو ایسی موت پر ہزار زندگیوں کو قربان کرنے کی تمنا نہ رکھتا ہو:

منم و ہمیں تمنا کہ بوقتِ جاں سپردن
برخِ تو دیدہ باشم تو درونِ دیدہ باشی

تین معترفین خطا کا سخت امتحان اور وحی معافی

۲۔ تبوک میں حضرت اکرمؐ کا قیام بیس دن رہا۔ آنے اور جانے اور وہاں کے قیام میں قریباً پچاس دن صرف ہوئے۔ منافقوں کو یقین تھا کہ اب کوئی مسلمان واپس نہ آسکے گا اس لیے کہ مقابلہ اس قوم سے تھا جو نصف دنیا پر حکمرانی کر رہی تھی اور جو ابھی ایرانیوں کی گردن غرور کو نیچا دکھا چکی تھی۔ منافقین کے اس پروپیگنڈے سے اہل مدینہ بھی پریشان تھے۔ جب مسلمان سالماً غانماً واپس آئے تو جتنی حسرت و ندامت منافقوں کو تھی اتنی ہی خوشی و مسرت اہل ایمان کو ہوئی۔ چنانچہ حضورؐ کی تشریف آوری کے وقت ویسی ہی خوشی منائی گئی جیسی ہجرت کے بعد پہلی بار داخلۂ مدینہ کے وقت منائی گئی تھی۔ اس وقت بھی عورتوں نے "طلع البدر علینا" والا گیت الایا تھا۔

جو منافقین شرکتِ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے اپنے جھوٹے سچے عذر پیش کیے اور حضورؐ نے قبول فرمالیے۔ لیکن ان ہی پیچھے رہ جانیوالوں میں تین اہلِ ایمان ایسے بھی تھے جنہوں نے صاف لفظوں میں اعتراف کر لیا کہ ہم محض اپنی سستی و کاہلی کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ یہ کعب بن مالکؓ، ہلال بن امیہؓ، مرارہ بن ربیعؓ تھے۔ حضورؐ نے ان تینوں کے فیصلے کو وحی الٰہی پر چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ ان تینوں کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے۔ تقریباً پچاس دن ان کا اس طرح بائیکاٹ رہا کہ ایک مسلمان حتیٰ کہ گھر کے بیوی بچے بھی ان سے سلام و کلام نہ کرتے تھے۔ یہ ایام سخت ترین امتحان میں گزرے۔ اسی درمیان میں ایک اور بھی سخت امتحان ہوا۔ ایک دن ایک عیسائی نے شاہ غسان کا خط لاکر چپکے سے کعب بن مالکؓ کے ہاتھ میں دیا جس میں لکھا تھا کہ "مجھے معلوم

ہوا ہے کہ تمہارا آقا (محمدؐ) تم سے ناراض ہے اگر تم اسے چھوڑ کر میرے پاس چلے آؤ تو بہترین سلوک تمہارے ساتھ کروں گا۔" کعبؓ نے یہ خط وہیں جلا ڈالا، اور جواب دیا کہ: "میرے آقا کی ناراضی بھی تیری عنایات سے لاکھ درجے بہتر ہے۔" پچاس دن اس مصیبت میں گزر گئے اس کے بعد وحی نازل ہوئی (وعلی الثلثۃ الذین خلفوا الخ) یعنی ان تین پیچھے رہ جانے والوں کی توبہ بھی اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔" حضور اکرمؐ نے اور تمام صحابہ نے مبارکبادیں دیں۔ کعبؓ نے اس خوشی میں ثلث مال راہِ خدا میں خیرات کر دیا۔ یہ اپنا کل مال خیرات کے لیے پیش کر رہے تھے۔ حضورؐ نے کہا نہیں پھر کہا نصف۔ ارشاد ہوا نہیں۔ پھر کہا ثلث ارشاد ہوا۔ ہاں اتنا بہت ہے (وصیت بھی ثلث مال سے زیادہ میں نہیں ہوتی جیسا کہ سعدؓ سے حضورؐ نے فرمایا تھا۔)

مسجد ضرار کا نیا فتنہ اور اس کا ہدم

۴۔ منافقین اپنی نفاقی کارروائیوں سے کبھی باز نہیں آتے تھے ان لوگوں نے اب اسلام کو مٹانے کی ایک نئی ترکیب نکالی۔ یعنی مسجد قبا کے مقابلہ میں ایک نئی مسجد تیار کی اور بہانہ یہ کیا کہ کمزور لوگ یہیں نماز ادا کر لیا کریں گے۔ اس تعمیر مسجد کی چار بڑی اغراض تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یوں ظاہر فرمایا ہے کہ:

والذین اتخذوا مسجدا ضرارا وکفرا وتفریقا بین المومنین وارصادا لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل ط ۹:۱۰۷

جن لوگوں نے اسلام کو نقصان پہنچانے، کفر کی تائید کرنے، مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور قدیم دشمنانِ خدا و رسول کے لیے اڈا بنانے کی غرض سے یہ مسجد تیار کرائی ہے۔

ان چار اغراض کے لیے یہ مسجد تیار کرائی گئی تھی۔ ابو عامر راہب انصاری عیسائی ہو کر شام کی طرف نکل گیا تھا اور منافقوں سے کہہ گیا تھا کہ "میں رومیوں کا لشکر جرار ساتھ لاکر اسلام کو اس ملک سے ختم کرادوں گا۔ تم اسلحہ اور قوت جمع کرتے رہو"۔ اسی سازش کے مطابق یہ مسجد بھی بنی تھی اور خفیہ کارروائیاں بھی شروع ہو گئی تھیں لیکن عام مسلمانوں کی نظر میں اسے شبہے سے پاک رکھنے کے لیے یہ منافقین حضرت اکرمؐ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ "اگر حضورؐ ایک دفعہ اس مسجد میں نماز پڑھ لیں تو یہ مسجد مقبول ہو جائے گی"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ "میں تبوک کی مہم پر جا رہا ہوں واپس آکر دیکھا جائے گا"۔ پھر وحی نازل ہوئی کہ لاتقم فیہ ابدا الخ اس میں ہرگز کبھی نماز نہ ادا کرنا۔ نماز کے لیے اسی مسجد قبا میں حسب معمول جاؤ"۔ چنانچہ تبوک سے واپسی پر حضور اکرمؐ نے مالکؓ اور معنؓ بن عدی کو بھیج کر اس جگہ یعنی "مسجد ضرار" میں آگ لگوا کر منہدم کرا دی۔

حجِ اکبر

مکہ رمضان ۸ھ میں فتح ہوا تھا۔ اس سال کا ذوالحجہ حج سے خالی تو نہیں گیا تھا۔ لیکن یہ حج اسلامی ارکان و فرائض کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ اقتدائے سنتِ ابراہیمی یا نفلی عبادت کے طور پر تھا۔ ۹ھ میں باقاعدہ فرض ہوا اور اسلام میں پہلا حج اسی سال ادا کیا گیا۔ تین سو مسلمانوں کی جمعیت آنحضرت اکرمؐ کے حکم سے مکہ معظمہ روانہ ہوئی۔ امیر الحاج سیدنا صدیق اکبرؓ کو بنایا یعنی آپؓ ہی کی امامت میں یہ حج ادا ہوا۔ قافلۂ حجاج روانہ ہونے کے بعد سورۂ برائت نازل ہوئی جسے لے کر سیدنا حضرت علی مرتضیٰؓ بعد میں تیزی سے روانہ ہوئے اور راستہ میں قافلے سے جا ملے۔ چونکہ یہ اسلام کا پہلا حج تھا جس میں

مشرکوں کی روک ٹوک وغیرہ کا مطلقاً کوئی دخل نہ تھا اس لیے اس حج کو سورۂ برائت میں "حج اکبر" کہا گیا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے ہر موقع پر امامت کے فرائض انجام دیے۔ مناسکِ حج کی تعلیم دی اور یوم النحر میں نہایت بلیغ خطبہ دیا جس میں حج کے مسائل و حقائق بیان فرمائے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ نے سورۂ برأت کی چالیس آیتیں سنا کر اعلان فرمادیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا، نہ اب کوئی برہنہ ہو کر حج کرنے پائے گا۔" اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ "مشرکین کے معاہدے خود ان کے نقضِ عہد کے سبب سے ٹوٹ گئے۔ لیکن انہیں چار ماہ کی اور بھی مہلت ہے۔ اس مدت کے بعد کوئی معاہدہ باقی نہ رہے گا۔" اس اعلان کے بعد عام طور سے لوگ مسلمان ہونے شروع ہو گئے اور یہی زمانہ ہے جب کہ تمام اطراف و اکناف سے بکثرت وفود آ آ کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور وفاتِ نبوی تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ نجاشی حبشہ یعنی اصحمہؓ بن الجبر نے اسی سال رحلت کی تھی اور حضورؐ نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی جس میں دیگر صحابہ بھی شریک تھے۔

حجۃ الوداع یا حجۃ البلاغ ۱۰ھ

لوگوں نے حج اکبر تو کر لیا لیکن کونسا دل ہو گا جسے ایک بار امام المرسلینؐ کی امامت و اقتدا میں یہ فریضہ ادا کرنے کی تمنا بے چین نہ کر رہی ہو گی؟ کسے ایک بار کعبۂ حقیقت کے ساتھ طواف کرنے کی حسرت نہ ہو گی اور کس کو یہ آرزو مضطرب نہ کر رہی ہو گی کہ ایک بار رسول اکرمؐ کو اپنی آنکھوں سے یہ فریضہ

ادا کر کے اسوۂ عمل چھوڑتے دیکھ لے مگر ہاں حج عمر میں ایک ہی بار فرض ہے اس لیے اس آسمان کے نیچے ایسا موقع صرف ایک ہی بار آیا جب کہ رسولِ آخر ؐ نے اپنی تیار کردہ بے شمار امت کے ساتھ یہ فرض بھی ادا کیا۔ امام انبیاءؑ ہے اور امام امم کا ساتھ۔ وہ امت جس کا ہر فرد شان نبوت کا آئینہ دار ہے ساتھ ہے اور وہ رسولؐ جو تمام رسولوں کی صفاتِ کاملہ کا حامل ہے مقتدا اور امام ہے۔ یہ وقت اور یہ موقع اور منظر پھر کبھی نہ آئے گا اور کبھی نہ آیا۔ ازل سے اس کا ایک ہی بار ظاہر ہونا مقدر تھا جو اب سنہ ۱۰ھ میں پورا ہو رہا ہے۔

روانگی اور ادائے حج

اس سال خیر الرسلؐ نے حج کا ارادہ فرمایا اور یہ خبر بجلی کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ خیر امت کے سعادت مند افراد ٹوٹ پڑے اور روانگی سے پہلے ایک لاکھ کا مجمع ہو گیا۔ راستے میں اور سرزمین مکہ میں پہنچ کر کم و بیش سوا لاکھ حجاج کا اجتماع ہو گیا۔ حضرت اکرمؐ ہفتہ کے دن ۲۶ ذیقعدہ کو ظہر پڑھ کر مدینے سے قافلۂ حجاج کے ساتھ روانہ ہوئے۔ تمام ازواج مطہراتؓ بھی ساتھ تھیں۔ قربانی کے اونٹ بھی لے لیے گئے تھے اور کچھ حضرت علیؓ یمن سے ساتھ لائے تھے۔ حضورؐ کی خاص سواری کی اونٹنی کا نام قصوار تھا۔ مدینے سے چھ میل کے فاصلے پر میقاتِ مدینہ یعنی ذو الحلیفہ میں پہنچ کر ایک رات قیام فرمایا۔ صبح غسل کر کے دو رکعت نماز ادا فرمائی پھر لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے قصوار پر چڑھ کر احرام باندھا اور بآوازِ بلند یہ ترانۂ تقدیس پڑھا لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لاشریک لک

دوسرے ہفتے کے دن سَرِف پہنچے اور غسل فرمایا۔ دوسرے دن (یعنی اتوار کو ۴ ذوالحجہ کو بالائی سمت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ خاندانِ ہاشم کے بعض بچے خوشی میں گھر سے باہر نکل آئے جنہیں حضور ؐ نے اپنے آگے پیچھے بٹھا لیا۔ کعبہ پر نظر پڑتے ہی فرمایا "الٰہی اس گھر کو اور زیادہ عزت دے"۔ پھر طواف کیا۔ پھر مقامِ ابراہیمؑ پر پہنچ کر دوگانہ ادا فرمایا اور یہ پڑھا اتخذوا من مقام ابراھیم مصلّٰی پھر کوہ صفا و مروہ پر پہنچے اور پڑھا ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ اس جگہ سے کعبہ دکھائی دیا تو ترانہ تحمید بلند فرمایا کہ لا الہ اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک و لہ الحمد یحیی و یمیت وھو علی کل شیئ قدیر لا الہ الا اللہ وحدہ انجز وعدہ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہ پھر ان لوگوں کو جن کے ساتھ ھدی (قربانی) نہ تھی احلال کا حکم دیا۔ اور خود قربانی ساتھ ہونے کی وجہ سے احرام نہ اتارا۔ آٹھویں کو تمام مسلمانوں کے ساتھ منٰی میں قیام فرمایا۔ نویں کو نماز صبح پڑھ کر عرفات میں تشریف لائے اور تمام قریش کو بھی اسی کا حکم دیا۔ قریش عرفات میں قیام کرنا خلافِ شان سمجھتے تھے اور مزدلفہ ہی میں جو حدود حرم میں ہے قیام کرتے تھے۔ عرفات میں بمقام نمرہ حضور ؐ نے قیام فرمایا اور دوپہر ڈھلنے کے بعد قصواء پر سوار ہو کر میدان میں تشریف لائے اور اوپر ہی سے خطبہ دیا۔ خطبہ پورے کا پورا کسی کو یاد نہ رہا ہوگا اس وجہ سے مختلف راویوں سے لے کر اس کو جمع کیا گیا ہے اس لیے ترتیب کا کوئی ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ بہر حال خلاصہ جس میں مختلف ہدایات ہیں یہ ہے۔ اصل الفاظ کی بجائے ہم صرف ترجمے پر اکتفا کرتے ہیں۔

خطبۂ حج بزبانِ رسالتؐ

"لوگو! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ہم تم یہاں پھر اکٹھے نہ ہو سکیں گے۔ لوگو جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ سرزمین حرمت والے ہیں اسی طرح اپنی جان، مال اور عزت کو بھی ایک دوسرے پر حرام تصور کرو۔ تمہیں عنقریب بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ میرے بعد گمراہ ہو کر ایک دوسرے کی گردنیں نہ کاٹنے لگنا۔ جاہلیت کی رسموں کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوں۔ اپنے خاندانی مورث ربیعہ بن حارث کا خون بنو ہذیل کی گردن سے ساقط کرتا ہوں (یعنے اب رسمِ جاہلیت کے مطابق بنو ہاشم اس کا بدلہ لینا اپنا خاندانی فرض نہ سمجھیں) اور عباسؓ بن عبدالمطلب کی سودی رقم جو بعض لوگوں کے ذمے ہے ساقط کرتا ہوں (یعنے اسے بھی کوئی ہاشمی یا عباسی وصول کرنا خاندانی فرض نہ سمجھے۔ یہ سودی کاروبار ہی رسمِ جاہلیت تھی جو آج ختم کی جاتی ہے)۔ لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ ان کو بیوی بناتے وقت اور اپنے لیے حلال کرتے وقت تم نے اللہ کو ضامن بنایا ہے۔ لوگو! زیردستوں کا حق ادا کرتے رہو۔ جو خود کھاتے پہنتے ہو وہی ان کو بھی کھلاؤ اور پہناؤ۔ لوگو میں تم میں ایک چیز چھوڑے جاتا ہوں اسے مضبوطی سے پکڑ لو تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز "کتاب اللہ" ہے۔ لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں۔ لوگو اللہ کی عبادت سے کبھی غافل نہ ہو یعنے نماز پنجگانہ، صیامِ رمضان، زکوٰۃ اور حج کے فرائض ادا کرتے رہو۔ اور امیرِ وقت کی اطاعت کو جب کہ وہ کتاب اللہ کے خلاف حکم نہ دے اپنا فرض سمجھو۔ اگر تم نے ان احکام کی پیروی کی تو اللہ

تعالیٰ تمہیں اس کی جزا میں جنّت عطا فرمائے گا۔ میرے ان الفاظ کو حاضر غائب تک پہنچا دیں۔"

اس کے بعد حضور اکرمؐ نے اپنی امت سے پوچھا کہ "لوگو! میری بابت (بروز قیامت) تم سے سوال کیا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟" لوگوں نے جواب دیا کہ ہم یہ کہیں گے کہ "حضورؐ نے تبلیغ احکام، حق رسالت، اور بہی خواہی کے تمام فرائض ادا فرما دیے۔" حضرت اکرمؐ نے تین بار آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر نیچے کی اور ہر بار فرمایا اللّھم اشھد یعنی الٰہی تو ان کی شہادت پر گواہ رہنا عین اسی وقت یہ آیت اُتری کہ:

الیوم اکملت لکم دینکم	آج مسلمانو ہم نے تمہارے دین کو مکمل
واتممت علیکم نعمتی	کر دیا اور تم پر اپنی نعمتوں کو بھی تمام کر دیا
و رضیت لکم الاسلام	اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت
دینا۔	سے پسند کر لیا۔

خطبۂ غدیر خم

راستہ میں بُریدہ اسلمیؓ نے حضرت علیؓ کے متعلق بعض شکایات پیش کیں جو حکومت یمن کے موقع پر بہ سلسلۂ تقسیم غنیمت پیدا ہوئی تھیں۔ مقامِ خم کے غدیر (یعنی تالاب) کے پاس حضورؐ نے ایک مختصر سا خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ من کنت مولاہ فعلیٌ مولاہ یعنی جو مجھے اپنا حاکم و افسر تسلیم کرتا ہے وہ علیؓ کو بھی مانے (کیونکہ یہ میرے ہی حکم سے یمن گئے تھے اور ان کا فیصلہ میرا فیصلہ ہے)۔ حضرت عمرؓ نے اس شرف پر حضرت علیؓ کو مبارکباد دی اور بریدہؓ اسلمیؓ تمام زندگی بھر حضرت علیؓ کے مطیع رہے اور جنگ جمل میں

شہید ہوئے۔

خطبے کے بعد حضورؐ کے حکم سے بلالؓ نے اذان دی اور ظہر و عصر ملا کر ادا فرمائی۔ پھر موقف میں دیر تک قبلہ رو ہو کر کھڑے دعا مانگتے رہے قریب مغرب اسامہ بن زیدؓ کو اپنے پیچھے اونٹ پر بٹھا کر مزدلفہ پہنچے۔ مغرب پڑھ کر فوراً ہی عشاء پڑھی اور آرام فرمانے کے لیے لیٹ گئے۔ نبوت کے دن سے لے کر آج تک کے درمیان میں یہ پہلی اور آخری شب تھی جب حضور اکرمؐ تہجد کے لیے بیدار نہ ہوئے۔ صبح یعنی دسویں ذی الحجہ صبح کی نماز ادا فرما کر سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہو گئے۔ مہار شتر بلالؓ کے ہاتھ میں تھی اور اسامہؓ پیچھے بیٹھے غلاموں کی سربلندی کا اعلان زبانِ حال سے کر رہے تھے۔ راستے میں سائلین حج کو مسائل حج کی تعلیم فرماتے جاتے تھے۔ وادی محسّر کے راستے سے منیٰ میں پہنچے۔ جمرۂ عقبہ پہنچ کر ابن عباسؓ سے کنکریاں منگوائیں اور رمی جمارہ فرمائی۔ یہاں لوگوں کو مذہبی غلو سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ پھر راستے میں ضروری نصائح فرماتے ہوئے منحر (قربان گاہ) پر پہنچے۔ ۶۳ اونٹ اپنے دستِ مبارک سے ذبح کیے اور ۳۷ حضرت علیؓ نے ذبح کیے۔ اور سب راہِ خدا میں خیرات کیے گئے۔ قربانی سے فارغ ہو کر معمرؓ بن عبداللہ سے سر کے موئے مبارک اتروائے۔ کچھ موئے مبارک حضرت اکرمؐ نے خود تقسیم فرمائے اور کچھ ابوطلحہؓ نے۔ پھر مکّے تشریف لا کر طواف فرمایا اور قبلہ رو استادہ ہو کر آبِ زمزم نوش فرمایا۔ اس کے بعد واپس آکر ایام تشریق یعنی ۱۳ ذوالحجہ تک منیٰ ہی میں قیام پذیر رہے اور یہیں سے ہر روز بعد زوال رمی جمارہ کے لیے جمرات پر تشریف لے جاتے رہے۔ ۱۳ ذوالحجہ یوم سہ شنبہ کو بعدِ زوال منیٰ سے روانہ ہو کر

وادی محصّب میں پہنچے اور شب یہیں گزار کر صبح خانۂ کعبہ کا آخری طواف اور نماز صبح ادا فرمائی اور یہیں سے مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔

وصالِ حق کی تیاریاں

رمضان ۱۰ھ میں سورۂ نصر نازل ہوا یعنی۔

اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا فسبح بحمد ربک واستغفرہ انہ کان توابا ؟ ۳

اس میں اشارہ تھا کہ اے رسول آپ کی تبلیغ عالمگیر ہو چکی۔ اب آپ ہمہ تن یادِ الٰہی میں مصروف ہو جائیں۔

پھر ذوالحجہ میں الیوم اکملت لکم دینکم کی آیت اتری۔ اس میں بھی یہی اشارہ تھا کہ کام تکمیل کو پہنچ چکا لہٰذا اب اپنے بھیجنے والے کے حضور میں آنے کی تیاری کیجیے۔ سورۂ نصر کے بعد کوئی سورت اور اس آیت کے بعد کوئی آیت نہیں نازل ہوئی۔ حضور اکرمؐ سورۂ نصر کے نزول کے بعد ہی سے تیاری فرمانے لگے تھے۔ چنانچہ جبرئیل امین ہر سال رمضان میں ایک دورِ قرآن سنتے تھے لیکن اس سال دو دَور فرمائے۔ اعتکافِ رمضان ہر سال دس دن فرماتے تھے مگر اس سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔ حجۃ الوداع میں صاف فرما دیا کہ "شاید اس سال کے بعد میں حج نہ کر سکوں"۔ چند دن قبل حضرت اکرمؐ کوہ احد پر بھی تشریف لے گئے اور اس طرح سے

شہدائے احد کے لیے دعائے مغفرت فرمائی اور اس طور پر ان سے مخاطب ہوئے جیسے کوئی وداع کرتا ہو۔ حجۃ الوداع کے بعد مختلف مواقع پر متعدد خطبے دیے جن میں ضروری ہدایات و نصائح اس طرح فرمائے جس طرح کوئی رخصت ہونے والا وقت کی تنگی محسوس کر کے جلد آگاہ کرنا ضروری تصور کرتا ہو۔

بیماری کی ابتداء

حضرت اکرمؐ لشکرِ اسامہؓ کی تیاری میں لگے تھے کہ ایک دن جنت البقیع میں مغفرت رفتگان کی دعا فرمانے تشریف لے گئے۔ واپس تشریف لائے تو دردِ سر کی تکلیف محسوس ہوئی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نصف شب کا وقت تھا اور حضورؐ اکرم حجرۂ عائشہؓ میں تشریف فرما تھے۔ صبح آپؐ اسی حالت میں حضرت میمونہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے کیونکہ آج ان ہی کی باری کا روز تھا۔ علی اختلاف الروایات اس دن ۲۹ صفر ۱۱ھ یوم دوشنبہ تھا۔ ازواج مطہراتؓ کی باری میں بحالت مرض بھی فرق نہ آنے دیا۔ ہر روز دریافت فرماتے آج کس کی باری کا دن ہے۔ چند بار یہ سوال فرمانے سے حضرت فاطمہؓ نے امہات مطہراتؓ کو منشائے نبوی سے آگاہ کیا اور تمام امہاتؓ نے اپنی اپنی باری جناب صدیقہؓ کو سونپ دی۔ اس کے بعد حضرت اکرمؐ حجرۂ عائشہؓ میں اپنے آخری لمحات تک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے تشریف لے آئے۔

امامت صدیق اکبرؓ پر بار بار زور

جب تک طاقت رہی مسجد میں تشریف لا کر باجماعت نماز ادا

فرماتے رہے۔ آخری نماز حضورؐ نے مغرب کی پڑھائی جس میں سورۂ المرسلات تلاوت فرمایا۔ عشاء کا وقت آیا تو بلالؓ نے حسبِ معمول آواز دی کہ جماعت تیار ہے۔ حضورؐ نے لگن میں پانی بھرواکر غسل فرمایا اور اٹھنا چاہا مگر غش آگیا۔ تھوڑی دیر میں افاقہ ہوا اور پھر غسل فرماکر اٹھنے کا ارادہ کیا۔ تو پھر غشی طاری ہو گئی۔ تیسری بار پھر یہی ہوا۔ ہر بار حضورؐ سوال کرتے تھے کہ کیا نماز ہو گئی؟ اور جواب ملتا تھا کہ حضورؐ کا انتظار ہے۔ تیسری بار افاقہ ہونے کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ "ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھائیں"۔ عائشہؓ نے کہا وہ رقیق القلب ہیں حضورؐ کی جگہ کھڑے ہونے کو برداشت نہ کر سکیں گے۔ حضرت اکرمؐ نے پھر یہی حکم دیا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھائیں"۔ عائشہؓ نے اب کی بار حضرت حفصہؓ کے ذریعے کہلوایا کہ حضورؐ عمرؓ سے نماز پڑھانے کو فرمائیں"۔ حفصہؓ نے کہا تو حضورؐ خفا ہوئے اور فرمایا کہ تم یوسف والیاں ہو گئیں ابوبکرؓ ہی سے کہو کہ نماز پڑھائیں"۔ حضرت ابوبکرؓ اس وقت موجود نہ تھے۔ لوگوں نے حضرت عمرؓ کو کھڑا کر دیا۔ حضورؐ کے کانوں میں حضرت عمرؓ کی قرأت کی آواز گئی تو فرمایا "میں کس کی آواز سن رہا ہوں کیا یہ عمر کی آواز نہیں؟" لوگوں نے عرض کی کہ "یارسول اللہ ابوبکرؓ موجود نہ تھے"۔ ارشاد ہوا مگر اللہ اور مومنین کو ایسا منظور نہیں، ابن ابی قحافہ (ابوبکرؓ) کہاں ہیں وہی نماز پڑھائیں"۔ حضرت عمرؓ کے کانوں میں یہ آواز پہنچی تو فوراً ہٹ گئے اور جماعت سیدنا صدیقؓ کے آنے تک ملتوی رہی۔

عقل حیران ہے کہ حضور اکرمؐ نے سیدنا ابوبکرؓ کی امامت کو بار بار اتنا زور دے کر پختہ سے پختہ تر کر دیا مگر پھر بھی کچھ اہل ہوا ایسے ہیں جن کو آپ کے امام المسلمین اور امیر المومنین ہونے میں شبہ ہے۔ اتنی زوردار تاکید وحی الٰہی کے سوا اور کسی شے پر نہیں ہو سکتی اس لیے یہ واقعات دیکھ کر مجبور

ہونا پڑتا ہے کہ اس امامت کو ہم وحی الٰہی کے ماتحت تسلیم کریں۔ نبی کریمؐ نے اپنے سامنے کائنات کے ایک ایک ذرے کو ابوبکرؓ کی اقتدا پر مجبور کر کے صاف صاف اشارہ فرمادیا کہ میرے بعد خلافت کا لاہیم مستحق ابوبکرؓ کے سوا کوئی فرد بشر نہیں۔

عدم استخلاف کی مصلحت

لیکن حضور صلعم خلافت کو منصوص چیز بنانا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ جمہوریت کے خطوط پر چلانا چاہتے تھے اس لیے صرف اشارات پر ہی اکتفا فرمایا۔

اس حکم کے بعد سے کئی دن تک حضرت صدیق اکبرؓ ہی امامت فرماتے رہے۔ اس مدت میں ۱۷ یا ۱۳ نمازیں آپ نے پڑھائیں پہلی نماز آپ نے جب عشاء کی پڑھائی تو ساری مسجد ماتم کدہ بن گئی۔ امام اور تمام مقتدیوں کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی:

در نمازم خم ابروئے تو یاد آمد
حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

مختلف احادیث قرطاس

ایک دن حضورؐ کو حضرت علیؓ سہارا دیے تھے اس طور پر کہ حضورؐ کا سر مبارک حضرت علیؓ کی کلائی پر تھا۔ اسی حالت میں حضرت اکرمؐ نے فرمایا کہ اے علیؓ کاغذ لے آؤ تاکہ میں ایسی تحریر لکھوا دوں جس کے بعد میری امت کبھی گمراہ نہ ہو گی۔ حضرت علیؓ کو خوف ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کاغذ لینے

جاؤں اور ادھر حضورؐ کا وصال ہو جائے۔ اس لیے عرض کیا یارسول اللہؐ جو کچھ فرمانا ہے فرما دیں میں اسے یاد رکھوں گا۔" فرمایا" میں وصیت کرتا ہوں نماز کی اور زکوٰۃ کی اور ان کی جو تمہارے زیر دست (لونڈی غلام) ہیں۔" (یہ روایت مسند علی کی ہے)۔

ایک دن عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ سے فرمایا کہ کوئی جلد یا تختی لے آ تاکہ میں ابوبکرؓ کے حق میں ایک تحریر لکھ کر اختلاف کا دروازہ بند کر دوں۔" (حضرت ابوبکرؓ اس وقت موجود تھے)۔ عبدالرحمٰن جانے لگے تو انہیں روک دیا اور فرمایا کہ "اے ابوبکر اللہ کو اور مومنین کو یہ منظور ہی نہ ہوگا کہ تجھ پر اختلاف کیا جائے۔" (یہ روایت مسند عائشہؓ کی ہے)۔

ایسا ہی واقعہ صحیح بخاری میں بھی ہے۔ لیکن اس میں ہے کہ حضورؐ نے عبداللہ بن ابی بکرؓ کو بلوا کر حضرت ابوبکرؓ کے لیے فرمانِ خلافت لکھوانا چاہا لیکن پھر یہ فرما کر رک گئے کہ "خود رب العزت اور اہل ایمان ابوبکرؓ کے سوا کسی کو پسند نہ کریں گے۔" چنانچہ بعد کے واقعات نے اس کی حرف بہ حرف تصدیق کی۔ لیکن حضرت اکرمؐ نے اس کی تنصیص محض اس لیے نہ فرمائی کہ جمہوریت اسلامیہ پر اس کی زد نہ پڑے۔ یہ دراصل جمہوری فیصلہ ہی تھا جسے حضورؐ نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ تھوڑے بہت اختلاف کی گنجائش کو بھی لکھوا کر ختم فرمانا چاہتے تھے لیکن جمہوریت کے اصول کو توڑنا پسند نہ فرماتے تھے اس لیے رک گئے۔ ایک اور موقع پر وفات سے چار دن پہلے ایک عام خطاب کے ساتھ فرمایا کہ "لاؤ کاغذ میں ایسی تحریر لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو گے۔" جن کے شوقِ اطاعت پر تکلیف رسول کا احساس غالب تھا وہ تعمیل ارشاد میں ہچکچائے اور جن کو تعمیل ارشاد کا

زیادہ جذبہ تھا وہ ہچکچانے والوں کے خلاف بولے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان دوسری صنف کے لوگوں میں بھی سب بحث ہی کرتے رہے اور تعمیل ارشاد کسی نے بھی نہ کی۔ حضورؐ کو شور وغل ناگوار ہوا اور فرمایا کہ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔

حسبنا کتاب اللہ

حضرت عمرؓ پہلی قسم کے لوگوں میں تھے جنہوں نے حضورؐ کو تکلیف دینے کی بجائے ایک خدا لگتی بات لوگوں سے کہہ دی کہ "حضورؐ کو تکلیف ہے اور تمہارے پاس کتاب اللہ موجود ہے اور قرآن ہی ہم سب کے لیے کافی ہے۔"

آپ معلوم کر چکے ہیں کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضرت اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ میں تم میں کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں اگر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ آج یہ فرمایا کہ میں ایک تحریر ایسی لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے۔" ان دونوں کو ملا کر دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منشائے نبوی کو تاڑ جانے میں حضرت عمرؓ نے ٹھوکر نہیں کھائی۔

بہرکیف حضور اکرمؐ کے فرمانے کے بعد جب صحابہ کی باہمی تکرار شروع ہوئی تو بعض لوگوں نے حضورؐ سے مطلب دریافت کرنا چاہا تو حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جس طرف تم بلانا چاہتے ہو اس سے یہ حال جس میں میں ہوں بہت بہتر ہے۔ پھر تین وصیتیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ دوئم یہ کہ وفود و سفراء کے ساتھ ویسا ہی حسن سلوک ہوا کرے جیسا میں خود کرتا تھا۔ تیسری بات راوی

کو یاد نہیں رہی۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ تیسری وصیت لشکر اسامہؓ کو بھیجنا تھی۔

زندگی کا آخری پیغام

اسی دن ظہر کے وقت حضرت اکرمؐ نے اپنے اوپر سات لبریز مشکیں ڈلوائیں۔ پھر علیؓ و عباسؓ کے سہارے مسجد میں تشریف لائے حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ جمالِ اقدسؐ پر نظر پڑتے ہی پیچھے ہٹے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اپنی جگہ پر رہو۔ حضور حضرت ابوبکرؓ کی دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مقتدین ابوبکرؓ کی اور ابوبکرؓ حضور اکرمؐ کی اقتدا فرما رہے تھے۔ اس وقت طبیعت ذرا سنبھل گئی تھی۔ نماز کے بعد ختم المرسلینؐ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جو اس حیاتِ مستعار کا آخری خطبہ تھا۔ فرمایا:

"اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا اللہ کے پاس والی نعمتوں کو قبول کرے لیکن اس بندے نے اللہ ہی کے پاس کی چیزوں کو قبول کیا ہے۔" حضرت اکرمؐ نے یہیں تک فرمایا تھا کہ صدیق اکبرؓ رونے لگے۔ لوگ اسے کسی بندے کا واقعہ سمجھ رہے تھے اور رازدارِ نبوت صدیق اکبرؓ جان چکا تھا کہ وہ بندہ خود آقائے دو جہاںؐ ہے۔ پھر حضرت اکرمؐ نے سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا "سب سے زیادہ جس شخص کی دولت اور رفاقت کا میں مرہون ہوں وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن اسلامی رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے۔" (بعض روایتوں میں ہے "مگر میں نے اللہ کو خلیل بنا لیا ہے")۔ مسجد کے رُخ پر جتنے دریچے ہیں سب بند کر دیے جائیں بجز دریچۂ ابوبکرؓ کے۔" پھر فرمایا "تم سے پہلی امتوں نے اپنے

انبیاء و اولیا کی قبور کو عبادت گاہ بنالیا ہے۔ خبردار تم اس ہلاکت میں نہ پڑنا۔"

حضورؐ نے لوگوں کو اس کے بعد انصار کے بارے میں آگاہ کیا کہ:

"انہوں نے بہت خوبی سے ہماری اعانت و نصرت کے فرائض انجام دیے پس جو کوئی نفع و نقصان کا متولی ہو یعنی خلیفہ ہو وہ ان کے نیکو کاروں سے حسن سلوک اور ان کے بدوں سے درگذر کرے۔" پھر جن لوگوں نے لشکر اسامہ پر اسامہؓ کی سرداری کی وجہ سے نکتہ چینی کی تھی ان کا جواب دیا کہ "اسامہ میرا سب سے زیادہ محبوب اور وہ اس منصب کا اہل ہے" پھر فرمایا کہ میں نے خدا کی حرام کی ہوئی چیز کو حرام اور خدا ہی کی حلال کی ہوئی چیز کو حلال کیا ہے۔" پھر ارشاد ہوا کہ "اے بیٹی فاطمہؓ اور اے پھوپھی صفیہؓ نیکی کرو۔ میں تمہیں اللہ سے نہیں بچا سکتا۔"

اس کے بعد حجرۂ عائشہؓ میں تشریف لائے۔ لخت جگر فاطمہ زہراؓ سے کان میں کچھ فرمایا اور وہ رونے لگیں۔ پھر کچھ کہا اور وہ ہنسنے لگیں۔ بعد کو جناب زہراؓ نے حضرت عائشہؓ کو بتایا کہ پہلے حضورؐ نے اپنی وفات کی خبر دی تھی اس لیے میں رو دی۔ دوسری بار یہ خبر دی کہ تم ہی مجھ سے سب سے پہلے ملوگی۔" اس لیے میں ہنس دی۔

اجتناب سرمایہ داری سے

کرب برابر بڑھتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں آپؐ نے پوچھا کہ "عائشہؓ وہ دینار تم نے خیرات کر دیے؟" عرض کیا نہیں۔ حضورؐ کی تیمارداری نے یاد نہ آنے دیا۔ فرمایا "جلد خیرات کر دو۔ محمد اپنے پروردگار کے سامنے یہ لے کر

نہیں جانا چاہتا۔"

زندہ دلی

وفات سے ایک دن پہلے ازواج مطہراتؓ اور دوسرے لوگوں نے دوا پیش کی۔ حضورؐ نے انکار فرمایا۔ لوگوں نے بحالتِ غشی دوا منہ میں ٹپکا دی۔ حضورؐ کو ہوش آنے پر معلوم ہوا تو حکم دیا کہ جتنے لوگ دوا پلانے کی سازش میں شریک تھے سب کو دوا پلائی جائے۔ یہ حضورؐ کا مزاحیہ انتقام تھا۔ مگر کون جانتا ہے کہ اس "انتقامی دوا" کا ایک ایک قطرہ ان پینے والوں کے لیے کتنی برکتوں کا سمندر ہو گا۔

آخری دیدار

آخری شب کو کروٹیں بدل کر صبح کی۔ صبح کی جماعت ہو رہی تھی۔ کچھ افاقہ بھی تھا۔ پردہ ہٹا کر تھوڑی دیر نظارۂ نماز کا لطف اٹھاتے رہے جو حضرت اکرمؐ کی پاک تعلیم کا عملی ظہور تھا۔ نمازیوں کی نظر جمالِ اقدسؐ پر پڑی تو ان کے اضطراب کی یہ کیفیت ہوئی کہ سب متوجہ ہونے لگے:

بر مصحفِ روئے او نظر کن ۔۔۔ خسرو غزل و کتاب تا کے

ابوبکر صدیقؓ نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا۔ حضورؐ نے تسکین دی اور پردہ گرا لیا۔ بعض روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ نماز حضورؐ نے جماعت سے حضرت ابوبکرؓ کی اقتدا میں ادا فرمائی۔ بہرکیف آں حضرتؐ نے امت کے اس اجتماع کو اور اس اجتماع نے حضورؐ کو یہ آخری بار دیکھا۔

اس نماز کے بعد حضرت اکرمؐ پر پھر کوئی دوسرا وقت نماز نہیں آیا۔ اب جوں جوں دن چڑھتا جاتا تھا۔ غشی کی نوبت بھی اتنی ہی زیادہ آتی جاتی تھی۔ گھڑی میں غشی اور گھڑی میں افاقہ ہوتا۔ حضرت فاطمہؓ سے یہ حالت دیکھ کر رہا نہ گیا۔ بولیں "واکرب اباہ" ہائے باپ کی تکلیف۔" ارشاد ہوا "بیٹی آج کے بعد سے تیرے باپ کو تکلیف نہ رہے گی۔" آخری تکلیف بڑھتی گئی اور نزع کی حالت طاری ہونے لگی۔ پاس پانی کا پیالہ رکھا تھا۔ بار بار اس میں ہاتھ ڈالتے اور چہرۂ انور پر پھیرتے جاتے۔ رنگت کبھی سُرخ ہو جاتی اور کبھی زرد۔ اسی حالت میں فرماتے لا الٰہ الا اللہ ان للموت سکرات کبھی پڑھتے مع الذین انعم اللہ علیھم الخ کبھی فرماتے اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ اتنے میں دروازہ پر ایک آہٹ ہوئی۔ فاطمہ زہراؓ نے پوچھا "کون؟" حضورؐ نے فرمایا کہ بیٹی یہ عورتوں کو بیوہ کرنے والا، بچوں کو یتیم کرنے والا، جماعتوں کو پراگندہ کرنے والا، تمناؤں کا خون کرنے والا یعنی فرشتۂ اجل ہے۔ آنے کی اجازت چاہتا ہے۔" فاطمہؓ رو دیں حضورؐ نے ان کے آنسو پونچھے۔ پھر حسنینؓ کو بلا کر پیار کیا۔ پھر ازواج کو بلایا۔ پھر علیؓ کو بلایا۔ علیؓ نے آپؐ کو اپنی گود میں لے لیا۔ پھر عائشہؓ نے لیا۔

صفائی دہن کا خیال

اتنے میں عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ ایک تازہ مسواک ہاتھ میں لیے اندر آئے۔ حضورؐ نے مسواک کی طرف نظر جما کر دیکھا۔ وہ سمجھ گئے اور مسواک بڑھا دی۔ حضورؐ سے چبائی نہ جا سکی۔ عائشہ طیبہؓ نے چبا کر نرم کی اور

حضورؐ کو دی۔ حضورؐ نے مسواک کی۔

احکام غلامی کی تکمیل کا خیال

چاشت کا وقت آگیا تھا۔ سینے میں گھرگھراہٹ شروع ہوگئی۔ لب مبارک ہلنے لگے۔ اور زبان پر یہ الفاظ تھے: الصلوٰۃ الصلوٰۃ وما ملکت ایمانکم (نماز، نماز، اور لونڈی، غلام) پھر انگلی اٹھا کر تین بار فرمایا - بل الرفیق الاعلیٰ! پاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ ہاتھ بھی لٹک گئے اور آنکھیں چھت سے لگ گئیں۔ اور اللہ کا آخری رسولؐ اپنے آخری لمحاتِ دنیا ختم کر کے حیاتِ نبوی کی دنیا میں چلا گیا۔ یہ بالاتفاق دوشنبہ کا دن تھا، اور باختلاف روایات ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ تھی۔ اس لحاظ سے مدتِ علالت ۱۴ روز تھی اور عمر شریف ۶۳ قمری سال اور ۴ دن۔

رحلت کے بعد

کون دنیا میں اس غم کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے جو صحابہ کو، ازواج اور کنبے والوں کو خصوصاً جناب زہراؓ کو اس جدائی کے بعد ہوا ہوگا۔ کتنے تھے جو مرغ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے۔ کتنے تھے جنہوں نے جنگل کی راہ لی۔ کتنے تھے جو اپنے اندھے ہونے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ کتنے تھے جو عالم تحیر میں خاموش و ساکت اور سکتہ دم تھے۔ کتنے تھے جن کی آنکھیں آنسو روکنے پر قادر نہ رہی تھیں۔ کتنے تھے جو اس خبرِ وفات کو ہی غلط کہہ رہے تھے۔ کتنے تھے جنہیں اپنے حواس پر قابو نہ رہا تھا اور اسے محض عارضی چند روزہ جدائی سمجھ رہے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ حضورؐ

بارگاہِ خداوندی میں تشریف لے گئے ہیں اور پھر لوٹ کر آئیں گے۔

حضرت عمرؓ شمشیر برہنہ لے کر مسجد میں اِدھر سے اُدھر دوڑ دوڑ کر اعلان کرنے لگے کہ خبردار جس کسی نے کہا کہ رسول اللہؐ وفات پا گئے اس کا سر اڑا دوں گا۔" ساری مسجد نبوی ماتم کدہ بنی ہوئی تھی۔ اتنے میں ابوبکر صدیقؓ سُنح سے تشریف لائے۔ چونکہ صبح حضورؐ کو افاقہ تھا اس لیے آپ اجازت لے کر اپنی بیوی بنت خارجہؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ سُنح مدینہ سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے۔ یہیں آپ کو خبر وفات معلوم ہوئی۔ فوراً چل پڑے۔ پہلے حجرۂ عائشہؓ میں تشریف لے گئے۔ حضورؐ کے جسدِ اطہر پر چادر پڑی تھی۔ چہرۂ مبارک سے چادر ہٹا کر پیشانی کو چوما اور فرمایا "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان۔ بلاشبہ آپؐ پر موت آ چکی۔ اللہ آپؐ پر دو موتیں وارد نہ کرے گا۔" پھر مسجد میں آئے۔ لوگ دیکھتے ہی ادھر متوجہ ہو گئے۔ آپ نے ایک بلیغ خطبہ دیا جس کا خلاصہ یہ ہے:

ایھا الناس من کان منکم	اے لوگو! تم میں جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا
یعبد محمدًا فانہ قد مات	تھا وہ سُن لے کہ ان کی رحلت ہو چکی، اور
ومن کان یعبد اللہ فانہ	جو اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ
حیٌّ لایموت (قال اللہ تعالیٰ)	اب بھی زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں
وما محمدٌ الا رسول قد خلت	(اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ) "محمدؐ فقط
من قبلہ الرسل افان مات	ایک رسول ہیں بہت سے رسول ان
او قتل انقلبتم علی اعقابکم	سے پہلے بھی گذر گئے بس کیا اگر وہ (محمدؐ)
ومن ینقلب علی عقبیہ فلن	رحلت کر جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم
یضر اللہ شیئًا وسیجزی اللہ	اُلٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹ جاؤ گے؟

الشاکرین ہ (یاد رکھو، جو شخص بھی اس طرح مرتد ہو گا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا اللہ قدر دانوں کو نیک جزا دیتا ہے۔

ابوبکر صدیقؓ کے اس خطبے سے سارے مجمع پر سناٹا سا چھا گیا اور سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب کسی کو وفات میں شبہہ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے آیت مذکورہ انہوں نے آج سے پہلے نہیں سنی تھی۔ جب حضرت عمرؓ کو یقین وفات ہوا تو زمین پر صدمے سے گر پڑے۔ اور بیہوش ہو گئے۔ اکثر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ضبطِ گریہ سے عاجز تھے۔

تکفین و تدفین

حضور انورؐ کو کنبے والوں ہی نے غسل دیا البتہ ہاتھ بٹانے میں دوسرے لوگ بھی شریک تھے۔ علیؓ، عقیلؓ، عباسؓ اور ان کے دونوں صاحبزادے فضلؓ اور قثمؓ کنبے والوں میں اور غیر میں اسامہؓ اور اوسؓ بن خولی انصاری تھے۔ بعد غسل تین کفن دیے گئے جو سفید سوتی تھے۔ جنازہ تیار ہونے کے بعد جائے دفن کا سوال درپیش ہوا۔ مختلف رائیں ہوئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ نبی جہاں وفات پاتا ہے وہیں دفن ہوتا ہے۔" چنانچہ حجرۂ عائشہؓ ہی کو مدفن رسول ہونے کا ابدی شرف حاصل ہوا۔ ابو طلحہؓ نے قبر کھودی جو دستورِ مدینہ کے مطابق لحدی تھی۔ زمین نم تھی اس لیے وہ بستر جس پر وفات ہوئی تھی قبر مبارک میں بچھا دیا گیا تھا۔ جنازۂ مبارک تیار ہونے کے بعد سب سے پہلے اہل قرابت نے، پھر مہاجرین نے، پھر انصار نے، پھر عام مسلمانوں نے، پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ حجرے کے اندر کم:

بیش دس دس آدمی جاتے تھے (کیونکہ حجرہ تنگ تھا)، اور صلوٰۃ وسلام کے ساتھ کچھ دعائیں پڑھ کر واپس آجاتے۔ یہی حضور اکرمؐ کی نماز جنازہ تھی۔ جو گروہ اندر جاتا اس کا کوئی امام نہ ہوتا تھا۔

جسدِ اطہر کو قبر منوّر میں حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ، اسامہ بن زیدؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے اتارا تھا۔ قبر مطہر مُسنّم یعنی کوہانی شکل کی بنائی گئی۔

حدیث مسلسل بالبکاء

مٹی دے کر صحابۂ کرام لوٹ رہے تھے کہ حضرت انسؓ (جو کم و بیش دس سال حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے تھے) حجرۂ فاطمہؓ کے پاس سے گزرے۔ غمزدہ فاطمہؓ نے آہٹ پاکر دریافت کیا۔ کون ہے؟ جواب دیا "آپؓ کے پدر بزرگوارؐ کا خادم یعنے انس ہے۔" سیدۂ فاطمہ زہراؓ نے رو کر ایک عجیب سوال کیا جس پر دنیا کے سینکڑوں مرثیے قربان ہیں۔ فرمایا کہ:

یا انس کیف طابت انفسکم ان تحثوا التراب علیٰ رسول اللّٰہ؟	اے انس! تمہارے دلوں نے کیونکر گوارا کیا کہ رسول اللہؐ پر مٹی ڈال کر واپس آگئے؟

اس حدیث کی خصوصیت یہ ہے کہ جس شیخ نے اپنے تلمیذ کو اس کی اجازت دی ہے رو کر دی ہے۔ مجھے میرے شیخ طریقت (پدر بزرگوار حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان پھلواروی قدس اللہ سرہ العزیز) نے اسی طرح رو کر اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ گویا مجھ سے لے کر حضرت سیدۂ فاطمہؓ تک یہ حدیث بیان کرتے وقت رونے کا سلسلہ لگاتار قائم

رہا ہے۔ اس لیے اس حدیث کو "مسلسل بالبکاء" کہتے ہیں۔ میرے
بہت سے احباب بھی اس حدیث کی اجازت میں شریک ہیں۔
اللّٰھم صلّ علی صاحب خیر الھدی و علی من تبعہٗ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

فہرست مطبوعات

مجموعۂ تفاسیر ابو مسلم اصفہانی از سید نصیر شاہ و محمد رفیع اللہ

گلستانِ حدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

انتخابِ حدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مقامِ سنت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

معارف الحدیث از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مسئلہ اجتہاد از مولانا محمد حنیف ندوی

اجتہادی مسائل از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

کمرشل انٹرسٹ کی فقہی حیثیت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مسئلۂ تعدد ازدواج از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

ازدواجی زندگی کے لیے اہم قانونی تجاویز از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

چند ازدواجی مسائل از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ از مولانا محمد اسحاق بھٹی

فقہ عمر از ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی

رویتِ ہلال از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مقالات از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلام اور موسیقی از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

قوانین اسلامی کا نفاذ قرآن و سنت کی روشنی میں۔ از سید یعقوب شاہ

اسلام اور فطرت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

دینِ فطرت از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام — دین آسان از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

اسلام کا نظریۂ حیات از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

مقامِ انسانیت از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

عقائد و اعمال از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام کی بنیادی حقیقتیں از رفقائے ادارہ

مجمع البحرین (شیعہ سنی متفق علیہ احادیث) از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

روحِ اسلام اردو ترجمہ "سپرٹ آف اسلام" (سید امیر علی) از محمد ہادی حسین

اساسیات اسلام از مولانا محمد حنیف ندوی

کلامِ حکیم (مجموعۂ کلام ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم) مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

سکھ مسلم تاریخ حقیقت کے آئینے میں از ابو الامان امرتسری

گورو گرنتھ صاحب اور اسلام از ابو الامان امرتسری

اسلام اور مذاہبِ عالم از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

پیغمبر انسانیت از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

حیاتِ محمد از محمد حسین ہیکل - اردو ترجمہ از ابو یحییٰ امام خاں

تاریخ دولتِ فاطمیہ از مولانا رئیس احمد جعفری

زیر دستوں کی آقائی اردو ترجمہ "الوعد الحق" (طٰہٰ حسین) از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی

اسلام کا نظریۂ تاریخ از مولانا مظہر الدین صدیقی

مسلمانوں کے عقاید و افکار اردو ترجمہ "مقالات الاسلامیین" (امام اشعری) از مولانا محمد حنیف ندوی

حصہ اوّل ، حصہ دوم

تصوراتِ عرب قبل از اسلام از مولانا عبید اللہ قدسی

الفہرست اردو ترجمہ "کتاب الفہرست" (ابن الندیم وراق) از مولانا محمد اسحاق بھٹی

الفخری اردو ترجمہ از مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی

پاکستانی مسلمانوں کے رسوم و رواج از شاہد حسین رزاقی

اسلام اور رواداری از مولانا رئیس احمد جعفری - جلد دوم

اسلام اور عدل و احسان از مولانا رئیس احمد جعفری

مسلم ثقافت ہندوستان میں از مولانا عبد المجید سالک

تہذیب و تمدنِ اسلامی از مولانا رشید اختر ندوی حصہ اوّل حصہ دوم حصہ سوم

فقہائے ہند جلد اول از مولانا محمد اسحاق بھٹی

اسلام میں حیثیتِ نسواں از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

عقلیات ابنِ تیمیہ از مولانا محمد حنیف ندوی

سرسید اور اصلاحِ معاشرہ از شاہد حسین رزاقی

افکار ابنِ خلدون از مولانا محمد حنیف ندوی

مشاہیر اسلام از خواجہ عباد اللہ اختر

بیدل از خواجہ عباد اللہ اختر

مقالاتِ حکیم مجموعہ مضامین ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم۔ مرتبہ شاہد حسین رزاقی۔ حصہ اوّل اسلامیات

حصہ دوم اقبالیات حصہ سوم متفرقات

موسیقی کی شرعی حیثیت از سید نصیر شاہ و رفیع اللہ

تعلیمات غزالی از مولانا محمد حنیف ندوی

افکارِ غزالی از مولانا محمد حنیف ندوی

سرگزشت غزالی اردو ترجمہ "المنقذ من الضلال" (امام غزالی) از مولانا محمد حنیف ندوی

حکمتِ رومی از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

تشبیہاتِ رومی از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

ملفوظاتِ رومی اردو ترجمہ "فیہ ما فیہ" از عبد الرشید تبسم

اقبال کا نظریۂ اخلاق از پروفیسر سعید احمد رفیق

تہافۃ الفلاسفہ از مولانا محمد حنیف ندوی

انڈونیشیا از شاہد حسین رزاقی

اسلام اور تعمیر شخصیت از میاں عبد الرشید

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق از بشیر احمد ڈار

اسلام کا نظریۂ اخلاق از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام میں حریت، مساوات، اخوت از خواجہ عباد اللہ اختر

اسلام اور حقوقِ انسانی از خواجہ عباد اللہ اختر

سیاستِ شرعیہ از مولانا رئیس احمد جعفری

تاریخ جمہوریت از شاہد حسین رزاقی

مسلمانوں کے سیاسی افکار از پروفیسر رشید احمد

اسلامی جمہوریت از مولانا رئیس احمد جعفری

اسلام کا معاشی نظریہ از مولانا محمد مظہر الدین صدیقی

مسئلۂ زمین اور اسلام از پروفیسر محمود احمد

چند معاشی مسائل اور اسلام از سید یعقوب شاہ

تاریخ تعلیم و تربیت اسلامیہ (ڈاکٹر احمد شلبی) اردو ترجمہ از محمد حسین خاں زبیری

اسلام کا نظریۂ تعلیم از ڈاکٹر محمد رفیع الدین

اسلامی اصولِ صحت از فضل کریم فارانی

طب العرب (ایڈورڈ جی۔ براؤن) ترجمہ از حکیم سید علی احمد نیر واسطی۔

تاریخ تصوف (قبل از اسلام) از بشیر احمد ڈار

مکتوب مدنی (شاہ ولی اللہ) اردو ترجمہ از مولانا محمد حنیف ندوی

لمحات (شاہ ولی اللہ) اردو ترجمہ از پیر محمد حسن

ارمغان شاہ ولی اللہ از پروفیسر محمد سرور

ارمغان حالی از پروفیسر حمید احمد خاں

یادگار شبلی از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ از ڈاکٹر زبید احمد۔ ترجمہ از شاہد حسین رزاقی

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم از مس ممتاز مرزا

سید امیر علی از شاہد حسین رزاقی

مفصل فہرست مطبوعات مفت طلب فرمائیں۔

الفخری

اصول ریاست اور تاریخ ملوک

ساتویں صدی ھجری کے نامور مورخ محمد بن علی بن طبا طبا کی مایۂ ناز تالیف کا اردو ترجمہ از مولانا محمد جعفر شاہ صاحب پھلواری ۔ الفخری کا شمار معتبر ماخذ میں ہے اور فی الواقع ایسی مختصر اور جامع تاریخ پہلے نہیں لکھی گئی ۔ اس کے مولف کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ نہ تو کسی کے عیب کو چھپاتا ہے اور نہ کسی کے ھنر کے اعتراف میں جھجھکتا ہے ، پھر ان دونوں باتوں کے اظہار میں مبالغے سے اجتناب بھی کرتا ہے ۔

اس کتاب میں پہلی مرتبہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ محض حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی تاریخ لکھی جائے اور جہاں تک بے لاگ تبصرے اور تنقید کا تعلق ہے ، اس کتاب کو بڑا بلند مقام حاصل ہے ۔

صفحات 422 قیمت 5.25 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ